نوٹ

16

ہندوستان میں برطانوی راج کا قیام - 1857 تک

(Establishment of British Rule in India Till 1857)

ہندوستان میں انگریزوں کے باقاعدہ راج کی شروعات سے پہلے ہی ایک ہند-یوروپی اقتصادی رشتہ موجود تھا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی جسے کبھی کبھی ''جان کمپنی'' (John Compony) بھی کہا جاتا ہے، ایک مشترکہ تجارتی کمپنی تھی جو جزائر مشرق الہند میں تجارت کی غرض سے 1600 میں قائم کی گئی تھی۔ یہ مشرق الہند میں تجارت کرنے والے لندن کے سوداگروں کی کمپنی تھی۔ اسی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی طرح اس خطے میں پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور ڈینمارک کی کچھ دیگر کمپنیاں بھی سرگرم تھی۔ انگلینڈ کی ملکہ ایلزبتھ اول کے ایک نمائندہ سفارت کار سر تھامس رو (Sir Thomos Roe) کو جب مغل شہنشاہ جہانگیر نے 1612 میں سورت کے اندر ایک فیکٹری (تجارتی کوٹھی) قائم کرنے کے حقوق عطا کر دیے تو پھر ہندوستان میں انگریزوں کی کمپنی کے پاؤں جم گئے۔ سمجھا جاتا ہے کہ 1757 میں پلاسی کی جنگ کے بعد جب بنگال کے نواب نے اپنے مقبوضات برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو سپرد کر دیے تو ہندوستان میں باقاعدہ برطانوی راج کا آغاز ہوگیا اور اس کے بعد یہ برطانوی کمپنی جو ایک کمرشیل اور تجارتی کمپنی تھی ایک سیاسی ادارہ بن گئی جس نے عملی طور پر ہندوستان پر راج کیا۔ اب کمپنی نے سرکاری اور فوجی کاموں کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا یہاں تک کہ 1858 میں برٹش حکومت نے قانون حکومت ہند مجریہ 1858 کے نتیجے میں حکومت ہند کے نظم ونسق کا کام براہِ راست خود سنبھال لیا۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ:

- ہندوستان میں یوروپی لوگوں کے سیاسی اور تجارتی مفادات کو سمجھ سکیں گے۔

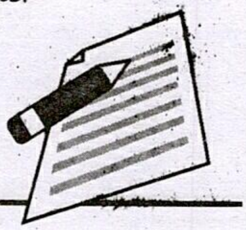

نوٹ

- اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے حوالے سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہونے والے کشمکش (Conflicts) کے اسباب کو سمجھ سکیں گے۔
- بنگال میں برطانوی اقتدار کی نشوونمای جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی توسیع کو سمجھ پائیں گے۔
- لارڈ ویلزلی کے ذریعے طے کردہ عہدنامہ اطاعت (Subsidiary Alliances System) کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکیں گے۔
- لارڈ ڈلہوزی کے ذریعے شروع کیے گئے نظریہ سوخت (Doctorine of Lapse) کی حکمت عملی کو سمجھ سکیں گے۔ جس کے ذریعے ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی توسیع ہوئی۔

16.1 ایشیا کے ساتھ یورپ کی مشرقی تجارت - ایک نیا مرحلہ

سولہویں اور سترہویں صدیوں کے دوران تجارتی راستوں پر کنٹرول کر لینے کے بعد بھی یوروپ والے عرصۂ دراز سے ہندوستان اور مغرب کے درمیان ہونے والی تجارت پر غلبہ حاصل کرنے کے بنیادی روش کو حل نہیں کر پائے۔ ہندوستان میں یوروپی مال کی مانگ اتنی نہ تھی جتنی یوروپ میں ہندوستانی مال کی مانگ تھی۔ یوروپی مال کے مقابلے ہندوستانی مال کی کوالٹی بھی بہتر تھی اور قیمت بھی کم ہوتی تھی۔ نتیجتاً تاجروں یا سوداگروں کو ہندوستانی سامان بیچنے سے بڑا نفع ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو یوروپ سے سونا چاندی (Bullion) کی ریل پیل ہندوستان کی طرف ہوئی اور دوسری طرف یوروپ کے ان صنعت کاروں میں سخت مقابلہ شروع ہو گیا جو ہندوستانی مال کی کوالٹی اور کم داموں پر دستیابی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دراصل، برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنے قیام کے پہلے پچاس سال میں کالونیاں آباد کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ پرتگالیوں کی روش پر گامزن ہو کر صرف تجارت میں لگے رہنا پسند کرتی تھی، اس کی یہ روش 1650 کے آس پاس اس وقت بدلی جب پرانے برطانوی شاہ پرست تاجروں کی طاقت ٹوٹ گئی اور تاجروں کے ایک نئے طبقے نے کمپنی کو اپنے کنٹرول میں کر لیا۔ انھوں نے اس روش (Pattern) کو اپنایا جس کو نوآبادیاتی تاجروں نے امریکا اور جزائرغرب الہند میں اپنایا تھا اور وہ کالونیوں کے ایک ایسے جال کی تشکیل میں مصروف ہو گئے جس نے انگلینڈ، افریقہ اور ہندوستان کو باہمی رشتوں کے ایک جال میں جکڑ دیا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں مغل سلطنت پر زوال آ گیا اور اس سیاسی خلا کو بنگال، حیدرآباد، اودھ، پنجاب اور مراٹھا جیسی علاقائی ریاستوں کے عروج نے پُر کیا۔ لیکن یہ علاقائی طاقتیں ایک پائیدار سیاسی استحکام کی ضامن نہ بن سکیں اور نتیجتاً برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں اپنے مقبوضات کی مملکت قائم کرنے کا حریصانہ موقع ہاتھ آ گیا۔ اب ایک استعماری میکانزم کے ذریعے ہندوستان میں راج کرنے کے لیے کچھ اداروں اور کچھ قوانین کی ضرورت پڑی۔ انھوں نے برطانوی مملکت کی توسیع کے لیے تین طریق کار اپنائے: 1۔ جنگیں اور فتوحات (Wars and

نوٹ

(conquests)، 2۔ عہدنامہ اطاعت (Subsidiory Alliance System) اور 3۔ اصول سوخت (Doctorine of Lapse) کو اپنا کر مقبوضات اور ریاستوں کا الحاق۔ اس میں پہلا طریقہ تو مکمل طور پر فوجی کامیابی کا یا بالفاظ دیگر مقبوضات یا ریاستوں کے براہِ راست الحاق کا تھا اور یہی علاقے تھے جنھیں بجا طور پر برطانوی ہندوستان (British India) کہا جاتا ہے۔ بعد میں اپنی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے ملکی حکمرانوں کے ساتھ معاہدوں اور اقرار ناموں کے ذریعے سفارتی کوششیں بھی کی گئیں۔

متن پر مبنی سوالات 16.1

1۔ ان طریقوں کا جائزہ لیجیے جو برطانیہ نے ہندوستان میں اپنا راج قائم کرنے کے لیے استعمال کیے۔

2۔ اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کی علاقائی ریاستوں (Regional States) کی نشاندہی کیجیے۔

16.2 جنوبی ہند میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کشمکش

اٹھارہویں صدی شروع ہوتے ہوتے ہندوستانی وسائل (Resources) پر قبضے کی دوڑ میں صرف برطانیہ اور فرانس کی ہی دو تجارتی کمپنیاں ہندوستان میں باقی رہ گئیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی رقابت کرناٹک کی تین جنگوں کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یہ تینوں جنگیں اٹھارہویں صدی میں جنوبی ہندوستان کے اندر برطانوی فتوحات کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے اس خطے سے فرانسیسیوں کا صفایا کردے۔ یوروپ میں سات سالہ (1756-1763) جنگ کے نتیجے میں، ہندوستان کے اندر انگریزی اور فرانسیسی نوآبادیات بھی کھلم کھلا جنگی سرگرمیوں میں ملوث ہوگئیں۔ کرناٹک کی تیسری جنگ میں برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے وانڈی وش کی لڑائی کے درمیان فرانسیسی افواج کو شکست دی اور ہندوستان پر بالادستی قائم کرنے کی جو کشمکش ایک صدی سے جاری تھی اس کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ہندوستان کے اندر برطانوی تجارتی کمپنی کو دیگر کمپنیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مستحکم پوزیشن حاصل ہوگئی۔ سر آیر کوٹ نے جنوری 1760 میں وانڈی واش کے مقام پر فرانسیسیوں کو شکست دی اور پھر ایک سال بعد پانڈیچری نے بھی اطاعت قبول کرلی۔ اس طرح 61-1760 میں جنوب میں ڈوپلے اور بسی (Bussy) کی محنت رائیگاں گئی۔ بہرحال ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات پیرس معاہدہ (1763) کے ذریعے بحال ہو گئے۔ اس کشمکش کا فیصلہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں ہوا اور اس کے اسباب ہندوستان میں کمپنی کی مضبوط بحریہ، اس کی مسلسل بڑھتی ہوئی فوجی طاقت، اچھی قیادت، انگلینڈ کی حکومت کی طرف سے اس کو ملنے والی حمایت اور بنگال کے

وسیع تر وسائل پر اس کا قبضہ تھے۔ کرناٹک جنگوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی علاقائی طاقتوں کی کمزوری (خاص طور پر بحری کارروائی کی عدم صلاحیت اور نسبتاً چھوٹی یوروپی افواج کے مقابلے میں کچھ طاقتوں کی بڑی بڑی افواج کا کھوکھلا) عیاں ہوگیا اور اس صورت حال سے اٹھارہویں صدی کے بقیہ سالوں کی سیاسی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

متن پر مبنی سوالات 16.2

1۔ تیسری کرناٹک جنگ کی کس لڑائی نے ہندوستان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ایک صدی سے جاری بالادستی کی کشمکش کا خاتمہ کر دیا؟

____

2۔ کرناٹک جنگوں کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔

____

3۔ کرناٹک جنگوں میں برطانیہ کی کامیابی کے کیا اسباب تھے؟

____

16.3 بنگال پر برطانوی قبضہ: پلاسی سے بکسر تک (1757-1765)

کسی ہندوستانی طاقت سے انگریزوں کی پہلی لڑائی بنگال میں ہوئی۔ 1757 سے 1765 تک کی بنگال کی تاریخ طاقت کے بتدریج منتقل ہونے کی تاریخ ہے جو نوابوں کے ہاتھوں سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھوں میں پہنچی۔ آٹھ سال کی اس مختصر مدت میں تین نوابوں یعنی سراج الدولہ، میر جعفر اور میر قاسم نے بنگال پر حکومت کی لیکن وہ نوابی اقتدار کو برقرار نہ رکھ سکے اور انجام کار اقتدار انگریزوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ انگریز تجارت میں ایشیائی تاجروں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے اسی لیے انھوں نے 1757 میں بنگال پر قبضہ کرنے کے لیے فوجی طاقت کا سہارا لیا اور اس کے لیے ''پلاسی کی بغاوت'' کو بہانہ بنایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے بنگال میں فتح حاصل کر لی اور فوجی طاقت کے استعمال سے اس تجارت پر بھی زوال آ گیا جس پر وہ کنٹرول کرنے کے خواہشمند تھے۔ جب 1756 میں سراج الدولہ بنگال کے نواب کی حیثیت سے علی وردی خان کی جانشین بنے تو اس وقت تجارتی مراعات اور کمپنی نیز اس کے افسران کے ذریعے ان مراعات کا بیجا استعمال پہلے ہی جھگڑے کا موضوع بن چکا تھا۔ یہ مراعات (Privilages) مغل بادشاہ فرخ سیر نے تجارتی درآمدات و برآمدات کے لیے کمپنی کو عطا کی تھی۔ اس شاہی فرمان کے مطابق کمپنی کو ہر سال تین ہزار روپیہ ادا کرنے ہوتے تھے اور بدلے میں کمپنی بنگال میں بلا محصول (Duty-free) تجارتی سرگرمیاں جاری رکھ سکتی تھی۔ کمپنی کے ملازمین نے اس مراعات کا دائرہ اپنی ساحلی تجارت،

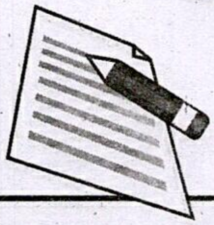

نوٹ

بین ایشیائی تجارت اور اندرون ملک تجارت تک وسیع کر لیا تھا۔ یہ کھلم کھلا طور پر فرمان کا ناجائز استعمال تھا۔ دیگر عوامل جیسے نواب کی اجازت کے بغیر کلکتے کے اطراف میں قلعہ بندی اور قانون شکنی کے مجرموں کو پناہ دینے کے ساتھ ساتھ نواب کے اقتدار اعلیٰ کی بار بار نافرمانی وغیرہ برٹش کمپنی کے ایسے کام تھے جو نواب کو برانگیختہ کرتے رہتے تھے۔ کمپنی کے عہدیداروں کو یہ شک تھا کہ نواب بنگال میں فرانسیسیوں کے ساتھ کوئی گٹھ جوڑ قائم کر رہے ہیں۔ کلکتے پر سراج الدولہ کے حملے نے ایک کھلم کھلا تصادم کی راہ ہموار کر دی۔ انگریزوں نے رائے درلبھ، امی چند، میر جعفر اور جگت سیٹھ وغیرہ سے مل کر نواب کے خلاف ایک سازش رچ کر نواب کے حملے کا جواب دیا۔ اس طرح پلاسی کی لڑائی (23 جون 1757) میں فتحیابی پہلے سے ہی ایک طے شدہ امر تھی۔ یہ کوئی فوجی قوت کی برتری نہیں تھی بلکہ ایک سازش تھی جس کی وجہ سے انگریزوں کو لڑائی میں فتح حاصل ہوئی۔ انگریزوں کی مدد کے بدلے نواب کے کمانڈر ان چیف میر جعفر کو لارڈ کلائیو نے نوابی عطا کی۔ میر جعفر نے اس کے عوض کمپنی کو ایک کروڑ ستہتر لاکھ روپے (17,700,000) اور کمپنی عہدیداروں کو رشوت میں بڑی بڑی رقوم ادا کیں۔ لیکن میر جعفر ان انگریزوں کی لگاتار بڑھتی مانگوں کو پورا نہ کر سکتا تھا جن کو یہ شک تھا کہ میر جعفر ڈچ تجارتی کمپنی سے مل گیا ہے۔ میر جعفر کو پلاسی کی لڑائی کے بعد نواب بنایا گیا تھا لیکن 1760 میں اس کو معزول کر دیا گیا۔ انگریزوں نے اب میر قاسم کو اس امید پر تخت پر بٹھایا کہ وہ ان کی مالی مانگوں کو پورا کرنے کا اہل ثابت ہوگا۔ نئے نواب نے اس انگریزی فوج کے اخراجات پورے کرنے کے لیے جو اس کی مدد کرتی بردوان، مدناپور اور چٹاگانگ کے ضلع مقرر کر دیے۔ اس معاہدہ سے انگریزوں کو 61-1760 میں فرانسیسیوں کے خلاف مہم چلانے میں بہت مدد ملی۔ میر قاسم نے جو رقم ادا کی اس سے کلکتہ کونسل کو جنوبی ہند پر اپنی جنگوں کے اخراجات پورا کرنے پر مدد ملی۔ نواب کو ایک بہتر انتظامی نظام قائم کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن مراعات یعنی کمپنی کے لیے بلا محصول پرائیوٹ تجارت کے مسئلہ پر بنگال میں میر قاسم اور انگریزوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ کلکتہ کی برٹش کونسل نے انگریز اور ہندوستانی تاجروں کے لیے یکساں تجارتی محصول کے بارے میں میر قاسم کے مجوزہ منصوبے کو مسترد کر دیا۔ ان حالات میں میر قاسم نے دو سال کے لیے انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں کے لیے یکساں طور پر تمام محصول معاف کر دیے۔ اس تدبیر سے برٹش پرائیوٹ تاجر اس امتیازی پوزیشن سے محروم ہو گئے جس کو انھوں نے صرف اپنے لیے حاصل کیا تھا۔ اس طرح اب وہ مساوی شرائط پر ہندوستانی تاجروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ فوج کی از سر نو تنظیم اور راجدھانی کو مرشد آباد سے مونگیر منتقل کرنے کے لیے نواب کی کوششیں بھی کمپنی کے لیے ناقابل معافی جرم تھیں۔

جون 1763 میں میجر ایڈمز کی کمان میں انگریزی لشکر نے بنگال کے نواب میر قاسم کو شکست دی۔ میر قاسم نے پٹنہ کی طرف راہ فرار اختیار کی اور شہنشاہ شاہ عالم ثانی اور شجاع الدولہ (جو اودھ کا نواب اور مغلیہ سلطنت کا وزیر بھی تھا) سے مدد مانگی۔ معاملات نے اس وقت سنگین صورت اختیار کر لی جب پٹنہ میں کمپنی کی فیکٹری کے چیف نے شہر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سے جنگ چھڑ گئی۔ میر قاسم ایک بہترین شہری منتظم تھا لیکن فوجی قائد نہ تھا چنانچہ اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ جب اس کو واپس اودھ کی طرف جانا پڑا تو نواب وزیر اور شہنشاہ شاہ عالم ثانی نے سلطنت کے مشرقی صوبوں کے دفاع کے لیے فیصلہ لے لیا۔ اتحادی پٹنہ کی طرف بڑھے اور 22 اکتوبر 1764 کو بکسر کے مقام پر جنگ ہوئی۔ بکسر میں فیصلہ کن فتح کے ساتھ ہی برطانوی افواج نے اودھ کو تاراج کیا۔ نواب

وزیر نے روہیلوں کے ملک کی طرف راہ فرار اختیار کی البتہ شاہ عالم ثانی نے انگریزوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ لارڈ کلائیو نے جو اس وقت کلکتے میں برطانوی گورنر تھا اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ کے ساتھ بھی الہ آباد معاہدہ کیا جس کی رو سے شجاع الدولہ کو پچاس لاکھ روپے جنگ کے خرچ کے طور پر ادا کرنے پڑے اور اس طرح اس کو اپنے مقبوضات واپس ملے۔ شجاع الدولہ نے کمپنی کے ساتھ جو اتحاد کیا اس میں اس کی دفاعی حیثیت تھی۔ اودھ انگریزوں کی ایک بفر اسٹیٹ(Buffer state) بن گیا۔ شاہ عالم ثانی اب ایک معذور تھا۔ دہلی پر روہیلوں کے سردار نجیب الدولہ نے قبضہ کر لیا۔ انگریزوں نے بادشاہ شاہ عالم ثانی کو کٹرہ اور الہ آباد کا قبضہ دیا جبکہ شاہ عالم ثانی نے چھبیس لاکھ روپے کی سالانہ کی باقاعدہ ادائیگی کے لیے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کمپنی کو کو دینی منظور کی۔

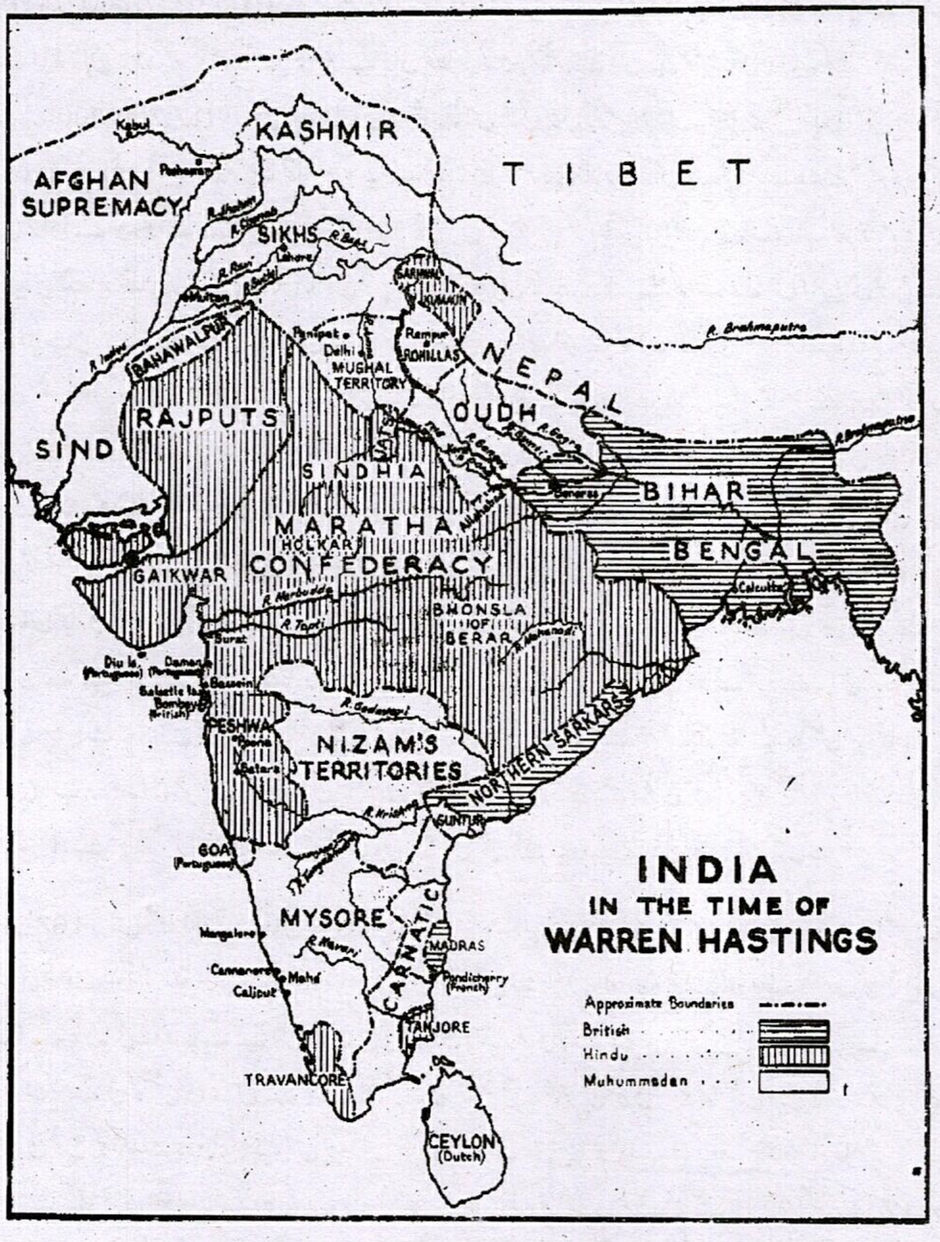

نقشہ 16.1: ہندوستان 1783 میں

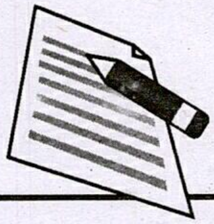

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 16.3

1۔ 1757 میں بنگال کا حاکم تھا:

(a) شجاع الدولہ (b) سراج الدولہ

(c) میر قاسم (d) میر جعفر

2۔ پلاسی کی لڑائی لڑی گئی:

(a) 1757 (b) 1764

(c) 1765 (d) 1771

3۔ پلاسی کی لڑائی کے کیا اسباب تھے؟

____

4۔ 1760 میں میر جعفر کے بعد بنگال کا نواب کون بنا؟

____

5۔ بکسر کی لڑائی کے اسباب بیان کیجیے۔

____

16.4 بنگال کے انتظام کا دوہرا نظام (The Dual System of Administration of Bangal)

بنگال میں کمپنی راج کے نظم ونسق کا ابتدائی میکانزم وہی تھا جو مغلوں کے زمانے میں تھا۔ مغلوں کا صوبائی انتظام دو زمروں میں تقسیم تھا ایک نظامت اور دوسرا دیوانی۔ نظامت کا مطلب تھا نظم و قانون (Law and order) کا بندوبست اور فوجداری عدالت (Criminal Justice) جبکہ دیوانی کا مطلب تھا محصولات یا مالیہ (Revenue) کا انتظام اور شہری یا غیر فوجی عدلیہ (Civil Justice)، نظامت کی ذمہ داری صوبہ دار کے پاس ہوتی تھی (صوبہ دار کو ناظم بھی کہا جاتا تھا) مالی انتظام (Revenue Administration) کی ذمہ داری دیوان کے پاس ہوتی تھی۔ الہ آباد معاہدہ کے بعد انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال کا دیوان بنایا گیا لیکن لارڈ کلائیو نے براہِ راست بنگال کے انتظام کو قبول کرنا پسند نہ کیا اور یہ ذمہ داری نواب کے نائب دیوان اور نائب ناظم محمد رضا خاں کے لیے چھوڑ دی گئی۔ وہ نائب ناظم کے طور پر تو نواب کی نمائندگی کرتا تھا اور نائب دیوان کے طور پر کمپنی کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس طرح فوجداری اور شہری یا غیر فوجداری عدالتی انتظام کی ساری ذمہ داری نواب کی تھی۔ البتہ نواب ان امور کی انجام دہی محمد رضا خاں کے ذریعے کرتا تھا جو برٹش کمپنی کی زیرنگرانی، اس کی زیر ہدایت اور اس

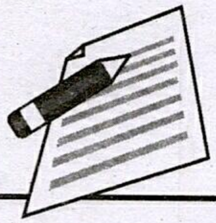

نوٹ

کے کنٹرول کے تحت تھا۔ دیوان کی حیثیت سے کمپنی محصول (Revenue) کو براہِ راست وصول کرتی تھی اور چونکہ اس کو ڈپٹی ناظم نامزد کرنے کا حق حاصل تھا اس لیے وہ نظامت یا پولیس یا عدلیہ کے اختیارات پر بھی کنٹرول رکھتی تھی۔ اس نظام کو ''دہرا نظام حکومت'' کہا جاتا تھا۔ اس کے تحت کمپنی کو اختیار بھی حاصل تھا اور وسائل بھی لیکن اس کی کوئی جوابدہی نہیں تھی جبکہ نواب کے پاس انتظامیہ کی ذمہ داری تھی لیکن اس کو اختیارات حاصل نہیں تھے۔ اس طرح حکومت کی ساری بدنظمی کی ذمہ داری نواب پر آتی تھی۔ محصول کی آمدنی کمپنی کی ہوتی جو ایک حقیر رقم مغل بادشاہ کو ادا کرتی تھی۔

متن پر مبنی سوالات 16.4

1۔ نظامت اور دیوانی اصطلاحات کی وضاحت کیجیے۔

2۔ ''دہرے نظام حکومت'' سے کیا مطلب ہے؟

3۔ لارڈ کلائیو نے دہرے نظام حکومت کو کیوں شروع کیا؟

16.5 توسیع پسند نظریہ: تدابیر اور طریقے
(Idelogy of Expansion : Tools and Methods)

انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی جو ایک تجارتی کارپوریشن تھی ہندوستان میں بتدریج ایک اعلیٰ سیاسی طاقت بن گئی۔ کچھ دیگر علاقائی بادشاہتیں بھی تھیں جن کو انگریزوں نے فتح کر لیا تھا۔ میسور (جو موجودہ ہندوستانی ریاست کرناٹک میں ہے) کے نامور حکمران حیدرعلی اور اس کے بیٹے ٹیپوسلطان نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انگریز فوجوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔ حیدرعلی 1749 سے میسور میں فوج کا کمانڈر تھا۔ وہ 1761 میں ریاست کا حکمراں بنا۔ 1781 میں سر آئیر کوٹ کے ہاتھوں شکست کھانے تک حیدرعلی نے کمپنی کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ بالآخر 1799 میں ٹیپوسلطان کے قتل کیے جانے کے ساتھ ہی میسور کمپنی فوج کے ہاتھوں فتح ہوگیا۔ انگریز اور مراٹھوں کی تین جنگوں کے بعد جو 1818-1772 کے درمیان لڑی گئیں، مراٹھوں کی حکومت بتدریج کمزور ہوتی گئی اور بالآخر انگریزوں نے مراٹھا علاقوں کو حاصل کر لیا۔ میسور اور مراٹھا دونوں کے خلاف مہموں کے دوران آرتھر ویلزلی کی کمان میں انگریزوں نے مغربی ہندوستان، مشرقی

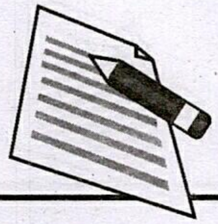

نوٹ

ہندوستان اور (فرانسیسی اور مقامی حکمرانوں کے چھوٹے چھوٹے علاقوں کو چھوڑ کر) تمام جنوبی ہندوستان کے خطے کو حاصل کر لیا۔

دوسرا طریقہ انگریزوں اور مقامی حکمرانوں کے درمیان اسناد اطاعت: (Subsidiary Agreements Sanads) کا استعمال ان کے نتیجے میں مقامی ریاستیں (Nation State) یا رجواڑے (Princely States) وجود میں آئے۔ عہدنامہ اطاعت (Subsidiary Alliances System) کو بھی لارڈ ویلزلی نے 1798 میں شروع کیا۔ اس کے تحت انگریز بیرونی حملوں اور داخلی بدامنی سے ہندوستانی حکمرانوں کی حفاظت کرتے تھے اور اس کے بدلے جو ہندوستانی حکمراں اس عہد نامہ اطاعت کو قبول کر لیتے تھے ان کو انگریز فوج کے لیے اپنے یہاں چھاؤنی مہیا کرنی ہوتی تھی اور فوج کے گذارہ کے لیے ایک مخصوص رقم انگریزوں کو دینی پڑتی تھی اس نظام عہد معاونت کے تحت کوئی حاکم نہ تو کسی دوسری طاقت کے ساتھ کوئی معاہدہ کر سکتا تھا اور نہ ہی انگریزوں کی اجازت کے بغیر کسی سے جنگ کر سکتا تھا۔ ان حکمران ریاستوں میں ایک انگریز ریزیڈینٹ (Resident) بھی قیام پذیر رہتا تھا جو ریاست کی سیاست میں مداخلت کرنے کا اختیار بھی رکھتا تھا۔ یہ نظام انگریزوں کے لیے بہت سود مند تھا کیونکہ اس میں کوئی پائی پیسہ خرچ کیے بغیر انگریز بڑی بڑی فوجوں کو پال سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اس نظام کے تحت انگریز ہندوستانی درباروں کو غیر ملکی اثرات سے پاک کر سکتے تھے۔ سب سے پہلے 1798 میں نظام حیدر آباد انگریزوں کے ساتھ اس نظام میں شامل ہوئے۔ ان کو اس بات کے لیے مجبور ہونا پڑا کہ وہ اپنے دربار کے فرانسیسی افسروں کو تبدیل کر کے انگریز افسران کو ان کی جگہ رکھیں۔ نظام حیدر آباد نے فوج کے گذارہ کے لیے بیلاری اور کڈّپا کے علاقے بھی انگریزوں کو دینا منظور کیے۔ عہد معاونت کے اس نظام کے نتیجے میں نوابوں اور مہاراجاؤں کی ریاستیں یا رجواڑے (مقامی ریاستیں) وجود میں آگئیں۔ ان میں جو رجواڑے (Princely States) ممتاز حیثیت رکھتی تھیں وہ ہیں: کوچین (1791)، جے پور (1794)، ٹراونکور (1795)، حیدر آباد (1798) اور میسور (1799) اور جن خطوں کا الحاق (Annexation) ہوا وہ تھیں: شمال مغربی صوبہ جات (ان میں روہیل کھنڈ، گورکھپور اور دوآب شامل تھے) (1801)، دہلی (1803) اور سندھ (1843)، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ اور کشمیر کا الحاق 1849 کی سکھ-انگریز جنگوں کے بعد ہوا۔ کشمیر کو امرتسر معاہدہ (1850) کے تحت جموں کے ڈوگرہ خاندان کو فروخت کر دیا گیا اور اس سے وہاں ایک رجواڑہ (Princely State) وجود میں آگئی۔ 1854 برار کا اور اس کے دو سال بعد اودھ کا الحاق ہوا۔ نظام عہد معاونت کا خاص مقصد ہندوستان میں نئے نئے علاقوں کو اپنے قبضہ و تصرف میں لا کر سلطنت میں برطانیہ کی توسیع کرنا اور فرانسیسی اثرات کو کم کرنا تھا تا کہ انگریز ہندوستان میں ایک برتر اور باقتدار طاقت بن سکیں۔

سب سے آخری ریاست جو انگریزوں نے فتح کی وہ پنجاب تھی۔ یہ 1849 میں فتح ہوئی۔ یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیر حکمرانی تھی جنھوں نے مختلف سکھ مسلوں (Misls) کو ایک ریاست میں متحد کر دیا تھا۔ انھوں نے ایک جدید انتظامی سسٹم قائم کیا تھا۔ ان کی فوج انگریزی فوج کے بعد ایشیا کی دوسری سب سے بڑی باقاعدہ اور جدید طور پر تیار شدہ فوج تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے دوستانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے لیکن 1839 میں

نوٹ

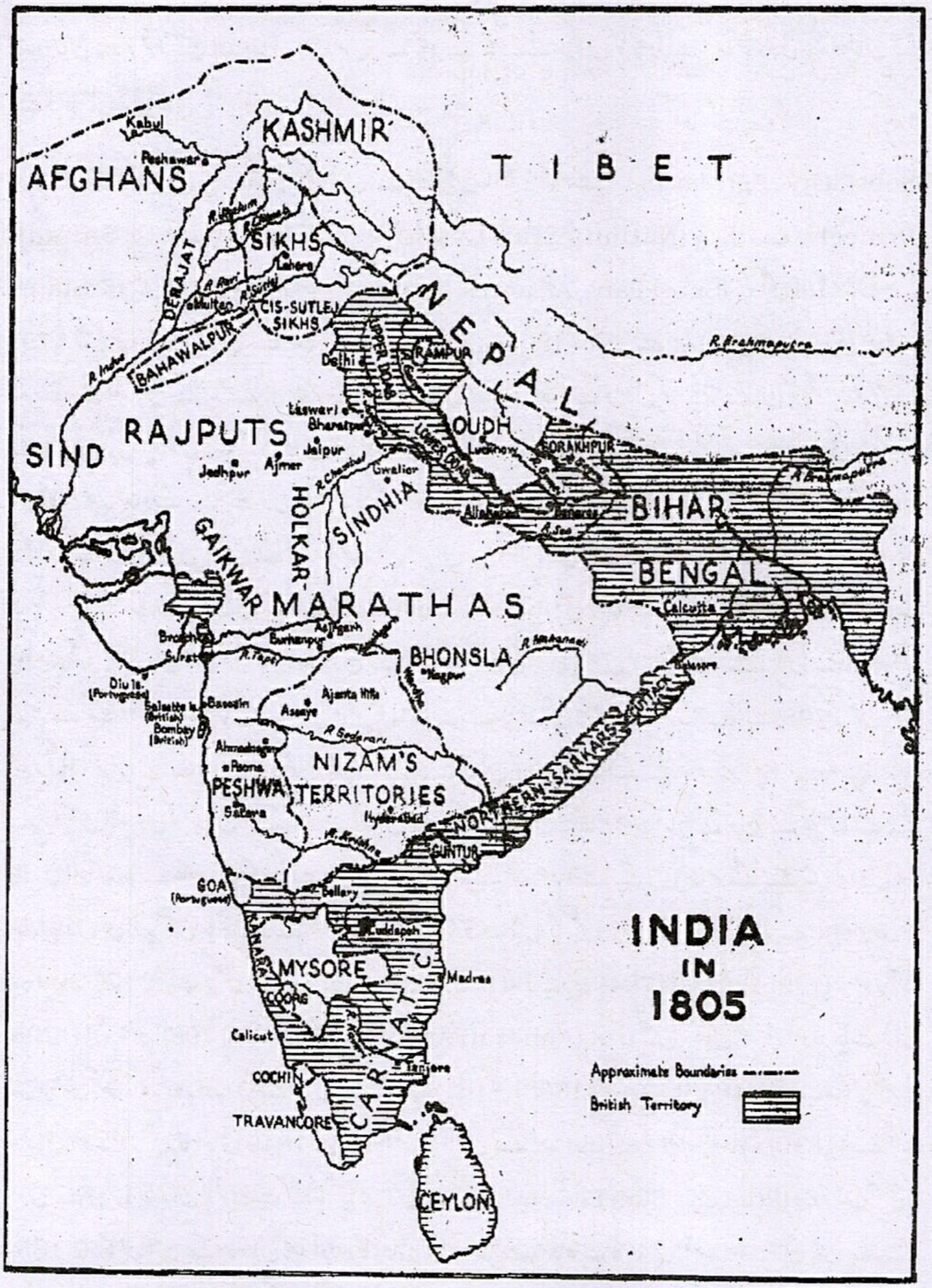

نقشہ 16.2: ہندوستان 1797-1805 تک

ان کے انتقال کے بعد ایک ہی دہائی میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دو جنگیں ہوگئیں اور 1849 میں پنجاب برطانیہ ہندوستان کا ایک حصہ بن گیا۔

اصول سوخت(*Doctrine of Lapse*) لارڈ ڈلہوزی کی تیار کردہ ایک الحاق کی حکمت عملی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی 1848 سے 1856 کے درمیان ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔ ہندوستانی بادشاہوں کے یہاں بڑے پیمانے پر یہ

نوٹ

رسم رائج تھی کہ وہ کسی قدرتی جانشین یعنی بیٹے کے نہ ہونے کی صورت میں کسی کو متبنیٰ بنا لیتے تھے یا بالفاظ دیگر اس کو گود لے لیا کرتے تھے۔ لیکن اس اصول ساخت(Doctorine of lapse) کے مطابق کوئی بھی ریاست جو برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے براہِ راست اثر (اقتدار اعلیٰ) کے ذریعے نظام عہد معاونت کے تحت ایک تابعدار ریاست کے طور پر وجود میں آئی ہو اور اس کا حکمراں نا اہل ہو یا بغیر کسی قدرتی نرینہ وارث کے فوت ہو جائے تو اس ریاست کا حق جانشینی سلب یا سوخت ہو جائے گا یا یوں کہیے کہ برٹش کے ذریعے اس کا الحاق ہو جائے گا۔ اس طرح نہ صرف لاولد ہندوستانی حکمرانوں کے کا عرصے سے چلا آرہا مسلمہ طور پر جانشین چننے کے حق کو چھین لیا گیا

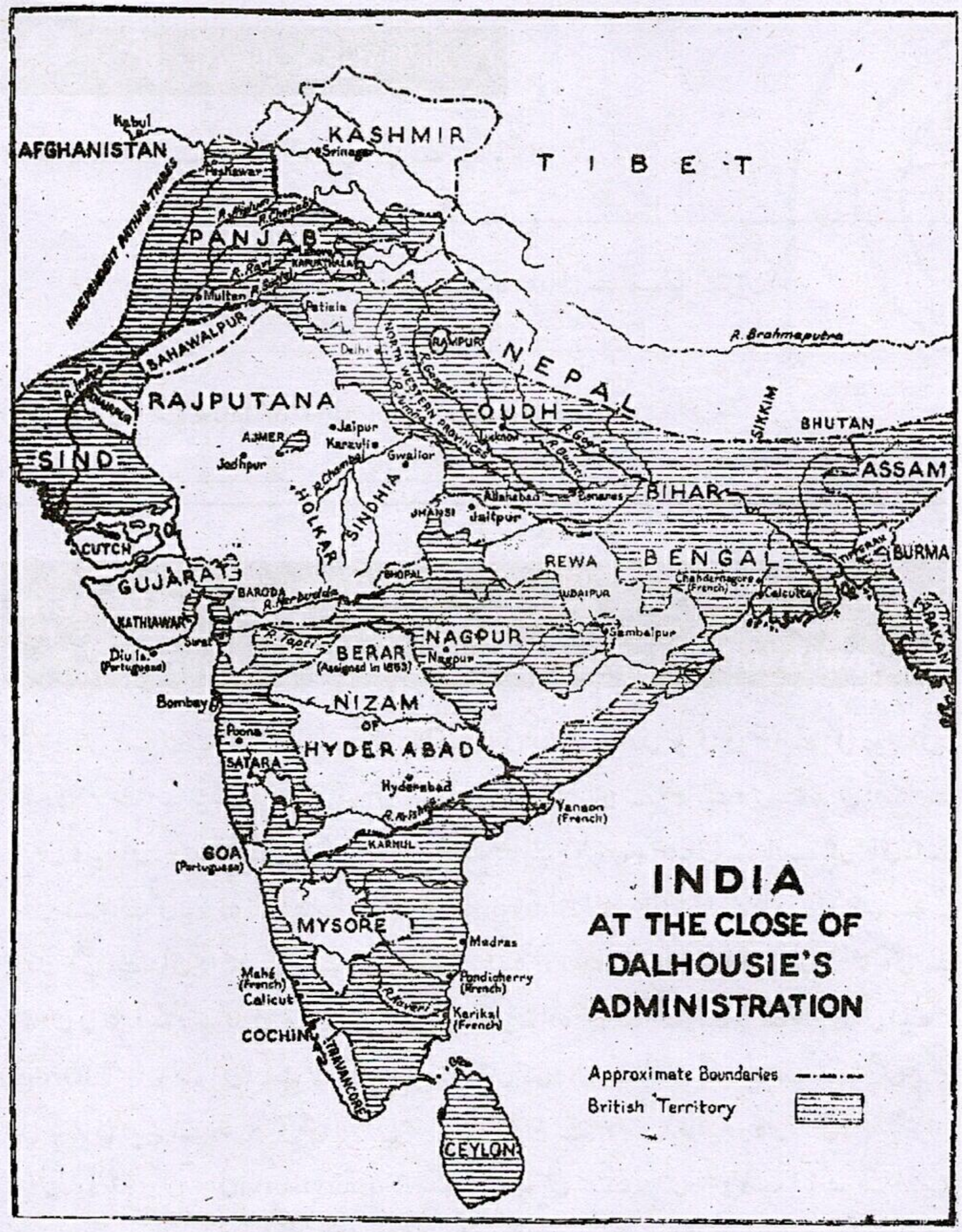

نقشہ16.3: ہندوستان 1857 میں

بلکہ انگریزوں نے ہندوستانی حکمرانوں کی اہلیت متعین کرنے کے اختیار کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ نظریۂ سوخت کی اس پالیسی کو شروع کر کے کمپنی نے پورے برصغیر پر پھیلے ہوئے بہت سے خطوں پر اپنا مکمل حاکمانہ انتظامی کنٹرول قائم کر لیا۔ کمپنی نے اس اصول کے تحت ستارا، جیت پور، سمبل پور، ناگپور اور جھانسی کے رجواڑے یا شاہی ریاستیں(Princely States) کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ الحاق کو اس بنا پر جائز ٹھہرایا گیا کہ مقامی والی ریاست بدمزاج اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے معاملے میں لاپروا تھا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ 1856 میں اودھ کے ساتھ بھی ہوا۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 16.5

1۔ لارڈ ویلزلی نے انگریزی اقتدار کی توسیع کے لیے کیا تدابیر اختیار کیں؟

____

2۔ نظام عہد معاونت(Subsidiary Alliance System) سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

____

3۔ اصول سوخت(Doctorine of lapse) کی وضاحت کیجیے۔

____

16.6 نوآبادیاتی انتظامی مشنری کا فروغ
(Growth of Colonial Administrative Apparatus)

1757 میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ایک سیاسی طاقت بن گئی تو ایک دستوری تبدیلی کی ضرورت بھی پیدا ہوئی۔ برطانوی حکومت اب یہ نہیں چاہتی تھی کہ کمپنی کے معاملات کو کسی نگران کے بغیر چلنے دیں۔ تاجروں اور صنعت کاروں کا یہ دباؤ بڑھ رہا تھا کہ کمپنی کی اجارہ داری ختم ہو۔ حکومت بنگال کی بدعنوانیوں کے بارے میں عوامی رائے کمپنی کے خلاف تھی۔ بہت اہم مطالبہ آزاد تجارت(Free Enterprise) کا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے کئی قانون وضع کیے۔ ان قوانین میں سب سے پہلے 1773 کا وہ ریگولیٹنگ ایکٹ آتا ہے جس کا منشا کمپنی کے تاجروں کی بنا روک ٹوک تجارتی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کرنا اور کمپنی کے تحت آنے والے علاقوں میں ایک نظم (Order) قائم کرنا تھا۔ اس ایکٹ نے کمپنی کے چارٹر کو بیس بیس سال کے وقفوں کے لیے محدود کر دیا جس پر نظر ثانی چارٹر کی تجدید کے بعد ہو سکتی تھی اور اس طرح اس قانون سے حکومت برطانیہ کو بنگال، بمبئی، مہاراشٹر اور مدراس پریسیڈینسیوں نگرانی(Supervisory) کے حقوق حاصل ہوگئے۔ اس ریگولیٹنگ ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کے لیے ایک یکساں حکومتی انتظام بھی تشکیل پا گیا جس نے تینوں پریسیڈینسیوں کو بنگال کے گورنر کے زیر

اقتدار متحد کر دیا نیز گورنر کا عہدہ بڑھا کر گورنر جنرل کر دیا گیا۔ وارن ہسٹنگز(Waren Hastings) پہلا گورنر جنرل تھا(1785-1773)۔ 1784 کے پٹ انڈیا ایکٹ(Pitt's India Act) کو جسے کبھی کبھی ہاف لوف سسٹم(Half Loaf System) بھی کہا جاتا ہے پارلیمنٹ اور کمپنی کے ڈائیریکٹروں کے درمیان مصالحت کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس ایکٹ سے پارلیمنٹ کا کنٹرول بڑھ گیا کیونکہ اس کی رو سے ایک بورڈ آف کنٹرول تشکیل دیا گیا تھا جس کے ارکان برطانوی کابینہ میں سے منتخب کیے جاتے تھے۔ لارڈ کارنوالس(Lord Carnwallis) نے جو 1786 سے 1793 تک گورنر جنرل رہا کمپنی کی انتظامیہ کو پروفیشنل اور ضابطہ پرست اور یوروپی انداز کا بنا دیا۔ اس نے کمپنی کے ملازمین کی پرائیوٹ تجارت کو غیر قانونی قرار دیا۔ کمرشیل اور انتظامی امور کو الگ الگ کیا اور کمپنی کے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ کیا۔

چونکہ محصول کی فراہمی کمپنی کا سب سے اہم انتظامی کام تھا اس لیے لارڈ کارنوالس نے بنگال میں زمینداروں کو زمین کی قانونی ملکیت عطا کردی۔ اس کے بدلے زمیندار ایک معینہ تاریخ تک ایک طے شدہ محصول سرکار کو دیتے تھے۔ یہ معاہدہ ہمیشہ کے لیے تھا اور اسی لیے اس کو استمراری بندوبست(Permanant Settlement) کہا جاتا ہے۔ اسی نظام کو زمینداری نظام بھی کہا جاتا ہے اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ زمیندار اب زمین کا مالک بن گیا جبکہ کسان کی حیثیت اپنی ہی زمین پر مزارع کی رہ گئی۔ اس کے علاوہ اب زمین ایک قابل گفت وشنید جائیداد (Negotiable Property) بن گئی اور سرکار کو زراعتی توسیع اور ترقی سے خارج کر دیا گیا کیونکہ اب یہ براہِ راست زمینداروں کے دائرۂ اختیار میں آگئی۔ بہر حال، مدراس اور بنگال میں رعیت باری (کسان) بندوبست نام کا نظام(Ryot wary settlement system) چلتا رہا جس میں کھیتی باڑی کرنے والے کسان سالانہ ٹیکس براہِ راست حکومت کو ادا کرتے تھے۔

1813 کے چارٹر ایکٹ نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کے معاملے میں کمپنی کی اجارہ داری کو ختم کر دیا، البتہ اس نے محصول، انتظامیہ اور تقرریوں کو یونہی رہنے دیا۔ 1833 کے چارٹر ایکٹ نے چین کے ساتھ تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ اس ایکٹ نے پریزیڈینسیوں (Presidenceis) کو قانون بنانے کے اختیار سے بھی محروم کر دیا اور قانون سازی کے حقوق گورنر جنرل اور اس کی کونسل کو دے دیے۔

برطانوی علاقوں کی توسیع اور بڑھتی ہوئی انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ ایک بیوروکریسی(Bureaucracy) کی بھی ضرورت ہوئی تاکہ برطانوی املاک کو کنٹرول کیا جاسکے۔ 1785 میں لارڈ کارنوالس نے کمپنی ملازمین کا ایک پروفیشنل کیڈر(Professional Cadre) بنایا جن کی تنخواہیں بڑی بڑی تھیں اور جن کا ہندوستان میں کوئی پرائیوٹ تجارتی یا مینوفیکچرنگ مفاد بھی نہ تھا۔ ان لوگوں کو باقاعدہ ترقی(Regular Promotion) کے مواقع بھی حاصل تھے اور یہ پنشن کے بھی حقدار تھے۔ تمام اونچی اسامیاں انگریزیوں کے لیے مخصوص تھیں اور ہندوستانی اس میں شامل نہ تھے۔ کارنوالس نے انگریز ججوں کو مقرر کیا اور اسی نے اعلیٰ انگریز عہدیداروں جیسے ریونیو کلکٹر اور مجسٹریٹ بنگال کے ہر ضلع میں مقرر کیے۔ 1806 سے کمپنی نے اپنے نوجوان رنگروٹوں کی لندن کے قریب ہیلی بری کالج(Hailey bury collage) میں ٹریننگ شروع کردی۔ ان تقرریوں

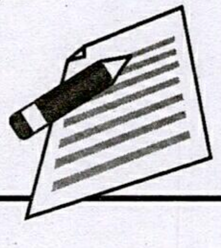

نوٹ

(Appointments) کی تنظیم اب بھی ایک سرپرستانہ نظام کے تحت کی جاتی تھی۔ 1829 میں تمام برطانوی ہندوستان میں ایسے ضلع قائم کر کے اس نظام کو تقویت دی گئی۔ یہ ضلع کافی چھوٹے ہوتے تھے تاکہ ایک برٹش عہدیدار جس کو مکمل آمرانہ اختیار حاصل ہوتے تھے موثر طور پر ان کو کنٹرول کر سکتا تھا اور ایک ریونیو کلکٹر، ایک جج یا ایک پولس افسر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری نباہ سکتا تھا۔ 1833 کے بعد، کمپنی نے تقابلی امتحان کے ذریعے اپنے چندہ امیدواروں کا انتخاب شروع کیا۔ 1853 کے بعد یہ تقرری امتیازی صلاحیت کی بنیاد پر ہونے لگی اور اس کے لیے ایک امتحان شروع کیا گیا جس میں کوئی بھی برطانوی امیدوار حصہ لے سکتا تھا۔ ہندوستانی سول سروس میں (i) بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں، (ii) اور ان لوگوں کو وہ سیاسی طاقت حاصل تھی جو انگلینڈ میں کسی بھی بیوروکریٹ کو حاصل نہ تھی۔

متن پر مبنی سوالات 16.6

1۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ نے جو سب سے پہلا قانون بنایا وہ کون سا تھا؟

2۔ بنگال کا پہلا گورنر جنرل کون تھا؟

3۔ 1833 کے چارٹر ایکٹ کی کیا خصوصیات تھیں؟

4۔ کمپنی کے ملازمین کی تربیت کے لیے لندن میں قائم کالج کا نام بتایئے۔

اٹھارہویں صدی کے وسط تک آتے آتے ممبئی، مدراس اور کلکتہ تینوں شہروں کی پریزی ڈینسیوں میں انگریزوں کی سیاسی موجودگی ہوگئی تھی۔ ان شہروں نے ہندوستان میں برطانوی عدالتی نظام کا ظہور بھی دیکھا تھا۔ ممبئی، مدراس اور کلکتہ میں دیوانی کی قانونی چارہ جوئی (Civil litigation) کے لیے 1727 میں میئر کورٹ قائم کیا گیا۔ 1772 میں عدلیہ کا ایک جامع نظام جسے (عدالت کے نام سے جانا جاتا ہے) دیوانی اور فوجداری کے عدالتی اختیارات کے لیے قائم کیا گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں رائج قوانین کی تشریح کے معاملات میں پریزائڈنگ ججوں

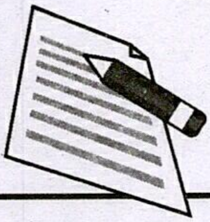

نوٹ

(Preseding Judge) کی مدد کے لیے ہندو پنڈت اور مسلمان قاضی (شرعی عدالتوں کے جج) مقرر کیے گئے لیکن عمومی طور پر برطانوی رائج قانون(Common Law) اور ان ہی کا اپنا وضع کردہ قانون(Statutory Law) مستعمل رہے۔ ہندوستان میں پورے برطانوی نظام عدل کے دو اہم نظریاتی اصول تھے یعنی ''قانون کی نظر میں مساوات اور قانون کی حکومت''(Rule of law and equality before law)۔ اس طرح کوئی شخص بھی قانون سے بالاتر نہیں تھا (کچھ ایسے قوانین تھے جن میں لوگوں کے حقوق، ان کی مراعات اور ان کے فرائض بیان کیے گئے تھے)۔ تمام شہری چاہے وہ کسی ذات، طبقہ یا اور کسی رتبہ کے ہوں قانون کی نظر میں مساوی تھے۔ پروانہ حاضری ملزم(Habeas corpus) (یعنی وہ تحریری حکم جس کے ذریعے ملزمین کو اصولاً عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لیے ہدایت کی جائے) کا اصول اس بات کی ضمانت تھی کہ کسی شخص کو بھی کسی انتظامی یا عدالتی عہدیدار کے تحریری حکم کے بغیر نہ گرفتار کیا جائے گا اور نہ قید میں رکھا جائے گا حتیٰ کہ کسی سرکاری ملازم پر ان کاموں پر بھی عدالت میں مقدمہ چلایا جاسکتا تھا جو اس نے اپنی سرکاری حیثیت میں کیے ہوں۔ قانون کی نظر میں مساوات، دراصل قانونی کی حکومت(Ruel of law) کا ہی قدرتی نتیجہ ہے۔ قانون کی حکومت کے بعد ہی قانون مساوات کا ظہور ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ذات پات میں جکڑے ہوئے معاشرہ کے اندر 'قانون کی نظر میں مساوات' ایک انوکھی چیز تھی۔

1773 کے ریگیولیٹنگ ایکٹ کے تحت کنگ ان کونسل(King-in-council) نے کلکتہ کے پریزیڈینسی شہر میں ایک سپریم کورٹ قائم کی۔ اس چارٹر کے تحت سپریم کورٹ کو بہار، بنگال اور اڑیسہ کے خطہ میں ہر قسم کے عدالتی اختیارات کو استعمال کرنے کا حق حاصل تھا سوائے ان صورتوں کے جن میں متنازعہ فیہ رقم 4,000 سے زائد ہوتی۔ ایسی صورت میں لندن کی پریوی کونسل میں اپیل کی جاتی تھی۔ بالآخر 1801 میں مدراس میں اور 1823 میں ممبئی میں سپریم کورٹ کا قیام عمل میں آیا۔

لارڈ کارنوالس نے ضلعی سطح پر عدلیہ اور انتظامیہ کی ذمہ داریوں کو الگ الگ کردیا۔ دیوانی کے مقدمات کے لیے صدر دیوانی عدالت اپیل کے لیے سب سے اونچی عدالت تھی۔ اس کے بعد کلکتہ، ڈھاکہ، مرشد آباد اور پٹنہ میں سول اپیل کے لیے چار صوبائی کورٹ تھے۔ صوبائی عدالتوں کے بعد مقامی سطحوں پر ڈسٹرکٹ کورٹ، رجسٹرار کورٹ اور کچھ ماتحت عدالتیں(Subordinate Courts) تھیں اور اس طرح عدالتوں کا ایک نظام مراتب بنایا گیا تھا۔ فوجداری مقدمات کے حل کے لیے بڑی تعداد میں مجسٹریٹ ہوتے تھے۔ ان کے اوپر کلکتہ، ڈھاکہ، مرشد آباد اور پٹنہ میں سرکٹ کورٹ(Courts of Circuit) ہوتے تھے جو کلکتہ کی ''صدر نظامت عدالت'' (Sadar Nizamat Adalat) کے تحت کام کرتے تھے۔ 1831 میں ولیم بینٹنک(Willium Bentinck) نے چاروں صوبائی دیوانی و فوجداری کورٹ(Provincial Civil and Criminal Court) ختم کردیے اور ان کا سارا کام کمشنروں اور ڈسٹرکٹ کلکٹروں میں بانٹ دیا گیا۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 16.7

1۔ ''قانون کی حکومت'' اور ''قانون کی نظر میں مساوات'' اصطلاحوں کی وضاحت کیجیے۔

____

2۔ 1773 کے ریگیولیٹنگ ایکٹ کے تحت سب سے پہلے کس شہر میں سپریم کورٹ قائم کی گئی؟

____

چنانچہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ برطانوی راج نے ہندوستان کی تاریخ کے دھارے کو تبدیل کر دیا۔ انگریز ہندوستان میں سترہویں صدی کے شروع میں آئے۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کا مقصد ایشیا کی تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا تھا۔ ہندوستان میں تجارتی حقوق حاصل کرنے کے عمل میں، انگریزوں نے بہت سی رجواڑہ ریاستوں (Princely states) کا الحاق کر لیا اور خود اپنے قوانین اور پالیسیاں بنائیں۔ بتدریج مگر تیزی کے ساتھ تمام ہندوستانی برصغیر انگریز راج کے تحت آ گیا۔ بہرحال ہندوستانی کمپنی کی پالیسیوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور انہوں نے مل کر 1857 میں کمپنی کے خلاف بغاوت کردی۔ اس کے نتیجے میں کمپنی کا زوال ہونے لگا اور ہندوستان کا انتظام براہِ راست ملکۂ برطانیہ کے تحت آ گیا۔ 1858 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت کمپنی راج کی جگہ بالآخر برطانوی تاج کی حکومت قائم ہوگئی۔

آپ نے کیا سیکھا

آپ نے ہندوستانی برصغیر پر برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے راج یا تسلط کے قیام کے بارے میں پڑھا اور دیکھا کہ برطانوی راج کس کس طرح آگے بڑھا۔ 1757 میں پلاسی کی جنگ کے بعد بنگال کے نواب نے اپنی عملداری کمپنی کو سونپ دی، 1765 میں بہار اور بنگال کی دیوانی یعنی محصول اکٹھا کرنے کا حق کمپنی کو دے دیا گیا۔ 1772 میں کمپنی نے کلکتہ میں راجدھانی قائم کی، وارن ہیسٹنگز کو اپنا پہلا گورنر جنرل مقرر کیا اور اس طرح کمپنی حکومت کے نظم ونسق میں براہِ راست شامل ہوگئی۔ یہ عمل ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی جاری رہا۔ برطانوی طاقت نے اپنے قیام اور توسیع کے لیے ایک تو نظام عہد معاونت (Subsidiary Alliance) کا طریقۂ کار اپنایا اور دوسرے اصول سوخت جانشینی کا استعمال کر کے ڈلہوزی کی توسیع پسندانہ پالیسی کو اختیار کیا۔ اس سبق میں 1858 سے قبل ہندوستان میں عدلیہ اور انتظامیہ کے برطانوی سسٹم کو بھی بتایا گیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا راج 1858 تک چلا اس کے بعد 1858 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نتیجہ میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کے نظام حکومت کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اختتامی سوالات

1۔ انگریزوں نے ہندوستان میں غلبہ کس طرح حاصل کیا؟

2۔ لارڈ ویلزلی نے ہندوستان میں برطانوی طاقت کی توسیع کس طرح کی؟ نظام عہد معاونت (Subsidiary Alliance System) کی خوبیاں اور خامیاں بتائیے۔

3۔ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی توسیع کے لیے ڈلہوزی نے جس حکمت عملی کو اختیار کیا اس کی وضاحت کیجیے۔

4۔ ہندوستان میں برطانوی عدلیہ کے نظام کی وضاحت کیجیے۔

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

16.1

1۔ انگریزوں نے برطانوی سلطنت کی توسیع کے لیے (1) جنگوں اور فتوحات، (2) نظام عہد معاونت اور نظریۂ سوخت جانشینی کو اپنا کر علاقوں کے الحاق کو اپنایا۔

2۔ بنگال، میسور، حیدرآباد، اودھ، پنجاب اور مراٹھا بادشاہتیں

16.2

1۔ جنوری 1760 میں وانڈی واش کی لڑائی۔

2۔ انگریزوں کا غلبہ قائم ہوا اور ہندوستانی علاقائی طاقتوں کی کمزوری خاص طور پر بحری مزاحمت کرنے کی عدم صلاحیت اور چھوٹی چھوٹی یوروپی قوتوں کے خلاف ان کی بڑی بڑی افواج کی بے اثری آشکار ہوگئی۔

3۔ ہندوستان میں ان کی مضبوط بحری طاقت میں مسلسل اضافہ، اچھی قیادت، حکومت برطانیہ کی حمایت اور اعانت اور بنگال کے بڑے بڑے وسائل پر ان کا قبضہ کرناٹک کی جنگوں میں انگریزوں کی کامیابی کے کچھ اسباب تھے۔

16.3

1۔ سراج الدولہ

2۔ (a) 1757

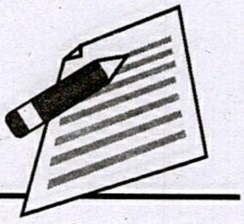

3۔ جون 1756 میں سراج الدولہ کا ابتدائی حملہ اور فورٹ ولیم کلکتہ پر قبضہ ہندوستان کے ساتھ داخلی تجارت کے لیے، مغل سلطنت نے انگریزوں کو جو برآمداتی تجارت کے پروانے (دستک) دیے تھے ان کا ناجائز استعمال، نواب کے دربار میں برطانوی مداخلت اور نواب کی مرضی کے بغیر اٹھی ہوئی بندوقوں کے ساتھ فورٹ ولیم پر اضافی استحکامات۔

4۔ میر قاسم

5۔ برطانوی اور ہندوستانی تجارت کے لیے یکساں تجارتی محصول، فوج کی تنظیم نو کے لیے نواب کی کوششیں اور مرشد آباد سے مونگیر کو راجدھانی کی تبدیلی وغیرہ میر قاسم کو ہٹانے کے اسباب تھے۔ بالآخر ان ہی کے نتیجے میں بکسر کی لڑائی ہوئی۔

16.4

1۔ نظامت(Nizamat) کا مطلب نظم و قانون(Law and Order) اور فوجداری عدالت (Criminal Justice) کا انتظام؛ دیوانی کا مطلب تھا مالیہ(Revenue) اور سول عدلیہ۔

2۔ کمپنی کا دیوان براہِ راست محصول یا مالیہ کو اکٹھا کرتا تھا اور نواب کے لیے ڈپٹی ناظم کو نامزد کرنے کے حق کی بنا پر کمپنی نظامت یعنی پوس اور عدالتی اختیارات پر اپنا کنٹرول رکھتی تھی۔

3۔ سوخت جانشینی کا اصول(Dectorine of Lapse) لارڈ ڈلہوزی کی ترتیب دی ہوئی الحاق کی پالیسی تھی۔ کوئی بھی ہندوستانی ریاست جو برٹش عہد معاونت کے تحت ایک تابعدار ریاست کی حیثیت سے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے براہِ راست اثر (اقتدارِ علی) کے ذریعے یا اس کے تحت وجود میں آتی ہو وہ اس وقت خود بخود اپنا حق جانشین کھودے گی یعنی برٹش کے ذریعے اس کا الحاق ہو جائے گا جب کہ اس کا والی یا حکمراں نااہل ہو یا وہ کسی قدرتی نرینہ وارث کو چھوڑے بغیر فوت ہو جائے۔

16.6

1۔ ریگولیٹنگ ایکٹ 1773

2۔ وارن ہیسٹنگز

3۔ چارٹر ایکٹ 1833 نے چین کی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔

4۔ ہیلی بری کالج (Haileybury college)

نوٹ

16.7

1۔ ''قانون کی حکومت'' اور ''قانون کی نظر میں مساوات'' کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص قانون (وہ ضابطے جن میں لوگوں کے حقوق، مراعات اور فرائض کی وضاحت کی گئی ہے) سے بالاتر نہیں ہے۔ اور تمام شہری قانون کی نظر میں یکساں ہیں چاہے ان کا تعلق کسی بھی ذات یا طبقہ سے ہو یا ان کا کوئی بھی رتبہ ہو۔

2۔ کلکتہ کا پریزیڈینسی شہر

اختتامی سوالات کے لیے اشارے

1۔ دیکھیے ذیلی اکائی 1.2

2۔ دیکھیے ذیلی اکائی 1.5، پیرا 1 اور 2

3۔ دیکھیے ذیلی اکائی 1.5، پیرا 4

4۔ دیکھیے ذیلی اکائی 1.7

اصطلاحات

1۔ **ایسٹ انڈیا کمپنی** : یہ کمپنی ایک مشترکہ تجارتی کمپنی تھی جو 1600 میں کمپنی میں مرچنٹس آف لندن ٹریڈنگ انٹو ایسٹ انڈیز کے طور پر قائم کی گئی تھی۔ شروع میں یہ ہندوستان کے ساتھ تجارت میں لگی رہی۔ یہ 1858 تک ہندوستان میں ایک حکمراں طاقت رہی۔

2۔ **دو عملی حکومت (Dual Government)** : یہ سسٹم بنگال میں بکسر کی لڑائی کے بعد شروع ہوا۔ کمپنی بنگال کے دیوان کے طور پر براہِ راست اپنا محصول وصول کرتی تھی اور نظامت یعنی پولیس اور عدلیہ کے اختیارات نواب کے پاس تھے۔

3۔ **نظام عہد معاونت (Subsidiary Alliance System)** : اس نظام کو لارڈ ویلزلی نے ہندوستانی ریاستوں کو برطانوی سیاسی اقتدار کے تحت لانے کے لیے استعمال کیا۔ اس اصول کے مطابق برطانوی تحفظ کے ماتحت ہندوستانی حکمراں اپنی دیسی فوجوں کو معطل کر دیتے اور اس کے بجائے اپنی ریاستوں میں برطانوی فوجیوں کا رکھ رکھاؤ کرتے۔ یہ حکمراں اپنے خارجہ امور بھی انگریزوں کو سپرد کر دیتے۔ بدلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی دشمنوں کے حملوں سے ان کی حفاظت کرتی۔

4۔ **سوخت جانشینی کا اصول(Doctorine of Lapse)** : یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک الحاقی حکمت عملی تھی جسے گورنر ڈلہوزی نے شروع کیا تھا۔ اس اصول کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر فرمان رجواڑوں یا شاہی ریاستوں(Princely State) کا الحاق خود کمپنی سے ہو جاتا تھا جب اس کا حکمراں نا اہل ہوتا یا بغیر نرینہ وارث کے مر جاتا۔

5۔ **چارٹر ایکٹس(Charter Acts)** : چارٹر ایکٹس برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کے لیے پاس کیے گئے تھے۔ ان قوانین نے کمپنی کو زبردست تجارتی مراعات دیں اور اس کو 1858 تک ہندوستان پر راج کرنے کے اختیارات عطا کیے۔ جو چارٹر ایکٹس صادر ہوئے ان کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی کو بیس بیس سال کے لیے مختلف سیریز میں کمرشیل مراعات حاصل ہوئیں۔ پہلا چارٹر ایکٹ 1793 میں پاس ہوا جس نے کمپنی کو 20 سال کی مراعات عطا کیں۔ اس کے بعد چارٹر ایکٹ کی تجدید سلسلہ وار 1813، 1833 اور پھر 1853 میں ہوئی۔

6۔ **قانون کی حکومت(Rule of Law)** : قانون کی حکومت کو قانون کی بالادستی(Supremacy of law) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون ہر ایک سے اوپر ہے اور ہر ایک پر لاگو ہوتا ہے۔ چاہے راجا ہو یا رعایا، حاکم ہو یا محکوم۔ قانون سے کوئی اونچا نہیں ہے۔ قانون سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے اور قانون کے لاگو ہونے سے کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا۔

7۔ **قانون کی نظر میں مساوات(Equality Before Law)** : قانون کے تحت مساوات یا قانونی برابری وہ اصول ہے جس کے تحت ہر فرد قانون کے تحت ہوتا ہے اور کسی بھی فرد یا گروپ کو خصوصی قانونی مراعات حاصل نہیں ہوتیں۔ قانونی برابری کسی بھی طبقہ کے لیے جداگانہ قانونی افعال کو تسلیم نہیں کرتی۔

نوٹ

17

برطانوی نوآبادیت کے معاشی اثرات
(Economic Effects of British Colonialism)

ہندوستانی نوآبادی کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات ایک سیاسی ماتحت جیسے تھے لیکن ان تعلقات کی اصل معاشی استحصال میں مضمر تھی۔ نوآبادیت یا استعمار کے عمل میں فائدہ واضح طور پر مادر ملک(Mother Country) کا ہی ہوتا ہے اور آبادی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس باب میں ہم نوآبادکاری کے عمل میں جو معاشی استحصال ہوتا ہے اس کا جائزہ لیں گے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ :

- ہندوستان میں برطانوی نوآبادکاری(Colonisation) کے تینوں مرحلوں کی وضاحت کرسکیں گے؛
- ہندوستانی دیہات میں، محصول(Revenue) کے نوآبادیاتی بندوبستوں کے ذریعے آئی تبدیلیوں کو سمجھ سکیں گے؛
- نوآبادیت کے اندر نوآبادیاتی سرمایہ داری کی جدتوں کے ملے جلے اثر کو سمجھ سکیں گے؛
- ابتدائی قوم پرستوں(Nationalists) کے پیش کردہ ''دولت کی نکاسی'(Drain of wealth)' کے نظریہ کی وضاحت کرسکیں گے؛
- اور نوآبادی میں نوآبادیاتی جدید کاری(Modernisation) کی نمایاں نوعیت کو سمجھ سکیں اور یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ اس جدید کاری کا لازمی طور پر مطلب 'ترقی'(Progress) نہیں ہے۔

برطانوی نوآبادیت کے مرحلے (Phases of British Colonialism)

نوآبادیاتی استحصال (Colonial Exploitation) بڑے پیمانے پر تین مرحلوں میں جاری رہا۔ پہلا مرحلہ (1757-1813) تاجریت (Mercantilism) کا تھا۔ جو سیدھے طور پر لوٹ مار کے ذریعہ ہندوستانی تیار شدہ مال خریدنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا تاکہ یہ مال انگلینڈ کو برآمد کرایا جائے۔ دوسرا مرحلہ آزاد تجارت (Free Trade) کا تھا۔ اس کے دوسرے مرحلے (1813-1858) میں ہندوستان کو خام مال کے ایک ذریعے (Source) اور برطانیہ میں تیار شدہ مال کے لیے ایک بازار میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ تیسرا مرحلہ (1858 کے سے آگئے) مالی سامراجیت (Financial Imperialism) کا تھا جس میں برطانوی سرمایہ ہندوستان میں بنکوں، غیر ملکی تجارتی کمپنیوں اور مینیجنگ ایجنسیوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ یہ مرحلہ وار استحصال بہت ہی معاشی پالیسیوں کے سہارے خاص طور پر نوآبادی معیشت کے صنعتی اور زراعتی سیکٹروں میں جاری رہا۔

17.1 برطانوی نوآبادیت کا پہلا مرحلہ (The First Phase of British Colonialism)

پہلے مرحلے کی شروعات عام طور پر 1757 سے کی جاتی ہے جب برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے برصغیر کے مشرقی اور جنوبی حصوں میں اپنے مقبوضات سے محصول اکٹھا کرنے کے حقوق حاصل کر لیے تھے۔ یہ مرحلہ 1813 تک چلتا ہے جب ہندوستان کے ساتھ تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

انگریز ہندوستان میں ایک خالص تجارتی کمپنی کے طور پر سترہویں صدی میں آئے تھے۔ کمپنی کو ملکہ ایلزبتھ اول کی طرف سے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا ایک خصوصی شاہی منشور (Royal Charter) ملا ہوا تھا۔ انگریزوں نے اپنی پہلی ''فیکٹری'' بنگال میں ہگلی دریا کے کنارے پر قائم کی۔ کمپنی نے مغل بادشاہ سے ایک اجازت نامہ یا ''دستک'' حاصل کر لیا جس کی رو سے اس کو اپنی تجارت پر ڈیوٹی دینے سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اس سے کمپنی کے ملازمین میں بڑے پیمانے پر بدعنوانی پھیل گئی کیونکہ انھوں نے اس فرمان کو بڑے پیمانے پر ذاتی تجارت کے لیے بھی غلط طور سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسٹم ڈیوٹی کے معاملہ میں بنگال کے گورنروں (بعد میں نواب) کو ریوینیو کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ معاملہ تنازعہ ہی نہیں بنا بلکہ یہ 1757 میں لڑی جانے والی جنگ پلاسی کے اسباب میں ایک بنیادی وجہ بھی بنا۔

اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا اولین کام ہندوستان میں مسالے، سوت اور ریشم خریدنا اور اس کو بھاری منافع پر برطانیہ میں اس ہندوستانی مال کی بڑی منڈی میں بیچنا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان اشیا کی قیمت کی ادائیگی کے لیے بڑی مقدار میں برطانیہ کی دولت (Bullion) ہندوستان آ گئی تمام کوششوں کے باوجود بھی یہ بات مشکل لگ رہی تھی کہ ہندوستانی مال کے بدلے میں جو برطانوی مال ہندوستان آ رہا ہے وہ اس دولت (Bullion) کے ہندوستان کی طرف بہاؤ کو روک پائے گا۔ اس سامان کی خریداری پر آنے والے خرچ کے علاوہ، کمپنی کو ان جنگوں پر

بھی بڑی بڑی رقوم خرچ کرنی پڑتی تھیں جو اسے دیگر یوروپی طاقتوں سے لڑنی پڑتی تھیں جو سب کی سب اسی مال کی تجارت کے لیے سرگرداں تھیں۔ ان یوروپی طاقتوں میں پرتگالی، ڈچ اور فرانسیسی لوگ تھے۔ بکسر کی جنگ کے بعد جو کہ پلاسی کی جنگ کے بعد ہوئی تھی کمپنی کو بنگال میں دیوانی یعنی ریونیو اکٹھا کرنے کا حق حاصل ہو گیا اور اس کے نتیجے میں کمپنی کے اپنے اخراجات پورا کرنے کے واسطے پیسہ جٹانے کا راستہ کھل گیا۔

لگان کی پالیسیاں(Land Revenue Policies)

جب بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی 1765 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو مل گئی تو اس نوآبادی سے زیادہ سے زیادہ محاصل (Revenue) کی فراہمی برطانوی انتظامیہ کا خاص مقصد بن گیا۔ کمپنی کے لیے آمدنی یا خاص ذریعہ زراعتی ٹیکس تھا جس کو کمپنی اپنے سرمایہ کاروں کے ڈویڈینڈ (منافع میں حصہ) میں دیتی تھی۔ اس لیے برطانوی انتظامیہ نے اس خاص مقصد کو دھیان میں رکھتے ہوئے لگان کے بارے میں مختلف تجربے کیے۔ ان تجربات سے بڑی حد تک ان رشتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ایک نوآبادیاتی ریاست(Colonial State) اپنی محکوم رعایا کے ساتھ رکھتی ہے۔

1772 میں بنگال کے گورنر وارن ہیسٹنگز نے صوبہ بنگال میں لگان کی فراہمی کو ٹھیکہ پر دینے (Revenue farming) کا ایک نیا سسٹم شروع کیا۔ اس نظام کے تحت یوروپی ڈسٹرکٹ کلکٹر محصول جمع کرنے کا اختیار زیادہ اونچی بولی لگانے والے کو دیتے تھے۔ یہ سسٹم ایک دم ناکام ہو گیا اور اس سے کاشتکار(Cultivators) برباد ہو گئے کیونکہ اونچی بولی لگانے والے من مانے طریقے سے اونچا محصول کسانوں سے طلب کرتے تھے۔

اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے کارنوالس نے 1793 میں بندوبست استمراری (Permanent Settlement) کو شروع کیا۔ اس سسٹم میں ان زمینداروں کو جنھیں اس سے پہلے صرف محصول جمع کرنے کا حق حاصل تھا، زمین کا مالک تسلیم کر لیا گیا۔ لگان یا محصول کے لیے ریاستی مطالبہ مستقل طور پر متعین کر دیا گیا۔ لیکن اگر زمیندار ٹیکس کی پوری رقم وقت پر ادا نہ کر پاتا تو ان سے زمین لے لی جاتی اور ریاست اس کا نیلام کر دیتی۔ اس سسٹم کے ذریعے ریاست میں زمین مالکوں کا ایک حوصلہ مند طبقہ پیدا کرنا چاہتی تھی جو زیادہ منافع کمانے کے لیے اپنے کھیتوں کی پیداوار میں سدھار اور اضافہ کرنے کی کوشش کر سکتے۔ اس کے علاوہ، ریاست کے لیے یہ بھی آسان ہو جاتا کہ ہر ہر کسان کے بجائے کچھ محدود زمینداروں کے معاملات رکھتے اور سماج کا ایک طاقتور طبقہ برطانوی انتظامیہ کا وفادار بن جاتا۔

لیکن اس سسٹم کے نفاذ سے کرایہ دار مزارع(Tenant-Cultivator) کی حالت پتلی ہو گئی کیونکہ اس پر محصول کا تعین اونچی شرح پر کیا جاتا۔ اس کے علاوہ زمینداروں کے لیے بھی ایک مشکل کا سامنا تھا کیونکہ بہت سے زمیندار ریونیو وقت پر ادا نہ کر پاتے تھے اور اس طرح اپنی زمینوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ روایتی زمیندار گھرانوں کی ایک بڑی تعداد بکھر گئی۔ اس سسٹم سے شکمی ٹھیکہ داری (Subinfeudation) کو بڑھاوا ملا یعنی زمینداروں اور کسانوں کے درمیان بچولیوں کے کئی طبقے پیدا ہو گئے جس سے کسانوں کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوا۔

نوٹ

محصول کی فراہمی سے بچولیوں کو ختم کرنے کے لیے 1792 میں الیگزینڈر ریڈ (Alxander Read) نے مدراس پریزیڈینسی کے لیے رعیت واری (Ryot wory) سسٹم شروع کیا تا کہ ریاست کو زمین سے آمدنی کا زیادہ بڑا حصہ حاصل ہو۔ بعد میں یہ سسٹم بمبئی پریزیڈینسی میں بھی شروع کر دیا گیا۔ اس سسٹم کے تحت شروع میں محصول ہر گاؤں سے الگ الگ وصول کیا جاتا تھا لیکن بعد میں ہر مزارع یا رعیت پر محصول کی شرح انفرادی طور پر مقرر کی گئی۔ اس طرح زمینداروں کے بجائے کسان مالک قرار پائے۔ اگرچہ اس سسٹم سے ریاست کا محصول بڑھ گیا لیکن محصول کی رقم کا تعین صحیح نہیں تھا اور کسانوں پر ٹیکسوں کا بوجھ بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ صاحب زمین بچولیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ 1822 کے بعد شمال اور شمال مغربی ہندوستان میں محال واری بندوبست (Mahal wari settlement) شروع کیا گیا۔ اس کے مطابق ریاست یا تو خود گاؤں والوں کے ساتھ یا کہیں کہیں روایتی تعلقدار کے ساتھ محصول کے معاملات کا تصفیہ کرتی تھی۔ ایسی مالی اکائیوں کو 'محال' کہا جاتا تھا۔ اس سسٹم کے تحت ملکیت کے اجتماعی حقوق کو بھی تھوڑا تھوڑا تسلیم کیا گیا تھا۔

برطانیہ کی محصول سے متعلق پالیسیوں کے نتیجے میں زراعت میں جمود پیدا ہو گیا اور کسان تقریباً کرایہ دار بن گیا۔ وہ صاحب جائیداد بچولیوں کی تعداد بڑھا دیتے تھے اور دیہات میں ان کی حیثیت ساہوکاروں کی سی ہو گئی تھی۔ صاحب جائیداد اور زمینداروں کا ایک اہم طبقہ تیار ہو گیا تھا جو برطانوی نوآبادیاتی راج کے حمایتی تھے۔

دیوانی حقوق کے حاصل ہو جانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اب کمپنی بنگال کے دولت مند صوبہ میں مقامی حاکموں، زمینداروں اور مہاجنوں کی دولت کا رخ بدل سکتی تھی اور اس کا استعمال اس سامان کو خریدنے کے لیے کر سکتی تھی جو فروخت کے لیے برطانیہ بھیجا جاتا۔ دولت بڑی مقدار میں بنگال سے برطانیہ پہنچنے لگی۔ اس میں کمپنی افسران کی ناجائز آمدنیاں بھی شامل تھیں۔ کمپنی کے عہدیداران کے پاس وطن واپسی سے قبل بڑی دولت اکٹھی ہو جاتی اور چونکہ ان کا طرز زندگی بڑا امیرانہ ہوتا اس لیے وہ برطانیہ میں ''نواب'' (Nabobs) کہلاتے۔ ایسی ہی بڑی دولت نے برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے لیے ایندھن کا کام کیا۔ محصول کے ذریعے بڑی بڑی آمدنیوں کے لالچ نے کمپنی کو ہندوستان میں علاقائی توسیع کی جارحانہ پالیسی کے اپنانے پر آمادہ کیا۔

متن پر مبنی سوالات 17.1

1۔ برطانوی ہندوستان میں نوآبادکاری کے تین مرحلے کون سے تھے؟

____

2۔ پلاسی کی جنگ کے لیے ذمہ دار اہم عوامل میں سے کسی ایک کو لکھیے۔

____

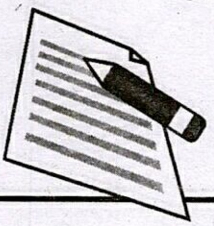

نوٹ

3۔ بنگال میں کمپنی نے کس کے ساتھ محصول کا استمراری بندوبست کیا تھا؟

4۔ کس پریزیڈینسی میں رعیر واری بندوبست شروع کیا گیا تھا؟

17.2 برطانوی نوآبادیت کا دوسرا مرحلہ (آزاد تجارت)
[The Second Phase of British Colonialism (Free Trade

یہ مانا جاتا ہے کہ 1813 کے چارٹر ایکٹ کے ساتھ ہی ''دوسرا مرحلہ'' اسی وقت شروع ہوگیا تھا جب کمپنی کے اجارہ دارانہ تجارتی اختیارات ختم ہو گئے تھے۔ پھر یہ مرحلہ 1858 میں اس وقت ختم ہوا جب برطانوی راج نے ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کا انتظام اور براہ راست کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

جب کمپنی کا منافع بڑھ گیا تو حکومت برطانیہ کی طرف سے حاصل حمایت غیر یقینی ہوگئی۔ اس سے پہلے برطانوی پارلیمنٹ کے بہت سے ممبران کی 'ایسٹ انڈیا' میں دلچسپیاں تھیں اور وہ حکومت کے اندر رہ کر اپنی سرپرستی قائم رکھنے کے لیے کمپنی کے وسائل کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن چونکہ برطانیہ میں صنعت کاری (Industrilization) بڑے زبردست پیمانے پر ہوئی تو پارلیمنٹ کے دستور اساسی میں بھی تبدیلی آئی۔ آدم اسمتھ (Adam Smith) کی کتاب *"An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations"* معاشی نظریات کے ایک نئے مکتب فکر کی نقیب بن گئی۔ اسمتھ نے اس بات پر سخت تنقید کی کہ کمپنیوں کو بلاشرکت غیرے اجارہ داری حاصل ہو۔ اس نے ایک آزاد تجارت (Laissez Faire) کے لیے حکومت کی پالیسی کی حمایت کی۔ پارلیمنٹ نے کمپنی کی آمدنی پر زیادہ کنٹرول رکھنے کے لیے کمپنی کے انفرادی عہدیداروں پر ''ناشائستہ افعال'' کے اثرات عائد کرنے شروع کر دیے۔ آزاد تجارت کے حامیوں نے جو پارلیمنٹ میں غلبہ رکھتے تھے انیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ ہندوستان کے ساتھ تجارت آزاد ہو۔ اسی مطالبہ کے نتیجے میں 1813 کا چارٹر ایکٹ منظور ہوا جس سے ہندوستان میں کمپنی کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوگیا اور کمپنی کے عام مقبوضات برطانوی تاج کے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت ہوگئے۔

''آزاد تجارت'' نے ایک دوہری حکمت عملی کے ذریعے ہندوستانی نوآبادی کی نوعیت کو مکمل طور سے تبدیل کر دیا۔ پہلی حکمت عملی تو یہ تھی کہ بڑے پیمانے پر مشینوں سے تیار شدہ سستے برطانوی مال کے لیے ہندوستانی بازاروں کو کھول دیا گیا۔ اس مال کی درآمد و برآمد پر یا تو کوئی محصول تھا نہیں اور تھا تو بہت معمولی۔ ہندوستان کے قیمتی اور ہاتھ سے کڑھے بنے کپڑوں کے باہر جانے کے راستے میں محصول کی اونچی شرحوں کی وجہ سے رکاوٹیں پیدا ہوگئیں جبکہ ہندوستانی کپڑے یوروپ میں بڑے مقبول تھے۔ دوسری حکمت عملی یہ تھی کہ ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کو برطانیہ کے لیے غذائی اشیا اور خام مال کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کیا جائے اور اس سے

برطانیہ میں صنعت کو بڑھاوا ملے جو مضبوط سرمایہ دارانہ معیشت کے وجود کے لیے ناگزیر تھا۔ ان تبدیلیوں سے وہ خوشگوار تجارتی توازن الٹ پلٹ ہوگیا جو اس سے قبل ہندوستان کو حاصل تھا۔ اس مرحلے نے صنعت کاری (Industrilization) اور زراعت کے کمرشیلائزیشن (کمرشیل بنانے) کے پیچیدہ عمل کے ذریعے ہندوستان میں ایک اعلیٰ درجے کی نوآبادیاتی معیشت کی بنیاد ڈال دی۔ ہم ذیل میں ان ہی دونوں یعنی انڈسٹریلائزیشن اور زراعت کے کمرشیلائزیشن پر گفتگو کریں گے۔

زراعت کو کمرشیل بنا دینا (Commercialization of Agriculture)

اکثر یہ یقین کر لیا جاتا ہے کہ نوآبادیاتی انتظام حکومت نے زراعت کے کمرشیلائزیشن کو فروغ دیا جس سے ہندوستانی نوآبادی کے بہت سے علاقوں میں کسانوں کی حالت میں سدھار آیا۔ 1860 اور اس کے بعد، سمندر پار کے بازاروں میں ہندوستانی پرائمری مصنوعات کی مانگ کا کے زراعتی پیداوار پر گہرا اثر ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں جو اشیا برآمد کی جاتی تھیں ان میں نیل، افیم، کپاس اور ریشم وغیرہ کی نقدی فصلیں شامل تھیں۔ رفتہ رفتہ خام جوٹ، غذائی اجناس، تیل کے بیجوں اور چائے نے نیل اور افیم کی جگہ لے لی۔ خام کپاس کی سب سے زیادہ مانگ تھی۔ 1850 کے بعد تجارت کو مزید ترقی اس وقت ملی جب نقدی فصلوں کی توسیع کے ساتھ ریلوے کا بھی آغاز ہوا۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمرشیلائزیشن ایک مصنوعی اور تھوپا ہوا عمل تھا جس سے زراعتی شعبے میں ایک بہت محدود اضافہ (Growth) ہوا۔ اس سے خود زراعتی شعبے میں تفریق تو ہوگئی لیکن برطانیہ کے انداز پر ''سرمایہ دار زمیندار (Capitalist landowner) نہ پیدا ہو سکے۔ بڑے پیمانے پر اور بیک وقت صنعتی ترقی کے فقدان کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمع کردہ زراعتی پونجی کو سرمایہ کاری کے نفع بخش ذرائع نہ ملے جس سے وہ صنعتی سرمایہ میں تبدیل ہو سکتی۔ پیداواری صلاحیت کی توسیع اور زراعت کی تنظیم کے لیے اقدامات بھی آسان نہ تھے کیونکہ یہ شعبہ دور کے غیر ملکی بازار کی ضرورت کو پورا کرتا تھا جہاں قیمتوں میں اتار چڑھاؤ بہت ہوتے تھے اور خود نوآبادکار ریاست کھیتی باڑی کرنے والوں کو کوئی تحفظ نہیں دیتی تھی۔ اس طرح کمرشیلائزیشن سے دیہی علاقوں میں زمین کی شکمی کرایہ داری (Sub-infeudation) میں اضافہ ہوا اور روپیہ پیسہ تجارت یا سودخوری کی نذر ہوگیا۔

برآمداتی تجارت سے جو منافع ہوا اس کا بڑا حصہ کمیشن ایجنٹوں، تاجروں اور ساہوکاروں کے علاوہ برطانیہ کے ان تجارتی گھرانوں کے پاس چلا جاتا جو جہاز رانی اور بیمہ انڈسٹریز کو چلاتے تھے۔ نوآبادی میں جن کو منافع حاصل ہوتا ان میں بڑے کسان، کچھ ہندوستانی تاجر اور مہاجن شامل تھے۔ کمرشیلائزیشن سے دیہی علاقوں میں زمین مالکوں اور ساہوکاروں کے جاگیردارانہ نظام کو بڑھاوا ملا۔

کمرشیلائزیشن کا نام نہاد عمل جس کے بارے میں مانا جاتا ہے کہ اس سے سرمایہ دارانہ زراعت کا فروغ ہوا اکثر مزدوروں کے بڑے استحصال اور بندھنوں میں جکڑی مزدوری کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ آسام میں ان باغات میں

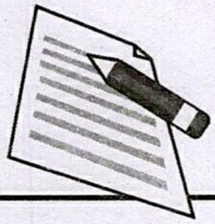

نوٹ

چائے پیدا کی جاتی تھی جن کے مالک گورے تھے۔ یہ گورے مزدوری کے اقرار نامے لکھواتے تھے اس قسم کی اقراری مزدوری (Indentured labour) ایک طرح کی غلامی (Slavery) تھی۔ ان باغات کے گورے مالک کسانوں کو مجبور کرتے کہ وہ نیل پیدا کریں کیونکہ نیل کی آمدنی کم ہوتی ہے۔ اس طرح فصلوں کی گردش درہم برہم ہو جاتی۔ اس معاملے میں بڑا غیر انسانی جبر کیا جاتا اور درحقیقت 60-1859 میں نیل کی بغات اس کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ کمرشیلائزیشن سے 1860 کی دہائی میں مغربی ہندوستان کپاس پیدا کرنے والے اور مشرقی ہندوستان میں جوٹ پیدا کرنے والے علاقوں میں کامیابی کے محدود مرحلے رونما ہوئے لیکن ان کی وجہ پیداوار اور تنظیم میں سرمایہ دارانہ جدت سے زیادہ مانگ میں اضافہ تھا۔

کسانوں کو اس بات کے لیے بھی مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ نقدی فصلیں اگائیں کیونکہ ان کو اونچا محصول، کرایہ اور قرض نقد ادا کرنا ہوتا تھا۔ غذائی فصلوں جیسے جوار، باجرہ اور دالوں وغیرہ کو چھوڑ کر نقد کی فصلیں اگانے سے اکثر قحط کے دنوں میں بدامنی پھیل جاتی تھی۔ جب دنیا میں ہندوستانی کپاس کی مانگ کم ہوگئی تو 1870 کی دہائی میں دکن کی کپاس والی مٹی میں کسانوں کے فسادات اور قحط کے ساتھ بھاری قرضوں کا بوجھ بھی بڑھ گیا۔ 1930 کی دہائی میں جوٹ کی انڈسٹری بھی بکھر گئی اور اس کے بعد 1943 میں بنگال کے اندر بھیانک بھکمری پڑی۔ اگرچہ مورخین نے ان قحط سالی کا بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غذائی فصلوں کی مجموعی پیداوار آبادی کے اضافہ سے کہیں کم تھی اور لاکھوں لوگ بھوک اور وبائی بیماریوں کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

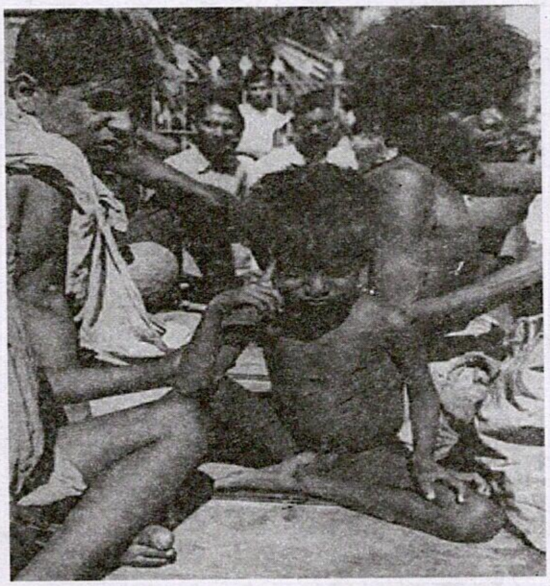

شکل 17.1: 1943 کی قحط سالی (بنگال)

ہندوستان کے شمالی، شمال مشرقی اور جنوب مغربی حصوں میں چند آبپاشی نہروں کی تعمیر ان چند اقدامات میں سے ایک تھی جو نوآبادکار حکومت نے زراعتی پیداواریت کو بڑھانے کے لیے اٹھائے تھے۔ مشرقی ہندوستان میں جہاں

محصول کا مستقل طور پر بندوبست ہو چکا تھا ان میں حکومت نے ایسے قدم نہیں اٹھائے کیونکہ وہاں محصول میں مزید اضافے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اس طرح محصول میں اضافہ اور انتہائی قسم کے حالات میں محدود بھکمری کی امداد وہ عوامل تھے جنھوں نے اس عوامی سرمایہ کاری کے لیے ترغیب دی۔ اس سے کچھ علاقوں اور خاص طور پر پنجاب کی نہری علاقوں میں بڑی خوشحالی آئی اور زراعت کا کمرشیلائزیشن ہوا! لیکن اس سب کا دائرہ ان کسانوں کی ایک مختصر سی تعداد تک محدود رہا جو پہلے سے ہی خوشحال تھے اور پانی کی اونچی قیمت ادا کر سکتے تھے۔ اس سے نقدی فصلوں جیسے چینی، کپاس اور گیہوں کی کھیتی کو بڑھاوا ملا البتہ دالوں اور باجرہ وغیرہ کی پیداوار میں کمی آئی۔ کہیں کہیں جیسے صوبہ جات متحدہ میں یہ چیز مقامی حالات سے ہم آہنگ نہ ہوئی اور وہاں اس سے دلدل اور بہت زیادہ کھاری پن پیدا ہو گیا۔

1853 لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان میں ریلوے بنانے کا فیصلہ لیا۔ زیادہ تر یہ مانا جاتا ہے کہ برطانوی راج میں جو جدید کاری (Modernization) ہوئی اس کا سبب ریلوے ہے لیکن ہندوستان میں ریلوے کی تعمیر نے صرف ہندوستانی معیشت کی ترقی کی نوآبادی نوعیت کو مضبوط بنایا۔ ریلوے کے جال نے دور دراز یا اندرونی بازاروں اور ذرائع (Sources) تک پہنچ کو آسان بنا دیا جہاں نوآبادی کا خام مال دستیاب تھا۔ ریلوے کے جال سے داخلی بازاروں کے ایک دوسرے سے جڑنے کے بجائے یہ مقامات بندرگاہوں سے جڑ گئے۔ ریلوے کے نیٹ ورک کو بنیادی طور پر غیر ملکی تجارت کے مفاد کے پیش نظر فروغ دیا گیا تھا۔ جو ریلوے لائنیں سرحدی علاقوں میں ڈالی گئی تھیں ان سے فوجی نقل وحرکت میں سہولیت پیش نظر تھی۔ اناج کی کمی والے علاقوں میں کچھ ''قحط لائنیں'' (Famine lines) بھی ڈالی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ تمام پروجیکٹ برطانوی سرمایہ سے بنایا گیا تھا اور برطانوی سرمایہ کاروں کو 5% کی ضمانت دی گئی تھی جس کی ادائیگی ہندوستانی محصول سے کی گئی۔ تمام اعلیٰ سطح کی مہارت، ریلوے کا سازوسامان جیسے مشینری، پٹریاں اور ایک حد تک کوئلہ بھی برطانیہ سے درآمد کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ ریلوے کی تعمیر کے ہمہ گیر (Multiplier) اثرات بھی ہندوستان میں مفقود ہے۔

دیگر عوامل کے ساتھ ہی ساتھ ملک کے دور دراز اندرونی حصوں تک رسائی کو ریلوے نے ممکن تو بنا دیا لیکن اس کا ایک دوسرا نتیجہ بھی برآمد ہوا — یعنی ہندوستان کی دستکاری کی وہ صنعت برباد ہوگئی، جس کو مقامی امرا ہی نہیں بلکہ غیر ملکی بازاروں کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ برطانیہ کے بڑھتے کنٹرول کے ساتھ ساتھ روایتی دیسی دربار بھی ختم ہوتے گئے۔ برطانیہ نے بھی درآمدو برآمد پر کسٹم ڈیوٹی کی غیر مساوی شرحیں لاگو کردیں اور اونچی کسٹم ڈیوٹیوں کی وجہ سے برطانوی بازاروں میں ہندوستانی مال کے داخلہ پر بندشیں لگ گئیں اور ہندوستانی بازاروں میں ان کا سیلاب سا آگیا۔ ہندوستانی مال اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا چنانچہ گھریلو اور غیر ملکی دونوں منڈیاں ہاتھ سے نکل گئیں۔ اس تخریبی عمل سے تو انڈسٹریلائزیشن کی ایک معکوس شکل پیدا ہوگئی جس سے ملک پر دباؤ میں اضافہ ہوگیا۔

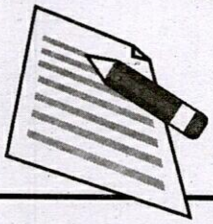

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 17.2

1۔ اٹھارہویں صدی میں کس ماہر معاشیات نے آزاد تجارت(Laissez faire) کا نظریہ پیش کیا تھا؟

2۔ زراعت کے کمرشیلائزیشن سے قحط کس طرح پڑا؟

3۔ انگریزوں کی بنائی ہوئی آبپاشی کی نہروں سے کس خطے کو سب سے زیادہ فائدہ ہوا؟

4۔ برطانوی ہندوستان میں برطانیہ کے صنعتی انقلاب سے انڈسٹریلائزیشن کی معکوس شکل کس طرح پیدا ہوئی؟

17.3 برطانوی نوآبادیت کا تیسرا مرحلہ
(The Third Phase of British Colonialism)

سمجھا جاتا ہے کہ تیسرا مرحلہ 1860 کی دہائی میں اس وقت شروع ہوا جب برطانوی ہندوستان براہِ راست برطانوی تاج کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے کنٹرول کے تحت آگیا اور ایک مستقل توسیع پذیر برطانوی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ یہ زمانہ ایک مالیاتی سامراجیت(Finance Imperialism) کا تھا کیونکہ اس وقت کچھ برطانوی سرمایہ نوآبادی میں لگایا گیا تھا۔ یہ سرمایہ برطانوی بینکوں، برآمداتی اور درآمداتی کمپنیوں اور مینیجنگ ایجنسیوں کے ایک نیٹ ورک کے ذریعے جٹایا گیا تھا۔

اگرچہ نوآبادیت کا عمل تین مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ زمانہ بندی (Periodisation) ایک طرح سے ایک طرفہ ہے، تیسرا مرحلہ تو صرف ان رجحانات کی یکجائی صورت ہے جو دوسرے مرحلے میں ہی صاف نظر آرہے تھے۔ یہ مرحلے بہت زیادہ ایک دوسرے سے گڈمڈ ہیں۔ اور اسی بات کو ذہن میں رکھ کر ہم ان کا مطالعہ کریں تو زیادہ سودمند ہوگا۔ ان میں استحصال کی پرانی مگر زیادہ ظالمانہ شکلوں کے ساتھ ساتھ، استحصال کی نئی اور ذرا نازک شکلیں موجود ہیں۔ بہرحال اس مرحلے کی سب سے ممتاز بات یہ ہے کہ ترقی یافتہ اور صنعتی ممالک کے درمیان ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکا کی نوآبادیوں کے سلسلے میں رقابت پیدا ہوگئی۔ انیسویں صدی میں فرانس، بیلجیم، جرمن، امریکا اور یہاں تک کہ جاپان جیسے ملکوں میں تیزی کے ساتھ انڈسٹریزلائزیشن آگیا۔ دنیا کی منڈی میں رقابت کو دیکھیں تو اس سلسلہ میں برطانیہ کی پیش قدمی ماند پڑ گئی۔ ان ملکوں نے نئی نئی منڈیوں اور خام مال کے نئے ذرائع کی تلاش میں نوآبادیوں کے لیے کوششیں تیز کیں اور موجودہ نوآبادیوں پر اپنی گرفت مضبوط

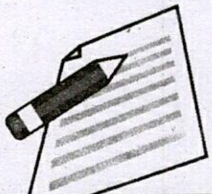

نوٹ

کی۔ صنعتی ترقی کے نتیجے میں سرمایہ اکٹھا ہوا جسے کچھ بینکوں اور کارپوریشنوں میں یکجا کر دیا گیا۔ اس سرمایہ کو خام مال کی فراہمی برقرار رکھنے کے لیے نوآبادیوں میں لگایا گیا تا کہ صنعتی پیداوار کی توسیع مزید تیز رفتار ہو جائے۔

دوسرے ترقی پذیر سرمایہ دار ملکوں میں کسٹم کی اونچی شرحوں کی وجہ سے برطانیہ میں بنے مال کے لیے بازار تنگ ہوگئے۔ ادھر برطانیہ میں زراعتی پیداوار کی بھاری مقدار میں درآمد کی ضرورت نے دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت میں اس کی پوزیشن کو نازک بنا دیا۔ برطانوی خساروں کے مسئلہ کو حل کرنے میں ہندوستان بہت اہم ثابت ہوا۔ ہندوستان پر برطانیہ کے کنٹرول سے یہ بات تو یقینی رہی کہ لنکا شایر کے ٹیکسٹائلز کے لیے ایک محفوظ بازار موجود ہی ہے۔ پھر برطانیہ کے علاوہ دیگر ممالک کے ساتھ ہندوستانی خام مال کے فاضل برآمدات (Export surplus) نے ہر جگہ اس کے خساروں کا توڑ کیا۔

ایک طرف تو دیسی دستکاروں کو زوال کا سامنا کرنا پڑا دوسری طرف نوآبادی میں جدید صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے بھی کوششیں نہ ہوئیں۔ اگر چہ استعماری حکومت (Colonial Government) آزاد تجارت کی بات کرتی رہی لیکن دیسی تجارتی سرگرمیوں میں ہمیشہ ریاست کی امتیازی پالیسیوں کی وجہ سے رکاوٹیں آئیں۔ برطانوی سرمایہ شروع میں ریلویز، جوٹ کی صنعت، چائے باغات اور کان کنی میں لگا۔ ہندوستانی روپیہ کی مارکیٹ پر یوروپی بینکنگ گھرانوں کا تسلط رہا۔ برطانوی تاجروں کو اس بینکنگ نیٹ ورک کے ذریعے آسانی سے سرمایہ حاصل ہو جاتا تھا لیکن ہندوستانی تاجروں کو سرمایہ کے حصول سے محتاط طریقے پر روکنے کے لیے استعماری ریاست کو بھی متاثر کر سکتی تھیں۔ پہلی عالمی جنگ سے پہلے برطانوی مینیجنگ ایجنسیاں صنعتی سرمایہ کے 75% کو کنٹرول کرتی تھیں اور محدود انڈسٹریلائزیشن سے حاصل ہوا بیشتر منافع واپس برطانیہ کو بھیج دیا جاتا تھا۔

لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود جب کبھی برطانیہ کے لیے معاشی دشواریوں کا زمانہ آتا تو ہندوستانی تاجروں کو توسیع اور نشوونما کے مواقع حاصل ہو جاتے۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران کلکتہ کے کچھ مارواڑی تاجروں جیسے جی ڈی برلا اور سوروپ چند حکم چند نے جوٹ انڈسٹری میں سرمایہ لگایا۔ رفتہ رفتہ دوسرے شعبوں جیسے کوئلہ کھانوں، شوگر ملوں اور کاغذ انڈسٹری میں بھی ان کا کنٹرول بڑھنا شروع ہو گیا اور وہ کچھ یوروپی کمپنیوں کو خریدنے کے قابل ہو گئے۔ ہندوستانی سرمایہ کی سب سے بڑی کامیابی، مغربی ہندوستان میں کاٹن انڈسٹری میں نظر آتی ہے۔ اس انڈسٹری نے اپنی کامیابی کو مضبوط بنانے کے لیے جنگ کے زمانے (1914-18) میں اونچی مانگوں سے فائدہ اٹھایا اور حقیقتاً لنکا شایر کو ٹکر دینے لگی۔ ٹریڈنگ کے کچھ روایتی سماج (Communities) جیسے گجراتی، بنیے، پارسی، بوہرے اور بھاٹیا وغیرہ اس شعبے میں اہم بن گئے۔ ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی نے حکومت کی سرپرستی میں ہندوستان کی ناتجربہ کار آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی کو قیادت مہیا کی۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد غیر ملکی بازار سے رابطے دوبارہ قائم ہوئے لیکن چونکہ غیر ملکی تجارت زوال پذیر ہوگئی تھی اس لیے مندی کے زمانے (1929-1933) میں گھریلو بازار، دیسی انڈسٹری کے استحصال سے نسبتاً آزاد رہا۔ زراعتی شعبے میں گرتی ہوئی قیمتوں کے چلتے استعماری حکومت (Colonial Government) نے بھی شوگر اور کاٹن

نوٹ

انڈسٹریز کو کچھ تحفظ دیا۔ قیمتوں میں کمی نے سرمایہ کو زراعت سے ہٹا کر مینوفیکچرنگ کے شعبے کی طرف آنے پر مجبور کر دیا۔ ہندوستانیوں نے بیمہ اور بینکنگ کے شعبوں میں بھی سرمایہ لگایا۔ پھر دوسری عالمی جنگ (1934-1945) کے بعد چونکہ غیر ملکی معاشی اثر زوال پذیر ہو گیا تھا اس لیے ہندوستان نے بہت منافع کمایا۔ اپنی محدود کامیابی سے حوصلہ پا کر ہندوستانی سرمایہ دار طبقے نے قومی تحریک (Nationalist Movement) سے اپنے تعلقات مضبوط کر لیے۔ پھر جلدی ہی اس نے ریاست کی ملکیت کے تحت بھاری صنعتوں کے قیام کا مطالبہ شروع کر دیا اور بیرونی سرمایہ کے داخلے کو روکنے کے لیے خود کو منظم کرنا بھی شروع کر دیا۔

لیکن اگر ان کامیابیوں کو ان کے اصل تناظر میں ہی دیکھا جائے تو یہ ساری ترقی گھریلو بازار تک محدود تھیں اور دیسی سرمایہ کو ابھی استعماری معیشت کی ساختی کمزوریوں (Structural Weaknesses) کے خلاف ایک لمبی لڑائی لڑنی تھی۔ ہندوستانی لوگوں کی بڑے پیمانے پر غریبی کی وجہ سے ترقی کی صلاحیت سرد پڑی رہی۔

ابتدائی ہندوستانی قوم پرستوں جیسے دادا بھائی نوروجی، ایم جی رانا دے اور آر سی دت نے یہ امید قائم کی تھی کہ برطانیہ ہندوستان میں ایک سرمایہ دارانہ انڈسٹریلائزیشن کو شروع کرے گا لیکن نوآبادیاتی انڈسٹریل پالیسیوں کے نتائج نے ان کی خام خیالی دور کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے انیسویں صدی کے اواخر میں نوآبادیت یا استعمار کی معاشی طور پر سخت تنقیدیں کیں۔ دادا بھائی نوروجی نے دولت کی نکاسی کا نظریہ پیش کیا۔ ان کے مطابق ہندوستان میں غریبی ہندوستانی دولت کے برطانیہ کی طرف لگاتار نکاس (Drainage) کی وجہ سے ہے اور یہ نتیجہ ہے برطانیہ کی نوآبادی پالیسی کا۔ یہ نکاسی اس سود (Interst) کے ذریعے ہوتی ہے جس سے ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے غیر ملکی قرضوں، فوجی اخراجات، ریلوے اور دیگر بنیادی ڈھانچوں میں لگے غیر ملکی سرمایہ کی گارنٹی شدہ واپسی، انگلینڈ سے اسٹیشنری کی درآمد، برطانیہ میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے لیے ادا کردہ ''ہوم چارجز'' (Home Charges)، ہندوستان میں حکومت چلانے کے لیے برطانیہ کے ذریعے رکھے گئے فوجی اور سول ملازمین کی تنخواہوں، پنشنوں اور ٹریننگ اخراجات وغیرہ کی ادائیگی کرتا ہے۔ اگر چہ یہ نکاسی ہندوستان کی مجموعی برآمد کی قیمت کا ایک چھوٹا حصہ ہی سہی لیکن اگر اس کی ملک کے اندر ہی سرمایہ کاری کی جاتی تو اس سے بہت بچت (Surplus) ہوتی اور اس سے ایک سرمایہ دارانہ معیشت کی تعمیر ہوتی۔

ہندوستان میں آبادیاتی معاشی پالیسیوں کے بارے میں ایک آخری سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہندوستان میں کوئی ترقی ہوئی بھی یا نہیں۔ اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے۔ ہم اٹھارہویں صدی کے مغلوں کے ہندوستان پر ایک نظر ڈالتے ہیں جب برطانیہ ایک ناقابل تسخیر طاقت نہیں بنی تھی۔ یہ نظریہ کہ اٹھارہویں صدی کا مغل ہندوستان ایک سخت معاشی بحران اور زوال سے دوچار تھا، مورخین کے درمیان دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس نظریہ کو ایک فیصلہ کن اور وسیع تر پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے اور اس پس منظر میں ہم مغل سلطنت کے زوال کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں۔ البتہ بعد کے کچھ مؤرخین اس نظریہ کو باطل قرار دیتے ہیں اور ہماری توجہ نئے باغی گروہوں کے طاقتور ہوجانے کی طرف مبذول کراتے ہیں جو مغل سلطنت کے اس زوال کے لیے ذمہ دار تھے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ درحقیقت مغل عہد،

ایک مجموعی طور پر خوشحالی اور معاشی ترقی کا دور تھا، کسی جمود اور بحران کا دور نہ تھا۔ اس وقت کے سیاسی ڈھانچے کے اندر مقامی صاحب جائیداد اور امیروں اور شہری انجمنوں(Urban grids) کے ہاتھوں سے سرپلس پیدا کرنے اور اکٹھا کرنے کے لیے کافی مواقع اور اقتدار ہوتا تھا۔ مرادآباد، بریلی، اودھ، بنارس اور بنگال فاضل دولت (Surplus) کے کچھ ایسے ہی علاقے تھے۔ زراعت کی توسیع کے لیے جنگلات کی صفائی کی جاتی تھی، اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زراعتی پیداوار اور لین دین کی سہولتوں نے ان سابقہ زمین مالکوں اور زمینداروں کے ہاتھوں میں فاضل دولت کے اکٹھا ہونے کو ممکن بنا دیا جو ایک نئی علاقائی طاقت بننے کے لیے مغلیہ اقتدار کو چیلنج دیتے رہتے تھے۔

متن پر مبنی سوالات 17.3

1۔ دنیا کے کس واقعہ نے ہندوستانی تاجروں کو توسیع اور نشوونما کے لیے پہلا موقع فراہم کیا؟

2۔ ''دولت کی نکاسی'' کے نظریہ کو کس نے پیش کیا؟

3۔ کیا بعد کے مورخین نے اٹھارہویں صدی کو معاشی پسماندگی کا زمانہ قرار دیا ہے؟

اس طرح، ہندوستان کی جو تصویر ہمیں نظر آتی ہے وہ ایک ایسی لچکدار معاشی آب و ہوا کی ہے جس میں نشوونما کے معقول امکانات موجود ہیں۔ ہم اس پسماندگی اور غریبی کی کس طرح وضاحت کر سکتے ہیں جو ہم کو برطانوی استعمار کے آنے والے دوسو سال کے اختتام پر نظر آتی ہے۔ کچھ مصنفین نے یہ دلیل دی ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کو جزوی طور پر جدید(Modernized) بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے روایتی ڈھانچوں کی مضبوط پکڑ کی وجہ سے ناکافی ہوئی۔ لیکن ہم نے اس سے قبل یہ بتایا ہے کہ جدید کاری(Modernization) کی بے دلی سے کی جانے والی ان کی تمام کوششوں کا اصل مقصد اپنے ''آبائی ملک'' (برطانیہ) کو فائدہ پہنچانا تھا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نوآبادی دائرہ میں جو پسماندگی ہے وہ مغرب کے اردگرد رونما ہونے والے صنعتی انقلاب کا ایک بدنما رخ ہے۔ وہ تمام اعمال و افعال جن کے نتیجے میں برطانیہ میں انڈسٹریزیلائزیشن واقع ہوا، ان ہی اعمال و افعال کے نتیجے میں ہندوستانی نوآبادی میں پسماندگی پیدا بھی ہوئی اور برقرار بھی رہی اور اس کی وجہ یہ رہی کہ ایک آزاد تجارت کے ایک مربوط عالمی معاشی نظام میں برطانوی معیشت ہندوستانی معیشت سے ایک طفیلی کی طرح جڑی ہوئی تھی۔

1947 میں بھی ہندوستان کسی ''ماقبل صنعتی'' مرحلے(Pre-Industrical state) میں نہیں تھا اور اسی طرح آزادی کے بعد یہاں کی معاشی نشوونما کے طور طریقوں کا بھی مغرب کے انڈسٹریلائزیشن کے کسی عمل سے مقابلہ یا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ 1947 میں اگرچہ ہندوستان پہلے سے ہی مغرب کے دوسو سالہ سرمایہ دارانہ ترقی کا ایک

حصہ تھا لیکن اس کی یہ حصہ داری ایک نوآبادی کی حیثیت میں ہی تھی۔ اس طرح آزاد ہندوستان 1947 میں ایک نوآبادیاتی نظریہ کے ساتھ جدید کاری(Modernization) کے عمل میں شریک ہوا۔ اس وقت ہندوستان اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے پسماندہ بھی تھا اور غیر ترقی یافتہ بھی۔

آپ نے کیا سیکھا

برصغیر ہند میں اپنا راج قائم کرنے کے لیے برطانیہ کے سامنے اصل مقصد اس نوآبادی کا مرحلہ وار معاشی استحصال تھا۔ برطانیہ میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں یہاں کی حکومت کے انداز میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس استحصال کی نوعیت بھی بدلتی رہی اور ان تبدیلیوں نے نوآبادی کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات پر بھی اثرات مرتب کیے۔ استعماری ریاست (Colonial state) نے اکثر جو معاشی قدم اٹھائے ان کو ترقی (Development) اور جدید کاری(Modernization) ہی کا نام دیا لیکن نوآبادی پر ان کا ایک مختلف اثر مرتب ہوا جو اکثر ترقی کے بجائے پسماندگی کا سبب بنا۔ آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان اقدامات سے یوروپ کے انڈسٹریزلائزیشن کے لیے ہندوستانی وسائل کا استحصال کرنے میں مدد ملی۔

اختتامی سوالات

1۔ برطانیہ نے محصول(Revenue) کی کون سی پالیسیوں کو شروع کیا اور وہ نوآبادی کے دیہی علاقوں میں کون کون سی تبدیلیاں لائے؟

2۔ نوآبادی میں زراعت کا کمرشیلائزیشن ایک ''مجبوری کا عمل''(Forced process) کیوں تھا؟

3۔ ''مالیاتی سامراجیت''(Finance Imperialism) کے مرحلے کی وضاحت کیجیے۔

متن پر مبنی سوالوں کے جواب

17.1

1۔ تاجریت (سوداگری) کا پہلا مرحلہ (1757-1813) سیدھے طور پر لوٹ مار(Direct plunder) تھا، دوسرا مرحلہ (1813-1858) آزاد تجارت کا تھا اور تیسرا مرحلہ (1858 کے بعد) مالی سامراجیت (Finance Imperialism) کا تھا۔

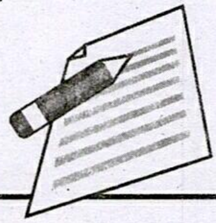

نوٹ

2۔ کمپنی کے ملازمین کے ذریعے اپنی پرائیوٹ تجارت کے لیے دستک کے غلط استعمال سے بنگال کے نوابوں کو غصہ آیا۔

3۔ زمیندار

4۔ مدراس اور بمبئی پریزی ڈینسیاں

17.2

1۔ آدم اسمتھ

2۔ غذائی فصلوں کی قیمت پر نقدی فصلوں کی پیداوار کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

3۔ پنجاب

4۔ ہندوستانی بازاروں میں مشینوں سے تیار شدہ برطانوی مال کی بھرمار ہوگئی اور ہندوستان کی دستکاریاں ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔

17.3

1۔ پہلی عالمی جنگ نے

2۔ دادا بھائی نوروجی

3۔ نہیں، بعد کے مؤرخین نے اٹھارہویں صدی کو عام خوشحالی اور معاشی نشوونما کا زمانہ کہا ہے۔

اختتامی سوالات کے لیے اشارے

1۔ دیکھیے سیکشن 17.1 ''زمینی محصول یا لگان کی پالیسیاں''

2۔ دیکھیے سیکشن 17.2 ''زراعت کا کمرشیلائزیشن''

3۔ دیکھیے سیکشن 17.3 ''برطانوی استعمار (Colonialism) کا تیسرا مرحلہ''

فرہنگ اصطلاحات (Glossary)

1۔ تاجریت (سوداگری) (Mercantilism) — تاجریت یا مرکنٹلزم ایک معاشی نظریہ ہے جسے سولہویں اور اٹھارہویں صدیوں کے درمیان یوروپ میں اپنایا گیا، اس کے تحت ریاستوں نے نوآبادیوں کے ذریعے سونے چاندی (دولت) کے اندرونی بہاؤ (Inflow) اور تجارت و وسائل پر کنٹرول کے لیے جنگ و جدل کا استعمال کیا۔

نوٹ

2۔ بُلین(Bullion)	—	سونا چاندی جیسی قیمتی دھاتوں کی شکل میں دولت
3۔ دیوانی(Diwani)	—	محصول(Revenue) اکٹھا کرنے کا حق
4۔ تعلقدار(Taluqdar)	—	انگریزوں سے پہلے دیہات میں محصول کا آفیسر
5۔ اجارہ داری(Monopoly)	—	کسی تجارت کا بلاشرکت غیرے حق
6۔ محصول نامہ(Tariff)	—	کسی برآمداتی ملک کے لیے قابلِ ادائیگی کسٹم ڈیوٹیاں
7۔ آزادتجارت(Free Trade)	—	بین الاقوامی تجارت جو کسی حکومت کے قوانین یا پابندیوں سے آزاد ہو
8۔ کمرشیلائزیشن (Commercialization)	—	تجارت کی غرض کسی چیز میں ترمیم واصلاح
9۔ محنت کشی کی غیرآزاد شکلیں (Unfree froms of Labour)	—	وہ محنت(Labour) جوصرف اجرت کے لیے ہی نہ لی جائے بلکہ ذہنی، جسمانی، روایتی اور سیاسی وغیرہ ہرقسم کے دباؤ کے تحت لی جائے۔
10۔ ہمہ گیراثرات (Multipliar effect)	—	یہ معاشیات کا ایک نظریہ ہے جس کے مطابق کسی بھی خرچ میں اضافہ سے یہ توقع ہوتی ہے کہ اس سے معاشی سرگرمیوں کو تحریک وفروغ ملے گا۔ مثلاً ریلوے ڈبے بنیں گے اور ریلوے لائن بنے گی تو اس سے لوہے، اسٹیل اور کوئلہ کی پیداوار بڑھے گی۔ اس سے بڑی تعداد میں لوگوں کو نوکریاں بھی ملیں گی۔
11۔ خسارہ(Deficit)	—	جب تجارت سے حاصل ہونے والی آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہو۔

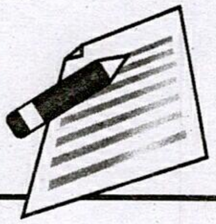

نوٹ

18

سماجی تبدیلیاں اور جدید ہندوستان

(Social Changes in Modern India)

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران ہندستانی برصغیر میں کچھ اہم سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ برطانوی راج کی ابتدا، سماجی اور مذہبی اصلاحات کی بڑھتی ضرورت، متوسط طبقہ (Middle class) کا ابھرنا، انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں اخبارات کی تیزی سے نشونما، مادی بنیادی ڈھانچہ میں تبدیلیاں اور ملک کا نیم سیاسی اتحاد (Unification) جیسے عوامل کسی حد تک ان تبدیلیوں کے لیے ذمہ دار تھے۔ اٹھارہویں صدی میں مغل بادشاہیت کے خاتمہ کے بعد بہت سی علاقائی حکومتوں کو تقویت ملی۔ اسی خلا میں برطانوی راج کی بتدریج توسیع ہوتی گئی جس کا مطلب تھا ایک قطعی نامانوس طرز حکومت جس کے نتائج بھی بڑے دور رس تھے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ :

- ہندوستان میں برطانوی حکمرانوں کی کلچرل پالیسیوں کا ایک وسیع خاکہ تیار کرسکیں گے؛
- مشرقیت پسندی اور انگریزیت پسندی کے درمیان کشمکش کی نوعیت کا جائزہ لے سکیں گے؛
- ہندوستان میں تعلیم یافتہ طبقوں پر برطانوی راج کے اثر کا جائزہ لے سکیں گے؛
- سماجی اور مذہبی زندگی میں برائیوں کا پتہ لگا سکیں گے؛
- جدید ہندوستانی دانشوران کے ابھار کے پس منظر کی وضاحت کرسکیں گے؛

نوٹ

- اصلاحی تحریک اور اصلاح پسندوں کے ذریعے اٹھائے گئے مسائل کو سمجھ سکیں گے؛
- ہندوستان میں مغربی تعلیم کے فروغ کے مرحلوں اور
- ہندوستان میں پریس کی ترقی کے مرحلوں کی نشاندہی کر سکیں گے۔

18.1 ہندوستان میں برطانیہ کی کلچرل پالیسیاں (British Cultural Polices in India)

ہندوستان میں برطانوی راج کے آغاز میں بہت سے سامراجی نظریات(Imperial ideologies) نے رواج پایا۔ اگر خود انگلینڈ میں دیکھیں تو وہاں بھی سلطنت کے کام کاج کو بہتر سے بہتر طریقے سے چلانے کے لیے مختلف نظریات رائج رہے ہیں۔ یوروپ میں عام طور پر اور انگلینڈ میں خاص طور پر پالیسیاں وضع کرنے میں مخصوص نظریوں کی مقبولیت کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ یہ پالیسیاں بھی ہندوستان میں اعلیٰ برطانوی عہدیداروں کی خود اپنی سوچ اور فکری رجحانات پر منحصر تھیں۔ پلاسی (1757) اور بکسر (1764) کی جنگوں کے بعد انگریز حاکموں کو ان خطوں پر حکومت کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئیں جن کو انھوں نے فتح کر لیا تھا۔ یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف نظریات کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔

مشرقیت پسند (Orientalists)

ہندوستان میں برطانوی حکام کی پہلی نسل جیسے وارن ہیسٹنگز، ولیم جونس اور جوناتھن ڈنکن نے اس سوچ کو مقبول بنایا کہ ہندوستان کا ماضی شاندار ہے لیکن یہ بعد کے زمانے میں زوال پذیر ہو چکا ہے۔ ان ہی محققین(Scholors) اور انتظامی امور کے ماہرین کو ''مشرقیت پسند''(Orienlatists) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی روایات کے شائق تھے اور ہندوستانی زبان وعلوم کو سیکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ بہتر طور پر ہندوستان کو سمجھ سکیں گے اور ہندوستان پر حکومت کرنے میں اس سے مدد ملے گی۔ اگر اس استدلال کو تھوڑا پھیلائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کے ماضی کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے کہ وہ نوآبادی حکومت کی ضرورتوں سے ہم آہنگ ہو۔ ان لوگوں کی کوششوں سے جو ادارے قائم ہوئے ان میں ایک کلکتہ مدرسہ ہے جسے 1781 میں وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا، دوسرا ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ہے جس کی بنیاد 1784 میں ولیم جونس نے ڈالی اور تیسرا سنسکرت کالج آف بنارس ہے جسے جوناتھن ڈنکن نے 1794 میں قائم کیا۔

ولیم جونس نے کلاسیکل زبانوں کو سیکھا اور سنسکرت نیز کلاسیکل مغربی زبانوں جیسے یونانی اور لاطینی زبانوں وغیرہ کے درمیان ایک لسانی رشتہ بھی معلوم کر لیا۔ ایشیاٹک سوسائٹی تقریباً پچاس سال تک علم کا ایک اہم مرکز رہی اور اس نادر ادارہ نے بہت سے قابلِ ذکر سنسکرت متنوں کے ترجمے کرائے۔ ایشیاٹک ریسرچز نامی اہم رسالہ بھی اس نے شائع کیا۔ وارن ہیسٹنگز کا خیال تھا کہ ہندوؤں کے پاس ایسے قوانین تھے جن میں صدیوں تک کوئی تحریف نہیں ہوئی۔

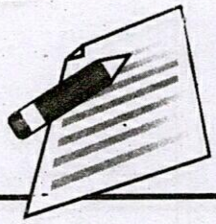

نوٹ

اسی لیے انگریزوں کو چاہیے کہ اگر ہندوستان میں حکومت کرنا چاہتے ہیں تو ان قوانین کو اور اس سنسکرت زبان کو سیکھیں جس میں یہ کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ ہندوؤں کے طور طریقے اور رسوم و رواج کے بارے میں ایک ہلکا سا نظریہ قائم کرنے کے لیے این بی ہل ہیڈ (NB Halhead) نے 1776 میں A Code of Gentor Laws نامی کتاب لکھی۔

اس بات کی بہت شدید ضرورت تھی کہ برطانوی حکام، ہندوستانی کلچر اور ہندوستانی روایات سے آشنا ہوں۔ لارڈ ویلزلی نے ہندوستان میں سول سروسز کے نئے برطانوی ملازمین کی ٹریننگ کے لیے 1801 میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔ شروع میں اس کالج کے قیام کا یہی مقصد تھا پھر یہ کالج ہندوستان کے بارے میں علوم کی تخلیق کا اہم مرکز بن گیا۔ اس کالج میں بہت سے شعبے تھے جو کلیتاً ہندوستانی زبانوں اور ادبیات پر تحقیق میں لگے ہوئے تھے۔

انتظامی اور معاشی پالیسیوں پر نظریات کے اثرات (Influence of Ideas on Administrative and Economic Policies)

انتظامی اور معاشی پالیسیوں پر ان نظریات کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ لارڈ کارنوالس جو 1786 میں گورنر جنرل ہوا وہ اٹھارہویں صدی میں وہیگ (Whig) کے فلسفہ کے مطابق حکومت کے تینوں شعبوں یعنی انتظامیہ (Executive)، قانون ساز (Legislative) اور عدلیہ (Judiciary) الگ الگ ہونے چاہئیں۔ اس سے ایک دوسرے کی سرگرمیوں پر نگرانی بھی رہے گی اور ایک توازن بھی باقی رہے گا اور کوئی ایک شعبہ یک طرفہ طور پر اپنے حقوق سے تجاوز نہ کرے گا۔ فلپ فرانسس اور ایڈمنڈ برک اٹھارہویں صدی کے دو بہت ممتاز انگریز سیاسی مفکر ہیں۔ برک (Burke) نے اس بات پر زور دیا کہ دیسی لوگوں سے کسی بھی منفعت کے حصول سے پہلے ان کی خوشحالی کا تحفظ ہونا ضروری ہے۔ اس کے دوست اور کلکتے کی سپریم کونسل کے ممبر فلپ فرانسس نے 1770 کی دہائی میں بنگال کی املاک کے نظم ونسق کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار کیا۔ آنے والے زمانے میں کارنوالس نے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں (1793) بندوبست استمراری (Permanent Settlement) کے نام سے جو پالیسی تیار کی تھی اس پر اس منصوبہ کا اثر ہوا۔ کارنوالس حکومت بنگال کے نظم ونسق کے سلسلے میں وہگ (Whig) کی مضبوط پالیسی کی بنیاد ڈالنے میں کامیاب رہا۔ آپ برطانوی عہد کی معاشی تاریخ سے متعلق باب میں بندوبست استمراری کی پالیسی کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔

انگلینڈ میں صنعتی انقلاب سب سے پہلے آیا اور اس کے نتیجے میں تیار شدہ مال کی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوگیا۔ برطانیہ کے صنعتی سرمایہ دار برطانوی نوآبادیوں میں آزاد تجارت کی حمایت کرنے لگے اور انھوں نے حکومت برطانیہ پر یہ دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ ہندوستانی بازار میں کمپنی کی اجارہ داری کو کم کیا جائے۔ آزاد تجارت کے حامیوں نے خود ہندوستان میں پالیسی سازوں کے نظریات کو متاثر کیا۔ انجام کار 1813 کے چارٹر ایکٹ نے ہندوستان کے ساتھ تجارت میں کمپنی کی اجارہ داری کا خاتمہ کر دیا۔ اس زمانے میں حریت پسندوں (Liberals) اور افادیت پسندوں (Utilitarianists) نے ہندوستان میں پالیسی سازوں کے ادارہ پر مضبوط پکڑ بنالی۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 18.1

1۔ مشرقیت پسندوں نے جو ادارے قائم کیے تھے ان میں سے کچھ اداروں کے نام بتائیے۔

2۔ ہندوستانی علوم کی ترویج و فروغ میں ایشیاٹک سوسائٹی کی اہمیت بیان کیجیے۔

3۔ فورٹ ولیم کالج کس نے قائم کیا تھا؟

4۔ وہ پہلا ملک کون سا ہے جہاں صنعتی انقلاب آیا؟

5۔ وہ کون سا قانون ہے جس نے ہندوستانی تجارت پر سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کا خاتمہ کیا؟

18.2 سماجی و مذہبی اصلاحات (Socio-Religious Refroms)

سماجی اور مذہبی اصلاحات کی ضرورت انیسویں صدی کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ ان اصلاحات نے ذات پات اور برادریوں پر گہرا نشتر چلایا۔ ہندوستان میں مذہبی اصلاحات اور عقائد کے اختلاف کی روایت بہت قدیم ہے۔ اپنشدوں، بدھ مت، جین مت، وجر یان(Vajrayan) اور تانترک ازم میں عہد قدیم کے دوران بھی اصلاح کے لیے اصرار کو دیکھا جاسکتا ہے۔ عہد وسطی (Medeival period) میں بھکتی اور صوفی سنتوں کی مقبولیت ایک جانی پہچانی حقیقت ہے۔ برطانوی حکمرانوں کی پہلی نسل نے ہندوستان کے ماضی کو تلاش کرنے کی جو کوششیں کیں ان سے تعلیم یافتہ طبقات کے شعور کو جلا ملی اور انھوں نے خود کو پہچانا۔ ابتدائی مصلحین مناسب جوابوں کی تلاش میں تھے، لیکن مغربی اثر نے جدیدکاری(Modernization) کا کوئی ایجنڈا طے نہیں کیا تھا کیونکہ اصلاح کی منطق کو خود ہندوستان کے ماضی میں ہی تلاش کرنا تھا۔

بنگال کا نشاۃ ثانیہ(Bangal Renaissance)

اصلاحی تحریکات کو جن کی جڑیں، بنگال میں بہت گہری تھیں اکثر بنگال کی نشاۃ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ بنکم چندر چڑ جی اور بپن چندر پال نے انیسویں صدی کے بنگال میں ہونے والے تغیرات کو نشاۃ ثانیہ کا زمانہ کہا ہے۔ بنگال میں رونما ہونے والے تغیرات کا یوروپی نشاۃ ثانیہ سے موازنہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ دونوں کا سیاق وسباق(Context)

بھی مختلف ہے اور دونوں کے طور طریقے (Patterns) بھی یکساں نہیں ہیں۔ لیکن بنگال کی نشاۃ ثانیہ کا ذکر کرتے وقت جن خصوصیات کو بیان کیا جاتا ہے ان کو ہم تین اہم زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ یعنی تاریخی بازیافت (Historical rediscovery)، لسانی اور ادبی جدید کاری (Linguistic and literary modernization) اور سماجی و مذہبی اصلاحات (Socio-religious reforms)۔

برہمو سماج (Brahmo Samaj)

بنگال کے رام موہن رائے جدید زمانہ کے سب سے ممتاز مصلح (Reformer) تھے۔ وہ ان پہلے لوگوں میں سے ایک تھے جو سیاسی سوالات کو عوامی مباحثے کے دائرہ میں لے آئے۔ ان کی آتمیہ سبھا نے جو کہ 1814 میں قائم ہوئی تھی اپنے زمانے کے اہم سیاسی اور سماجی امور پر تبادلۂ خیال کیا۔ 1828 میں اسی کو آتمیہ سبھا کے ذرا مفصل ایڈیشن کو برہمو سبھا کہا گیا اور بعد میں اسی برہمو سبھا کا نام برہمو سماج رکھا گیا۔ انھوں نے جلد ہی اپنے زمانے کے اہم سماجی معاملات پر اظہار خیال کرنا شروع کر دیا جس میں بڑے پیمانے پر رائج ستی ہو جانے کی رسم بھی شامل تھی۔ انھوں نے اس رسم کے خاتمے کے لیے (گورنر جنرل) ولیم بنیٹنک کی کوششوں کی بڑی زبردست حمایت کی اور اس کے لیے انھوں نے کافی کچھ لکھا۔ 1829 میں ستی کی رسم کا سرکاری طور پر خاتمہ کر دیا گیا۔ انھوں نے کثرت ازدواج اور عورتوں کی محکومی کی دیگر شکلوں کی بڑی مذمت کی۔ رائے جدید تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے 1825 میں ایک ویدانت کالج قائم کیا اور ایک انگلش اسکول کھولا۔ وہ توحید یعنی ایک خدا کے نظریہ پر یقین رکھتے تھے۔ وہ بت پرستی کے خلاف تھے انھوں نے پایا کہ اپنشد حقیقی ہندوازم کی بنیاد ہیں۔ انھوں نے ہندوازم کو ان تمام قسم کی برائیوں سے پاک کرنا چاہا جو صدیوں میں ہندوازم میں راہ پا گئی تھیں۔ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے پھیلاؤ کے مخالف نہ تھے۔

شکل 18.1: راجہ رام موہن رائے

نوٹ

1833 میں راجہ رام موہن رائے کی وفات کے بعد برہمو سماج بکھرنے لگا۔ دبیندر ناتھ ٹیگور کی زیر قیادت اس کو ایک نئی شکل دی گئی اور اس کو کلکتہ سے باہر بھی مقبول بنایا گیا۔ ٹیگور نے برہمو سماج میں 1842 میں شرکت کی۔ ایک سال کے بعد انھوں نے ایک برہمو عہد نامہ(Brahmo Covenant) لکھا جو سماج کے عقیدوں کا بیان اور اس کے ارکان کی ذمہ داریوں اور فرائض کی ایک فہرست تھی۔

کیشب چند سین (84-1838) نے 1858 میں سماج میں شرکت کی۔ وہ ایک فصیح و بلیغ اور اپنی بات منوا لینے والے رہنما تھے۔ وہ سماج کی سرگرمیوں کو بنگال سے نکال کر یو پی، پنجاب، مدراس اور بمبئی لے گئے۔ انھوں نے ذات پات کے نظام پر تنقید کر کے عورتوں کے حقوق اور بیواؤں کی دوسری شادی کی حمایت کی اور برہمو مبلغین کی ذات کے مسئلہ کو اٹھا کر سماج میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس سے قبل جاتی کا اعلیٰ رتبہ(Status) برہمنوں کے لیے مخصوص تھا۔ انھوں نے مذہب میں ہمہ گیریت(Universalism) پر زور دیا۔ ان کی بنیاد پرستی کی وجہ سے دبیندر ناتھ نے ان کی مخالفت کی۔ 1866 میں سماج رسمی طور پر آدی برہمو سماج (دبیندر ناتھ کی زیر قیادت) اور برہمو سماج آف انڈیا (کیشب چندر کی زیر قیادت) میں تقسیم ہو گیا۔

ایشور چندر ودیا ساگر

ایک دوسرے بنگالی مصلح جنھوں نے بڑی شدت سے عورتوں سے متعلق امور کو اٹھایا، ایشور چند ودیا چندر ساگر تھے۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔ ان کا یقین تھا کہ تعلیم کی کمی ہی تمام مسائل کی اصل وجہ ہے۔ بیتھون (Bethun) نامی ایک انگریز کی مدد سے انھوں نے بہت سے اسکول کھولے جو خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے وقف رہے۔ انھوں نے بچپن کی شادی اور متعدد ازواج(Polygamy) پر سخت تنقید کی۔ وہ بیوہ عورتوں کی شادی کے زبردست حامی تھے۔ ان ہی کی مساعی سے 1856 میں بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کا قانون(Widows Remarriage Act) پاس ہوا۔ اس قانون کی رو سے بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کو قانونی حیثیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے خود ایسی بہت سی شادیاں کرائیں۔ انھوں نے اس وقت تو ایک مثال قائم کر دی جب انھوں نے اپنے بیٹے کی شادی ایک بیوہ سے کی۔

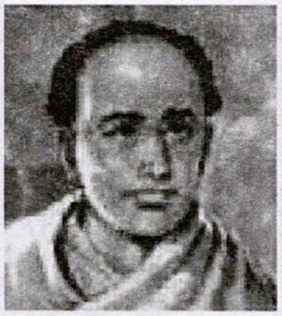

شکل18.2 : ایشور چندر ودیا ساگر

رام کرشنا مشن

انیسویں صدی کے اواخر میں بنگال میں رام کرشنا مشن نامی ایک اور تحریک شروع ہوئی جو جلدی ہی ملک کے دوسرے حصوں میں پھیل گئی۔ یہ تحریک ایک سادھو سنت گدادھر چٹرجی یا سوامی رام کرشنا پرم ہنس (86-1836) کی قیادت میں شروع ہوئی۔ جنھیں 72-1871 میں باطنی تسکین(Inner peace) حاصل ہوئی۔ انھوں نے تمام مذاہب کی آفاقیت کا سبق دیا اور ہندوازم کے عقائد اور رسوم کے تحفظ کی حمایت کی۔ نریندر ناتھ یا سوامی وویکانند جنھوں نے 1885 میں رام کرشنا کو اپنا گرو مان لیا تھا ان کے خاص چیلوں میں سے تھے۔ انھوں نے 97-1893 کے دوران اپنے امریکہ اور یوروپ کے ٹور کے دوران ہندوازم کے روحانی پیام کو پھیلایا۔ انھوں نے 1897 میں راما کرشنا مشن کو قائم کیا اور بیلور میں ایک مٹھ بنایا۔ 1902 میں چالیس سال کی مختصر عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وویکانند مذہب میں گراوٹ، طرح طرح کے اختلافات، ذات کی سخت گری، چھوا چھات اور توہمات کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں کی موجودہ حالت ان کی جہالت کی وجہ سے ہے اور ان کی جہالت کی یہ وجہ بھی ہے کہ وہ ایک محکوم نسل رہے۔ انھوں نے مغرب کی خود غرض تہذیب کے مقابلے ہندو روحانی برتری کو قائم کرنے کی کوشش کی۔ بہر حال ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہندوستان کو عمل کی اخلاقیات، تنظیم کی شکلیں اور ٹیکنولوجیکل ترقی مغرب سے سیکھنی چاہیے۔

مغربی ہندوستان میں اصلاحی تحریکیں(Reform Movement in Western India)

انیسویں صدی کے دوران مغربی ہندوستان میں بہت سی اہم اصلاحی تحریکیں اٹھیں۔ کے ٹی تلنگ، وی این منڈالک اور آر جی بھنڈارکر جیسے مصلحین نے ہندوستان کے ماضی کو شاندار بنا دیا۔ کچھ ایسے مصلحین تھے جنھوں نے ذات پات کے نظام جیسی سماجی برائیوں پر براہ راست حملہ کیا اور بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کی حوصلہ افزائی کی۔ ان میں کرسون داس ملجی(Karsondas Mulji) اور دادوبا پانڈورنگ سرفہرست ہیں۔ انھوں نے 1844 میں مانو دھرم سبھا، 1849 میں پرم ہنس منڈلی کی تشکیل کی۔ منڈلی کی سرگرمیاں خفیہ تھیں۔ اس کے ارکان یہ عہد کرتے تھے کہ وہ جاتی کے تمام امتیازات کو چھوڑ دیں گے۔ 1860 کے بعد منڈلی(Mandali) کا زوال ہوگیا کیونکہ اس کی رکنیت(Membership) اور سرگرمیاں دونوں راز نہ رہیں۔ 1864 اور پھر 1867 میں دوبار کیشب چندر سین کے بمبئی کے سفروں کا اس خطے کی سماجی اصلاحات پر گہرا اثر پڑا۔ ان کے اس سفر کا ایک براہ راست اثر یہ ہوا کہ آتمارام پانڈورنگ(Atmaram Pandurang) نے 1867 میں پرارتھنا سماج کی بنیاد ڈالی۔ مہادیو گووند راناڈے جو دکن ایجوکیشن سوسائٹی چلاتے تھے اس تنظیم کے اصل روح رواں تھے۔ پرارتھنا سماج کے کئی رکن اس سے قبل پرم ہنس منڈلی میں بھی بہت فعال رہ چکے تھے۔ یہ سماج بت پرستی، پروہتوں کی برتری اور جاتی کی سخت گیری کو برا سمجھتا تھا اور توحید(Monotheism) کو ترجیح دیتا تھا۔ ہندو فرقوں سے قطع نظر یہ سماج عیسائیت اور بدھ مت سے قریب تھا۔ اس کو تمام مذہبوں میں سچائی کی تلاش رہتی تھی۔ عہد وسطیٰ کے مراٹھی بھکتی سنتوں سے فیض پاکر راناڈے نے ایک خدائے رحیم کے نظریہ کو قائم کرنا چاہا۔

نوٹ

آریہ سماج

آریہ سماج انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کی سب سے گہری اصلاحی تحریک تھی۔ یہ مغربی ہندوستان اور پنجاب میں شروع ہوئی اور بتدریج ہندی زبان کے بڑے حصے میں پھیل ہوگئی۔ تحریک کی بنیاد دیانند سرسوتی (83-1824) نے ڈالی تھی۔ 1875 میں انھوں نے ستیارتھ پرکاش (سچائی کی روشنی) لکھی اور اسی سال انھوں نے بمبئی آریہ سماج کی بنیاد ڈالی۔ 1877 میں لاہور آریہ سماج کی بنیاد پڑی۔ بعد میں لاہور آریہ تحریک کا مرکز بن گیا۔ دیانند رسوم زدہ ہندو مذہب کے خلاف تھے اور اس بات کے حامی تھے کہ یہ ویدوں کی تعلیمات پر مبنی ہو۔ صرف بید اور ان کے صحیح تشریحی ستون ہی سچے ہیں۔ انھوں نے پرانوں، تعدد خدا یا شرک، بت پرستی اور پروہتوں کی برتری پر سخت تنقید کی انھوں نے عوام تک بات پہنچانے کے لیے ہندی زبان کو اپنایا۔ انھوں نے بچہ شادی کی بھی مخالفت کی۔ وہ ذاتوں کے تعدد (Multiplicity) کے کٹر مخالف تھے اور سمجھتے تھے کہ نچلے طبقات کے ذریعہ عیسائی یا اسلام مذہب کو قبول کرنے میں یہی چیز سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ 1883 میں دیانند کی موت کے بعد آریہ سماج بکھر گیا۔ آریہ سماج اور اس کی سرگرمیوں کو متحد رکھنے کے لیے سب سے اہم کوشش 1886 میں لاہور میں دیانند اینگلو ویدک ٹرسٹ اینڈ مینیجمنٹ سوسائٹی کا قیام تھا۔ اسی سال اس سوسائٹی نے ایک اسکول کھولا اور لالہ ہنسراج کو اس کا پرنسپل بنایا۔ البتہ کچھ لیڈر اینگلو ویدک ایجوکیشن کے خلاف تھے۔ یہ لوگ تھے منشی رام (سوامی شردھانند)، گبرودت او رلیکھ رام وغیرہ۔ ان کی دلیل یہ تھی کے آریہ سماج کی تعلیمی کوشش سنسکرت آریائی نظریات اور ویدک کتابوں پر ہی مرکوز ہونی چاہئیں اور اس میں انگریزی تعلیم کے لیے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ اس جنگجو گروہ کا یہ خیال تھا کہ دیانند کے الفاظ مقدس ہیں اور ستیارتھ پرکاش میں ان کے پیغام پر کوئی سوال نہیں اٹھ سکتا۔ البتہ لالہ ہنس راج اور لالہ لاجپت رائے کی قیادت والا اعتدال پسندوں کا گروہ یہ کہتا تھا کہ دیانند ایک مصلح ہیں کوئی رشی یا سادھو نہیں ہیں۔ ڈی اے وی مینجمینٹ سوسائٹی کے کنٹرول پر بھی اختلاف پیدا ہوگیا۔ ان تمام اختلافات کا آخری نتیجہ یہی ہوا کہ 1893 میں آریہ سماج کی رسمی تقسیم ہوگئی اور منشی رام نے اپنے حامیوں کے ساتھ الگ ہوکر گروکل کی طرز پر تعلیم شروع کردی۔ اسی لیے 1893 کے بعد آریہ سماج کے دو گروپ ڈی اے وی گروپ اور گروکل گروپ بن گئے۔

منشی رام اور لیکھ رام نے خود کو ویدوں کی تعلیم مقبول عام کرنے کے لیے وقف کردیا اور جالندھر میں ایک آریہ کینا پاٹھ شالا قائم کی تاکہ تعلیم کو مشنری اثرات سے محفوظ رکھ سکیں۔ 1902 میں ہری دوار میں کانگڑی مقام پر ایک گروکل کی بنیاد ڈالی۔ یہ ادارہ ہندوستان میں آریہ سماج کے دونوں گروہ (wing) یعنی ڈی اے وی گروہ اور گروکل گروہ کے درمیان تعلیم کے موضوع پر اختلافات تھے لیکن یہ دونوں اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی مسائل پر متحد تھے۔ آریہ سماج ہندوؤں کے عیسائی اور مسلمان ہو جانے کے خلاف تھا اور مذہب تبدیل کرنے والوں کو پھر سے مذہب تبدیل کرانے کے حامی تھے۔ اسی عمل کو شدھی کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ دیوناگری رسم الخط میں ہندی کے استعمال کے بھی کٹر حامی تھے۔ 1890 کی دہائی میں آریہ سماج نے گاؤکشی کا مسئلہ اٹھایا اور گایوں کے تحفظ کے لیے گؤر کشنی سبھائیں (گایوں کے تحفظ کی سوسائٹیاں) بنائیں۔ آریہ سماج نے چھوا چھوت کے خلاف ایک لمبی تحریک چلائی اور ذات کی بنیاد پر امتیازات کو کم کرنے کی کوشش کی۔

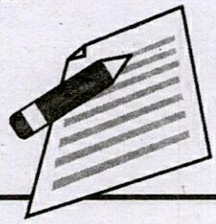

نوٹ

مسلمانوں میں اصلاحی تحریکیں(Reform Movrments among Muslims)

ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور ممتاز مسلمان طبقے میں اقتدار کھو دینے کا احساس تھا۔ اس کی وجوہات یہ تھیں (i) اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں پہنچ گیا اور (ii) نئی بیورو کریسی میں نوکری اور ترقی کے لیے فارسی کی جگہ انگریزی زبان نے لے لی۔ ابتدائی انیسویں صدی کے بنگال میں کسانوں کے اندر فرائض (Farazis) تحریک شروع ہوئی۔ یہ تحریک مسلمانوں کو خالص اسلام کی طرف دعوت دیتی تھی۔ یہ لوگ شاہ ولی اللہ دہلوی (63-1703) کی تعلیمات کے پیروکار تھے۔ شاہ ولی اللہ نے ایک ہی صدی پہلے خالص اسلام پر عمل کرنے کی بات کہی تھی اور انھوں نے مسلمانوں میں غیر اسلامی رسوم کی رخنہ اندازی پر اعتراض کیا تھا۔ فرائضی تحریک کے بانی شریعت اللہ (1836-1781) نے مذہب کو خالص رکھنے کی بات کہی اور مسلمانوں کو فرائض کی ادائیگی کی طرف بلایا۔ فرائض کا مطلب ہے اسلام کے لازمی ارکان یعنی کلمہ (عقیدہ کا اعلان)، صلاۃ (نماز)، صوم (روزہ)، زکوٰۃ (غریبوں کو خیرات) اور حج۔ انھوں نے توحید (یعنی ایک خدا کو ماننا) کی تبلیغ کی۔ بنگال کے مسلمانوں میں طریقۂ محمدیہ نامی ایک تحریک ٹیٹو میر کی زیر قیادت شروع ہوئی۔ یہ تحریک سید احمد بریلوی کے زیر اثر شروع ہوئی تھی۔ اس تحریک کا مقصد بھی ماضی کے تقدس کو بحال کرنا تھا۔ ایک اور تحریک جس کا تعلق علماء کے اثرات میں زوال پذیری سے تھا وہ صوبائے متحدہ میں دیوبند کے مقام پر اٹھی۔

دہلی اسکول آف اسلامک تھاٹ کا ماخذ دہلی کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) ہے۔ یہ کالج متوازی طور پر اسلامی اور انگلش دونوں قسم کی تعلیم دینے کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ 1830 میں شروع ہونے والے اس کالج نے مسلم سماج میں ایک نیا شعور پروان چڑھایا۔ لیکن 1857 کی بغاوت اور اس کے بعد انگریزی افواج کے ذریعے باغیوں کی سرکوبی سے دانشور طبقے کا سارا جوش و خروش دب گیا۔ پھر بھی مسلمانوں کے ایک طبقے سے جدیدکاری (Modernization) کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا رہا۔

سید احمد خاں (98-1817) نے مسلمانوں کو ایک نئی قیادت عطا کی۔ انھوں نے بجا طور پر یہ بات محسوس کر لی تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت میں سدھار کرنے کے لیے سب سے اہم طریقہ جدید تعلیم کا ہے۔ انھوں نے یوروپی سائنس اور ٹیکنالوجی کے مطالعہ پر زور دیا۔ 1866 میں انھوں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی تشکیل کی۔ وہ 70-1869 کے دوران ایک سال تک انگلینڈ میں رہے۔ وہاں سے واپسی پر انھوں نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ انگریزی سوسائٹی کی کچھ مثبت خصوصیات جیسے ڈسپلن، نظم و ضبط، اعلیٰ کارکردگی اور اعلیٰ تعلیم کو اپنے اندر پیدا کریں۔ انھوں نے واضح کیا کہ قرآن اور نیچرل سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے اور نئے حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ایک اسلامی سیاق وسباق میں انگریزی زبان مسلمانوں میں رائج ہو جائے۔ انھوں نے 1875 میں علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر مسلمانوں میں جدید اعلیٰ تعلیم کی ایک درسگاہ بنی۔ ابتدائی سطح پر طلبا ایک بہت محتاط طریقے پر تیار کردہ اسلامی ماحول میں سرکاری اسٹینڈرڈ نصاب تعلیم ہی کی تعلیم پاتے تھے۔ 1878 میں کالج کی کلاسیں بھی شروع ہو گئیں اور غیر مسلموں کا بھی داخلہ ہوا۔ 1886 میں سید احمد خاں نے محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ 1902-1882 کے دوران علی گڑھ کے مسلمان گریجویٹ طلبا (جن

کی تعداد 220 تھی) نے دنیا کے مسلمان دانشوروں میں ایک جوش پیدا کیا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مسلم سماج کو ایک قابل اور جدید قیادت بھی دی۔

اصلاحی تحریک کا اثر(Impact of Reform Movements)

انیسویں صدی کی اصلاحی تحریکات نے برطانوی شہنشاہیت کے خلاف قومی تحریک آزادی (National Liberation Movemen) کے لیے ایک مضبوط پس منظر کی تشکیل کی۔ انیسویں صدی کی سماجی زندگی (Social Life) پر کچھ خاتون مصلحین نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ پنڈتا راما بائی (مغربی حصہ میں)، بہن سبا لکشمی (مدراس میں)، اور رقیہ سخاوت حسین (بنگال میں) کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ اصلاحی تحریکات نے ایک ایسے جدید مڈل کلاس کی نشوونما میں بھی اہم رول ادا کیا جو اپنے حقوق کے بارے میں باشعور تھا۔ کچھ ہندوستانی مصلحین نے ایسے قوانین پاس کرنے کی برطانوی کوششوں پر احتجاج کیا جن کو وہ مذہب اور معاشرہ میں دخل اندازی سمجھتے تھے۔ یہ بات اس قضیہ سے واضح ہے جس میں شادی کی رضا مندی کے اظہار کے لیے عمر 10 سے بڑھا کر 12 سال کردی گئی تھی۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان میں کچھ تحریکات نے ایسے مسائل اٹھا کر جو دوسرے فرقوں کے مفادات سے ٹکراتے تھے یا جو احیا پسندانہ(Revivatist) نوعیت کے تھے کی لوگوں کو فرقہ وارانہ خطوط پر اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔

متن پر مبنی سوالات 18.2

1۔ رام موہن رائے نے جن اہم مسائل کو اٹھایا ان میں سے کچھ کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

2۔ دیبندر ناتھ ٹیگور اور کیشب چندر سین کے درمیان جھگڑے کی نوعیت کا تجزیہ کیجیے۔

3۔ آریہ سماج کی تقسیم کب ہوئی؟ دونوں گروپوں کے رہنما کون تھے؟

4۔ فرائضی تحریک کس بات پر زور دیتی تھی؟

5۔ مسلم معاشرہ کو ماڈرن بنانے میں سید احمد خاں کے کردار کا جائزہ لیجیے۔

نوٹ

18.3 ہندوستان میں مغربی تعلیم کا عروج (Rise of Western Education in India)

برطانوی حکمراں ہندوستان میں اپنی تہذیب اور نظریات کی اشاعت و ترویج میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اس سے اس ملک میں ان کی جڑیں مضبوط ہوتیں۔ اس کے علاوہ، اس سے ہندوستانیوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہوجاتا جو برطانوی سلطنت کے قابلِ اعتماد ایجنٹ کے طور پر کاموں کو انجام دیتے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے سب سے اہم ذریعہ انگریزی تعلیم تھی۔ انگریزی تعلیم کو مقبول بنانے اور اس کے مطابق اس کے بنیادی ڈھانچے میں تبدیلیاں لانے کے لیے انیسویں اور بیسویں صدی میں کئی کوششیں کی گئیں۔ شروع میں تو مشرقیت پسند حکام اور محقق جیسے وارن ہیسٹنگز، کارنوالس، ولیم جونس اور جوناتھن ڈنکن وغیرہ نے ہندوستانی اعلیٰ تعلیم کو بڑی اہمیت دی لیکن رفتہ رفتہ ان کے خیالات نے اپنی اساس کھودی اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ برطانوی سلطنت کو ہندوستان میں اپنا ایک تہذیبی مشن پورا کرنا ہے اور اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مغربی سائنس اور تہذیب کو مقبول بنایا جائے۔

انگریزی تعلیم کی ابتدا اور چارٹر ایکٹ 1813 (Introduction of English Education & Charter Act of 1813)

اٹھارہویں صدی میں یوروپی اور اینگلو انڈین بچوں کی تعلیم کے لیے کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں کچھ خیراتی اسکولوں کے ذریعے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو شروع کیا گیا۔ اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی مختلف طریقوں سے ان اسکولوں کی مدد کرتی تھی لیکن ان اسکولوں نے ہندوستانی آبادی کو انگریزی پڑھانے کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ اس کام کی شروعات آخر کار 1813 میں ایک چارٹر ایکٹ کے ذریعے ہوئی۔ مشنریوں کو اس بات میں ہمیشہ دلچسپی رہی کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے وسیلہ سے عیسائیت کی تعلیمات اور مغربی ادبیات کو بڑھاوا ملے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس ایکٹ کی رو سے کمپنی کو ہر سال ایک لاکھ روپے درج ذیل مقاصد کے لیے خرچ کرنے ہوتے تھے: (i) ہندوستان کی تعلیم یافتہ طبقات کی حوصلہ افزائی کرنا، ادبیات کی نظرثانی اور اصلاح کرنا اور (ii) ہندوستانیوں میں سائنس کو فروغ دینا۔ بہرحال اس دفعہ (Clause) کی تشریح مختلف لوگوں نے مختلف انداز سے کی۔

ذریعہ تعلیم پر مباحثہ اور میکالے کا کردار (Debate on Medium of Education and Role of Macaulay)

جلدی ہی ہندوستان میں ذریعہ تعلیم کے انتخاب کے بارے میں ایک بحث شروع ہوگئی۔ اسی بات کے فیصلے کے مطابق کمپنی کی سرکار کو روپے خرچ کرنے تھے۔ یہ مشرقی اور انگریزی تعلیم کے حامیوں کے درمیان ایک جذباتی مباحثہ تھا۔ جب 1828 میں بینٹنک (Bentinck) نے ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری

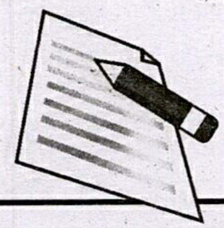

سنبھالی تو انگریزی ذریعہ تعلیم کے حق میں حالات نے پلٹا کھایا۔ اس نے 1834 میں ٹی بی میکالے کا اپنی کونسل میں لا ممبر کی حیثیت سے تقرر کیا۔ میکالے انگریزی تعلیم کا زبردست حامی تھا۔ اس کو تعلیمات عامہ (Public Instruction) کی جنرل کمیٹی کا صدر بنادیا گیا۔ لارڈ میکالے کی زیر قیادت انگریزیت پسندوں یا انگریزی اساس والی تعلیم کے حامیوں کی جیت ہوئی۔ میکالے نے 2 فروری 1935 کو ہندوستانی تعلیم پر اپنا مسودہ پیش کیا جو انگریزی ذریعۂ تعلیم کی شروعات کے لیے ایک رہنما اصول بن گیا۔حکومت نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اس کا مقصد انگریزی زبان کے ذریعے یوروپی علوم اور وادبیات کو فروغ دینا ہوگا۔ مستقبل میں کمپنی کے ذریعے تعلیم پر خرچ ہونے والے تمام فنڈ فقط اسی مقصد کے لیے ہوں گے۔ اس تبدیلی کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہندوستان میں انگریزی تعلیم مغربی علوم کی درآمد کا ایک اہم ذریعہ ہو جائے گی۔

میکالے کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی حمایت سے ایسے ہندوستانی لوگوں کا ایک طبقہ پیدا ہو جائے گا جن کا خون اور رنگ ہندوستانی مگر ذوق انگریزی ہوگا۔ یہ بات مان لی گئی تھی کہ یہ طبقہ دراصل ہندوستان میں برطانوی راج کے مضبوط ستونوں (Pillars) کا کام کرے گا۔ توقع یہ تھی کہ یہ ہندوستانی جن کی تربیت انگریزی تعلیم سے ہوئی ہوگی مغربی سیرت اور مغربی اخلاقیات سے مستفید ہوں گے۔ جب یہ لوگ نوآبادیاتی حکومت کے ڈھانچے میں شامل ہوں گے تو ان سے برطانیہ کے ہندوستانی مقبوضات کو تقویت حاصل ہوگی۔ یہ ڈاؤن ورڈ فلٹریشن (Downword filteration) کا نظریہ تھا۔ اس قسم کی تعلیم عوام الناس کے لیے نہیں تھی بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے تھی جو پڑھے لکھے اور خوشحال تھے۔ اس نظریہ کے مطابق یہ مان لیا گیا کہ انگریزی تعلیم کی اخلاقیات ان ہی ہندوستانیوں کے ذریعے رفتہ رفتہ عوام الناس تک پہنچے گی جب یہ تربیت یافتہ ہندوستانی، استادوں کے طور پر کام کریں گے تو اس وقت یہ ایک ایسا ذریعہ ہوں گے جس سے ابتدائی تعلیم علاقائی زبانوں میں نیچے کے طبقات میں پہنچے گی۔ میکالے کو اس بات کا یقین تھا کہ اس طرح محدود فنڈ پر باوجود عوام الناس کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوشش ناممکن ہوگی۔ یہی بہتر ہے کہ چند انگریز تعلیم یافتہ ہندوستانی ایک ''طبقۂ مترجمین'' (Class of interpreters) کے طور پر کریں۔ یہ طبقہ دیسی زبانوں اور ادب کو مالامال کرکے مغربی سائنس اور ادب کو عوام الناس تک پہنچا سکتا ہے۔ اس سے برطانوی حکمرانوں کو یہ فائدہ ہوگا کہ وہ کم سے کم عوامی خرچ پر ہندوستانی عوام تک مغربی اخلاق پہنچا سکتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق تعلیم ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے ہندوستانی لوگ کمپنی کی بیوروکریسی میں ماتحت عہدے (Subordinate positions) اور کلرک وغیرہ جیسی نوکریاں حاصل کرسکتے ہیں۔

ووڈ کا مراسلہ (Wood's Dispatch)

انیسویں صدی میں تعلیم اور خاص طور پر انگریزی تعلیم کی نشوونما (Development) کا سب سے اہم حصہ وہ رہنما اصول ہیں جو 1854 میں معتمد اعلیٰ چارلس ووڈ نے تیار کیے تھے اور جنھیں ووڈ کا مراسلہ (Wood's Dispatch)

کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں تعلیمی حکمت عملی پر اس جامع اسکیم کا بول بالا رہا اور یہاں کے تعلیمی نقشے پر اسی اسکیم کی چھاپ رقم ہوئی۔

وُوڈ کے اس مراسلے/ ڈسپیچ کی اہم خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:

- اس کے مطابق ہندوستان میں تعلیم کا مقصد یوروپی علوم کا پھیلاؤ ہے۔
- اعلیٰ تعلیم کے لیے انگریزی ایک ترجیحی ذریعۂ تعلیم ہوگی جبکہ دیسی زبانیں ایسا ذریعہ تعلیم ہوں گی جن کے ذریعے یوروپی علوم عوالناس تک پہنچ سکیں گے۔
- اس مراسلے میں اسکولوں کا ایک نظام مدارج (Hierarchy of schools) تجویز کیا گیا ہے یعنی دیہی سطح پر ورنا کیولر پرائمری اسکول، اس کے بعد اینگلو ورنا کیولر ہائی اسکول اور پھر ضلعی سطح پر ایک الحاق شدہ کالج۔
- اس ڈسپیچ میں تعلیم کے میدان میں پرائیوٹ کوششوں کی حوصلہ افزائی کے لیے پہلی بار گرانٹ-ان-ایڈ (Grant-in-aid) کی سفارش کی گئی۔
- اس ڈسپیچ میں برطانوی راج کے تحت پانچ میں سے ہر ایک صوبہ میں ایک ڈائریکٹر کے تحت محکمۂ تعلیمات عامہ (Department of Public Instruction) قائم کرنے کی تجویز کی گئی۔ یہ محکمے اپنے اپنے صوبوں میں تعلیمی پیشرفت پر نظر ثانی کرتے رہیں گے۔ محکمہ تعلیمات عامہ 1855 میں قائم کیا گیا اور اس نے کمیٹی برائے تعلیمات عامہ (Committee for Public Instruction) اور کونسل آف ایجوکیشن (Council of Education) کی جگہ لی۔
- ڈسپیچ نے لندن یونیورسٹی کے نمونہ پر کلکتہ، بمبئی، اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کرنے کی تجویز پیش کی جو امتحانات منعقد کرائیں گی اور ڈگریاں عطا کریں گی۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی یونیورسٹیاں 1857 میں قائم ہوئیں۔
- رسمی تعلیم (Formal Education) کے علاوہ، ڈسپیچ نے ووکیشنل (Vocational) تعلیم کی اہمیت بھی بتائی اور ٹیکنیکل اسکول اور کالج قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔
- اس نے مستقبل کے اساتذہ کے لیے ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی بھی سفارش کی۔
- اس ڈسپیچ نے خواتین کی تعلیم کی بھی حمایت کی۔ بعد میں بہت سے ماڈرن گرلس اسکول قائم کیے گئے اور انھیں حکومت کی طرف سے گرانٹ ان ایڈ بھی ملی۔

نوٹ

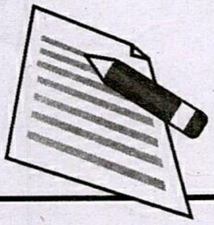

نوٹ

ہنٹر کمیشن (Hunter Commission)

وُڈ کے ڈسپیچ کے بعد تعلیم کے میدان میں ہوئی پیش رفت پر نظر ثانی کرنے کے لیے 1882 میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (W. W. Hunter) کی زیرِ قیادت ایک کمیشن قائم کی گئی۔ یہ کمیشن خاص طور پر پرائمری اور سیکنڈری تعلیم کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس کمیشن نے بہت سی سفارشات کیں۔ اس نے پرائمری تعلیم پر خاص طور سے زور دیا اور کہا کہ اس کا کنٹرول ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں کے پاس جانا چاہیے۔ ثانوی سطح (Secondary level) پر دو اسٹریم (Stream) ہونی چاہئیں۔ ایک لٹریری ایجوکیشن جس سے یونیورسٹی تعلیم جڑی ہو اور دوسری اسٹریم پریکٹیکل نوعیت کی ہو جس سے کمرشیل یا ووکیشنل میدان میں کیریر (Career) شروع کیا جا سکے۔ تعلیم کے میدان میں نجی کوششوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ اس کمیشن نے پریزیڈینسی شہر کے باہر عورتوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے ضروری سہولتوں کی فراہمی کی اہمیت پر زور دیا۔ ہنٹر کمیشن کی سفارشات کا بھرپور اثر اگلی دو دہائیوں میں ہوا۔ سیکنڈری اور کالج کی تعلیم کے میدان میں کمیشن نے غیر متوقع ترقی کا مشاہدہ کیا۔ 1882 میں پنجاب یونیورسٹی اور 1887 میں الہ آباد یونیورسٹی قائم ہوئی۔

متن پر مبنی سوالات 18.3

1۔ کس ایکٹ نے ایجوکیشن پر ہر سال ایک لاکھ روپے خرچ کرنے کی بات ایسٹ انڈیا کمپنی سے کی۔

2۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا سب سے زیادہ فعال حامی کون تھا؟

(a) جوناتھن ڈنکن

(b) ٹی بی میکالے

(c) وارن ہیسٹنگز

(d) ولیم جونس

3۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانے میں میکالے کے محرک کا مختصر جائزہ لیجیے۔

4۔ ہندوستان میں ایجوکیشن پالیسی کے لیے رہنما اصول تیار کرنے میں وڈ کے ڈسپیچ کی کیا اہمیت ہے؟

5۔ ہنٹر کمیشن کا تعلق کس تعلیم سے تھا؟

نوٹ

18.4 ہندوستان میں پریس کا ارتقا

نئے زمانے میں پریس اور صحافت (Journalism) کا ارتقائی بیداری کے عروج کے لیے ایک اہم پس منظر کی تشکیل کرتا ہے۔ چھاپہ کی ٹیکنالوجی کا مطلب یہ ہوا کہ کتابیں آسانی سے دستیاب ہونے لگیں۔ دوسرے لفظوں میں وسیع پیمانے پر چھاپہ نے تمام ہندوستان میں مواصلات (Communication) کے نئے نئے ذرائع کھول دیے۔ چھاپہ کی نئی ٹیکنالوجی سے پریس اور جرنلزم کے ارتقا میں بہت مدد ملی۔ انگریزی اخبارات اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہی چھپنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے دوران مقامی زبانوں میں بھی اخبارات کی ایک بڑی تعداد چھپنے لگی تھی۔ جیمس آگسٹس ہکی (James Augustus Hickey) نے 1780 میں دی بنگال گزٹ (The Bangal Guzette) نامی پہلا اخبار شائع کیا۔ اس کے بعد بنگال، بمبئی اور مدراس سے کئی اخبارات شائع ہوئے۔ ان میں دی کلکتہ کرانیکل (The Calculta Chronicle) (1786)، دی مدراس کوریر (The Madras Courier) (1788) اور دی بمبئی ہیرالڈ (The Bombay Herald) (1789) اہمیت رکھتے ہیں۔

انگریزی میں شروعاتی اخبارات خاص طور پر یوروپی اور ان اینگلو انڈین لوگوں کے لیے تھے جو ہندوستان میں مقیم تھے۔ بہرحال، کمپنی کے عہدیداران کو ان اخبارات میں شائع ہونے والی ان خبروں سے غرض تھی جو ان کے عمل سے متعلق ہوتی تھیں۔ اس لیے اکثر ان پر پابندیاں بھی عائد کردی جاتی تھیں۔ لارڈ ویلزلی (1804-1796) نے 1799 کے قانونی سینسرشپ کے ذریعے سخت ضابطے لاگو کردیے تھے۔ اس ایکٹ نے یہ تنبیہ کردی تھی کہ تمام موادحکومت کے سکریٹری کے ذریعے پاس ہونا ضروری ہے۔ ناشر، مدیر اور مالک کے نام صاف طور پر ہر شمارہ میں شائع ہونے چاہئیں۔ لارڈ ہیسٹنگز (23-1813) نے 1818 میں ان میں سے کچھ قوانین میں نرمی کردی اور پریس کی چھپنے سے پہلے سینسرشپ کو ختم کر دیا۔ لیکن یہ نرمیاں عارضی ثابت ہوئیں کیونکہ جان ایڈمس (John Adams) نے جو 1823 میں ایکٹنگ گورنر جنرل بن گیا تھا اسی سال کچھ سخت قسم کے ضابطے لاگو کر دیے۔ اخبار شروع کرنے یا استعمال کرنے کے لیے لائسنس لازمی کر دیا۔ گورنر جنرل کو لائسنس مسترد کرنے (Cancel) کا حق حاصل تھا۔

کارگزار گورنر جنرل چارلس میٹکالف (36-1835) آزاد پریس کا حامی تھا۔ اس نے 1823 کے ضابطے ختم کر دیے۔ میٹکاف کا پریس ایکٹ صرف یہ چاہتا تھا کہ ناشرین اخبار شائع ہونے کا مکان اور مقام کا ایک اعلان نامہ دے دیں۔ اس حریت پسندانہ اثر سے پریس کے ارتقا پر ایک مثبت اثر پڑا اور بہت سے اخبارات شائع ہونا شروع ہوگئے۔ یہاں تک کہ سخت ضابطے 1857 میں انقلاب کی وجہ سے پھر لاگو ہوگئے۔ لارڈ لٹن (Lord Lytton) کے ورنا کیولر پریس ایکٹ (1878) نے ہندوستانی زبانوں کے اخبارات پر بہت ہی سخت قسم کی پابندیاں عائد کردیں۔ یہ قانون بہت زیادہ متعصّبانہ اور نسل پرستانہ تھا۔ اس قانون سے ملک کی مقامی زبانوں

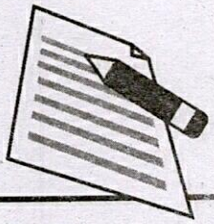

نوٹ

میں حکومت کے خلاف اٹھائی جانے والی کوئی بھی آواز ختم کر دی گئی۔ انگریزی اخبارات پر اس قسم کی پابندیاں لاگو نہیں تھیں۔ یہ چیز لارڈ لٹن کے سخت گیر اور قدامت پسندانہ رویہ کی مظہر تھی۔ اس قانون نے بالواسطہ طور پر حکومت کے ہاتھ میں یہ اختیار دے دیا کہ وہ ہندوستانی اہل رائے کی تمام باغیانہ تحریروں کو دبا دے۔ ضلع مجسٹریٹ کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس ایکٹ کو 1882 میں لارڈ رپن (Lord Ripon) نے منسوخ کر دیا۔ لارڈ رپن اپنے حریت پسندانہ خیالات اور کاموں کی وجہ سے ہندوستانیوں میں بہت مقبول وائسرائے تھا۔

متن پر مبنی سوالات 18.4

1۔ ہندوستان کا پہلا اخبار کون سا تھا اور یہ کب شائع ہوا؟

2۔ اخبارات کے ارتقا میں چھاپہ کی ٹیکنالوجی کے بڑے پیمانے پر استعمال کی کیا اہمیت ہے؟

3۔ 1799 کے سینسرشپ آف پریس ایکٹ کے ذریعے لگی پابندیاں کیا تھیں؟

4۔ چارلس میٹکاف کس طرح کچھ مثبت تبدیلیاں لا پائے؟

5۔ 1878 کا ورناکیولر پریس ایکٹ کیا تھا؟

آپ نے کیا سیکھا

آپ نے یہ سیکھا کہ برطانوی حکمراں ہندوستان کو بالکل مختلف طریقوں پر دیکھتے تھے اسی لیے ان کی بنائی ہوئی پالیسیاں بھی ان کے نظریات اور رجحانات سے متاثر ہوئی تھیں۔ انیسویں صدی کے دوران بہت سی اصلاحی تحریکیں تمام ہندوستان میں اٹھیں۔ ان تحریکوں نے عورتوں کی حالت، ذات پات کی سخت گیریوں، لوگوں کے مذہبی عقیدوں میں آجانے والی برائیوں، مختلف سماجوں کی جدیدکاری (Modernization) اور تعلیمی پسماندگی

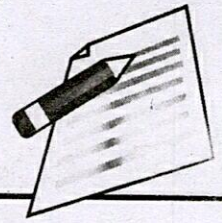

نوٹ

سے متعلقہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی۔ برطانوی پالیسی سازوں نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو مقبول بنانے کی کوشش کی کیونکہ انگریزی تعلیم یوروپی کلچر اور یوروپی اخلاقیات کی درآمد کا بہترین ذریعہ بن سکتی تھی۔ اس سے دراصل اس ملک پر کنٹرول رکھنے میں بڑی تقویت ملی۔ اس عہد میں انگریزی اور ہندوستانی اخبارات خوب چمکے البتہ پریس کی آزادی کو کم کرنے کے لیے مختلف اوقات میں پابندیاں بھی عائد کی گئیں۔ اس جدید زمانے میں جو سماجی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان سے آخر کار برطانوی راج کے خلاف قومی تحریک آزادی کے لیے ملک کو تیار کرنے میں مدد ملی۔

فرہنگ

مشرقیت پسند (orientalists)	:	وہ برطانوی حکام جنھوں نے ہندوستان کے شاندار ماضی کو مقبول بنایا۔
وھگ کا سیاسی فلسفہ (Whig political philosophy)	:	انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ حکومت کے الگ الگ ادارے ہونے چاہئیں۔
بنگال کی نشاۃ ثانیہ (Bengal Renaissance)	:	بنگال کے شاندار ماضی کی تاریخی بازیافت اور اس کی زبان وادبیات کی جدیدکاری (Modernization)۔
ستی کی رسم (Custom of Sati)	:	شوہر کی چتا میں اس کی بیوہ کی خودسوزی۔
تعدد ازواج (Polygamy)	:	ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا۔
برھمو عہد نامہ (Brahmo Covenant)	:	اسے ربیندر ناتھ ٹیگور نے لکھا تھا۔ یہ سماج کے عقائد کا بیان ہے اور اس میں اس کے ارکان کے فرائض اور ذمہ داریوں کا ذکر ہے۔
روحانی ہندوازم (Spiritual Hinduism)	:	سوامی وویکانند نے ہندوازم کی روحانیت کی تبلیغ کی۔
بت پرستی (Idolatry)	:	بتوں کی پرستش۔
توحید (Montheism)	:	ایک خدا میں یقین رکھنا۔
انگلو ویدک تعلیم (Anglo Vedic Education)	:	آریوں کے نظریات اور ویدوں کے ستون کو انگریزی تعلیم کے ساتھ پڑھانا۔

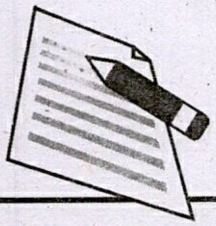

نوٹ

شدھی (Shuddhi) : یہ تحریک آریہ سماج نے شروع کی تھی جو ہندوؤں کے عیسائی یا مسلمان بن جانے کے خلاف تھی اور چاہتی تھی کہ جن لوگوں نے مذہب تبدیل کیا ہے وہ پھر سے ہندو بن جائے۔

گئورکشنی سبھا (Gaurakshini Sabha) : گایوں کے تحفظ کے لیے سبھا۔

فرائض (Faraiz) : خالص اسلام کا تحفظ اور غیر اسلامی رسوم کی مخالفت۔ اسلامی عقائد کلمہ، نماز، روزہ، زکات اور حج کا اقرار اور ان پر عمل۔

نیچرل سائنس (Natural Science) : نیچر یا قدرت کی سمجھنے کی کوشش کرنا۔

چارٹر ایکٹ (Charter Act) : وہ قانونی دستاویز جو انگلینڈ کی ملکہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کی تھی، جس کی رو سے کمپنی کو بلا شرکت غیر تجارت کی مراعات حاصل تھیں، جس میں دیگر شرائط اور حوالوں کا ذکر تھا اور جس کی وقتاً فوقتاً تجدید ہوتی تھی۔

ورنا کیولر پریس (Vrernacular Press) : چھاپہ خانہ جس میں مقامی ہندوستانی زبانوں میں اخبارات چھپتے تھے۔

اختتامی سوالات

1۔ ہندوستان میں برطانوی پالیسیوں کو طے کرنے میں نظریات کس طرح اہم تھے؟

2۔ ہندوستان کے ماضی کو مقبول بنانے میں مشرقیت پسندوں کی کیا دین (Contribution) تھی؟

3۔ وہ اہم اور خاص معاشرتی برائیاں کون سی تھیں جنھوں نے انیسویں صدی میں ہندو معاشرہ (Hindu Society) پر بہت اثر ڈالے؟

4۔ اس عہد کی اصلاحی تحریکوں میں عورتوں سے متعلق مسائل کس طرح اہم تھے؟

5۔ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کیبارے میں وویکانند کی کیا رائے تھی؟

6۔ وہ کون سے اہم اور تھے جنھیں آریہ سماج نے اٹھایا؟

نوٹ

7۔ انیسویں صدی کے دوران مسلم سماج میں پیدا ہونے والی اہم اصلاحی تحریکات کون سی تھیں؟ انھوں نے کون سے مسائل اٹھائے؟

8۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے پھیلانے میں میکالے کی سفارشات کا جائزہ لیجیے۔

9۔ ڈاؤن ورڈ فلٹریشن نظریہ (Downward Filteration Theory) کیا تھی؟

10۔ 1878 کے ورنا کیولر پریس ایکٹ میں کیا برائی تھی؟

متن پرمبنی سوالوں کے جواب

18.1

1۔ کلکتہ مدرسہ (1781)، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (1784)، سنسکرت کالج آف بنارس (1794)

2۔ ایشیاٹک سوسائٹی اہم قدیم سنسکرت کتابوں کے ترجمے کا کام شروع کیا۔

3۔ لارڈ ویلزلی

4۔ انگلینڈ

5۔ 1813 کا چارٹر ایکٹ

18.2

1۔ جدید تعلیم کا فقدان، کثرت ازدواج اور ستی کی رسم جیسے مسائل۔ دیکھیے 18.2 پیرا3۔

2۔ دیبندر ناتھ ٹیگور کے مقابلے کیشپ چندرسین سماجی طور پر اپنے خیالات میں زیادہ شدت پسند تھے۔

3۔ 1893 ڈی اے وی سیکشن : لالہ ہنس راج، لالہ لاجپت رائے؛ گروکل سیکشن : منشی رام (سوامی شردھانند)، لیکھ رام، گرودت

4۔ خالص مذہب اور فرائض یعنی اسلام کے لازمی ارکان کی ادائیگی۔

5۔ انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم پر بہت زور دیا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کھولا۔ سیکشن 18.2، پیرا14

نوٹ

18.3

1- 1813 کا چارٹر ایکٹ

2- ٹی بی میکالے

3- اس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے پھیلاؤ سے ایسے ہندوستانیوں کا ایک طبقہ وجود میں آئے گا جو برطانوی حکومت کا حامی ہوگا۔ دیکھیے 18.3، پیرا4

4- یہ ڈسپیچ ایک جامع اسکیم بھی تھی جو یوروپی ماڈل پر تیار کی گئی تھی۔ ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کوئی پچاس سال تک اسی کے مطابق چلتی رہی۔ دیکھیے 18.3، پیرا5۔

5- اس کا تعلق وڈ کے ڈسپیچ کے بعد تعلیم میں ہونے والی پیشرفت سے تھا اور یہ زیادہ تر پرائمری اور سیکنڈری تعلیم تک محدود تھا۔ دیکھیے سیکشن 18.3، پیرا6۔

18.4

1- بنگال گزٹ 1780

2- چھاپ کی ٹیکنالوجی کے بڑے پیمانے پر استعمال سے اخبارات کا ارتقا ہوا اور بڑی مقدار میں کتابوں کی اشاعت ہوئی۔ دیکھیے سیکشن 18.4 پیرا1

3- حکومت کا سکریٹری سارے مواد کو پاس کرتا تھا۔ ناشر، ایڈیٹر اور مالک کے نام ہر شمارے میں چھپنے ضروری تھے۔ دیکھیے سیکشن 18.4، پیرا2

4- اس نے 1823 میں پریس پر لگے ضابطوں کو ہٹا دیا۔ اب ناشرین کو مطبع کے مکان اور مقام کے بارے میں ایک اعلان نامہ جاری کرنا پڑتا تھا۔ دیکھیے سیکشن 18.4، پیرا3۔

5- 1878 کے ورنا کیولر ایکٹ نے ہندوستانی زبانوں میں چھپے اخبارات پر سخت پابندیاں عائد کردیں۔

اختتامی سوالات کے متعلق اشارے

1- 18.1 انتظامی اور معاشی پالیسیوں پر نظریات کے اثر کے تحت

2- 18.2، پیرا2، 18.2.1 اور 18.2.2

3. 18.2.2 اور 18.2.3

4. 18.2.5 آریہ سماج کے تحت

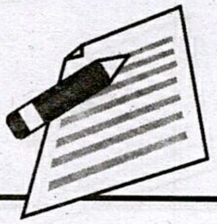

نوٹ

5. 18.2.3 راما کرشنا مشن کے تحت

6. 18.2.7

7. 18.3 اور 18.1.1

8. 18.3.2، پیرا 1

9. 18.3.2 پیرا 2

10. 18.4 پیرا 3

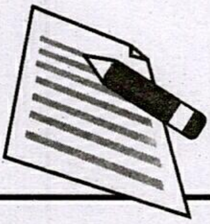

19

کمپنی راج کے خلاف عوامی مزاحمت

(Popular Resistance to Comapny Rule)

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے راج کے ابتدائی سالوں میں ہی بڑی تعداد میں شورشیں اور بغاوتیں ہونے لگی تھیں۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ 1750 سے 1850 تک تقریباً سو سال کے عرصہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کو ایک نوآبادی میں تبدیل کرنے کے لیے بہت سی تدابیر اختیار کیں۔ اس عرصہ میں برطانیہ نے جو مختلف پالیسیاں ہندوستان میں اپنائیں وہ بنیادی طور پر برطانیہ کے مفاد میں تھیں۔ زراعتی محصول کے جو بہت سے تجربات کیے گئے ان سے کسانوں کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوا۔ مقامی انتظامیہ غریب دیہی لوگوں کو فطری انصاف اور امداد پہنچانے میں ناکام رہی۔ اس سبق میں ہم یہی سیکھیں گے کہ کسانوں اور قبائلی لوگوں کو نوآبادیاتی انتظامیہ کے تحت کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے بغاوت کا راستہ کیوں اختیار کیا۔ اہم اور مقبول عوامی شورشوں کے مختصر ذکر کے ساتھ ساتھ ہم ان شورشوں کی نوعیت اور ان کی اہمیت کا بھی تجزیہ کریں گے۔ 1857 کی بغاوت کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس بغاوت سے مختلف نسلوں، مذہبوں اور مختلف سماجی طبقوں کے لوگ پہلی بار برطانوی راج کے خلاف ایک مشترکہ تحریک میں متحد ہوکر شریک ہوئے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ:

- ان عوامی بغاوتوں کے پس منظر کو سمجھ سکیں گے جو 1857 تک ہوئیں؛
- ان بغاوتوں کی نوعیت اور اہمیت کو سمجھا سکیں گے؛

- ان مسائل کی نشاندہی کرسکیں گے جو 1857 کی بغاوت کا سبب بنے؛
- 1857 کی بغاوت کی اہمیت کا تجزیہ کرسکیں گے؛

19.1 عوامی بغاوت کے لیے ذمہ دار حالات
(Circumstances Leading to Popular Revolt)

ہم نے پچھلے اسباق میں پڑھا کہ ہندوستان کے اندر برطانوی راج میں لوگوں کی زندگی میں بہت سی معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انقلاب کی وجہ سے انگلینڈ کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ وہ خام مال اور منڈیوں کو دوسرے ملکوں میں تلاش کرے (صنعتی انقلاب کے بارے میں ہم آئندہ پڑھیں گے)۔ ہندوستان میں نوآبادیاتی حکمرانوں کی پالیسی مرتب کرنے میں خام مال اور منڈیوں کی ضرورت ہی رہنما اصول بنی۔ برطانوی آقاؤں کے مفادات کے لیے ہندوستانی معیشت کا استعمال کیا گیا۔ اس زمانے میں ہندوستانی معیشت میں جو اہم تبدیلیاں ہوئیں ہم ان کی یاد ایک بار پھر تازہ کرتے ہیں:

- جائیداد کی ملکیت کے نئے اصول طے کیے گئے اور زمین کو قابل فروخت مال بنا دیا گیا۔
- زمین کی نجی ملکیت کو تسلیم کر لیا گیا اور زمین کے کسان یا کاشتکار (Cultivator) اور مالک کے درمیان بچولیوں کی بڑی تعداد وجود میں آگئی۔
- برطانوی سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے غذائی فصلوں کے بجائے تجارتی فصلیں اگانے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔
- تاجروں، نوکرشاہی کے افسروں اور زمین مالکوں (Landlords) کے ذریعے زراعت میں سرمایہ کاری اور سٹہ بازی کی وجہ سے غیر حاضر جاگیرداری (Absentee landlordsim) کو فروغ ہوا۔
- ٹیکسوں کے بڑھتے بوجھ کی وجہ سے کسان ساہوکاروں، تاجروں اور ٹیکس وصول کرنے والوں کے ہاتھوں پریشان رہتے۔
- ہندوستان سے انگلینڈ کی طرف دولت کی منتقلی ایک عام سی بات ہوگئی۔
- برطانوی صنعت کاروں کے مال کے لیے راستہ صاف کرنے کی غرض سے ہندوستان کے مقامی صنعتوں کو دبا دیا گیا۔
- برطانوی حکومت کی زراعتی محصول سے متعلق پالیسی کی وجہ سے زمین پر قبائلی لوگوں کے روایتی حقوق سلب ہو گئے۔

نوٹ

ان تبدیلیوں سے دیہی سوسائٹی اور خاص طور پر کھیتی باڑی کرنے والے اور قبائلی لوگ بہت متاثر ہوئے۔ کسانوں کے لیے زراعتی معیشت اور سماجی ڈھانچہ میں آنے والی ان تبدیلیوں کا مطلب یہ تھا کہ استحصال (Exploitation) زیادہ شدید اور زیادہ باقاعدہ ہو گیا۔

ہم اس بات کو بھی ذہن میں ایک بار پھر تازہ کرلیں کہ نوآبادیاتی حکمرانوں کو صرف محصول کو وقت پر اکٹھا کر لینے سے غرض تھی جس کی شرح بھی بہت اونچی تھی۔ زمیندار اور وہ لوگ جو محصول اکٹھا کرنے میں لگتے ان کو کسانوں کی ادائیگی کی صلاحیت میں ذرا دلچسپی نہ ہوتی اور وہ ٹیکسوں کو زبردستی حاصل کرنے، ٹیکسوں کی بڑھتی مانگ پوری کرنے کے لیے کسانوں کو اپنی زمین بیچنی پڑتی یا پھر وہ ساہوکاروں کے جال میں گرفتار ہو جاتے۔ مقامی حکام سے انصاف کی امید یوں نہیں تھی کہ وہ خود دولتمند لوگوں کے زیر اثر تھے۔ اس طرح، نوآبادیاتی حکومت میں اعلیٰ افسران، زمیندار اور ساہوکار تینوں کے گٹھ جوڑ نے مل کر کسانوں کا استحصال کیا۔ 1770 کا قحط دیہی آبادی پر برطانوی پالیسی کے بھیانک اثرات کا کھلا ثبوت ہے۔ معیشت کی نوآبادکاری (Colonization) کے ساتھ ساتھ برطانیہ کے مقامی انتظامیہ اور سماج میں جو تبدیلیاں کیں ان سے مقامی آبادی میں بے اطمینانی اور ناراضگی پھیلی۔ مختلف مواقع پر اس بے اطمینانی نے بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔

متن پر مبنی سوالات 19.1

1۔ انگریزوں کے ٹیکسوں کی بڑھتی مانگ کو ہندوستانی کسانوں نے کس طرح پورا کیا؟

____

2۔ نوآبادی حکومت کے تحت کون سی تین ایجنسیوں کے گٹھ جوڑ نے مل کر کسانوں کا استحصال کیا؟

____

19.2 اہم شورشیں (Major Uprisings)

برطانوی اقتدار کے خلاف ابتدائی مزاحمت کی نوعیت اور اہمیت کے تجزیہ سے قبل بہتر یہ ہوگا کہ ہم کچھ بغاوتوں سے متعارف ہو جائیں۔ 1760 کی دہائی سے 1857 کی بغاوت تک ہندوستان کے مختلف حصوں میں بہت سی شورشیں ہوئیں۔ ہم ان شورشوں پر دو زمروں میں گفتگو کریں گے؟ ایک کسانوں کی شورشیں اور دوسرے قبائل کی شورشیں۔

(i) کسانوں کی شورشیں (Peasant Uprisings)

ٹیکسوں کے بڑھتے بوجھ، زمینوں سے انخلا (Eviction) اور بنگال کے قحط نے کسانوں کے ایک بڑے طبقے کو افلاس کا شکار بنا دیا۔ جن بہت سے لوگوں کو زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا وہ سنیاسیوں اور فقیروں کی جماعتوں

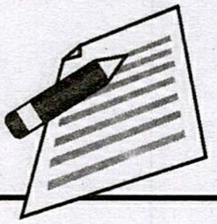

میں شریک ہوجاتے اور اگرچہ وہ مذہبی ہوتے تھے مگر امیروں اور مقامی حکومت کے ذخیروں سے اناج لوٹ لیتے تھے۔ سنیاسی اکثر ان کی دولت کو غریبوں میں بانٹ دیتے اور خود اپنی حکومت بنا لیتے تھے۔ لیکن یہ لوگ زیادہ عرصے تک اپنی جدوجہد کو برقرار نہ رکھ سکے اور اس کی وجہ برطانوی حکمرانوں کی جبری اور انسدادی تدابیر ہوتی تھیں۔ بنکم چندر چٹرجی نے تو سنیاسی بغاوت کو لافانی بنانے کے لیے آنند مٹھ نامی ایک ناول بھی لکھا ہے۔

بنگال کے دوضلعوں رنگپور اور دیناجپور کے کسان ٹیکس ٹھیکیداروں کے ظلم و استبداد سے سخت دکھی تھے۔ ایک ایسے ہی ٹیکس ٹھیکیدار دیبی سنگھ نے ٹیکس اکٹھا کرنے کے لیے کسانوں کو اذیت پہنچا کر خوف و دہشت کی حکومت قائم کر دی تھی۔ جب برطانوی اعلیٰ افسران کسانوں کی حفاظت کرنے میں ناکام ہوگئے تو کسانوں نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انھوں نے مقامی کچہریوں اور ٹھیکیداروں نیز سرکاری افسروں کے مال گوداموں پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ باغیوں نے اپنی حکومت بنالی اور کمپنی کے دلالوں کو ٹیکسوں کی ادائیگی روک دی۔ یہ 1783 کی بغاوت تھی لیکن انجام کار باغی کمپنی کے افسران کے آگے جھکنے پر مجبور ہوگئے۔

جنوبی ہندوستان میں حالت کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ بے دخل زمینداروں اور اجاڑے گئے کسانوں نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ مالابار، ساحلی آندھرا اور تامل ناڈو کے پولیگروں (جنوبی ہندوستان کے جاگیردار) نے اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ملک کے نوآبادیاتی راج کے خلاف بغاوت کی۔ مالابار کے موپلوں کی بغاوت سب سے زیادہ اہم تھی۔ مالابار کے موپلے (Mappilas) عرب مہاجروں کی اولاد تھے۔ ان کی اکثریت کرایہ دار کسانوں، بے زمین مزدوروں، معمولی تاجروں اور ماہی گیروں کی تھی۔ اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی میں جب برطانیہ نے مالابار فتح کرلیا اور وہاں زمین کے محصول کا برطانوی انتظام لاگو ہوگیا تو اس سے موپلوں کو بہت غصہ آیا۔ زمین کی قیمت کے تعین، غیرقانونی ٹیکسوں، زمین سے انخلا اور زمین کی ملکیت میں تبدیلی کے حق سے موپلوں میں بے چینی بہت بڑھ گئی اور اس طرح وہ برطانیہ اور زمیندار دونوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوگئے۔ مذہبی رہنماؤں نے موپلوں کی سپاہیانہ طاقت کو بڑھانے اور ان میں برطانیہ مخالف بیداری پیدا کرنے میں مدد کی۔ نوآبادیاتی حکمرانوں نے ان موپلا لوگوں کو بھی کچل دیا۔

شمالی ہندوستان میں مغربی یوپی اور ہریانہ کے جاٹوں نے 1824 میں بغاوت کردی۔ مغربی ہندوستان میں مہاراشٹر شورش کا مشترکہ مرکز تھا۔ گجرات میں بھی کولیوں (Kolis) نے بغاوت کی۔ کسان باغیوں کی اس فہرست میں مزید اضافہ ہوسکتا ہے۔ لیکن پہلے ہم قبائلی شورشوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

(ii) قبائلی شورشیں (Tribal Uprisings)

نوآبادیاتی حکومت کے قیام نے قبائلی لوگوں کو بھی متاثر کیا۔ آبادی کے اصل دھارے کی سرحد سے باہر رہنے والے قبائلی اپنی ہی زندگی گذارتے ہیں اور ان پر ان کی اپنی ہی روایات اور رسوم و رواج کی حکومت بھی ہوتی ہے۔ نوآبادیت کا اقتدار قبائلی علاقوں تک وسیع ہوگیا تو یہ لوگ بھی ان کے جبریہ استحصال کا شکار ہوگئے۔ قبیلوں نے اپنی

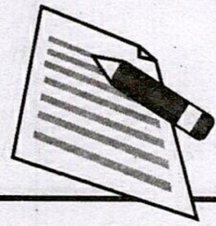

نوٹ

سرزمین میں نوآبادیاتی انتظامیہ کے داخلہ پر ناراضگی کا اظہار کیا۔ خاندیش کے بھیلوں اور سنگھ بھوم (بہار) کے کولوں (Kols) کی ہی مثال لیجیے جو اپنے قبائلی سرداروں کے تحت آزادی کی زندگی گزارتے تھے لیکن ان کے علاقوں پر برطانوی قبضے اور قبائلی سرزمین پر تاجروں، ساہوکاروں اور برطانوی حکام کے داخلے نے قبائلی سرداروں کے اقتدار اعلیٰ کو ختم کر دیا۔ اس سے قبائلی لوگوں نے برطانوی راج کے خلاف بغاوت کی اور انھوں نے قبائلی علاقوں میں تمام غیر قبائلیوں کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا۔ برطانیہ نے ان شورشوں کو بھی دبا دیا۔

اس طرح بہار، بنگال اور اڑیسہ کی سرحد پر ایک بڑے رقبے میں سنتھالا لوگ رہتے تھے اور ان کی گذراوقات بھی جنگل کے حیوانات اور وہاں کی نباتات پر ہی ہوتی تھی۔ جب برطانوی راج آیا تو ان لوگوں کو جنگل کی صفائی کے لیے استعمال کیا گیا لیکن جب انھوں نے ان زمینوں پر کھیتی باڑی شروع کی تو ان کو زبردستی وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اس طرح، زمینداروں، تاجروں اور ساہوکاروں کی ان علاقوں میں آمد سے ان سادگی پسند سنتھالوں کی مصیبتیں اور دکھ شروع ہوئے۔ زور و جبر نے سنتھالوں کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا لیکن ان کو دو بھائیوں سِدھو اور کانو کی شکل میں لیڈر مل گئے۔ عقیدہ یہ ہے کہ سدھو اور کانو کو دیوتاؤں کا آشیرواد حاصل تھا تاکہ وہ ان کے دکھوں اور مصیبتوں کا خاتمہ کر دیں۔ انھوں نے اپنی زمین پر قبضہ کرنے اور خود اپنی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ مقامی غریب لوگوں جیسے تیلی، گوالوں اور لوہاروں وغیرہ کی حمایت بھی ان باغی سنتھالوں کو حاصل تھی لیکن برطانیہ کے بے رحم جبر وظلم کے سامنے انجام کار سنتھالوں کی بغاوت بھی ناکام ہوئی۔

19.3 ابتدائی مزاحمت کی نوعیت اور اہمیت
(Nature and Signifcance of the Early Resistance)

ان عوامی بغاوتوں کے مذکورہ بالا بیان سے ان بغاوتوں کی نوعیت کے بارے میں چند باتیں واضح ہو جاتی ہیں:

- باغیوں کی کوششوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ اپنے مفادات اور اپنے دشمنوں کے بارے میں ایک واضح ذہن رکھتے تھے۔ کسانوں اور قبائل نے جو احتجاجی تحریکیں شروع کیں ان کی کچھ خصوصیات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کے اندر سیاسی اور سماجی بیداری کی ایک خاص سطح موجود تھی۔
- بہت سی صورتوں میں ممکن ہے بغاوت کے اسباب مقامی معاملات ہوں لیکن تحریک کے ارتقائی مراحل میں، اس کے مقصد میں وسعت پیدا ہوئی تھی۔ کسی تحریک کے شروع ہونے کا فوری پس منظر ہو سکتا ہے مقامی زمینداروں کا جبر، لیکن اس کا خاتمہ برطانوی راج کے خلاف احتجاج ہی رہا۔
- کسانوں کو تحریک کے لیے تیار کرنے اور ان کی وابستگی کو مستحکم کرنے میں مذہبی عقائد، نسلی رابطوں اور روایات نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ اپنے شاندار ماضی کے احساسات نے باغیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے کھوئے ماضی کو دوبارہ حاصل کر لیں۔ بنیادی طور پر ماضی کا مطلب باغیوں کے لیے یہ تھا کہ وہ استحصال اور جبر سے نجات پالیں۔

- حکمراں طبقہ کی کوشش یہ تھی کہ اس مسئلہ کو نظم وضبط (Law & Order) کا مسئلہ اور ایک مجرمانہ عمل ثابت کرے۔ دراصل یہ عمل کسانوں کے مسئلہ کو سمجھنے اور ان کا احتجاج کا حق دینے سے انکار کا مترادف تھا کسانوں اور قبیلوں کے عمل کو ان کے اصل پس منظر میں سمجھنا ضروری ہے۔
- بہرحال، پرانے نظام کی برقراری کے علاوہ باغیوں کے پاس کوئی مستقبل کا منصوبہ نہ تھا۔ ان کے محدود مقاصد اور دنیا کے بارے میں ان کے محدود نظریہ کے باوجود باغیوں نے نوآبادیاتی راج کے غیر مقبول کردار کو یقینی طور پر ظاہر کر دیا۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 19.2

1۔ سنتھالا بغاوت کس خطے میں ہوئی؟

2۔ کس ناول نے سنیاسی بغاوت کو لافانی بنا دیا؟

19.4 1857 کی بغاوت - اسباب اور راہ عمل
(Revolt of 1857 –Causes and Courses)

پچھلے سبق میں ہم نے یہ دیکھا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اور مختلف اوقات میں کس طرح عوامی بغاوتوں نے برطانوی راج کے سامنے چیلنج پیدا کر دیے۔ 1857 میں پہلی مرتبہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ برطانوی فتوحات کے خلاف کسانوں کی بے اطمینانی اور دیگر طبقات کے احتجاج نے اس مشترکہ تحریک میں سماج کے مختلف طبقات کو یکجا کر دیا۔ بہت سے مؤرخین نے 1857 کے واقعات کو قوم پرستی (Nationalism) کا ابتدائی ظہور سمجھا ہے۔

بغاوت کے اسباب

درحقیقت کچھ ایسی پریشانیاں لاحق تھیں جن کی وجہ سے برطانوی راج کے خلاف عوامی بے اطمینانی بہت جلدی پھوٹ پڑی اور جس کے نتیجے میں 1857 کی بغاوت شروع ہوگئی۔ یہ بغاوت 10 مئی کو میرٹھ میں اس وقت پھوٹ پڑی جب سپاہیوں (Sepoy) نے بغاوت کر کے آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ثانی کا تخت بحال کرنے کے لیے دہلی کی طرف کوچ شروع کر دیا۔ سپاہیوں نے جو بغاوت کی تھی وہ جلدی ہی سماج کے دوسرے طبقات تک پہنچ گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ برطانی حکومت نے زراعتی محصول میں اور انتظامی ڈھانچہ میں تبدیلیاں لاکر اپنے راج کو مقامی آبادی کی اکثریت کے لیے ناقابل قبول بنا دیا۔ لارڈ دلہوزی کی الحاق (Annexation) اور سوخت جانشینی

نوٹ

(Doctonine of lapse) کی پالیسی اختیار کرکے اور خاص طور پر اودھ اور شمالی وسطی ہندوستان کے کچھ دیگر حصوں کا الحاق کرکے اس حصے کے مقامی لوگوں میں دور دور تک بے چینی پیدا کردی۔ زمین چونکہ سب سے بڑا معاشی وسیلہ تھا اس لیے زمین کے محصول کے مختلف بندوبست جیسے استمراری بندوبست، رعیت واری بندوبست اور محل واری بندوبست وغیرہ انگریزوں نے شروع کیے تھے۔ ان کی زمین کی تقسیم اور مقامی سوسائٹی میں اقتدار کی تقسیم پر زبردست نتائج مرتب ہوئے۔ زمین کے نئے بندوبستوں کا مقصد بنیادی طور پر محصول کی آمدنی بڑھانا اور ان مقامی ایجنٹوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو برطانوی راج کی حمایت میں کھڑے ہو سکتے۔ ان تمام باتوں کے کسانوں کے اوپر بہت مثبت انگیز نتائج مرتب ہوئے اور محصول کی بڑھتی مانگ نے تعلقداروں اور دیگر سرداروں کو زمینیں بیچنے کے لیے مجبور کردیا۔ ساہوکاری اور جائیداد کی نیلامی نے کسان طبقے کی مشکلات میں مزید اضافہ کیا۔ برطانیہ کے تیار شدہ مال کے فروغ نے اور ہندوستانی صنعت کے نظرانداز کیے جانے سے ہندوستانی ریل حرفہ اور دستکاروں پر بہت برا اثر پڑا۔

معاشی دقتوں کے علاوہ سماجی سطح پر دیکھیں تو مقامی سماج میں چند قدیم سے چلی آرہی رسوم و روایات میں برطانوی مداخلت کے خلاف زبردست ردعمل تھا۔ نسلی برتری کے فلسفے کے زیر اثر، برطانوی افسران کا ایک طبقہ ہندوستان کو جدید (Modern) اور مہذب بنانے میں لگا ہوا تھا۔ برطانیہ نے جو سماجی قوانین شروع کیے تھے لوگوں کو ان سے بھی اندیشے تھے۔ مثلاً ستی کی رسم کے خاتمے اور بیواؤں کی شادی کا بھی عام لوگوں پر ایک منفی اثر مرتب ہوا تھا۔ ان تبدیلیوں کو لوگ مقامی رسم و روایات میں ایک مداخلت سمجھتے تھے۔ ان سب پر مستزاد لوگوں میں عیسائیت پھیلنے کا بھی بڑا خوف تھا۔ ان سب چیزوں نے لوگوں کو برطانوی راج سے برگشتہ کردیا تھا۔

سپاہیوں میں پائی جانے والی بے چینی کے اپنے الگ اسباب تھے۔ سپاہی اپنی کم تنخواہوں اور ترقی، پینشن اور سروس کی شرائط کو لے کر نسلی امتیاز کی وجہ سے ناخوش تھے۔ جو سپاہی بنیادی طور پر کسان خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے وہ برطانیہ کے ذریعے لگائے گئے ٹیکسوں سے ناخوش تھے۔ یہ بات سچ ہے سپاہی مختلف وجوہات سے بھڑکے ہوئے تھے لیکن جس بات نے فوری طور پر ان کو بھڑکایا یا ورغلایا وہ یہ شک تھا کہ ان کو سینکڑوں سال سے چلے آرہے سماج کے تہذیبی نظام سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ 1857 کی بغاوت سے ذرا پہلے ایک افواہ یہ اڑی تھی کہ راشن کے آٹے میں ہڈیوں کی گرد ملی ہوئی ہے اور اینفیلڈ رائفلوں کی گولیوں کو خنزیر اور گائے کی چربی سے چکنا کیا جاتا ہے جبکہ ان رائفلوں کو لوڈ کرتے وقت ان کو دانتوں سے کاٹا جاتا تھا۔ اس بات کو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اپنے مذہبی عقائد پر حملہ سمجھا۔ سپاہیوں کے جذبات اس اعلان سے سمجھ میں آسکتے ہیں جو دہلی میں شائع ہوا تھا ”یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ ان دنوں تمام انگریز اپنے ان برے منصوبوں پر عمل پیرا ہیں۔ پہلے تو یہ کہ وہ تمام ہندوستانی فوج کے مذہب کو برباد کر رہے ہیں اور پھر وہ زبردستی لوگوں کو عیسائی بنا رہے ہیں۔ اس لیے ہم صرف اپنے مذہب کی خاطر لوگوں کے ساتھ شریک ہوگئے ہیں، ہم نے ایک بھی دین کو نہیں بخشا ہے اور ہم نے ان ہی شرطوں پر خاندان دہلی کو دوبارہ برقرار کردیا ہے۔

نوٹ

بغاوت کی راہ(Courses of the Revolt)

ابتدائی شورشیں مارچ 1857 میں اس وقت شروع ہوگئی تھیں جب کلکتے کے قریب بیرکپور(Barrackpore) میں ایک سپاہی منگل پانڈے نے دوسرے سپاہیوں سے برطانوی فوجی افسروں کے خلاف بغاوت کرنے کو کہا اور اس نے خود ایک برطانوی فوجی اجیٹن(Adjutant) کو مار ڈالا۔ بعد میں منگل پانڈے گرفتار ہوا اور اس کو پھانسی ہوئی۔ اس کے بعد مئی 1857 میں میرٹھ میں ہندوستانی سپاہیوں کی ایک رجیمینٹ نے برطانوی افسروں کو قتل کر دیا، جیلوں کو توڑ دیا، اپنے ساتھیوں کو آزاد کرالیا اور وظیفہ خور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر ثانی سے اپنا لیڈر بننے کی درخواست لے کر دہلی کی طرف کوچ کیا۔ برطانوی راج کے زوال کی افواہ پھیل گئی اور بغاوت جلدی ہی ہندوستان کے وسطی اور شمالی حصوں میں پھیل گئی۔ اودھ میں سپاہیوں نے یہ اعلان کر دیا کہ سپاہیوں کا راج شروع ہوگیا ہے۔

شکل19.1: بہادر شاہ ثانی ظفر
آخری مغل تاجدار، مجاهد آزادی

شکل19.2: جھانسی کی رانی
رانی لکشمی بائی، مجاهد آزادی

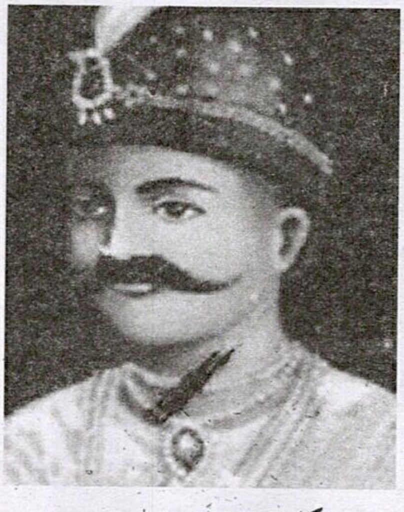

شکل19.3: تانتیہ ٹوپے

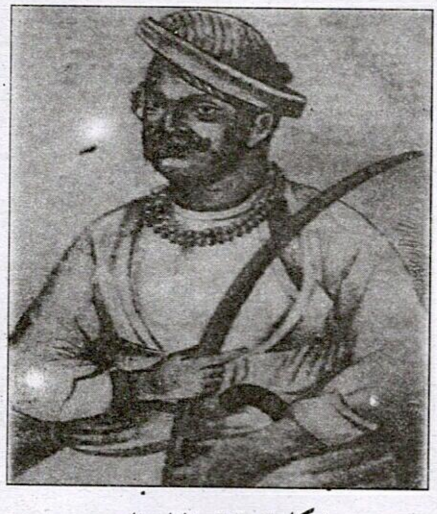

شکل19.4: نانا صاحب

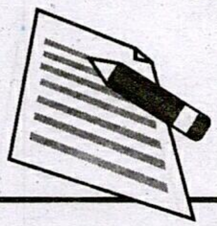

برطانوی راج سے بے اطمینانی اور نجات پاجانے کے خیال نے مقامی سرداروں، کسانوں، دستکاروں، سول ملازمین اور مذہبی لوگوں کو اس بغاوت میں شریک کر دیا۔ اودھ اندر یہ بغاوت لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، بنارس، روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ، جھانسی اور بنارس تک پھیل گئی۔ ان علاقوں میں شہری آبادیوں میں بغاوت کو بہت زبردست حمایت حاصل ہوئی۔ رانی لکشمی بائی، تانتیہ ٹوپے، بیگم حضرت محل، نانا صاحب اور کنور سنگھ آف آرہ بغاوت کے اہم لیڈروں میں سے تھے۔

متن پر مبنی سوالات 19.3

1۔ ہندوستانی سپاہیوں کی پریشانیاں کیا تھیں؟

2۔ 1857 کی بغاوت کے پانچ اہم رہنماؤں کے نام بتایئے۔

19.5 بغاوت کی نوعیت اور نتائج

1857 کی بغاوت کے بارے میں مؤرخین کی رایوں میں اختلاف ہے۔ برطانوری مورخین نے اس بغاوت کو سپاہیوں کا غدر(Mutiny) کہا ہے۔ مقامی لوگوں کے دکھوں اور تحریک میں ان کی شرکت کونظر انداز کرتے ہوئے برطانوی مورخین نے محسوس کیا کہ یہ بغاوت سپاہیوں، کچھ زمینداروں اور ان شہزادوں نے تیار کی تھی جن کی اپنی اغراض شامل تھیں۔ بہرحال 1857 کے بارے میں جدید تحقیقات کی رو سے غیر مقبول برطانوی راج کی متحدہ مخالفت کے سامنے ذاتی خودغرضی جیسے محرکات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

کچھ مورخین کا خیال ہے کہ 1857 کی بغاوت ہندوستان کی آزادی کی پہلی جنگ تھی جولوگ اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ باغی لیڈرو نے کوئی نیا نظام قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے بہادرشاہ ثانی کو دعوت دے کر قدیم مغل راج کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ ہندوستانی اقدامات اور ترجیحات تبدیلی کے اس تجربے میں بہت مرکزی نوعیت کے تھے لیکن 1857 کی بغاوت قومی(National) نہ تھی۔ غیر مطمئن لوگوں کی وفاداری تھی، شکستہ تھی اور نیت بھی ٹوٹی پھوٹی تھی، ان کی نظریں ماضی کے اس سماج اور اس پالیسی پر تھیں جواب بے جان ہو چکی تھیں۔ اس طرح یہ بغاوت کوئی انقلاب نہ تھا بلکہ صرف ایک بحالی تھی۔

بہرحال 1857 کی بغاوت کی خصوصیت اس میں عوامی شرکت تھی۔ سپاہیوں اور تعلقہ داروں کے علاوہ، دیہی کسانوں نے اس میں بڑی تعداد میں حصہ لیا۔ اودھ کے مقابلہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تعلقہ داروں اور کسانوں نے

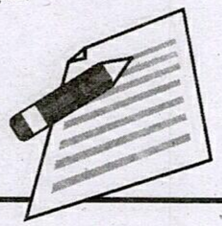

نوٹ

مل کر حملہ کیا تھا۔ بہت سی جگہوں پر تعلقہ داروں نے جب انگریزوں کے ساتھ امن قائم کرلیا تب بھی کسانوں نے اپنی تحریک جاری رکھی۔ سپاہیوں کے تعلقات گاؤوں میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تھے اور سپاہیوں کی بغاوت نے فوجی آبادی کو بھی بہت متاثر کیا تھا کہ وہ برطانوی راج کے خلاف اپنی پریشانیوں کو ہوا دیں۔ اس طرح 1857 کی بغاوت اپنے اندر ایک عوامی شورش کی خصوصیات لیے ہوئی تھی۔

بغاوت کی ناکامی کے اسباب

1857 کی بغاوت میں عوامی شرکت کے باوجود باغیوں کو بالآخر انگریزوں کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ باغیوں کی اس ناکامی کے درجہ ذیل اسباب تھے:

- باغیوں کے پاس ہتھیاروں اور گولہ بارود وغیرہ کی رسد محدود تھی،
- باغیوں کے درمیان مواصلات کی بھی کمی تھی اور ایک مرکزی قیادت کی بھی کمی تھی،
- انگریزوں کے پاس کافی وسائل تھے اور بہتر ہتھیاروں اور دیگر ساز وسامان سے بھی لیس تھے،
- سوائے اس کے کہ باغی غیر ملکی حکومت سے غیر مطمئن تھے ان کے پاس مستقبل کے لیے کوئی واضح سیاسی ایجنڈا نہیں تھا،
- تحریک کے عوامی ہونے کے باوجود باغیوں کو تاجروں، اہل الرائے اور بہت سے مقامی شہزادوں کی حمایت حاصل نہ تھی بلکہ وہ انگریزوں کے حامی تھے۔

بغاوت کی اہمیت

اگرچہ انگریزوں نے بغاوت کو دبا دیا لیکن انھیں لوگوں کی انھیں لوگوں کی زیادہ ناراضگی کا احساس ہوگیا۔ 1857 کے واقعات نے انگریزوں کو مجبور کر دیا کہ بغاوت کے بعد وہ ہندوستان کے بارے میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کریں۔ اسی لیے انھوں نے مستقبل میں ایسی کسی بغاوت کے واقعات کو روکنے کے لیے ایک حکمت عملی تیار کی۔ مقامی شہزادوں کے اعتماد کو جیتنے کی خاطر انگریزوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ اب اپنے موجودہ مقبوضات میں توسیع نہیں کریں گے۔ وفادار شہزادوں کو خصوصی انعامات بھی دیے گئے۔ فوج کی بھرتی کے وقت فرقہ، ذات، قبیلہ اور علاقائی وفاداریوں کا خیال رکھا گیا تاکہ ان فوجیوں کے درمیان باہمی اتفاق و اتحاد پر نظر رکھی جاسکے۔ انگریزوں نے ہندوستانی لوگوں کی علاقائی، مذہبی اور جاتی سے متعلق شناختوں کو بہت ڈھنگ سے استعمال کرکے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کا سہارا اپنایا۔ 1857 کی بغاوت کا ایک اور اہم نتیجہ 1858 کے شاہی فرمان (Royal Proclamation) کا اجرا تھا۔ اس فرمان کے مطابق برطانوی تاج نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے راج کا خاتمہ کرکے ہندوستان کی حکومت کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

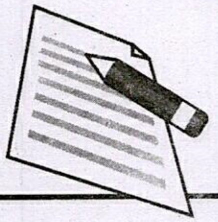

نوٹ

بہرحال، باغی اگرچہ ناکام ہوئے لیکن برطانوی راج کے خلاف ان کی بہادرانہ کوشش نے لوگوں کے ذہنوں پر ایک گہرا اثر چھوڑا۔ ہندوستانی قومیت کا وہ جذبہ جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں اپنے تشکیلی مرحلے میں تھا وہ اس بغاوت سے بہت متاثر ہوا۔

متن پر مبنی سوالات 19.4

1۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے راج کا کب اور کیسے خاتمہ ہوا؟

2۔ بغاوت کی ناکامی کے کوئی تین اہم اسباب لکھیے۔

آپ نے کیا سیکھا

اس سبق میں ہم نے سیکھا کہ ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کے نتیجے میں ہندوستان برطانوی سلطنت کی ایک نوآبادی میں تبدیل ہوگیا اور اس تبدیلی کا سب سے زیادہ اثر دیہی سماج پر پڑا۔ اپنی زمینوں سے بے دخل ہو کر کسان اپنی زمینوں پر محنت کش بن گئے۔ ٹیکسوں کی مختلف شکلوں نے ان کی زندگی کو اور خستہ حال بنا دیا۔ جو لوگ چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں لگے ہوئے تھے ان کے کارخانے برطانیہ کے تیار شدہ مال کی درآمد کی وجہ سے بند ہوگئے۔ ان ہی تبدیلیوں اور برطانیہ کے گونگے بہرے رویوں نے کسانوں کو اس بات کے لیے مجبور کر دیا کہ وہ بغاوتوں کے ذریعہ اپنے دکھ درد کا اظہار کریں۔ برطانیہ کی منظم اور مسلح افواج کے آگے بغاوتیں ناکام ہوگئیں لیکن ان کوششوں سے ہندوستان میں برطانوی راج کے لیے آئندہ چیلنجوں کا راستہ ہموار کر دیا۔ اس سلسلہ میں 1857 کی بغاوت اس مفہوم میں بہت انوکھی ہے کہ ہندوستانی لوگوں نے پہلی بار جاتی، فرقہ اور طبقہ کی تمام بندشوں کو پس پشت ڈال کر برطانوی راج کو ایک مشترکہ چیلنج دیا۔ اگرچہ باغیوں کی کوششیں ناکام ہوئیں لیکن برطانوی حکومت ہندوستان کے معاملہ میں اپنی پالیسی بدلنے کے لیے مجبور ہوگئی۔

اختتامی سوالات

1۔ 1857 کی بغاوت سے قبل ہونے والی بغاوتوں کی نوعیت کی وضاحت کیجیے۔

2۔ 1857 کی بغاوت کے اسباب پر بحث کیجیے۔

3۔ 1857 کی بغاوت کی اہمیت واضح کیجیے۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالوں کے جواب

19.1

1۔ اپنی اراضی - سامان فروخت کر کے

2۔ برطانوی حکومت کے اعلیٰ افسران، زمیندار اور ساہوکار

19.2

1۔ اڑیسہ، بہار اور بنگال کی سرحد

2۔ بنکم چندر چٹرجی کے ناول آنند مٹھ نے

19.3

1۔ کم تنخواہیں؛ ترقی، پینشن اور نوکری کی شرائط میں امتیاز

2۔ رانی لکشمی بائی، تانتیہ ٹوپے، بیگم حضرت محل، نانا صاحب، کنور سنگھ اف آرہ

19.4

1۔ 1858 میں برطانوی تاج نے ایک شاہی فرمان جاری کر کے

2۔ دیکھیے سیکشن 19.5

اختتامی مشقوں کے لیے اشارات

1۔ دیکھیے سیکشن 19.2، 19.3

2۔ دیکھیے سیکشن 19.4

3۔ دیکھیے سیکشن 19.5 پیرا4

ماڈیول 4

ہندوستانی قومی تحریک اور عصری ہندوستان

سبق 20 قوم پرستی

سبق 21 ہندوستانی قومی تحریک

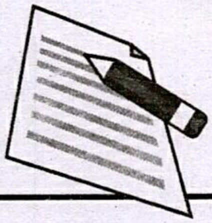

نوٹ

20

قوم پرستی

(Nationalism)

ہم سب زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر اپنے وطن کے لیے وفادار ہوتے ہیں۔ اپنے ملک کے لیے اسی وفاداری کو عام طور پر قوم پرستی سمجھا جاتا ہے۔ ایک قوم پرست وہ شخص ہوتا ہے جو اپنے وطن سے محبت کرتا ہے۔ آپ اس قسم کے بیانات ناولوں، شاعری، تقاریر اور اخبارات اور فلم وغیرہ میں پائیں گے۔

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ یہ سب کچھ کیسے شروع ہوا ہوگا؟ قوم پرستی کی تاریخ کیا ہے؟ یہ نظریہ کتنا پرانا ہے؟ کیا لوگوں کو ہمیشہ ہی اپنے ملک سے پیار رہا ہے؟ کیا اپنے ملک سے وفاداری کے احساس کے علاوہ بھی قوم پرستی کا کوئی اور مطلب ہے؟ یہی سب وہ سوالات ہیں جن کے جواب ہم اس سبق میں دینے کی کوشش کریں گے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ:

- قوم پرستی کے نظریہ کی تاریخ کا سراغ لگا سکیں گے؛
- یوروپ میں قوم پرستی کے عروج کے اسباب بیان کر سکیں گے؛
- ہندوستان میں قوم پرستی کے ارتقا کا رشتہ برطانوی نوآبادیت کے خلاف جدوجہد سے جوڑ سکیں گے؛
- ہندوستان میں کلچر کے میدان میں قوم پرستی کے نظریات کے ظہور کا پتہ لگا سکیں گے؛
- اور اس بات کی وضاحت کر سکیں گے کہ معاشی اصطلاحات میں قوم پرستی کا اظہار کس طرح کیا گیا ہے۔

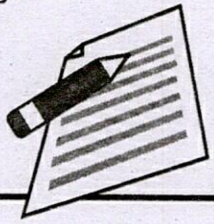

نوٹ

20.1 قوم پرستی: ابتداء اور مفہوم (Nationalism : Origin & Meaning)

آپ یہ جان کر حیرت کریں گے کہ اس نظریہ کی تاریخ دو سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ جس مفہوم میں آج ہم لفظ قوم پرستی (Nationalism) کا مطلب لیتے ہیں وہ مطلب انیسویں صدی سے پہلے ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ آپ کو یہ جان کر بھی حیرت ہوگی کہ اس نظریہ کی جڑیں ہندوستانی تاریخ میں نہیں ہیں بلکہ اس کی جڑیں جدید یوروپ کی تاریخ میں ہیں۔ درحقیقت یہ ممکن ہے کہ جب ہم ہندوستانی قوم پرستی کا ذکر کریں تو وہ یوروپی قوم پرستی سے قطعاً مختلف قسم کی کوئی ہو۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے جن کے تحت یوروپ میں قوم پرستی نے پر بال و پر نکالے۔

یوروپ میں قوم پرستی کا ارتقا ان بنیادی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہوا جو اٹھارہویں صدی کے آس پاس سوسائٹی اور معیشت میں واقع ہو رہی تھیں۔ صنعتی انقلاب کے اثر سے تیار شدہ مال کی افراط ہوگئی اور دولت کی بے مثال ریل پیل ہوگئی (بے مثال کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا)۔ اس کے لیے یہ ضروری ہوگیا کہ ایک ایسی بڑی اور مشترکہ منڈی بنائی جائے جہاں یہ سامان بیچا جاسکے۔ بڑی منڈی کی تخلیق سے گاؤں، ضلعوں اور صوبوں کی ایک سیاسی یک جہتی ایک بڑی ریاست کی شکل میں ہوگئی۔ اس بڑی اور کامپلیکس منڈی میں مختلف لوگوں کو مختلف کام انجام دینے پڑے جس کے لیے مختلف مہارتوں میں ان کو ٹریننگ کی ضرورت ہوئی۔ ان سب باتوں کے سوا، سب سے اہم چیز یہ کہ ایک دوسرے کے ساتھ مواصلات (Communication) کی ضرورت پیدا ہوئی۔ اس کے نتیجے میں ایسے یکساں تعلیمی اداروں کی ضرورت ہوئی جن میں ایک ہی زبان پر توجہ ہوتی۔ زمانہ ماقبل جدید میں لوگ اپنے مقامی ماحول کے مطابق زبان اور ضروری مہارتوں کو سیکھتے تھے اور یہ مقامی ماحول ایک دوسرے ماحول سے مختلف ہوتے تھے۔ لیکن اب چونکہ جدید معیشت کی وجہ سے نئی نئی تبدیلیاں آگئی تھیں اس لیے ٹریننگ اور اسکولنگ کا ایک یکساں (Uniform) نظام وجود میں آیا۔ اس لیے انگلینڈ میں جدید انگریزی، فرانس میں فرانسیسی اور جرمن میں جرمنی زبانوں کو غلبہ حاصل ہوگیا۔

مواصلات (Communication) کے نظام میں یکسانیت (Uniformity) آئی تو ایک قومی کلچر بھی وجود میں آیا اور مضبوط قومی سرحدیں بھی بنیں۔ ان سرحدوں کے اندر رہنے والوں نے خود کو ان سرحدوں سے جوڑ لیا۔ ثقافتی یا کلچر طور پر لوگوں نے خود کو ''ایک قوم'' کی شکل میں دیکھنا شروع کیا اور خود کو ایک بڑی کمیونٹی کا فرد سمجھا مثلاً انگریزوں نے انگلینڈ کی سرحدوں کے اور باہم ایک دوسرے کے ساتھ اور ملک کی جغرافیائی سرحدوں کے اندر اپنی شناخت قائم کی۔ یہی بات جرمنی اور فرانسیسی لوگوں کے ساتھ بھی ہوئی۔ یہی چیز قوم پرستی کے نظریہ کی ابتدا تھی۔

ہم اس بات کو ایک مختلف طریقے سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ قوم پرستی یوروپ میں قوموں اور قومی ریاستوں (Nation States) کے ظہور کا نتیجہ تھی (قومی ریاستیں ایسے بڑے اور کلچر کے اعتبار سے یک رنگ و ہم جنس (Homogenous) خطے تھے۔ جن کے اندر ایک یکساں سیاسی نظام تھا)۔ یہ قومی ریاستیں (Nation Sates)

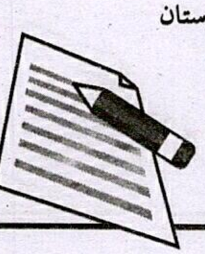

نوٹ

ہمیشہ موجود نہیں تھیں۔ ابتدائی سوسائٹیوں کی انسانی تنظیموں کی شکلیں نسبتاً سادہ ہوتی تھیں اور وہ کسی جانفشانی والی تقسیم کے بغیر ہی معاملات کو آسانی کے ساتھ سدھار لیتی تھیں اور ان کو نظم و قانون کے نفاذ کے لیے کسی ریاستی یا مرکزی اقتدار کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرکزی اقتدار کی حیثیت سے ریاست کا وجود منظم زراعت کے شروع ہونے کے بعد ہی ہوا۔ لوگوں کے لیے ایک ایسے مرکزی اقتدار کے بغیر جس سے وہ اپنی زندگیوں کو منظم کر سکتے زندگی کی گذر بسر مشکل محسوس ہوئی۔ انڈسٹریلائزیشن اور ایک جدید عالمگیر معیشت کی شروعات کے ساتھ ہی ساتھ ایک ریاست(State) کی ضرورت بھی بڑھ گئی۔ مواصلات کے ایک مرتب سسٹم اور تعلیم کے ایک یکساں نظام نے ایک معیاری زبان(Standardized language) پر توجہ مرکوز کی اور سیاسی و ثقافتی(Cultural) یکسانیت کو پیدا کیا۔ خود کو پائیدار بنانے اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے ان ریاستوں(Nation State) کو ان لوگوں کی وفاداری اور جان نثاری کی ضرورت ہوئی جو ان ریاستوں کی حدود میں رہتے تھے۔ یہی قوم پرستی کی شروعات تھی۔ دوسرے لفظوں میں کسی قوم، ریاست اور اس کے اعلیٰ کلچر کی حد بندی کے ساتھ کسی فرقے یا لوگوں کی شناخت نے قوم پرستی کو جنم دیا۔

لیکن ہندوستان میں قوم پرستی کے نظریہ کا کس طرح ارتقا ہوا اس کی کہانی مختلف ہے جس وقت یوروپ میں قوم پرستی کا نظریہ پروان چڑھ رہا تھا اس وقت ہندوستان کے حالات بہت مختلف تھے۔ یہاں انڈسٹریلائزیشن بہت محدود پیمانے پر ہوا۔ جب یوروپ کا تیزی کے ساتھ انڈسٹریلائزیشن ہو رہا تھا اس وقت بھی ہندوستان میں بیشتر زراعتی معیشت تھی۔ مختلف لوگ مختلف زبانیں بولتے تھے۔ اگرچہ حب وطن(Patriotism) کا جذبہ ہندوستان میں قدیم زمانے سے ہی موجود تھا لیکن جس کو ہم قوم پرستی (حکومت، مشترکہ زبان، ایک اعلیٰ مشترکہ کلچر اور ایک سیاسی یک جہتی کا یکساں سسٹم) کہتے ہیں وہ تقریباً انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ (حب وطن : ملک اور کلچر سے محبت اور وفاداری کا ایک ایسا احساس جیسے مراٹھوں میں مراٹھ واڑہ کے لیے یا راجپوتوں میں راجپوتانہ کے لیے تھا)۔

ہندوستان میں قومیت کا فروغ بنیادی طور پر برطانوی راج کے جواب میں ہوا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستانی سرزمین پر برطانوی راج 1757 میں پلاسی کی جنگ کے ساتھ آیا اور رفتہ رفتہ یہاں دیسی حکمرانوں کو شکست دے کر مضبوط ہوتا گیا۔ جیسا کہ آپ واقف ہیں یہاں کے لوگوں اور دیسی حکمرانوں کو برطانوی حکمرانوں کا آنا بہت برا لگا۔ یہ بات بالکل صاف ہے کہ یہ سب لوگ ہندوستان میں انگریزی وجود کے مخالف تھے لیکن ابتدائی طور پر انھوں نے ساتھ مل کر یا ایک قوم کی حیثیت سے ان کی مخالفت نہیں کی۔ مختلف لوگوں کو برطانیہ کے خلاف مختلف شکایتیں تھیں اور اپنی مخصوص شکایات کے ازالہ کی کوششیں بھی کرتے تھے۔ مثال کے طور پر دیسی حکمران یہ نہیں چاہتے تھے کہ برطانیہ ان کے مقبوضات پر قبضہ کرے (جیسا کہ اودھ اور جھانسی کے حکمرانوں کے ساتھ ہو چکا تھا جو اب یو پی میں ہیں)۔ لیکن صرف برطانوی راج کی مخالفت یا ان کے ساتھ جنگ سے ہندوستان میں قوم پرستی کا جذبہ نہیں آیا۔ اگرچہ انگریزوں کے ہاتھوں عام لوگوں کے استحصال کی وجہ سے آبادی

نوٹ

کے مختلف طبقات متحد ہو گئے تھے لیکن تمام ملک اور ملک کے لوگوں کے ساتھ اپنی پہچان یا ایک ہونے کا جذبہ ابھی نہیں ابھرا تھا۔ خود 1857 کے بہت بڑے ہنگامے نے جس میں آبادی کے بہت سے طبقے جیسے دیسی یا مقامی حکمران سپاہی، زمیندار اور کسان وغیرہ اس میں متحد ہو گئے تھے، قوم پرستی کے جذبے یا ایک کل ہند اتحاد کو نہیں پیدا کر سکا تھا۔ اس نظریہ نے کہ سب سے اختلافات کے باوجود ہندوستان کے لوگوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں ابھی بھی جڑیں نہیں پکڑی تھیں۔ اس طرح یہ احساس کہ انگریزی حکمراں بدیسی ہیں اور یہ کہ غیر ملکی اور بدیسی حکمران تمام لوگوں کو اپنی رعایا بنانا اور ان کو اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتے ہیں ابھی ان کے لیے کسی الجھن اور پریشانی کا سبب نہیں بنا تھا۔

ہندوستان میں قوم پرستی یا ہندوستانی قوم پرستی کی حقیقت یا ماہیت یہی احساس ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کی قومیت مشترک ہے اور برطانوی راج کی مزاحمت اور اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا ان کے اجتماعی مفاد میں ہے۔ سادے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی راج کی ایک متحدہ مخالفت اور قومی اتحاد کے حصول کی خواہش ہی ہندوستانی قوم پرستی کی بنیاد ہے۔

قوم پرستی کی نشوونما کے لیے خارجی شرائط تو درحقیقت نوآبادیاتی حکمرانوں کی آمد اور ہندوستانی سماج اور معیشت میں ان کی گھس پیٹھ سے ہی پوری ہو گئی تھیں۔ لیکن یہ حالات ہندوستانیوں میں قوم پرستی کی بیداری شروع نہ کر پائے۔ قوم پرستی کے نظریہ کے شعور کو پختہ تر ہونے اور کلچر، معیشت اور سیاست کے میدانوں میں اپنا وجود ثابت کرنے میں لمبا وقت لگا۔ اگلے سیکشن میں ہم ان پر الگ الگ گفتگو کریں گے۔

متن پر مبنی سوالات 20.1

1۔ درج ذیل بیانات پڑھیے اور صحیح یا غلط پر نشان لگائیے۔

(i) قوم پرستی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانی تاریخ۔ (صحیح / غلط)

(ii) قوم پرستی کے نظریہ کا سرچشمہ جدید یوروپ کی تاریخ ہے۔ (صحیح / غلط)

(iii) قوم پرستی جدید صنعتی معیشت (Modern Industrial Economy) کا نتیجہ ہے۔ (صحیح / غلط)

(iv) ہندوستان میں قو پرستی کا احساس انیسویں صدی کے وسط تک نہیں ہوا تھا۔ (صحیح / غلط)

2۔ ہندوستانی قوم پرستی کو سمجھنے کے لیے دو اہم نکات بیان کیجیے۔

____

____

نوٹ

20.2 کلچر اور قوم پرستی (Culture and Nationalism)

قوم پرستی کے نظریات کا پہلا اظہار ثقافت یا کلچر کے میدان میں ہی ہوا۔ ایسا دو سطحوں پر واقع ہوا:

- پہلے تو یہ ہوا کہ ہندوستان کی روایتی ثقافت (Culture) کے کچھ عناصر پر سوالات اٹھنے لگے اور یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ذات پات، مذہبی توہمات، پروہت راج اور عورتوں کے خلاف امتیازی برتاؤ جیسی ہندوستانی کلچر کی کچھ ناپسندیدہ خصوصیات کو دور کرنے کے لیے کچھ اصلاحات لائی جائیں۔
- دوسرے ایک کوشش یہ بھی ہوئی کہ بہت سے ہندوستانیوں نے ہندوستانی کلچر میں برطانوی مداخلت کی مخالفت کی۔

یہ بات یاد رکھنی بہت ضروری ہے کہ نوآبادیاتی فتح کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ایک قسم کے حکمرانوں کی جگہ دوسری قسم کے حکمرانوں نے لے لی۔ اس کے بہت گہرے اثرات عام لوگوں کی زندگیوں پر پڑے۔ برطانوی حکمرانوں اور ان کے کارندوں کے ذریعے مختلف طریقوں سے اس وقت کے نوآبادیاتی حکمرانوں کا کلچر ہندوستانی لوگوں میں پھیلنے لگا۔ نوآبادیاتی زبان اور کلچر کے پھیلنے سے ہندوستان کے دانشور اور برگزیدہ (Elite) لوگوں میں دو قسم کے ردّعمل پیدا ہوئے۔ (انگریزی کے Elite لفظ کا مطلب ہے سماجی طور پر منتخب اور برگزیدہ لوگ جن کا تعلق اعلیٰ ثقافت اور سماج کے اعلی طبقات سے ہو)۔ کچھ لوگ تو ہندوستان کے سماج اور کلچر کا موازنہ اس سماج اور کلچر سے کرنے لگے جو جدید انگلینڈ میں تھا۔ اس طرح ان لوگوں نے ہندوستانی کلچر کے عناصر پر ہی سوال اٹھائے۔ مثال کے طور پر راجا رام موہن رائے اور ایشور چندر ودیا ساگر نے کچھ ایسی ہی سماجی برائیوں کو ختم کرنے کی بڑی کوشش کی جو ہندوستانی سماج کا حصہ بن چکی تھیں۔ خاص طور پر رام موہن رائے نے ستی (بیوہ کا شوہر کی موت کے بعد اس کی چتا پر خود کو جلانا) کی رسم پر زبردست وار کیا اور ودیا ساگر نے بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کی وکالت کی۔ جیوتی با پھولے جیسے رہنماؤں نے مہاراشٹر میں ذات پات کے خلاف تحریکیں شروع کیں۔ انھوں نے نوآبادیاتی حاکموں سے بھی یہ اپیل کی کہ وہ ہندوستانی سماج میں مداخلت کریں اور اصلاحات لائیں۔ لیکن یہ لوگ اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے کہ یوروپی کلچر ہندوستانی کلچر سے اعلیٰ ہے۔ ہاں ان کا یہ یقین ضرور تھا کہ برطانوی حکومت نے جدیدیت کی ایک لہر پیدا کر دی ہے جس سے جدّت عرازی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج کی ترقی بھی ہوگی۔

بہر حال ایک دوسرا ردّعمل یہ تھا کہ ہندوستانی لوگوں نے اپنے کلچر کو نوآبادیاتی کلچر سے بچانے اور محفوظ رکھنے کی کوشش کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کی زندگیوں میں ایک مداخلت بے جا ہے۔ 1850 کی دہائی میں جب یوروپی لباس اور یوروپی طور طریقے ہندوستانیوں پر تھوپنے کی کوششیں کی گئیں تو لوگوں نے اس کے خلاف مزاحمت کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی سماجی اصلاح پسندوں نے بھی مزاحمت کی جو برطانوی راج کی تعریف کرتے تھے اور جنھیں یہ امید تھی کہ نوآبادیاتی راج قانون بنا کر یا پھر کسی اور طریقے سے ہندوستان میں جدت پسندی کو متعارف کرے گا۔ اس طرح انیسویں صدی کے ایک ممتاز مصلح اور برہمو سماج (1928 میں رام موہن رائے کے

نوٹ

ذریعہ تشکیل شدہ) کے ایک رہنما کیشب چندر سین انگریزی لباس پہننا اور انگریزی کھانے کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی ایشور چندر ودیا ساگر ایسی تقریبات میں جانے سے انکار کر دیا کرتے تھے جو لیفٹیننٹ گورنر کی میزبانی میں ہوتی کیونکہ اس میں انگریزی لباس پہننا ضروری ہوتا تھا۔ اس طرز فکر کے مطابق لوگوں میں ثقافتی حقوق اور رسوم کو بہت اہم سمجھا جاتا تھا اور نوآبادیاتی راج کی اس لیے خلاف ورزی کی جاتی تھی کہ یہ راج ان کے کلچر سے متصادم تھا۔

اوپر جن دو مختلف قسم کے طرز فکر کو بیان کیا گیا ہوسکتا ہے وہ دونوں آپ کو مختلف اور ایک دوسرے سے متصادم معلوم ہوتے ہوں۔ پہلی طرز فکر (یعنی روایتی ہندوستانی کلچر کی برائیوں پر سوال اٹھانا) ہوسکتا ہے دوسری طرز فکر (یعنی نوآبادیاتی حکمرانوں کی ہر ایسی کوشش کی مزاحمت کرنا جو ہندوستانی کلچر کو ختم کرنے یا بدلنے کے لیے ہو) سے قطعاً مختلف معلوم ہو اور آپ کو ایسا لگے کہ پہلی طرز فکر تو ہندوستانی سماج میں انگریزوں کی مداخلت کو دعوت دینے اور دوسری طرز فکر برطانوی مداخلت کی مخالفت پر مبنی ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی بہت ضروری ہے کہ یہ دونوں ہی قسم کے طرز فکر ہندوستانی قوم پرستی کے حصے ہیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ثقافتی قوم پرستی (Cultural Nationalism) کے اس نظریے نے جس کا انیسویں صدی میں ارتقا ہوا، ہندوستان کے روایتی کلچر کی منفی خصوصیات کو مسترد کر دیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ انیسوین صدی کے ساجی مصلحین یہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی کلچر حقیقت میں ماڈرن ہو جائے لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ مکمل طور پر مغرب زدہ ہو۔ اس مفہوم میں وہ روایتی کلچر اور جدید نوآبادیاتی کلچر دونوں کے خلاف تھے۔ یہ تھا انیسویں صدی کی کلچرل قوم پرستی کا حقیقی مطلب۔

متن پر مبنی سوالات 21.2

1۔ درج ذیل سوالوں کے جواب دیجیے۔

(i) اس مصلح کا نام بتایئے جس نے ستی کی رسم کو اپنی سخت تنقیدوں کا نشانہ بنایا۔

____

(ii) اس مصلح کا نام بتایئے جس نے بیواؤں کی دوسری شادی کی حمایت اور وکالت کی۔

____

(iii) رام موہن رائے نے کون سی تنظیم کی بنیاد ڈالی۔

____

2۔ ثقافتی قوم پرستی (Cultural Nationalism) کی دو اہم خصوصیات لکھیے۔

____

نوٹ

20.3 معاشی قوم پرستی (Economic Nationalism)

آپ یہ سمجھ چکے ہیں کہ کلچرل قوم پرستی کا کیا مفہوم ہے اور کلچر اور قوم پرستی کے درمیان کیا رشتہ ہے۔ اب ہم معاشی قوم پرستی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معاشی قوم پرستی کی شروعات کو انیسویں صدی کے نصف آخر میں تلاش کر سکتے ہیں جب ہندوستانی رہنماؤں مثلاً دادا بھائی نوروجی، مہادیو گووند رانا ڈے اور رمیش چندردت وغیرہ کو یہ احساس ہوگیا کہ برطانوی راج ہندوستان کا استحصال کر رہا ہے اور وہی ہندوستان کو شدید ترین افلاس کے تحت رکھنے کے لیے ذمہ دار ہے۔ یہیں سے یا یوں کہئے اسی احساس کے تحت ہندوستانی رہنماؤں کی ایک پوری نسل جیسے گوپال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک، جی وی جوشی اور بہت سے دوسرے لوگوں نے بہت سلیقے سے اور بہت جامع طریقے سے برطانوی راج کی تنقیدیں لکھیں۔ ذیل میں اس معاشی قوم پرستی کی کچھ خصوصیات پیش ہیں جس کی ان لوگوں نے اپنی تحریروں میں تبلیغ کی۔

انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ برطانوی راج مختلف طریقوں سے ہندوستان کا استحصال کر رہا تھا۔ شروع میں تو یہ استحصال کسانوں پر بھاری ٹیکسوں اور ہندوستان کے ساتھ غیر مساویانہ تجارت تک محدود رہا۔ یہ تجارت غیر مساوی اس لیے تھی کیونکہ برٹش انڈیا کمپنی (جس کو برطانوی پارلیمینٹ نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کی اجارہ داری عطا کر رکھی تھی) ہندوستانی مال بہت سستے داموں میں خرید لیتی تھی اور برطانیہ میں تیار شدہ مال بہت مہنگا بیچتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی دولت انگلینڈ کو جانے لگی۔ اس تجارت نے ہندوستان کی روایتی دستکاری صنعتوں کو بھی برباد کر دیا۔ بہرحال انیسویں صدی میں ابھی یہ معاشی استحصال چل ہی رہا تھا کہ استحصال کی نئی نئی اور پیچیدہ شکلیں شروع ہوگئیں۔ اب نوآبادیاتی حکمرانوں نے برطانوی صنعتوں اور ایک ایسی منڈی کو خام مال سپلائی کرنے والے کی حیثیت سے ہندوستان کا استحصال کیا جس کے لیے مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنے یہاں ایسی فصلوں کی کھیتی باڑی کرے مثلاً جوٹ اور کاٹن وغیرہ۔ کیونکہ ان چیزوں کی برطانوی صنعتوں کو ضرورت رہتی تھی۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ ہندوستان کی دولت جس کا استعمال ہندوستان کے انڈسٹیریلائزیشن اور اس کی معاشی ترقی کے لیے کیا جا سکتا تھا، اب اس کا استعمال برطانیہ کی معاشی ترقی کے لیے ہونے لگا۔ ہندوستان کے قوم پرست رہنماؤں نے ان حقائق کو سمجھ لیا اور صحیح وقت پر ان باتوں کو لوگوں تک پہنچایا۔

دادا بھائی نوروجی جیسے قوم پرست رہنماؤں نے 'دولت کے نکاس' کے نظریہ کو پیش کیا کیونکہ درحقیقت یہ بھی ہندوستان کے مسلسل معاشی استحصال کے بارے میں ان کے فہم و ادراک کا ہی ایک حصہ تھا۔ نوروجی نے اپنی مشہور کتاب "Poverty and the un-British Rule in India" میں یہ بحث کی ہے کہ ہندوستان کے معاشی وسائل بہت باقاعدگی کے ساتھ تجارت، انڈسٹریلائزیشن اور برطانوی افسران کی اونچی تنخواہوں کے ذریعے انگلینڈ کو منتقل کیے گئے۔ یاد رہے کہ برطانوی حکام کی تنخواہیں ہندوستان سے ادا کی جاتی تھی۔ ان کے حساب و کتاب کے مطابق یہ نکاس حکومت کے محصول کے نصف کے برابر اور ہندوستان کی بچتوں کے 1/3 کے برابر ہوتا تھا۔ اس طرح برطانیہ کی امارت (Enrichment) اور ہندوستان کا افلاس (Improvishment) ساتھ ہی ساتھ چل رہے تھے۔

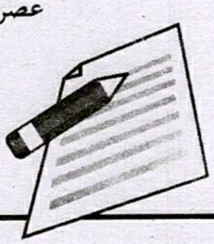

نوٹ

اس ترتیب سے قوم پرست لیڈروں کا یہ استدلال تھا کہ برطانیہ کی نوآبادیاتی حکومت نے عظیم برطانیہ کی معیشت کے مفاد میں ہندوستانی معیشت پر مختلف طریقوں سے اور مکمل طور سے کنٹرول کرلیا ہے۔ ان کے خیال میں ہندوستانی معیشت کا رخ برطانوی معیشت کی ضرورتوں کے پیش نظر موڑ دیا گیا ہے ۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انگلینڈ کے لیے ہندوستان کی دولت کا نکاس بند کیا جائے اور ہندوستان کا انڈسٹیریلائزیشن صرف ہندوستانی سرمایہ سے کیا جائے تاکہ اس کا فائدہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کو پہنچ سکے۔ اس مقصد کے پیش نظر اپنے ملک کے لیے اپنے راج یا اپنی حکومت یا سوراج کا مطالبہ کیا جیسے ۔قوم پرست رہنماؤں نے کہا تھا معاشی قوم پرستی کی معنویت کے دو پہلو تھے:

- قوم پرست رہنماؤں نے پہلے تو اس خیال کو غلط ٹھہرایا کہ برطانوی نوآبادیاتی حکومت ایک سودمند حکومت ہے اور آخرکار اس سے ہندوستان کی معیشت کو ترقی حاصل ہوگی۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اگر نوآبادیاتی حکومت لمبے عرصے تک چلتی رہی تو بالآخر ہندوستان عظیم برطانیہ کی طرح خوشحال ہو جائے گا۔ ہندوستان کے قوم پرست رہنماؤں نے یہ ثابت کردیا تھا کہ یہ سوچ صحیح نہیں ہے اور برطانوی نوآبادیاتی راج دراصل ہندوستانی لوگوں کے مفادات کے لیے ضرر رساں ہے۔

- دوسرے یہ کہ معاشی قوم پرستی نے اس برطانوی نوآبادیاتی راج کے خلاف ایک طاقتور قوم پرستانہ تحریک کی بنیاد ڈال دی۔ یہ تحریک بیسویں صدی میں گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں کی زیر قیادت شروع ہوئی۔ ان لوگوں نے معاشی قوم پرستی کے نظریہ کو ہندوستانی لوگوں تک پہنچایا اور اس طرح ان کو ایک قومی تحریک کے لیے تیار کردیا۔ جب ہندوستانی عوام ایک بار قومی تحریک میں شریک ہوگئے تو برطانیہ کے نوآبادیاتی راج کو ہندوستان میں ٹھہرنا ناممکن ہوگیا۔

متن پر مبنی سوالات 20.3

1۔ درج ذیل سوالوں کے جواب دیجیے

(i) کچھ ایسے ہندوستانی رہنماؤں کے نام بتائیے جو یہ کہتے تھے کہ برطانوی راج ہندوستانی معیشت کا استحصال کر رہا ہے۔

____

(ii) ''دولت کی نکاس'' کا نظریہ کیا تھا اور یہ نظریہ کس نے پیش کیا تھا؟

____

(iii) معاشی قوم پرستی کی کیا اہمیت ہے؟

____

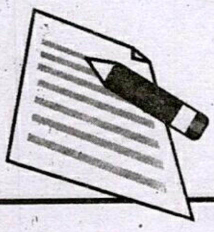

نوٹ

(iv) بیسویں صدی میں قومی تحریک کے رہنماؤں کا پیش کردہ معاشی قوم پرستی کا نظریہ کیا تھا؟

____

-2 خالی جگہوں کو پر کیجیے۔

(i) انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں کے ساتھ ________ جاری رکھی۔

(ii) دادا بھائی نوروجی نے ________ نامی کتاب لکھی۔

(iii) ہندوستان سے انگلینڈ کی طرف اصل دولت کا نکاس ہندوستان کی مجموعی بچتوں کے ________ کے برابر تھا۔

(iv) استعماری حکمرانوں نے اپنی صنعتوں کے لیے ________ کے ایک وسیلہ کے طور پر ہندوستان کا استحصال کیا۔

20.4 مذہب اور قوم پرستی

ثقافتی قوم پرستی اور معاشی قوم پرستی سے ہٹ کر اور بھی ایسے طریقے تھے جہاں ہندوستانی قوم پرستی کے نظریے کا اظہار ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستانی قوم پرستی کے بارے میں ایک اور سوچ پیدا ہوئی جو مذہب پر مبنی تھی۔ یہ بنکم چندر چٹوپادھیائے، دیانند سرسوتی (جنھوں نے 1875 میں آریہ سماج کی بنیاد ڈالی تھی)، وویکانند اور اروِندگھوش تھے جنھوں نے ہندوستانی قوم پرستی کے لیے ہندو مذہب کو ایک محرک قوت بتایا۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ ہندوستان میں برطانیہ کا وجود ہی ہندوستانی تہذیب پر مغربی تہذیب کے غلبہ کی ایک کوشش ہے۔ یہ لوگ اس غلبہ یا تسلط کے سخت مخالف تھے۔ ان رہنماؤں کا یہ نظریہ تھا کہ اگر چہ برطانیہ نے ہندوستان کو فتح کر لینے میں کامیابی حاصل کر لی ہے لیکن مشرقی تہذیب مغربی تہذیب سے اعلیٰ ہے۔ بنکم چندر کی دلیل یہ تھی کہ اگر چہ برطانیہ نے فوج اور ٹیکنالوجی کی برتری کی مدد سے ہندوستان کو فتح کر لیا ہے لیکن ہندوستانیوں کو یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی اندھی تقلید شروع کر دیں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستانی سماج ایک انوکھا سماج ہے اور اس میں مغربی تہذیب نہیں کھپ سکتی۔ ان رہنماؤں کا خیال تھا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد انفرادیت پسندی (Individualism) کے نظریہ پر ہے نہ کہ روحانیت پر، اور اسی لیے یہ تہذیب ہندوستان کے لیے ناقابل قبول ہے۔ وویکانند اس بات پر اعتقاد رکھتے تھے کہ مغربی نظریات کو ہندوستانی پس منظر کے مطابق دوبارہ مرتب کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ''یوروپ میں سیاسی نظریات قومی اتحاد کی تشکیل کرتے ہیں اور ایشیا میں مذہبی نظریات قومی اتحاد کی تشکیل کرتے ہیں۔''

ان رہنماؤں نے اپنے نظریات ورجحانات کو مغربی کتابوں یا دیگر ذرائع سے اخذ نہیں کیا بلکہ وید، اپنشد اور گیتا جیسے روایتی ہندوستانی کتابوں سے اخذ کیا۔ انھوں نے خاص طور سے اس بنیاد پر برطانوی نوآبادیاتی راج کی مخالفت کی

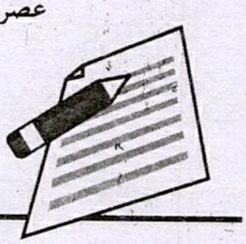

نوٹ

کہ یہ راج ہندوستان پر ایک کمتر درجے کے مادی نظام کو تھوپنا چاہتا ہے جبکہ ہندوستان روحانی وسائل سے مالا مال سرزمین ہے۔ مذہب پر مبنی قوم پرستی کی اس تفہیم کا ایک سیاسی پہلو بھی تھا۔ بال گنگا دھر تلک جیسے رہنما قوم پرستی کے نظریہ کو عام لوگوں تک لے جانا چاہتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہندوستانی سماج میں مذہب ایک زبردست اخلاقی طاقت ہے۔ اسی لیے انھوں نے قوم پرستانہ نظریات کی تبلیغ کے لیے مذہب کے استعمال کا فیصلہ کیا۔ لوگوں سے انہی کی زبان یعنی مذہبی زبان میں بات کرنے کے لیے تلک نے 1893 میں مہاراشٹر کے اندر گن پتی فیسٹول کی شروعات کی تاکہ قوم پرستانہ نظریات کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے ایک مذہبی پلیٹ فارم تیار ہو جائے۔

بیسویں صدی میں قوم پرستی کے بارے میں یہ سوچ دو قسم کی سیاسی حرکتوں پر منتج ہوئی۔ ایک طرف مہاتما گاندھی جیسے رہنماؤں نے قوم پرستانہ تحریک کے لیے مذہب کے استعمال کو خوش آمدید کہا لیکن انھوں نے اس روش کو صرف ہندو مذہب تک محدود نہیں کیا۔ انھوں نے ہندوازم، اسلام اور دیگر مذاہب کی علامات اور ان کی زبان کو استعمال کیا اور اس طرح دیگر مذہبی فرقوں کے ماننے والوں کو ایک قومی تحریک کے دائرہ میں لانے اور ان کے اندر اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ دوسری سوچ اپنی فطرت میں زیادہ خود پسند تھی اس کا اظہار ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ جیسی تنظیموں کی سرگرمیوں میں ہوا۔ ہندو مہاسبھا کے لیڈر اگر اپنی سرگرمیوں کو ہندوؤں تک محدود کرنا چاہتے تھے تو مسلم لیگ کے رہنما فقط مسلمانوں سے ہی مخاطب ہوتے تھے۔ ان کے یہاں ہندوستانی قوم پرستی والی سوچ کبھی پروان نہیں چڑھی، نہ انھوں نے کبھی ہندوستانی لوگوں کے اتحاد کے لیے کوئی کوشش کی اور نہ انھوں نے برطانوی نو آبادیاتی راج کی کسی پائدار مخالفت میں خود کو لگایا۔

آخر میں آپ کے لیے قوم پرستی کی ان مختلف قسموں کے درمیان رشتے کے کچھ پہلوؤں کو سمجھنا ضروری ہے جن کے بارے میں آپ نے اس ماڈل میں پڑھا ہے۔ اگرچہ یہ پہلو ایک دوسرے سے مختلف معلوم ہوتے ہیں لیکن اصل میں ان کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے صرف اس حد تک مختلف ہیں کہ ان کے راستے الگ الگ لیکن عمل ایک ہی ہے۔ وہ کسی بنیادی مفہوم میں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں۔ وہ سب برطانیہ کے نو آبادیاتی راج کے خلاف ہیں لیکن ان کی مخالفت الگ الگ بنیادوں پر مبنی ہے۔ کلچرل قوم پرستی کی وکالت اور حمایت کرنے کا یہ خیال کہ نو آبادیاتی راج نے ہندوستانی کلچر میں مداخلت شروع کر دی تھی جس کی مزاحمت یا جس کا مقابلہ ضروری تھا۔ معاشی قوم پرستی کے مبلغین کا کہنا یہ تھا کہ نو آبادیاتی راج ہندوستانی معیشت کا استحصال کر رہا ہے اور یہی چیز ہندوستانی پسماندگی کی اصل وجہ ہے۔ اس طرح بنکم اور وویکانند جیسے رہنماؤں نے برطانوی راج کی اس بنیاد پر مخالفت کی کہ اس راج نے ہندوستان کے مذہبی وسائل میں تبدیلی اور تحریف کر دی۔ یہ تینوں طرز فکر نو آبادیاتی راج کے اس لیے مخالف تھے کیونکہ اس کا اثر ہندوستان کے لوگوں پر ظاہر ہوا۔ بیسویں صدی میں ان نظریات نے ایک طاقتور استعمار مخالف ہندوستانی قومی تحریک کی تشکیل میں مدد کی جس نے انجام کار نو آبادیاتی راج کو شکست دی اور ہندوستان سے اس کو نکال دیا۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 4.2

1۔ مندرجہ ذیل سوالوں کے جواب دیجیے۔

(i) آریہ سماج کی بنیاد کس نے ڈالی؟

(ii) ہندوستانی لیڈروں کے مطابق مغربی تہذیب کے مرکزی خیالات کیا تھے؟

(iii) اس ہندوستانی لیڈر کا نام بتایئے جس نے عوام تک رسائی حاصل کرنے کے لیے گن پتی فیسٹول شروع کیا؟

2۔ درج ذیل بیانات کو پڑھیے اور ان پر غلط یا صحیح کے نشان لگایئے۔

(i) بنکم چندر نے یہ محسوس کہا کہ مغربی تہذیب کے نظریات کو ہندوستان پر لاگو کیا جا سکتا ہے۔(غلط/صحیح)

(ii) دیانند اور وویکانند جیسے رہنماؤں نے یوروپی کتابوں سے فیض حاصل کیا۔(صحیح/غلط)

(iii) معاشی قوم پرستی، ثقافتی قوم پرستی اور مذہب پر مبنی قوم پرستی نے ایک ہی منزل پر پہنچنے کے لیے مختلف راستے اپنائے۔(غلط/صحیح)

آپ نے کیا سیکھا

اس سبق میں درج ذیل نکات قابل ذکر ہیں:

- قوم پرستی کا نظریہ پہلے انیسوں ی صدی میں یوروپ کے اندر شروع ہوا۔ یہ تیز رفتار انڈسٹیریلائزیشن اور جدید صنعتی معیشت کے پھیلاؤ کا نتیجہ ہے۔
- ہندوستانی قوم پرستی یوروپی قوم پرستی سے نمایاں طور پر مختلف ہے۔ ہندوستان میں قوم پرستی کا نظریہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے آس پاس ہی وجود میں آیا۔
- ہندوستانی قوم پرستی کا نظریہ برطانوی نوآبادیاتی راج کی مخالفت اور ہندوستانی لوگوں کے اتحاد کے جڑواں نظریہ پر مبنی ہے۔

- برطانوی راج کا اثر پہلے کلچر پر نمودار ہوا۔ ہندوستانی رہنماؤں نے یہ دلیل پیش کی کہ برطانوی کلچر کی ہندوستانی کلچر میں مداخلت نقصان دہ ہے اور اسی لیے اس کی مزاحمت ضروری ہے۔

- ابتدائی قوم پرست رہنماؤں نے واضح کیا کہ برطانوی نوآبادیاتی راج کی نوعیت معاشی طور پر استحصال کی ہے اور اسی وجہ سے معاشی قوم پرستی وجود میں آئی۔

- اسی زمانے میں بہت سے رہنماؤں نے ہندوستانی قوم پرستی کو مذہب پر مبنی بتایا اور کہا کہ اس قوم پرستی کے محرکات مذہبی نوعیت کے ہیں۔

- ہندوستانی قومیت کی ترقی نے بیسویں صدی عیسوی میں اپنی بہت سی شاخوں سمیت ایک طاقتور ہندوستانی قوم پرستی کے نظریہ پر مبنی تھی اور اس میں جو عوامی شرکت ہوئی اس نے اس قوم پرستی کے نظریہ کو بڑی تقویت پہنچائی۔ عوام کی فعال شرکت نے ہندوستانی قوم پرستی کو ایک طاقتور اور ناقابل مقابلہ قوت میں بدل دیا اور اسی قوت نے انگریزوں کے نوآبادیاتی راج کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ (اس کے بارے میں آپ اگلے سبق میں پڑھیں گے)

اختتامی سوالات

1۔ انڈسٹیریلائزیشن کس طرح یوروپ میں قوم پرستی کی ترقی پر منتج ہوا؟

2۔ ہندوستانی قوم پرستی یوروپ کی قوم پرستی سے کس طرح مختلف تھی؟

3۔ کلچرل قوم پرستی کی اصلیت و ماہیت کیا ہے؟

4۔ دادابھائی نوروجی اور آرسی دت جیسے رہنماؤں نے معاشی قوم پرستی کی نشوونما میں کس طرح اعانت کی؟

5۔ کن کن طریقوں سے برطانوی نوآبادیاتی راج نے ہندوستانی معیشت کو عظیم برطانیہ کا غلام بنادیا؟

6۔ دیانند سرسوتی، وویکانند اور اوروبند گھوش جیسی رہنماؤں کی نظر میں قوم پرستی اور مذہب کے درمیان کیا رشتہ ہے؟

7۔ ہندوستانی قوم پرستی کی ترقی ہندوستانی قومی تحریک کی ترقی سے کس طرح مربوط ہے؟

نوٹ

متن پر مبنی سوالوں کے جواب

20.1

1- (i) غلط (ii) صحیح (iii) صحیح (iv) صحیح

2- (i) برطانوی نوآبادیاتی راج کی مخالفت اور

(ii) ہندوستانی لوگوں کا اتحاد

20.2

1- (i) راجہ رام موہن رائے

(ii) ایشور چندر ودیا ساگر

(iii) برہموسماج

2- روایتی ہندوستانی کلچر کے کچھ عناصر کی مخالفت اور نوآبادیاتی کلچر کی ہندوستانیوں کی زندگی میں مداخلت

20.3

1- (i) دادا بھائی نوروجی، آرسی دت، مہادیو گووندرانا دے وغیرہ

(ii) نکاس کے نظریہ کا مطلب تھا تجارت اور صنعت کے ذریعے نیز ہندوستان میں مقرر برطانوی افسروں کی تنخواہوں کے ذریعے ہندوستان کی دولت کا انگلینڈ کو منتقل ہونا۔ اس نظریہ کو دادا بھائی نوروجی نے پیش کیا تھا۔

(iii) معاشی قوم پرستی کی اہمیت یہ تھی کہ اس نے اس باطل خیال کی منہدم کر دیا کہ برطانوی نوآبادیاتی راج ہندوستانی لوگوں کے مفاد میں کام کر رہا ہے۔

(iv) قومی تحریک کے رہنماؤں نے معاشی قوم پرستی کے نظریات کو برطانوی نوآبادیاتی راج کے خلاف ہندوستانی لوگوں کو تیار کرنے کے لیے استعمال کیا۔

2- (i) غیر مساوی تجارت

(ii) Poverty and the un-British rule in India

(iii) ایک تہائی

(iv) خام مال

20.4

1۔ (i) دیانند سرسوتی

(ii) انفرادیت پسندی، سیکولرزم، ریشنلزم

(iii) بال گنگا دھر تلک

2۔ (i) غلط (ii) غلط (iii) صحیح

اختتامی سوالات کے اشارے

1۔ دیکھیے 20.1 پیرا 2

2۔ دیکھیے 20.1 پیرا 5

3۔ دیکھیے 20.2

4۔ دیکھیے 20.3 پیرا 1 اور 2

5۔ دیکھیے 20.3 پیرا 3 اور 4

6۔ دیکھیے 20.4 پیرا 1 اور 2

7۔ دیکھیے 20.4 پیرا 7 (آخری پیرا)

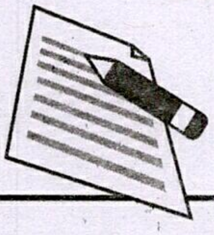

نوٹ

21

ہندوستانی قومی تحریک

(Indian National Movement)

ہماری آزادی کی تحریک کوئی یکساں سادی سی کہانی نہیں ہے۔ اس کہانی کی کئی مختلف کڑیاں یا کئی ایسے عناصر ہیں جو ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہیں اور ان ہی سے ہماری جنگ آزادی اپنے آغاز و انجام کے مراحل طے کرتی ہے۔ اعتدال پسندوں(Moderates) کی کوششوں نے قانونی اور دستوری تبدیلیوں کی راہ ہموار کی۔ انقلاب پسندوں کے جوش وخروش نے بہادرانہ کارناموں اور انقلابی جدو جہد کا راستہ دکھایا۔ مہاتما گاندھی نے جس عوامی تحریک پر زور دیا تھا اس کو ہندوستانی آبادی کے تمام طبقوں کی حمایت حاصل تھی۔ جو بھی تحریک شروع ہوئی اس نے دوسری تحریکوں کو تعاون بھی دیا اور تقویت بھی پہنچائی اور ان سب کے نتیجے میں بالاخر آزادی کی منزل ملی۔ اس سبق میں ہم ان مختلف تحریکوں کا مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ ہر ایک تحریک نے کس طرح دوسری تحریکات پر اثر ڈالا اور کس طرح ایک مشترکہ مقصد یعنی آزادی حاصل ہوئی۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ

- تحریک آزادی ہند کے بارے میں ایک مجموعی نظریہ قائم کرسکیں گے؛
- اس تحریک کی مختلف کڑیوں کو تاریخی ترتیب کے لحاظ سے متعین کرسکیں گے اور اسی ترتیب سے ان کی نشاندہی کرسکیں گے؛
- اور یہ پتہ لگاسکیں گے قومی تحریک کے مختلف عناصر نے ایک دوسرے کو کس طرح متاثر کیا۔

21.1 انڈین نیشنل کانگریس اور ابتدائی قوم پرست
(The Indian National Congress and the Early Nationalis

انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل دسمبر 1885 میں ان 72 ہندوستانیوں نے کی جو سیاسی طور پر باشعور اور تعلیم یافتہ ہندوستانی تھے۔ انڈین سول سروس کے ایک ریٹائرڈ انگریز افیسر مسٹر اے او ہیوم (A O Hume) نے اس کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس کانگریس کے ممبران میں فیروز شاہ مہتہ، بدرالدین طیب جی، ڈبلیوسی بنرجی، سریندر ناتھ بنرجی، آنند موہن بوس اور رمیش چندر دت شامل تھے۔ یہ تنظیم ہندوستانی لوگوں کی کوئی پہلی تنظیم نہ تھی۔ ہندوستان کا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ آہستہ آہستہ سیاسی طور پر باشعور ہوتا جا رہا تھا اور 1885-1875 کے درمیان کئی سیاسی انجمنیں قائم ہو چکی تھیں۔ کلکتہ کے دوارکا ناتھ گنگولی، پونا کے رانا ڈے اور جی وی جوشی، ممبئی کے کے ٹی تلنگ اور مدراس کے جی سبرامنیم ایر اور ویراگھوا چاری پہلے سے ہی علاقائی سیاسی انجمنوں سے وابستہ تھے۔ ان کی تنظیموں کے نام بالترتیب انڈین ایسوسی ایشن، پونا ساروجنک سبھا، بمبئی پریزیڈینسی ایسوسی ایشن اور مدراس مہاجن سبھا تھے۔ ان ایسوسی ایشن کا ایجنڈا محدود تھا اور مکمل آزادی کے نظریہ سے دور تھا۔ یہ انجمنیں نوآبادیاتی حکومت کی ان پالیسیوں کے خلاف اپنی آواز اٹھاتی تھیں جو ہندوستانیوں کے مفادات کو نقصان پہنچانے والی تھی۔ ان ایسوسی ایشنوں سے وابستہ ابتدائی قوم پرست جو بنیادی مسائل اٹھاتے تھے وہ حسب ذیل تھے۔

(a) کاٹن کی درآمدی ڈیوٹیاں ایسی بنائی جائیں جو ہندوستان کے مفاد میں ہوں

(b) سرکاری نوکریوں کو ہندوستانی (Indiamized) بنایا جائے

(c) برطانوی حکومت کی افغان پالیسی کی مخالفت

(d) ورناکیولر پریس ایکٹ اور پریس پر کنٹرول کی مخالفت

انڈین نیشنل کانگریس دیگر ایسوسی ایشنوں سے مختلف تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ہندوستانی لوگوں کو ایک مشترکہ سیاسی پلیٹ فارم مہیا کرنے کی کوشش کی اور اسی کی بنیاد پر اس کانگریس نے ملک کی نمائندگی کا دعوا بھی کیا۔ اگرچہ برطانوی حکومت نے آئی این سی (انڈین نیشنل کانگریس) کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن آئی این سی کسی نہ کسی طرح لوگوں کے جذبات یا آرزوؤں کی نمائندگی کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اسی لیے اس تنظیم کا سب سے اہم اور اولین مقصد لوگوں میں یہ شعور پیدا کرنا تھا کہ ہم ایک قوم ہیں۔ یہ کام بڑا صبر آزما تھا کیونکہ ملک میں بہت سی مختلف ثقافتی لسانی اور مذہبی روایات موجود تھیں۔ ان تمام قوتوں کو ایک مشترکہ دشمن "برطانوی سامراج" کے خلاف متحد کرنا تھا۔

شروع میں آئی این سی کے بانیوں کو یہ امید تھی کہ وہ نوآبادیاتی حکومت پر ان امور میں اپنا اثر ڈال لیں گے جنھوں نے ملک کی خوشحالی یا ملک کی صحت مندی کو متاثر کر رکھا ہے اور خاص طور پر ملک کی معاشی فلاح و بہبود کے معاملک میں وہ ضرور حکومت پر اپنا اثر ڈال سکیں گے۔ ان کو توقع تھی کہ اگر قوم کے مسائل اور مشکلات مناسب

نوٹ

طریقے سے پیش کی جائیں تو نوآبادیاتی حکومت مسائل کے حل کرنے کے لیے قدم اٹھائے گی۔ اس طرح شروع کے سالوں نیں لیکچروں کے ذریعہ اور اخبارات میں مضامین لکھ کر قوم پرستوں نے قوم کے اہم مسائل کو پیش کیا اور وہ طریقے بھی بیان کیے جن کے ذریعہ ان مسائل کو حل کیا جا سکتا تھا۔ ان اعتدال پسند کہلائے جانے والوں یا کانگریس کے اولین ممبروں کی معاشی تنقیدات ان کی بہت بڑی دین ہے۔ پہلے دادا بھائی نوروجی نے اور اس کے بعد دوسرے قوم پرستوں نے یہ محسوس کیا کہ معاشی انقلاب لانے کے بجائے برطانوی راج ہندوستان کو اور زیادہ غریب بنا رہا ہے اور ملک کی دست کاری کی صنعت کو بھی برباد کر رہا ہے حالانکہ اس روشن فکر طبقے کو ایک معاشی انقلاب کی امید تھی۔ اس انکشاف سے ابتدائی قوم پرستوں کے ان خیالات کو دھچکا لگا جن کو یہ امید تھی کہ برطانوی راج کے نتیجے میں ہندوستان میں ماڈرنزائزیشن آجائے گا۔ کانگریس کے دیگر سروکار حسب ذیل تھے:

(i) ہندوستانی نمائندوں کے لیے زیادہ اختیارات والی سپریم اور مقامی قانون ساز کونسلوں کی اصلاح

(ii) سول سروسز کو ہندوستانی بنانا اور ان کے امتحانات کو انگلینڈ اور ہندوستان دونوں میں بیک وقت منعقد کرنا

(iii) ان جنگلاتی قوانین میں تبدیلیاں لانا جن کا ہندوستانی لوگوں پر اثر پڑتا ہے

(iv) آسام کے چائے باغات میں اقرار نامے لکھوا کر مزدوری کرانے کے خلاف مہمیں چلانا

رفتہ رفتہ ایسے نوجوان لیڈر بھی اب میدان میں آنے لگے جو یہ سمجھتے تھے کہ نوآبادیاتی حکومت سے ہندوستان اور یہاں کے لوگوں کو کوئی مثبت فائدہ ہونے والا نہیں ہے اور نوآبادیاتی راج کا خاتمہ ہی وہ راستہ ہے جس پر ہندوستان کو آگے بڑھنا ہے۔ اس طرح ان رہنماؤں کا ایک نیا گروپ پیدا ہو گیا جو "اعتدال پسندوں" کے درخواست اور عرض معروض کو ناپسند کرتا تھا۔ اوروبندو گھوش، اشونی کمار دت، لاجپت رائے اور بی جی تلک وغیرہ نئی نسل کے لیڈر تھے جو سوراج یا سودیشی کے اپنے مقصد کے لیے عوامی حمایت جٹانا چاہتے تھے۔

21.2 سودیشی اور بائیکاٹ - انتہا پسندانہ سیاست
(Swadeshi and Boycott- The Extremist Politics)

1885-1905 کے درمیانی مرحلے کو اعتدال پسندوں کا دور کہا جاتا ہے۔ 1905 میں اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ کرزن نے بنگال کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ اس زمانے میں صوبہ بنگال موجودہ مغربی بنگال، بہار، جھارکھنڈ، اڑیسہ اور آسام کی ریاستوں پر مشتمل تھا۔ اس میں موجودہ بنگلہ دیش بھی شامل تھا اور درحقیقت یہ صوبہ انتظامی لحاظ سے ایک بہت بڑی اکائی تھا۔ لیکن جس طریقے سے یہ تقسیم کی گئی اس سے برطانیہ کی تفرقہ ڈالنے حکمت دل ظاہر ہوتی تھی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ یہ تقسیم مذہب کی بنیاد پر تھی۔ جن علاقوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی ان کو مسلم اکثریت والے علاقوں سے الگ کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ نئے ابھرنے والے دانشوروں (انگریزی تعلیم یافتہ اعلی ذات کے ہندو) کے شہری مرکزی علاقوں کو کو بھی زراعتی علاقوں (خاص طور پر جوٹ پیدا کرنے والے علاقوں)

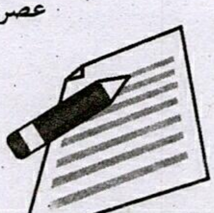

نوٹ

سے الگ کردیا گیا۔ اس کا مقصد ع کلکتہ کی اہمیت کو کم کرنا تھا کیونکہ کلکتہ میں ہی تمام بنگال کے دانشور ملتے ملاتے اور ایک دوسرے کے ساتھ افادہ اور استفادہ میں مشغول ہوتے تھے۔ تقسیم کے اس اعلان کے بعد دور دور تک احتجاج ہوئے۔ شروع میں یہ احتجاج اعتدال پسندوں والی درخواستوں اور عرض ومعروض کی تکنیک پر رہے اور نوآبادیاتی حکومت کو عریضے اور یاد داشتیں (Memoranda) بھیجی گئیں، تقریریں کی گئیں، عوامی جلسے کے گئے اور دیگر مہمیں چلائی گئیں۔ ان سب کا مقصد ہندوستان اور انگلینڈ میں عوامی رائے کو متاثر کرنا تھا۔ ان تمام کوششوں کے باوجود بھی جولائی 1905 میں بنگال کی تقسیم کا اعلان کردیا گیا۔

جیسے ہی تقسیم کا رسمی اعلان ہوا بنگال میں احتجاجوں کا سلسلہ پھوٹ پڑا۔ تمام بنگال میں احتجاجی جلسے ہوئے اور اہم بات یہ تھی کہ کلکتہ ہی میں نہیں بلکہ دیناج پور، پابنا، فرید پور، ڈھاکہ اور باری سال وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے اندرونی شہروں میں بھی احتجاج ہوئے۔ ان ہی میں سے ایک جلسے میں پہلی بار انگریزی سامان کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا۔ کلکتہ ٹاؤن ہال کے ایک جلسہ میں جہاں بکھری ہوئی قیادت کا ایک اجتماع ہو گیا تھا بائیکاٹ کا ایک ریزولیشن پاس کرکے 7 اگست 1905 کو سودیشی تحریک کا باقاعدہ اعلان کردیا گیا۔ 16 اکتوبر 1905 کو جب یہ تقسیم لاگو ہوئی تو کلکتہ میں عام ہڑتال ہوئی اور ایک یوم سوگ کا اعلان کیا گیا۔ اس دن لوگوں نے فاقہ کیا اور کسی چولھے میں آگ نہ جلی۔ لوگوں نے وندے ماترم گاتے ہوئے سڑکوں پر پیریڈ کی۔ بنگال کے لوگوں نے اتحاد کی نشانی کے طور پر ایک دوسرے کی کلائی پر راکھیاں باندھیں۔ سودیشی اور بائیکاٹ جیسے عوامی احتجاج کی اس انوکھی شکل کو ان کانگریسی رہنماؤں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی جو اپنی کوششوں کا ایک مثبت ردعمل دیکھنے کے لیے اعتدال پسندوں سے کہیں زیادہ بے چین تھے۔ لوک مانیہ تلک بدیسی مال کے بائیکاٹ اور سودیشی کا پیام لے کر بمبئی اور پونا گئے، اجیت سنگھ اور لاجپت رائے اس کو پنجاب اور شمالی ہندوستان کے دیگر حصوں میں لے گئے۔ سید حیدر رضا اس پیام کو دلی لائے اور چدمبرم پلائی مدراس پریزیڈنسی لے کر پہنچے۔ مدراس پریزیڈنسی پہلے ہی سے بپن چندر پال کے تقریری دورے سے متاثر ہو چکی تھی آئی این سی نے 1905 کے بنارس اجلاس میں سودیشی کے مطالبہ کو پاس کیا۔ اس اجلاس کی صدارت جی کے گوکھلے نے کی تھی۔ اگرچہ کانگریس نے بنگال میں سودیشی تحریک کی حمایت کی لیکن اس نے تمام ہندوستان میں اس تحریک میں شدت پیدا کرنے یا مکمل آزادی کے کاز کو توسیع کے پروگرام پر غور نہیں کیا تھا۔ جبکہ تلک، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور اوروبندو گھوش جیسے انتہا پسند لیڈر یہی چاہتے تھے۔ ان انتہا پسندوں کے اسی دباؤ کا نتیجہ ہوا کہ دادا بھائی نوروجی کلکتہ میں ہونے والے کانگریس کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا آخری مقصد ''اپنی حکومت یا سوراج'' ہے۔

سودیشی تحریک کی سب سے اہم دین احتجاج کرنے نئے طریقوں کی شروعات تھی۔ احتجاجوں کی یہ شکلیں ان طریقوں کے ابتدائی روپ تھے جنھیں بعد میں گاندھی جی نے اپنی ستیہ گرہ کے دوران اختیار کیا۔ احتجاج کی یہ نئی شکلیں تھیں: عوامی جلسے، جلوس، غیر ملکی چیزوں کا بائیکاٹ (بعد میں سرکاری اسکولوں، کالجوں، عدالتوں، سرکاری خطابات اور سرکاری نوکریوں وغیرہ سبھی کا بائیکاٹ شامل ہوگیا)، ہڑتالیں، غیر ملکی مال کو عوام کی عوامی ہولی جلانا اور

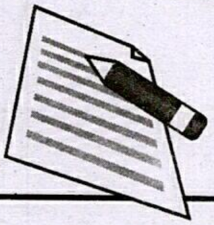

نوٹ

غیر ملکی مال بیچنے والوں کا گھیراؤ وغیرہ۔ عوام کو متحرک بنانے کے لیے کوشش کی گئیں اور سمیتیاں بنائی گئیں اور ان سمیتیوں کے ذریعے سودیشی کا پیغام بنگال کے اندرونی حصوں تک پہنچانے کا کام لیا گیا۔

قومی تحریک میں پہلی بار لوگوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے روایتی اور مقبول تہواروں کا استعمال کیا گیا۔ تلک نے اس تحریک کو عوام تک پہنچانے اور ان کو اس معاملے میں تعلیم دینے کے لیے مہاراشٹر میں گن پتی اور شواجی فیسٹیول شروع کیے۔ بنگال میں لوگوں کے اندر جوش وخروش پیدا کرنے کے لیے سودیشی گانوں کا استعمال کیا گیا، لوگوں میں قوم پرستی کے جذبات پھیلانے کے لیے تھیٹر کی وہ مقبول شکل جسے 'جاترا' کہا جاتا ہے شروع کی گئی ہے۔

انجام کار نوآبادیاتی حکومت نے جس شکل میں تقسیم کو لاگو کیا تھا اس کو واپس لینے پر مجبور ہوگئی۔ بہرحال انگریزوں نے کلکتہ اور وہاں کے روشن خیال لوگوں کی اہمیت کم کرنے کے لیے 1911ء میں راجدھانی دہلی میں منتقل کرنے کا اعلان کر دیا۔

متن پر مبنی سوالات 21.1

1۔ انڈین نیشنل کانگریس کب بنی؟ اس کی تشکیل میں کس انگریز افسر نے اہم کردار ادا کیا؟

____

2۔ بنگال کی تقسیم کا کس نے اور کب اعلان کیا؟

____

3۔ قوم پرستانہ جذبات کو پھیلانے میں عوامی تھیٹر کی کس شکل کا استعمال کیا گیا؟

____

4۔ 1911 میں راجدھانی کو کلکتہ سے دلی منتقل کرنے کا اہم سبب کیا تھا؟

____

21.3 ہند اور بیرون ہند میں انقلابی تحریک کا پہلا مرحلہ (First Phase of the Revolutionary Movement in India and Abroad)

کانگریس میں اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے درمیان خلیج بڑھتی چلی گئی۔ انتہا پسند اسمبلی انتخابات کا بائیکاٹ کرنا چاہتے تھے جو نوآبادیاتی حکومت کے ذریعہ شروع کی گئی دستوری اصلاحات کے تحت منعقد کرائے جانے تھے۔ اعتدال پسند یہ چاہتے تھے کہ چاہے محدود پیمانے پر ہی سہی لیکن الیکشن کے عمل میں حصہ لیا جائے بالآخر اس اختلاف

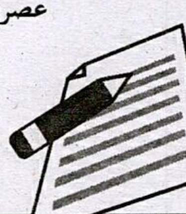

نوٹ

کا نتیجہ یہ نکلا کہ 1907 میں کانگریس کے اجلاس سورت میں کانگریس دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ انتہا پسند رہنما عوام کو متحرک بنانے میں لگے رہے جبکہ کانگریس اس کوشش میں لگی رہی کہ حکومت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہو۔ 1909 کی مورلی-منٹو اصلاحات (Morely-Minto Reforms) سے اعتدال پسندوں کی امیدوں کو ایک اور دھچکا لگا۔ سودیشی تحریک میں اب کوئی حرکت باقی نہ تھی۔ البتہ تحریک کے انقلابی پیغام نے ایک اور منفرد قسم کے احتجاج یعنی انقلابی تحریک کو زندگی بخشی۔

انقلابیوں کا مقصد اپنی انتہائی قربانیوں کے ذریعے برطانوی راج کا خاتمہ کرنا تھا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ ان غیر مقبول انگریز افسروں کو قتل کر دیتے تھے جو حکومت کی زور وظلم کی پالیسیوں کو لاگو کرنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ عوامی تحریکوں کے خلاف حکومت دوطرفہ پالیسی چلائی تھی ایک رف تو حکومت دستوری اصلاحات لاگو کر کے ان رہنماؤں کو محدود انتخابات میں شرکت کے لیے دعوت دے کر ان کو مراعات دیتی اور دوسری طرف خاص طور پر اہم لیڈروں کو گرفتار کر کے بڑے پیمانے پر جبر کرتی۔ انتہا پسند رہنماؤں نے کئی کئی سال جیلوں میں گزارے۔ کبھی جیل میں اور کبھی جیل سے باہر رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلابی تحریک زیادہ تر انڈر گراؤنڈ رہی اور انھوں نے خفیہ تنظیموں کے ذریعہ اپنے کام انجام دیے۔ ان تنظیموں کی ابتداء سودیشی زمانے کی سمیتیوں میں پوشیدہ ہے۔

1908 میں خودی رام بوس اور پرفل چاکی نے ایک گاڑی پر بم پھینکا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ مظفر پور کے عوام دشمن جج کنگس فورڈ (Kingsford) کی ہے۔ بہرحال انھوں نے اس کی جگہ دو انگریز خواتین کو قتل کر دیا۔ چاکی نے خود کو گولی ماری اور خودی رام کو پھانسی ہوگئی۔ انقلاب پسندوں نے جن کا تعلق خاص طور پر انوشیلن اور یگانتر سمیتیوں سے تھا اپنی تحریک کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے ڈکیتیاں بھی ڈالیں۔ انقلابی تحریک فقط بنگال تک محدود نہ تھی۔ راس بہاری بوس (Rasbehari Bose) اور سچندر ناتھ سانیال نے ایک ایسا انقلابی جال پھیلایا تھا جو پنجاب، اتر پردیش اور دہلی کے علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ 1912 میں ان دونوں انقلابیوں نے دہلی میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ پر جان لیوا حملہ کیا جس میں لارڈ ہارڈنگ بچ گئے۔

یہ انقلابی تحریک جلدی ہی ہندوستان سے باہر بھی پھیل گئی۔ شیام جی کرشن ورما نے 1905 میں لندن میں ہندوستانی طلبا کے لیے ایک سینٹر قائم کیا تھا جس کا نام انڈیا ہاؤس تھا۔ 1907 میں اس تنظیم کو وی ڈی ساورکر کے تحت ایک انقلابی گروپ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس تنظیم کے مدن لال ڈھینگرہ نے 1909 میں لندن کے اندر ہندوستان کے ایک بیوروکریٹ آفیسر کرزن ویلی (Curzon Wyllie) کو قتل کر دیا۔ یوروپ (پیرس اور جینوا) میں ایک پارسی انقلابی مادام گاما نے فرانسیسی سوشلسٹوں کے ساتھ تعلقات قائم کیے اور 'بندے ماترم' نامی ایک جرنل نکالا۔ برلن میں ویریندر چٹوپادھیائے اور کچھ دیگر لوگوں نے 1909 سے چلایا۔ برطانیہ اور یوروپ میں انقلابی گروہ الگ تھلگ پڑے ہوئے تھے۔ بہرحال ریاست ہائے متحدہ امریکہ خاص طور پر برطانوی کولمبیا اور ساحل بحرالکاہل کی ریاستوں میں اس تحریک نے عوام میں اپنی جگہ بنائی۔ ان ریاستوں کی آبادی پندرہ ہزار ہندوستانیوں کی تھی جس میں خاص طور پر سکھ فرقے کے وہ لوگ تھے جو اچھے تاجر اور اچھے کاریگر ہونے کے باوجود نسلی امتیاز کا

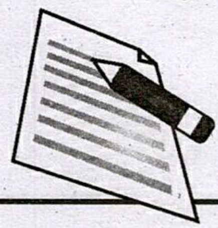

نوٹ

بہت زیادہ شکار تھے۔ 1913 میں سان فرانسسکو شہر کے اس فرقے کی آبادی میں غدر کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کی بنیاد سوہن سنگھ بھکنا نے ڈالی اور ہردیال اس کے بہت ممتاز رہنما ہوئے۔

1914 میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی اور اس میں انقلابیوں نے محسوس کیا کہ مکمل آزادی کے ایجنڈے کو پاس کرانے کا بہترین موقع ہے۔ برطانیہ جنگ کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا اور ہندوستان سے سپاہی اس مقصد کے لیے بھیجے جا رہے تھے۔ جرمن جیسے دشمن ملک بھی برطانیہ کو کمزور کرنے کے لیے انقلابی سرگرمیوں کی مالی مدد کرنے کے خواہشمند تھے۔ ترکی کے اوپر برطانوی حملے سے پان اسلامی ہمنواؤں کی حمایت ترکی کو حاصل ہوئی کیونکہ ترکی خلافت کا مستقر (Seat) تھا اور دنیا بھر کے مسلمان خلافت کا احترام کرتے تھے۔ برکت اللہ ایک اہم مسلمان انقلابی لیڈر تھے جنھوں نے غدر تحریک میں شرکت کر لی تھی۔ اسلامی علوم کے مرکز اتر پردیش کے شہر دیوبند میں علما کے ایک گروپ نے بھی انقلابی پیغام کی تبلیغ کی۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے اس پیغام کو قبول کیا۔

اسی دوران سودیشی ڈکیتیاں اور انگریزوں کا قتل جاری رہا اور اس زمانے میں انقلابی سرگرمیوں میں نمایاں اضافہ ہوا۔ بنگال کی انقلابی تنظیمیں جتن مکھرجی (باگھا جتن) کی قیادت میں متحد ہوگئیں اور انھوں نے ہتھیاروں پر قبضے اور ریل مواصلات میں توڑ پھوڑ کی بڑے پیمانے میں پلاننگ کی۔ کلکتہ کی رھودا کمپنیوں (Rhoda Firms) کے ہتھیاروں اور گولہ بارود کی بڑی مقدار جب ہاتھ میں آئی تو اس وقت ان کو بڑی کامیابی ملی۔ لیکن جب پولس نے بالاسور (اڑیسہ) میں باگھا جتن کو گرفتار کر لیا تو ان کی لمبی مدت کی منصوبہ بندی مختصر ہوگئی۔ راس بہاری بوس اور سچن سابیال کا بھی بنگال کی انقلابی تحریک کا حصہ تھے۔ غدر تحریک سے وابستہ لوگوں نے بڑی تعداد میں ہندوستان واپس آنا شروع کر دیا تھا۔ کوماگاتا مارو (Komagata Maru) کے واقعے نے جذبات کو اور بھڑایا۔ کوماگاتا مارو جہاز کو جو سکھوں اور مسلمانوں کو کینیڈا لے جا رہا تھا اور کنیڈا کی سرکار نے جس کو واپس کر دیا تھا ستمبر 1914 میں کلکتہ پہنچا۔ اس کے مسافر پولس سے بھڑ گئے اور اس حادثہ میں 22 لوگوں کی موت واقع ہوگئی۔

چونکہ برطانوی حکومت ان لوگوں کے ساتھ انتہائی سختی سے پیش آئی اس لیے غدر تحریک اور انقلابی منصوبے ناکام ہوگئے۔ غدر تحریک سے وابستہ جو لوگ واپس آئے وہ فوراً ہی گرفتار کر لیے گئے۔ کئی فوجی اکائیوں میں بغاوت بھڑکانے کی کوشش کو ناکام بنا دیا گیا راس بہاری جاپان کی طرف فرار ہوگئے اور سچن سانیال کو کالا پانی بھیج دیا گیا۔ انقلابی اور خاص طور پر غدر تحریک سے وابستہ لوگ فوجی اکائیوں اور کسانوں میں انقلابی کارروائیوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔

21.4 ہوم رول تحریک (Home Rule Movement)

بال گنگا دھر تلک 1808 سے 1814 تک جیل میں گذارنے کے بعد کانگریس میں لوٹے جو مورلے منٹو اصلاحات (Morly Minto Reforms) کے تحت کونسل انتخابات میں ناامیدی کے بعد اب ان کے لیے زیادہ موزوں

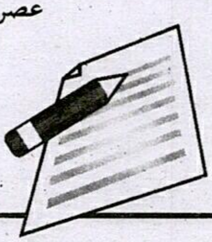

نوٹ

تھی۔ 15-1914 تک سودیشی تحریک، کونسل میں داخلے کی کوششیں، اندرونی طور پر انتظامیہ کو متاثر کرنے کی کوششیں اور انقلابی تحریک سبھی ختم ہو چکی تھیں۔ اب وہ اینی بیسینٹ(Anni Besant) اور تلک کی نئی ہوم رول تحریک(Home Rule Movement) کی شکل میں سامنے آئی تھی۔ تلک نے اپنی ہوم رول لیگ کے ذریعے ایک قسم کی جدوجہد شروع کرنے کے لیے کانگریس کے اندر ہی کام کرنا شروع کیا۔ یہ ہوم رول لیگ 1916 میں قائم کی گئی تھی۔ اسی زمانے میں ایک تھیوسوفی رہنما(Theosophist leader) اینی بیسنٹ نے بڑی اہمیت حاصل کرلی اور انھوں نے ہندوستانیوں کے لیے اپنی حکومت کے ایک بڑے مقصد کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ بیسنٹ نے آئرلینڈ کی ہوم رول تحریک کی طرز پر بیداری پیدا کرنے کے لیے اپنے ملک میں ہوم رول لیگ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ بیسنٹ کی یہ لیگ ستمبر 1916 میں قائم ہوئی۔

تلک کی یہ لیگ مہاراشٹر اور کرناٹک میں بہت فعال تھی۔ بیسنٹ کی اس لیگ کا ہیڈکوارٹر مدراس کے ادیار (Adyar) میں تھا اور ملک گیر پیمانے پر اس کے مقلدین کی جماعت تھی۔ ہوم رول لیگ رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے شہروں میں مباحثے کراتی، ریڈنگ روم قائم کرتی، پمفلٹ تقسیم کراتی اور تقریروں کا بندوبست کراتی تھی۔ ہوم رول کی تحریک نے کبھی مکمل آزادی کی بات نہیں کہی۔ البتہ ان لوگوں نے حکومت کی پالیسیوں مثلاً جنگلاتی قوانین، شراب کے متعلق قوانین وغیرہ کی مخالفت کرکے نوآبادیاتی پالیسی کے جور و جبر پر توجہ مبذول کی۔ اس دور میں قوم پرست تحریک کے رہنماؤں کی ایک نئی نسل وجود میں آگئی تھی اور تحریک کا مرکز بنگال اور پنجاب سے ہٹ کر مہاراشٹر اور جنوب ہوگیا تھا۔ بہت سے اعتدال پسند کانگریسی بھی ہوم رول تحریک میں شامل ہوگئے لیکن 1918 میں ہوم رول تحریک کا اچانک خاتمہ ہوگیا۔

متن پر مبنی سوالات 21.2

1۔ سان فرانسسکو شہر میں غدر تحریک کی بنیاد کس نے ڈالی؟

2۔ کوماگاتا مارو واقعہ کیا تھا؟

3۔ انقلاب جرنل کس نے نکالا تھا؟

4۔ اینی بیسنٹ اور تلک نے کون سی تحریک شروع کی تھی؟

نوٹ

21.5 گاندھی جی کی عوامی تحریک : ابتدائی سال
(The Gandghian Mass Movement: The Initial Years

1919 میں برطانوی حکومت نے دستوری اصلاحات (The Montague-Chelmsford Reforms) کی ایک نئی پہلی کی۔ دعویٰ تو یہ کیا گیا تھا کہ ان اصلاحات سے لوکل سیلف حکومت کا قیام ہوگا اور ہندوستانیوں کو قابل لحاظ خودمختاری حاصل ہوگی لیکن اصل اختیارات انگریزوں کے پاس ہی رہے۔ ان اصلاحات کے ذریعے جو دوعملی (Dyarchy) نظام شروع کیا گیا اس سے ہندوستانیوں کو زیادہ نمائندگی اور مقامی خرچ پر زیادہ کنٹرول ملا لیکن منتخب مقنّنہ (Elected legislative) کا انتظامیہ پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔

زمانۂ مابعد جنگ (پہلی جنگ عظیم 1918 میں ختم ہوئی) میں ملک کے اندر بے چینی میں اضافہ ہو گیا کیونکہ ہندوستان کی معیشت پر جنگ کے اثرات اور زیادہ ظاہر ہونے شروع ہوگئے۔ جنگ کے نتیجے میں قیمتوں میں اضافہ ہوا، چیزوں کی ارزانی ہوئی اور بے روزگاری بڑھی اور ان سب پر مستزاد انفلوئنزا کی وبا پھیل گئی۔ زمانۂ جنگ کی ضروریات سے ہندوستان میں ایک طرف تو تاجروں کا طبقہ پیدا ہوا اور دوسری طرف ایسا کامگار طبقہ (Working Class) وجود میں آیا جو زیادہ منظم ہوتا گیا۔ یہ کامگار طبقہ سرکش بھی تھا کیونکہ وہ کامگاروں کی اس قوت کو کنٹرول کرنے میں مدد کرتا تھا۔ بہرحال، ان ہی میں کچھ ایسے بھی تھے جو قوم پرستانہ تحریک کے حامی تھے۔ وہ لوگ نوآبادیاتی حکومت کی پالیسیوں کے مخالف تھے اور سمجھتے تھے کہ برطانوی پالیسی ہندوستانی صنعت کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگی۔

ایسے پرآشوب زمانے میں ایم کے گاندھی کی آمد سے قوم پرستانہ تحریک کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ گاندھی جی 1915 میں ہندوستان آئے اور زمانہ مابعد میں انھوں نے ہندوستان میں موجود توانائی کو استعمال کرنے کے لیے خود اپنے طریقوں کو اپنایا کیا۔ ان کا طریقۂ کار کچھ خاص مسائل اور قوانین پر توجہ مرکوز کرنا تھا اور پھر نظم وضبط رکھنے والے لوگوں کی مدد سے ان قوانین کی مزاحمت اور خلاف ورزی کو منظم کرنا تھا۔ گاندھی جی کی تحریک کی اہمیت یہ تھی کہ انھوں نے توجہ کچھ خاص مسئلوں پر ہی مرکوز رکھی۔ گاندھی جی نے شروع میں چمپارن، کھیڑا اور احمد آباد میں تین تحریکوں میں کامیابی حاصل کی۔ پہلی دو تحریکیں تو کسانوں کی تحریکیں تھیں اور آخری احمد آباد کے مل مزدوروں کی ایک ہڑتال تھی۔

چمپارن کے کسان کھیتوں پر قابض ان یوروپین لوگوں کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے جو ان کسانوں نیل کی بوائی مجبور کرتے تھے۔ چمپارن میں ان یوروپیوں کے خلاف کسانوں کی بے چینی کی بھی ایک تاریخ ہے۔ کسانوں کا ایک لیڈر راج کمار شکلا چل کر لکھنؤ پہنچا اور گاندھی جی کو ان کسانوں کی حالت دیکھنے کے لیے دعوت دی۔ گاندھی جی نے 1917 میں معاملے کی تحقیق کے لیے ایک کھلی انکوائری قائم کردی۔ چمپارن تحریک کی اس وقت اور زیادہ پبلسٹی ہوئی جب گاندھی کے اس علاقے میں داخلے پر پابندی لگادی گئی اور پھر ستیہ گرہ کی دھمکی پر وہاں جانے بھی دیا گیا۔ چمپارن تحریک کا نتیجہ یہ ہوا کہ تنکا تھیا (Tinkathia) سسٹم کا خاتمہ کر دیا گیا۔ تنکاتھیا سسٹم کے تحت کسانوں کو اپنی زراعتی زمینوں کے 3/20 حصے میں نیل کی بوائی کرنی ہوتی تھی۔

نوٹ

اس کے بعد جس تحریک میں گاندھی جی شامل ہوئے وہ احمد آباد کے مل ورکرز کی جدوجہد تھی۔ مل مزدوروں اور مل مالکان کے درمیان جھگڑا ''طاعون بونس'' کے واپس لے لینے پر شروع ہوا۔ جب یہ وبا ختم ہوگئی تو مل مالکان نے بونس کو واپس لے لیا اور نتیجہ میں ورکرز نے اس واپسی کی مخالفت کی کیونکہ جنگ کے بعد قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ مالکان نے اچانک اس بہانے ثالثی کے فیصلے سے خود کو الگ کرلیا کہ کچھ ورکرز نے ہڑتال کردی ہے۔ مل مالکان نے یہ اعلان کیا کہ وہ بونس کا صرف 20 فیصد دے سکتے ہیں اور یہ بھی دھمکی دی کہ جو ورکر حکم عدولی کریں گے ان کی نوکری ختم کردی جائے گی۔ گاندھی جی معاہدہ کی اس خلاف ورزی سے بہت دکھی تھے اور پروڈکشن کی لاگت، منافع اور زندگی کے خرچوں کا حساب لگانے کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ورکروں کی مزدوری میں 35 فیصد اضافے کی مانگ درست ہے۔ مل مالکان میں سے ایک امبالال سارا بھائی گاندھی جی کے نزدیکی دوست تھے اور انھوں نے ان کے سابرمتی آشرم کے لیے بڑی دریادلی کے ساتھ عطیات بھی دیے تھے اور ان کی بہن انا سویا بین (Anasuya Ben) مل ورکرز کی جدوجہد میں ان کی بہت بڑی حامی تھیں۔ اس جدوجہد کے آخری مرحلوں میں گاندھی جی نے پہلی مرتبہ احتجاج کے طور پر برت (Fast) رکھا۔ گاندھی نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ورکرز دھیرے دھیرے اپنا حوصلہ کھوتے جارہے ہیں اس لیے انھوں نے برت رکھنے کا فیصلہ لیا۔ انھوں نے یہ اعلان کردیا کہ اگر اسٹرائک کے نتیجے میں بھوک سے مرنا بھی پڑے گا تو وہ اس سلسلے میں بھی پہل کرنے والے ہوں گے۔ لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ ورکرز کو 35 فیصد کی بڑھوتری ملے گی۔

تیسری تحریک کھیڑا کے کسانوں کی تھی جن کی فصلیں خراب ہوگئی تھیں مگر حکومت کی طرف سے ان کا لگان معاف نہیں کیا گیا۔ پہلے تو اس صورت حال کی تحقیق کرائی گئی کیونکہ گاندھی جی کا طریقہ کار یہ تھا۔ فصلوں کا مطالعہ کیا گیا اور اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ اس بار فصل محصول کی فصل کے 1/3 کے برابر ہے اور کسانوں کو پورے لگان کی معافی ملنی چاہیے۔ گاندھی جی نے کسانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ محصول نہ دیں۔ ولبھ بھائی پٹیل اور اندولال یاگنک نے کھیڑا گاؤں کا سفر کرکے اور کسانوں کو ثابت قدم رہنے کا مشورہ دے کر کھیڑا ضلع میں گاندھی کی مدد کی۔ حکومت نے مویشی چھین کر، گھر کا سامان ضبط کرکے یہاں تک کہ کھڑی فصلوں کی بھی قرقی کرکے سخت ترین جبر و تشدد سے کام کیا۔ بہادرانہ جدوجہد کرنے کے نتیجے میں کسانوں کو سختیاں جھیلنی پڑیں۔ اسی صورت حال میں گاندھی جی کو یہ معلوم ہوا کہ سرکار یہ فیصلہ کرنا چاہتی ہے کہ محصول صرف ان سے وصول کیا جائے گا جو دے سکتے ہوں گے۔ گاندھی جی نے خوشحال کسانوں سے بھی یہ کہا کہ وہ محصول روک لیں تاکہ غریب کسانوں کو جھکنا نہ پڑے۔ حکومت کی ہدایات کے بارے میں معلوم ہونے کے بعد گاندھی جی نے اپنی تحریک واپس لے لی۔

چمپارن، کھیڑا اور احمد آباد کی ان تحریکوں کا نتیجہ جو 1916 اور 1917 کے درمیان گاندھی جی کو اپنی غیر تشدد آمیز ستیہ گرہ کو آزمانے کا موقع مل گیا۔ ان تحریکوں سے گاندھی کو یہ مدد ملی کہ انھیں اپنے حربوں کے استعمال کا موقع ہاتھ آگیا۔ گاندھی جی نے اپنے مقلدین یا اپنے پیروؤں کی ایک ٹیم بنائی جو ان کا ساتھ بھی دیتے تھے اور آنے والی تحریکوں میں ان کا حکم ماننے پر بھی تیار تھے۔ ان تحریکات کے درمیان گاندھی جی نے بظاہر مخالف مفادات کی

نوٹ

مفاہمت کرانے میں اپنی خصوصی صلاحیتوں کا اظہار کیا۔ مثلاً مل مالکان اور مزدوروں کے معاملے میں ہی ایک طرف انھوں نے دوستی برقرار رکھی اور دوسری طرف دوسرے گروہ کا اعتماد بھی حاصل کیا۔

گاندھی جی کی قیادت میں ایک اور اہم تحریک روولیٹ(Rowlatt) ستیہ گرہ تھی۔ فروری 1919 میں سوا ایسے بل قانون بننے والے تھے جن سے ہندوستانیوں کی شہری آزادی پر بڑا اثر پڑتا تھا۔ حکومت ان قوانین کو اس لیے پاس کروانا چاہتی تھی کہ وہ عوام میں پھیلی بے چینی کی بڑھتی لہر کو کنٹرول کر سکے۔ اس قانون کی رو سے حکومت بغیر مقدمہ چلائے یکطرفہ طور پر لوگوں کو نظر بند بھی کر سکتی تھی اور سزا بھی دے سکتی تھی۔ درحقیقت ان میں سے ایک بل بھی کونسل میں پاس ہو گیا تھا اور منتخب ہندوستانی ممبران کے احتجاج کے باوجود بھی یہ ایک قانون میں تبدیل ہو گیا تھا۔ افراد پر اس قسم کی پابندیاں زمانۂ جنگ میں قابل قبول ہو سکتی ہیں لیکن جنگ کے خاتمے پر مزید دستوری اصلاحات کی امید بڑھ گئی تھی اور اگرچہ خودمختاری حاصل نہیں تھی لیکن اپنے معاملات پر ہندوستانیوں کا اپنے محاصلات پر زیادہ کنٹرول رکھنے کی توقع بڑھ گئی تھی۔

کونسل کے ممبران اور دیگر لوگوں کے احتجاج کی بے وقعتی دیکھ کر گاندھی جی نے ستیہ گرہ شروع کی۔ ایک ستیہ گرہ سبھا تشکیل دی گئی جس کے ممبروں کی تعداد بہت ہو گئی۔ طے یہ کیا گیا کہ اس قانون کے خلاف ایک ملک گیر اسٹرائک یا ہڑتال شروع کی جائے اور برت اور پرارتھنا یا دعاؤں وغیرہ کا انعقاد کیا جائے۔ اس کے علاوہ کچھ قوانین کی سول نافرمانی بھی کی جائے۔ رولیٹ(Rowlett) ستیہ گرہ ہندوستان میں گاندھی جی کی زیر قیادت ایک ملک گیر احتجاج تھا۔ ہندوستان کے لوگوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بڑے زبردست طریقے سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا لیکن ہڑتالیں پرتشدد ہو گئیں۔ 6 اپریل 1919 کو ایک ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا لیکن کچھ افراتفری کی وجہ سے یہ ہڑتال دہلی میں 30 مارچ کو ہو گئی اور اس کے نتیجے میں دہلی کی سڑکوں پر لڑائیاں ہوئیں۔ جبریہ بھرتی بیماری کے پھیلنے اور دوسری مشکلات کی وجہ سے پنجاب کو سخت قسم کے زمانۂ جنگ کے سے ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑا۔ امرتسر اور لاہور اس تحریک کے مرکز تھے۔ گاندھی جی نے پنجاب جانے کی کوشش کی اور اپنی تحریک کو غیر تشدد آمیز ستیہ گرہ کے راستہ پر واپس لانا چاہا۔ برطانوی حکومت نے گاندھی جی کو پنجاب میں داخلے سے روک دیا اور ان کو بمبئی روانہ کر دیا۔ اس وقت بمبئی اور احمد آباد میں بھی بڑی افراتفری تھی اور گاندھی جی اپنی تحریک کو کنٹرول میں رکھنا چاہتے تھے۔ پنجاب کے واقعات نے اس وقت سنگین صورت اختیار کر لی جب دو مقامی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور جس کے نتیجے میں مقامی ٹاؤن ہال اور ڈاکخانہ پر حملہ کر دیا گیا۔ اس قوم پرستانہ تحریک کے دوران برطانوی حکومت کی نشانیوں(Symbols) پر حملہ کرنا۔ ٹیلی گراف کے تاروں کا کاٹ دینا، ڈاکخانوں پر حملہ کرنا اور انگریزوں (بشمول انگیز خواتین) پر حملہ کرنا احتجاج کا عام طریقہ تھا۔ چنانچہ فوج بلالی گئی اور تمام جلسے جلوسوں پر پابندی لگا دی گئی۔

13 اپریل 1919 کو جب امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں بیساکھی کے دن لوگوں کا مجمع اکٹھا ہو گیا تو جنرل ڈائر کو سخت غصہ آیا۔ جنرل ڈائر کو شہر کا انچارج بنایا گیا تھا۔ جنرل کو اس بات پر بہت غصہ تھا کہ ایک عوامی میٹنگ منعقد ہوتی۔ چنانچہ اس نے نہتے اور بے بس مجمع پر حملہ کر دیا اور اس کے لوگوں نے مجمع پر دس منٹ تک گولیاں برسائیں

نوٹ

اور یہ گولیوں کی برسات اس وقت ختم ہوئی جب گولہ بارود کا سارا ذخیرہ ختم ہوگیا۔ فائرنگ شروع کرنے سے پہلے لوگوں کو نہ کوئی وارننگ دی گئی اور نہ ان کے بچنے کے لیے اس تنگ راستے کے سوا کوئی اور راستہ تھا جہاں جنرل ڈایر کے آدمی بندوقیں لیے کھڑے تھے کیونکہ جلیانوالہ باغ کے ہر طرف چار دیواری تھی۔ اس حادثہ میں سرکار کے تخمینے کے مطابق 379 لوگ کام آگئے۔ اس وحشیانہ حادثے کے بعد ہونے والا جور و جبر اور بھی وحشیانہ تھا۔

متن پر مبنی سوالات 21.3

1۔ 1916 اور 1917 کے درمیان گاندھی جی نے کس تحریک کا سہارا لے کر اپنی غیر تشدد پسند ستیہ گرہ کے طریقے کا تجربہ کیا؟

____

2۔ رولیٹ (Rowlett) ستیہ گرہ کب شروع کی گئی تھی؟

____

3۔ قومی تحریک میں 1919 کے یوم بیساکھی کی کیا اہمیت ہے؟

____

21.6 غیر تشدد آمیز ترک موالات (Non-Violent Non-Cooperation)

جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے بعد پنجاب میں کرفیو لگا دیا گیا۔ ہندوستانیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا اور گلی کوچوں میں جہاں انگریز عوتوں پر حملے کیے گئے تھے وہاں ہندوستانیوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ پیٹ کے بل رینگتے ہوئے چلیں۔ اگرچہ رولیٹ (Rowlett) ستیہ گرہ کو واپس لے لیا گیا تھا مگر برطانوی حکومت کے بارے میں ناراضگی مزید بڑھتی گئی۔ 1919 کی مونٹیگ وچیمسفورڈ اصلاحات (Montague Chemsford Reforms) نے ان لوگوں کی امیدوں پر بالکل ہی پانی پھیر دیا جنھیں اب بھی برطانیہ کی نوآبادیاتی حکومت پر یہ یقین تھا کہ وہ ایسی اصلاحات لائے گی جس سے ہندوستانی لوگ حکومت میں حصہ لے سکیں گے۔

اس مرحلے پر مسلم رہنماؤں میں ایک بڑا روشن خیال طبقہ پیدا ہوا اور برطانوی حکومت کے بارے میں ان کی بے اطمینانی یا ناراضگی بھی بے سبب نہیں تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی کے ساتھ برتے گئے رویّے سے مسلمانوں کو بہت دکھ تھا۔ تمام دنیا کے مسلمان ترکی کے خلیفہ کو اپنا روحانی رہنما تصور کرتے تھے اور ان کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جنگ میں ترکی اور اس کے اتحادیوں کی شکست کے بعد خلیفہ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ ہوگا۔ بہرحال ترکی کے ساتھ ما بعد جنگ معاہدہ میں خلیفہ کے اختیارات کو بہت زیادہ کم کر دیا گیا۔

معاملات نے اس وقت سنگین صورت اختیار کرلی جب ہنٹر کمیشن نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کمیشن کو جلیانوالہ باغ کے حادثہ کی تحقیقات کے لیے حکومت کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں کمیشن نے جنرل ڈائر کے عمل اور تمام دیگر قسم کے جبر استبدا کو صحیح ٹھہرایا۔ اس رپورٹ سے تمام ہندوستانی رہنماؤں کا غصہ بھڑک گیا اور اب احتجاج کی کسی اگلی تحریک کے لیے معاملہ پک چکا تھا۔ اسی وقت گاندھی جی نے ایک غیر متشدد اپنا ترک موالات (Non-Voilent non Coopration) کی تحریک کے بارے میں ذہن بنایا۔ یہ تحریک برطانیہ کے ظالمانہ راج کے خلاف ہندوستانی لوگوں کے تمام طبقات کی بڑھتی ہوئی بے چینی کا اظہار تھا۔ تین خاص نکات پر عدم تعاون کی اس تحریک کا آغاز ہوا تھا: (a) خلافت کے معاملے میں غلط رویہ (b) پنجاب کی بدسلوکی اور (c) سوراج۔

سب سے پہلے 23 نومبر 1919 علی برادران (محمد علی اور شوکت علی) کی پہل پر دہلی میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کی طرف سے ترک موالات (Non Cooperation) کے لیے فیصلہ کیا گیا۔ خلافت کانفرنس کی الہ آباد میٹنگ میں ترک موالات کے چار مرحلوں والے ایک پروگرام کا اعلان ہوا۔ یہ چار مرحلے تھے۔ اعزازات و خطابات، سول سروسز، پولس اور فوج کا بائیکاٹ اور آخر میں ٹیکسوں کی عدم ادائیگی۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کانگریس کے ممبران پر زور ڈالا کہ وہ اس تحریک کی حمایت کریں۔ ستمبر 1920 کے کلکتے کے خصوصی اور تاریخی اجلاس میں کانگریس نے اعزازات اور خطابات کو چھوڑنے، اسکولوں، عدالتوں اور کونسلوں نیز غیر ملکی مال کا بائیکاٹ کرنے کے لیے ایک تجویز پاس کی۔ اس بائیکاٹ کے ساتھ ہی ساتھ قومی اسکولوں اور عدالتوں کے قیام کی بھی تجویز تھی تاکہ حکومتی عدالتوں میں چارہ جوئی کے بغیر ہی معاملات کو طے کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ کھادی کے استعمال کی تجویز بھی پاس کی گئی۔ دسمبر 1920 کی ناگپور کانگریس میں بنگال کے آزمودہ کار کانگریسی رہنما چترنجن داس نے اس تحریک کے لیے اپنی حمایت پیش کی۔ اگرچہ یہ تحریک رسمی طور پر یکم اگست 1920 کو شروع ہوئی لیکن کانگریسی رہنماؤں کی حمایت سے اس میں ایک نئی جان پیدا ہوگئی اور پھر جنوری 1921 سے اس پروگرام کو بہت تقویت ملی۔ ایک مہینے میں ہی بڑی تعداد میں طلبا نے سرکاری امداد یافتہ اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دیا اور ان اسکولوں میں جانے لگے جو ملک کے مختلف حصوں میں شروع کیے گئے تھے۔

کئی مشہور وکیلوں جیسے سی آر داس، موتی لال نہرو، سیف الدین کچلو، ولبھ بھائی پٹیل، سی راجگوپال آچاری اور آصف علی وغیرہ نے اپنی نفع بخش وکالت کی پریکٹس چھوڑ دی۔ اس قربانی سے لوگوں کو بہت حوصلہ ملا اور ہمت بندھی۔ غیر ملکی سامان کے بائیکاٹ اور غیر ملکی کپڑا بیچنے والوں کا گھیراؤ بھی احتجاج ہی کی شکلیں تھی۔ چرخوں کی تقسیم شروع کردی گئی اور قوم پرستوں کے درمیان ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے مقبول ہونے لگے۔ قوم پرست اخبارات میں ایسے اشتہارات شائع ہونے لگے جن میں لوگوں سے یہ درخواست ہوتی تھی کہ وہ غیر ملکی مال کو اجتماعی طور پر تلف کردیں۔ کپڑوں کی برآمد بڑی حد تک گرگئی۔ کپڑوں کی دوکانوں کے ساتھ ہی ساتھ پہلی مرتبہ شراب کی دوکانوں کا بھی گھیراؤ کیا گیا۔ جولائی 1921 میں محمد علی نے برطانیہ کی ہندوستانی فوج کے تمام مسلمانوں سے یہ اپیل کی کہ وہ برطانیہ کی فوج کا حصہ بنے رہنے کو اخلاقی طور پر غلط سمجھیں اور اپنی نوکریوں کو جاری نہ رکھیں۔ اس اعلان سے برطانوی حکومت چوکنا ہوگئی اور ان کو فوراً گرفتار کرلیا گیا۔ گاندھی جی اور کانگریس نے بھی اس اپیل کو دہرایا۔ ایک

منشور صادر کیا گیا اور اس میں تمام لوگوں (شہری اور فوجی) سے یہ کہا گیا کہ وہ برطانوی ہندوستانی فوج سے اپنے رابطے منقطع کرلیں۔ اسی دوران پرنس آف ڈویلز نے نومبر 1921 میں ہندوستان کا دورہ کیا اور بمبئی (جہاں وہ اترے تھے) اور سارے ہندوستان میں ہڑتال کرکے ان کا استقبال کیا گیا۔ ویلز کے شہزادے کی آمد کے دن گاندھی جی نے ایک بڑے مجمع کو خطاب کیا۔ برطانیہ مخالف جذبات اتنے شدید ہوگئے تھے کہ جب جلسے سے منتشر ہونے والے لوگوں کا آمنا سامنا ان لوگوں سے ہوا جو شہزادے کے استقبالیہ جلوس میں گئے تھے تو فساد کی سی صورت حال پیدا ہوگئی۔ گاندھی جی کو تناؤ کم کرنے کے لیے چار دن کا برت رکھنا پڑا۔ عدم تعاون کی تحریک کو بڑی تیزی سے قوت مل رہی تھی۔ بنگال کے مدنا پور ضلع میں یونین بورڈ کے ٹیکسوں کے خلاف ایک تحریک کو منظم کیا گیا اور ایسے ہی ''کوئی ٹیکس نہیں'' (No-Tax) تحریک آندھرا پردیش میں بھی شروع کی گئی۔ گاندھی جی کی زیر قیادت ٹیکس ادا نہ کرنے کی اسکیم کا فیصلہ تحریک کے آخری اور انتہائی حالات میں لیا گیا۔ یو پی کے اودھ علاقے میں ان کسان سبھاؤں کے ذریعے کسان تحریک کو مقبولیت حاصل ہورہی تھی جو روز بہ روز منظم ہوتی جارہی تھی اور برطانوی راج کے لیے ایک خطرہ بنتی جارہی تھیں۔

نوآبادیاتی حکومت کا موقف بھی سخت سے سخت تر ہوتا جارہا تھا۔ کپڑے کی برآمد میں کمی، طلبا، وکلا، سرکاری افسران، کاریگروں، کسانوں اور باغات کے کاریگروں کی بے چینی کا اظہار اور فوج پر اثر انداز ہونے کی کوششوں نے انجام کار حکومت کو تحریک کے خلاف جابرانہ اقدامات کرنے کے لیے مجبور کردیا۔ عوامی جلسوں اور اسمبلیوں پر پابندی لگا دی گئی، اخبارات پر سختیاں کی گئیں اور کانگریس نیز خلافت کے دفتروں پر راتوں میں دبش ڈالی گئی۔ کانگریس گاندھی جی کی قیادت میں بارڈولی میں سول نافرمانی کا ایک پروگرام ترتیب دینا چاہتی تھی لیکن یوپی کے گورکھپور ضلع کے چوری چورا مقام پر تشدد آمیز حادثے کے نتیجے میں سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ جب خلافت اور کانگریس کے جلوسوں کا سامنا کچھ پولس والوں سے ہوا تو وہ تشدد پر اتر آئے اور انھوں نے پولس پر حملہ کردیا۔ پولس نے تھانے میں پناہ لینے کی کوشش کی لیکن غصہ میں بھری بھیڑ نے تھانے کو آگ لگادی اور ان پولس والوں کو جو آگ سے بچنے کے لے باہر آئے اتنا پیٹا کہ وہ مرگئے۔ اس حادثہ میں 22 لوگ مارے گئے۔ یہ حادثہ 5 فروری کو ہوا اور 12 فروری کو گاندھی جی نے تحریک ترک موالات واپس لے لی۔ اس واپسی نے ثابت کردیا کہ اس مرحلے پر گاندھی جی یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ کوئی ایسی تحریک چلائیں جس پر وہ کنٹرول نہ کرسکیں نیز انھوں نے یہ بھی ثابت کردیا کہ قوم پرست گاندھی جی کی آواز کا ساتھ دیں گے کیونکہ بہت سے ایسے بھی لوگ تھے جنھیں گاندھی جی سے اختلاف تھا لیکن اس تحریک کی واپسی کے بارے میں گاندھی جی سے کوئی اختلاف کی بات نہ سوچ سکتا تھا۔

کانگریس پارٹی میں بھی ان لوگوں کے درمیان جو جلدی ہی منعقد ہونے والے انتخابات کے ذریعے قانون ساز کونسلوں میں جانا چاہتے تھے اور ان لوگوں کے درمیان جو گاؤوں میں گاندھی جی کے تعمیری کام کو لے کر چلنا اور جدوجہد کے اگلے قدم کے لیے تیاری کرنا چاہتے تھے، اختلاف رائے موجود تھا۔ راج گوپال آچاری، ڈاکٹر انصاری اور دیگر لوگوں نے گاؤوں کے تعمیری کام کی حمایت کی جبکہ موتی لال نہرو، وٹھل بھائی پٹیل اور حکیم اجمل خاں کونسلوں میں جانا چاہتے تھے اور سسٹم کے اندر ایک تعطل پیدا کرکے حکومت کے کام کاج کو ٹھپ کرنا چاہتے

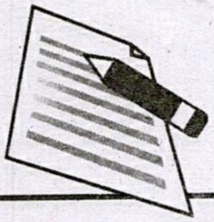

نوٹ

تھے۔ راجیندر پرشاد اور ولبھ بھائی پٹیل اول الذکر نظریہ کے حامی تھے جبکہ سی آر داس موخرالذکر نظریہ کے قائل تھے۔ داس اور موتی لال نہرو نے الیکشن لڑنے کے لیے 1923 میں ایک سوراج پارٹی بنائی۔ گاندھی جی کے گروپ کو جسے غیر تبدیلی پسند(No-Changer) کہا جاتا تھا 1924 میں جیل سے گاندھی جی کی رہائی سے حوصلہ مل گیا۔ بہرحال کانگریسیوں کو الیکشن میں کھڑا ہونے سے روکا نہ جاسکا اگرچہ وہ بھی گاؤں کے تعمیری کام کی اہمیت کے قائل ہوگئے تھے۔

نومبر 1924 میں مرکزی صوبوں اور بنگال میں ہونے والے انتخابات میں کانگریسی امیدواروں کو کئی سیٹیں حاصل ہوگئیں۔ کونسلوں کے کام کاج کو درہم برہم کرنے کی ابتدائی کوششیں شروع ہوگئیں لیکن جس قانون یا ضابطے کو ممبران پاس نہ ہونے دیتے اسے گورنر کو حاصل خصوصی اختیارات سے پاس کرالیا جاتا اور اس طرح دوعملی کے نظام کی حدبندیاں یا خامیاں ظاہر ہوجاتیں۔ جلدی ہی منتخب ممبران اپنی راہ بھولنے لگے اور آہستہ آہستہ حکومت کے نظام میں جذب ہوتے گئے۔ آرسی داس کا اچانک بنگال میں انتقال ہوگیا اور ان کی موت سے قیادت کا مسئلہ پیدا ہونے لگا۔ قوم پرستانہ تحریک کے اس مرحلے پر سیاسی غیر یقینی اور سرگرمیوں کے زوال کے درمیان، انقلابی تحریک کے دوسرے مرحلے میں کانگریسی تحریک زیادہ جوشیلے اور فعال گروہ کو لے کر اٹھی۔

21.7 انقلابی تحریک: نئی تنظیم اور نئی جہت (The Revolutionary Movement: Reorganization and Reorientation)

تحریک عدم موالات کی برجستہ شروعات سے ان ہندوستانی نوجوانوں کی ایک قوت عظیم کا ظہور ہوا جنھوں نے آزادی حاصل کرلینے کا ایک عزم راسخ کر رکھا تھا۔ ملک کے نوجوانوں نے گاندھی کی پکار پر بڑے جوش وخروش سے لبیک کہا تھا اور عدم موالات کی تحریک میں شرکت کی تھی۔ اس تحریک کی اچانک واپسی ان نوجوانوں کی امنگوں پر ایک بڑی ضرب تھی۔ انقلابی تحریک کے پہلے مرحلے کی خفیہ سمتیوں کا پنجاب اور بنگال میں احیا ہونے لگا۔

بنگال میں انسولیشن سمتی کا تعلق سبھاش بوس سے اور یوگانتر سمتی کا تعلق جے ایم سین گپتا گروپ سے تھا ان دونوں گروہوں کے درمیان اچھی خاصی رقابت(Rivalry) بھی تھی۔ اسی زمانے میں کچھ چھوٹے چھوٹے انقلابی گروپ بھی بنائے گئے۔ مثلاً ایک گروپ چٹاگانگ کے سوریہ سین کی قیادت میں بنا۔ یہ گروپ کافی انتہاپسند تھا۔ اس زمانے کا زبردست انقلابی کارنامہ ایک انگریز ''ڈے'' کا قتل تھا جسے جنوری 1924 کو گوپی ناتھ سہا نے انجام دیا تھا۔ سہا کلکتہ کے پولس کمشنر Tegarb کو قتل کرنا چاہتے تھے لیکن غلطی سے قتل ڈے(Day) کا ہوگیا۔ اس واقعے کے نتیجے میں بہت سے قوم پرست گرفتار ہوگئے۔

شمالی ہندوستان انقلابی جوش و جذبہ کا ایک دوسرا مرکز تھا جہاں سچن سانیال، یوگیش چٹرجی اور کچھ دیگر لوگوں نے صوبجات متحدہ میں ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن بنائی تھی اور وہ ڈاکے ڈال کر فنڈ اکٹھا کیا کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور واقعہ کاکوری ٹرین کی لوٹ مار ہے جو اگست 1925 میں پیش آیا تھا اور جس کے نتیجے میں تنظیم

نوٹ

کے کئی ممبران گرفتار کر لیے گئے تھے۔ اس تنظیم کے روابط فعال اور ذہین طالب علم لیڈر بھگت سنگھ کی زیر قیادت پنجاب کے نوجوانوں کے ایک گروہ سے بھی تھے۔ پنجاب سوشلسٹ نظریات سے بہت متاثر تھا۔ اسی لیے اس تنظیم کا نام بدل کر ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن (HSRA) ہوگیا۔ انقلاب پسندوں کا مقصد مکمل آزادی کا تھا اور وہ اس بات کے دیکھنے کے خواہشمند تھے کہ آزادی کے حصول کے بعد ریاست کیسی ہوگی۔ انھوں نے لوگوں کی ایک عوامی جدوجہد کو چلایا اور اس مقصد کے لیے طلبا، کامگاروں اور کسانوں کو تیار کرنے کی کوشش کی۔

21.8 سائمن کمیشن کا بائیکاٹ (Bycott of Simon Commission)

انقلابی تحریک کی نئی تشکیل اور اس کے نئے نئے اظہار نیز اصل دھارے والی تحریک کے دب جانے کے دوران ہی سائمن کمیشن کا اعلان ہوا۔ اس کا مقصد ہندوستان کے لیے مزید دستوری اصلاحات کی تشکیل تھا۔ اس سفید فام کمیشن میں کوئی ہندوستانی نہ تھا اور یہ بات عیاں تھی کہ اس کے ذریعے لائی جانے والی اصلاحات ہندوستانی لوگوں کی امیدوں اور امنگوں کو پورا نہیں کر سکیں گے۔ دوعملی (Dyarchy) کا نظریہ پہلے ہی یہ ثابت کر چکا تھا کہ یہ اس کی وقعت ایک بھونڈے مذاق سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ اس کے تحت تمام اہم اور فیصلہ کن اختیارات نوآبادیاتی حکومت کے ہاتھوں میں ہی رہیں گے۔ اس سفید فام سائمن کمیشن کے اعلان سے بڑے پیمانے پر بے چینی اور بے اطمینانی پھیل گئی اور اس سے قوم پرستانہ تحریک کے شعلے اور بھڑک گئے۔ تمام ہندوستان کی رائے عامہ نے متفقہ طور پر اس کمیشن کی مذمت کی کیونکہ اس میں ایک بھی ہندوستانی شامل نہیں تھا۔

ہندوستان میں اس کمیشن کا ردِّعمل یہ ہوا کہ تمام رہنماؤں کے متفقہ طور پر اس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ جس روز (3 فروری 1928) کمیشن کے ممبران ہندوستان آئے اس دن تمام اہم چھوٹے بڑے شہروں میں ہڑتال کی گئی۔ عوامی جلوس اور ریلیاں نکالی گئیں اور کمیشن کے خلاف کالے جھنڈوں سے مظاہرے کیے گئے۔ جھنڈوں پوسٹروں اور حتی کہ پتنگوں پر ''سائمن واپس جاؤ'' کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں کمیشن گیا وہاں کالی جھنڈیاں لہرائی گئیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پولس کا رویہ جابرانہ، سخت گیر اور وحشیانہ تھا، جلوسوں پر حملے کیے گئے اور کسی ایک اہم لیڈر کو بھی نہیں بخشا گیا۔ سب سے زیادہ سخت حملہ لالہ لاجپت رائے پر کیا گیا جو لاہور میں انتہا پسندانہ دور کے ممتاز رہنماؤں میں سے تھے۔ اس پرانے لیڈر پر لاٹھیاں برسائی گئیں اور چند دن بعد وہ اس حملہ کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ ان کی موت نے برطانوی حکومت کے خلاف ہر طرف زبردست بے چینی اور ناراضگی پیدا کردی۔ اسی زمانے میں کانگریس کے اندر بڑی تبدیلی یہ آئی کہ کانگریس نے پورن سوراج یا مکمل آزادی کو اپنا مقصد بنا لیا گیا۔ مکمل آزادی کا مطلب تھا برطانیہ سے ہر قسم کے تعلق کا مکمل انقطاع۔

پورن سوراج کے مقصد کو اختیار کرنے کے نتیجے میں تمام ملک میں لوگوں کی توقعات کافی بڑھ گئیں اور 26 جنوری 1930 میں تمام ملک میں اس طرح کے آزادی کے عہد لیے گئے۔ ملک میں بڑھتی بے چینی کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ بمبئی اور ناگپور میں کمیونسٹوں نے ریلویز کی ایک ہڑتال کروائی۔ کانگریس کی زیر قیادت تحریک ایک ایسی سول

نافرمانی کی تحریک کے لیے تیاری کر رہی تھی جس میں ٹیکسوں کی عدم ادائیگی بھی شامل تھی۔ یہ ایک انتہائی قدم تھا۔ کانگریس ممبران کونسل کو یہ ہدایت دے دی گئی کہ وہ اگلے دور کی جدوجہد کی تیاری کے لیے استعفیٰ دے دیں۔

گاندھی جی نے 31 جنوری کو وائسرائے اِرون کے نام ایک الٹی میٹم جاری کیا جس میں مکمل آزادی یا پورن سوراج کے بارے میں کوئی بات نہیں کہی گئی تھی۔ یہ گیارہ نکاتی الٹی میٹم دراصل گیارہ مطالبات تھے جو قوم کی طرف سے نوآبادیاتی حکومت سے کیے گئے تھے۔ ان میں ایک مطالبہ نمک ٹیکس اور نمک کی مینوفیکچرنگ سے سرکاری اجارہ داری کا خاتمہ تھا۔ ان مطالبات میں لگان (Land Revenue) میں پچاس فی صد کی تخفیف، کپڑا صنعت کا تحفظ اور فوج کے اخراجات اور سول سروسز کی تنخواہوں میں پچاس فیصد کی کٹوتی شامل تھیں۔

متن پر مبنی سوالات 21.4

1۔ کن خاص نکات پر تحریک عدم موالات شروع کی گئی تھی؟

2۔ سوراج پارٹی کب قائم ہوئی اور کس نے قائم کی؟

3۔ HSRA کی مکمل شکل لکھیے۔

21.9 سول نافرمانی کی تحریک (Civil Disobedience Movement)

چونکہ گیارہ نکاتی الٹی میٹم کا کوئی جواب نہ ملا اس لیے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی گئی۔ یہ تحریک نمک کے مسئلہ پر مبنی تھی۔ نمک سب لوگوں کے لیے بنیادی ضرورت کی چیز ہے اور اس پر ٹیکس کا مطلب ہے کہ غریب سے غریب آدمی بھی اس سے متاثر ہوگا۔ اس طرح نمک ہندوستانی لوگوں کی محرومی اور ان پر ہونے والے جور و جبر کی علامت بن گیا۔ عوام اور قومی رہنماؤں دونوں نے خود کو اس مسئلے سے جوڑ لیا۔ 12 مارچ 1930 کو گاندھی جی نے اپنے 72 ساتھیوں کے ساتھ سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کی طرف مارچ شروع کیا۔ ڈانڈی کے عجیب و غریب مارچ کو لوگوں کی زبردست حمایت حاصل ہوئی۔ لوگوں کا ازدحام تمام راستے مارچ کرنے والوں کو مبارکباد دینے اور ان کا ساتھ دینے کے لیے امڑ پڑا۔ گاندھی جی جیسے جیسے آگے بڑھے لوگوں نے ان کے ساتھ اپنی وابستگی کے اظہار کے لیے چرخوں پر سوت کاتا۔ 6 اپریل کو گاندھی جی ڈانڈی کے سمندر تک پہنچ گئے اور سمندر سے ایک مٹھی نمک اٹھایا اور نمک کا قانون توڑ کر سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا۔ تمام ہندوستان میں لوگوں نے غیر قانونی طور پر نمک

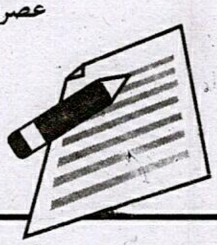

نوٹ

بنانا شروع کردیا۔ بہت محتاط منصوبہ بندی اور رضا کاروں کی بھرتی سے یہ تحریک ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک، مدراس سے مہاراشٹر اور بنگال و آسام سے کراچی تک پھیل گئی۔ شمال بعید میں پیشاور کے مقام پر ایک زبردست مظاہرہ کیا گیا۔ خاں عبدالغفار خاں اور ان کے پیروکار خدائی خدمت گار یا ریڈ شرٹس والے یہاں کچھ سالوں سے تعمیری کاموں میں لگے ہوئے۔ اس تحریک کو یہاں بڑی زبردست حمایت ملی۔ پورا شہر تقریباً ایک ہفتہ کے لیے عوام کے کنٹرل میں آ گیا اور گڑھ والی رجمنٹ نے نہتھی بھیڑ پر فائر کرنے سے انکار کر دیا۔ مدراس، کلکتہ اور کراچی میں 14 اپریل کو نہرو کی گرفتاری کے بعد عوامی احتجاج ہوئے۔ برطانوی حکومت بڑے شش و پنج میں تھی اور اس کو یہ توقع نہیں تھی کہ نمک ستیہ گرہ سے اتنا بڑا انقلاب پیدا ہو جائے گا۔ انجام کار حکومت نے کچھ کرنے کا فیصلہ لیا اور مئی میں گاندھی جی کو گرفتار کر لیا گیا لیکن اس کے نتیجے میں اس تحریک میں اور شدت پیدا ہوگئی۔ سول نافرمانی کی تحریک کا سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں نوجوانوں اور خاص طور پر طلبا اور عورتوں نے زبردست حصہ لیا۔ عورتوں نے شراب کی دوکانوں اور غیر ملکی مال کی دکانوں کا گھراؤ کیا۔

حکومت نے لوگوں کی شہری آزادی کو دبانے کے لیے فرمان(Ordinance) جاری کرنے شروع کردے اور تمام صوبوں میں سول نافرمانی کرنے والی تنظیموں پر پابندی لگادی گئی۔ جون میں کانگریس ورکنگ کمیٹی پر بھی پابندی لگ گئی اور کانگریس کے صدر موتی لال نہرو کو گرفتار کر لیا گیا۔ اگست تک مقامی کانگریس کمیٹیوں پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ بہت سے مقامی مسائل بھی سول نافرمانی کی تحریک کا حصہ بن گئے۔

حکومت کے جور وظلم اور تحریک کی شدت کے زمانے میں ہی سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع کردی گئی اور اس میں کوئی ایسی تجویز بیان نہیں کی گئی تھی کہ ہندوستان کو کوئی ڈومینین(Dominion) کا مرتبہ حاصل ہوسکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعتدال پسند ہندوستانی سیاست داں بھی بیشتر انگریزوں کے خلاف ہوگئے۔ تب وائسرائے نے ایک گول میز کانفرنس بلائی اور اس میں ایک ڈومینین(Dominion) کا مرتبہ عطا کرنے کے مسئلہ پر گفتگو کی گئی۔ موتی لال اور جواہر لعل نہرو کو اس پیش کش پر گفتگو کرنے کے لیے گاندھی جی کے پاس لے جایا گیا۔ لیکن کانگریس اور حکومت کے درمیان کوئی پیشرفت نہ ہوئی۔ نومبر 1930 میں ہندوستانی رہنماؤں اور برطانیہ کے درمیان پہلی گول میز کانفرنس ہوئی لیکن اس میں کانگریس کی نمائندگی نہ تھی۔ لیکن یہ بات تو واضح ہی تھی کہ برطانیہ اور ہندوستانی لیڈروں کے درمیان مساویانہ شرائط پر کوئی بھی گفت وشنید کانگریس کے بغیر بے نتیجہ رہے گی۔ اگلی کانفرنس کا انعقاد اگلے سال ہونا طے ہوا۔ حکومت نے 25 جنوری 1931 کو گاندھی جی کو رہا کر دیا اور کانگریس کی مجلس عاملہ(Working Commities) کے دیگر تمام ممبران بھی غیر مشروط طور پر رہا کر دیے گئے۔ کانگریس سے کہا گیا کہ وہ اگلی گول میز کانفرنس میں شرکت کر کے وائسرائے کی اس پیش کش پر غور و فکر کرے۔

پہلی گول میز کانفرنس کے نمائندوں کے ساتھ بہت زیادہ غور وفکر اور بحث و مباحثہ کے بعد کانگریس نے وائسرائے کے ساتھ گفت وشنید کے مسئلہ کو گاندھی جی کے سپرد کردیا۔ گاندھی جی اور لارڈ ارون کے درمیان بات چیت دو ہفتہ

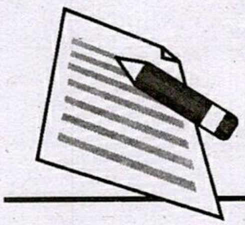

نوٹ

تک چلی۔ آخرکار 5 مارچ 1931 کو گاندھی اور ارون کے درمیان ایک معاہدہ پر دستخط ہوگئے۔ اس معاہدے کی دفعات حسبِ ذیل تھیں:

(a) غیر متشدد احتجاجوں میں جو لوگ گرفتار کیے گئے ہیں ان سب کو جلدی ہی رہا کر دیا جائے گا

(b) جو جرمانے جمع نہیں کرائے گئے ہیں انھیں معاف کر دیا جائے گا

(c) وہ ضبط کی گئیں زمین جو ابھی تک بیچی نہیں گئی ہیں انھیں کسانوں کو لوٹا دیا جائے گا

(d) جن سرکاری ملازمین نے استعفے دے دیے ہیں ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے گا

(e) ساحل کے کنارے آباد گاؤوں کو استعمال کے لیے نمک بنانے کا حق حاصل ہوگا

(f) پُر امن اور غیر جبر یہ گھیراؤ کے حق کو مان لیا گیا

اس کی بنیاد پر کانگریس سول نافرمانی کی تحریک کو واپس لینے پر راضی ہوگئی اور اس بات پر بھی راضی ہوگئی کہ اگلی گول میز کانفرنس میں شرکت کرے گی۔ بہرحال ایسے بھی بہت سے لوگ تھے اس تصفیہ سے مطمئن نہ تھے اور اسے ایک عارضی قدم مانتے تھے اور بہت سے لوگ اسے غیر ضروری بھی سمجھتے تھے۔ اس کے نتیجے میں انقلابی سوسائٹیوں کی تازہ سرگرمیوں نیز انتہا پسند کمیونسٹوں کو عروج حاصل ہوا۔ بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گروہ کو اسی زمانے میں پھانسی دی گئی کیونکہ کمیونسٹ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی تھی۔

مارچ 1931 کے کراچی اجلاس میں پورن سوراج کے مقصد کو دہراتے ہوئے ایک ہی سانس میں گاندھی اور ارون کے درمیان دہلی معاہدہ کو کو بھی منظوری دے دی۔ اگرچہ دلی معاہدہ میں آزادی کا کوئی ذکر نہ تھا لیکن کانگریس کراچی میں ہندوستانی دستور بنانے کی تیاری کر رہی تھی اور اس نے بنیادی حقوق اور قومی معاشی پالیسی کے بارے میں تجاویز پاس کیں۔ یہ تجاویز ہمارے ملک کی دستوری تاریخ کا ایک اہم باب ہے جس میں لوگوں کی آزادی تقریر کی آزادیِ تحریر کی آزادی اظہار کا ذکر ہے۔ مذہبی امور میں حکومت کی غیر جانبداری، قانون کی نظر میں مساوات، بالغوں کی حق رائے دھی، مفت اور لازمی پرائمری تعلیم اور بہت سی دوسری سہولیات کو آزاد ہندوستان کی دستوری دفعات میں پیشگی بیان کر دیا گیا۔

اگست 1931 میں گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہوئے۔ اس دوران برطانیہ اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا موقف بہت سخت ہو رہا تھا۔ ارون کی جگہ ولنگڈن آگئے تھے اور برطانوی حکومت کا ہمدردانہ رویہ بھی بدل چکا تھا۔ نتیجتاً گاندھی جی کی گول میز کانفرنس کے مذاکرات سے کچھ حاصل نہ ہوا بلکہ دسمبر 1931 میں واپسی کے وقت انھوں نے محسوس کیا کہ نیا وائسرائے ان سے ملاقات کرنا نہیں چاہتا۔ گویا اس کا مطلب یہ تھا کہ نوآبادیاتی حکومت کو اس بات پر افسوس تھا کہ اس نے کانگریس کے ساتھ معاہدہ کرکے اس کو اپنے برابر کا درجہ دیا۔ حکومت نے جواہر لعل نہرو کو بھی گرفتار کر لیا تھا اور خدائی خدمتگاروں کے رہنما خان عبدالغفار خاں کو گرفتار کرکے شمال مغربی سرحد صوبہ میں ان کی تحریک کو بھی دبا دیا تھا۔

ان حالات میں کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک کو دوبارہ شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ کام اس موقع پر شروع کیا جب گاندھی جی نے قیام امن کے لیے گفت وشنید کرنے کی غرض سے وائسرائے سے ملنے کی درخواست کی اور وائسرائے نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد نوآبادیاتی حکومت نے شدید جوابی کارروائی کی جس کا پہلا قدم یہ تھا کہ گاندھی جی کو جنوری کے شروع میں ہی گرفتار کرلیا گیا اور شہری آزادیوں میں کٹوتی کردی گئی۔ اس کے بعد حکومت نے جائیداد پر قبضہ کرنا اور لوگوں کو نظر بند کرنے کا حق حاصل کرلیا۔ اس اختیار کے حاصل کر لینے سے حکومت نے کانگریس کے سارے ممتاز رہنماؤں کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا۔

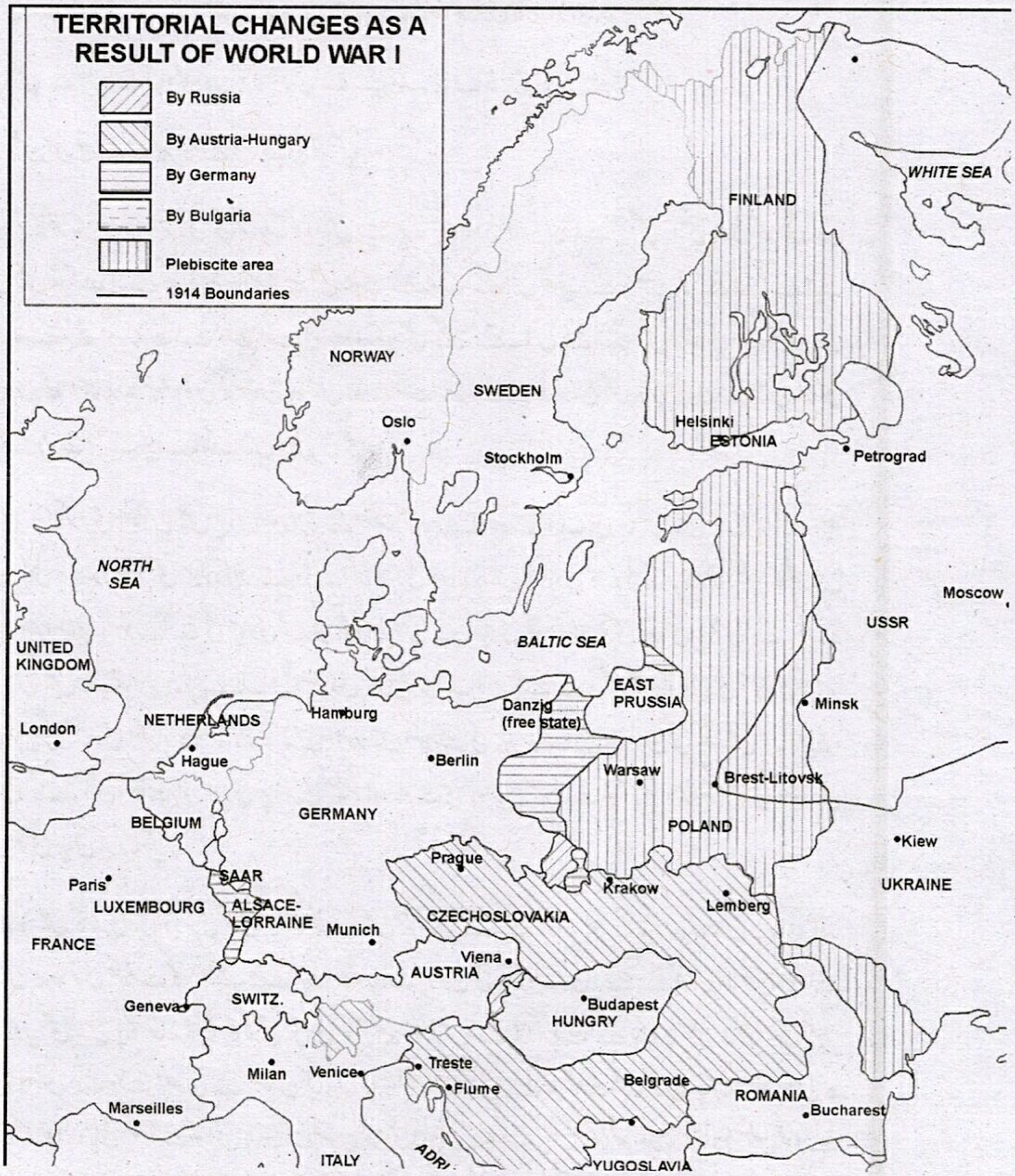

نقشہ 21.1: ہندوستان میں قومی تحریک کے اہم واقعات

نوٹ

لیکن عوام کی طرف سے ان باتوں کا ردِّعمل بہت شدید ہوا۔ عوامی مظاہرے، شراب کی دوکانوں اور غیر ملکی مال بیچنے والی دوکانوں کی گھیرابندی اور غیر قانونی اجتماعات وغیرہ بڑے پیمانے پر ہونے لگے جس پر حکومت نے سخت ظلم و جبر شروع کر دیا کیونکہ اب وہ قوم پرستوں کے ساتھ کسی طرح کا افہام وتفہیم کو نہیں چاہتی تھی۔ جیلیں بھر گئیں، کانگریس پر پابندی لگ گئی اور گاندھی جی کے آشرموں پر پولس کا قبضہ ہوگیا۔ جلوسوں کی پٹائی کر کے ان کو منتشر کیا گیا اور جو لوگ ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے ان کو مارا پیٹا جاتا اور جیل میں ڈال دیا جاتا تھا اور ان کی جائیداد کو قرق کر لیا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں جبکہ اکثر لیڈر جیل میں تھے اور حکومت کا رویہ وحشیانہ تھا لوگوں نے خود اپنے طور پر دو سال سے زیادہ تک سول نافرمانی تحریک کو برقرار رکھا۔ انجام کار اپریل میں گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی۔ اس تحریک نے ہندوستانی عوام کی اخلاقی قوت اور گاندھی جی کی ایک قومی رہنما کے روپ میں مقبولیت دونوں کو واضح کر دیا۔ اس مرحلے پر بھی رہنماؤں اور عوام نے اختلاف رائے کے باوجود تحریک جاری رکھنے کے معاملے میں گاندھی جی کے فیصلے کے آگے سرخم کر دیا۔

21.10 انتہا پسندانہ اور تحریکوں میں شدت اور بایں بازو کا عروج
(Intensification of Radical and Revolutionary Movements and Rise of the Left)

1930 اور 1935 کا درمیانی زمانہ انقلابی دہشت گردی کے واقعات کی بے مثال دھماکہ خیزی سے بھرا ہوا ہے، پنجاب اور بنگال ان واقعات کا خاص مرکز تھے۔ صرف 1931 میں 92 واقعات کی رپورٹ موجود ہے جس میں نو واقعات قتل کے ہیں۔ ان میں ایک نمایاں واقعہ چٹاگانگ (اسلحہ خانے) آرمری حملہ (Chittagong Armory Raid) کا ہے۔ چٹاگانگ میں سوریہ سین کی قیادت میں انقلابیوں کے ایک گروپ نے ایک مقامی اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا اور ہندوستانی رپبلکن فوج کے نام سے آزادی کا اعلان کر دیا اور کئی دن تک اطراف ملک کی پہاڑیوں میں برطانیہ سے بہادرانہ مقابلہ کیا۔ نوآبادیاتی حکومت کے جبر و تشدد کے باوجود دہشت گردانہ واقعات میں اضافہ ہوتا رہا۔ پنجاب میں ہندوستان سوشلسٹ رپبلکن ایسوسی ایشن (HSRA) بھی بہت فعال اور متحرک تھی اور وہاں صرف 1930 میں 26 واقعات رونما ہوئے۔

آزادی کی جدوجہد کبھی بھی صرف گاندھی جی کی اکیلی ستیہ گرہ تک محدود نہیں رہی۔ اس جدوجہد میں انتہائی متشددانہ اور انتہا پسندانہ انقلابی تحریک بھی شامل ہے اور وہ سوشلسٹ نظریات بھی شامل ہیں جو روسی انقلاب کے بعد ہندوستان میں پھیلے اس میں ایک فوجی حملہ آوری بھی شامل کا خیال بھی شامل تھا تحریک آزادی کے ان مختلف پہلوؤں یا رخوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے انقلابیوں نے گاندھی جی کی تحریک ترک موالات میں حصہ لیا۔ حقیقت میں چٹاگانگ آرمری پر قبضے کا واقعہ بھی ''گاندھی راج آ گیا ہے'' کے نعروں کے درمیان میں پیش آیا تھا۔ چندر شیکھر آزاد اور بھگت سنگھ کے گروپوں نے اُسی طرح سوشلزم کو قبول کیا جس طرح جواہر لعل نہرو اور سبھاش بوس کی قیادت میں کانگریس نے کیا تھا۔

سوشلزم نے ایسی عوامی تحریکوں کو منظم کر کے جنھوں نے ایک کامگار طبقے کو تیار کرنے میں مدد کی۔ آزادی کی جدوجہد اور سماجی مساوات کے ایک واضح ایجنڈے کو متحد کر دیا۔ ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کے نظریات کو تیار کرنے کا کام ایم این رائے جیسے ممتاز لوگوں نے انجام دیا جنھوں نے مارکسزم اور لینن کے خیالات کو ہندوستان کے پس منظر میں سمویا۔ رائے سمیت سات ہندوستانیوں نے اکتوبر 1920 میں تاشقند میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی بنیاد ڈالی۔ آہستہ آہستہ کیونزم کے نظریات ہندوستانی اہل رائے کے درمیان اور خود کانگریس کے ممبران میں مقبولیت پانے لگے۔

سبھاش چندر بوس کی شخصیت ایک انوکھی شخصیت تھی۔ وہ بہت سے نظریات سے متاثر تھے اور ایک طرف ترک موالات کے تحت تمام سرکاری عہدوں کو چھوڑا اور دوسری طرف انقلابی انتہا پسندی کو اپنایا اور ان سب پرستزاد سوشلسٹ خیالات سے بھی وابستگی اختیار کی اور انتہا یہ کہ فوجی اقدام کی جرأت مندی کو بھی اختیار کیا اور اس طرح قومی تحریک کے جذبے کی ایک علامت بن گئے۔ بوس نے ان تمام مختلف تدابیر کو اختیار کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ درحقیقت قوم پرستانہ تحریک کے کام میں آزادی کے مختلف نظریوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔

21.11 دستوری اصلاحات اور قانون سازی میں کانگریس کی شرکت (Constitutional Reforms and the Congress Participation in Legislatures)

1935 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہوا جس کے ذریعے صوبوں کے قانون ساز اداروں کے منتخب ممبران کو کچھ مزید خودمختاری دے کر قوم پرستانہ تحریک کو مراعات دی گئی تھی۔ اس ایکٹ کے ذریعے ہندوستانی لوگوں کی ایک اور بڑی تعداد کو حق رائے دہی دے دیا گیا تھا۔

1935 کے ایکٹ کو شروع کر کے برطانیہ نے 1937 کے اوائل میں صوبجاتی مجالس قانون ساز کے انتخاب کرانے کا اعلان کر دیا۔ خود کانگریس میں جوشش و پیچ کی حالت تھی اس کو حل کرنے کے بعد کانگریس نے الیکشن کے عمل میں حصہ لیا اور اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے گیارہ میں سے سات صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل کی۔ اس کامیابی سے کانگریس کو حوصلہ ملا اور اس میں طلبا، کسان اور کامگاروں کی شرکت بڑھ گئی۔ ان سب نے جلدی ہی کانگریس میں اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا اور ان طبقات میں حتیٰ کہ ان شاہی ریاستوں کے اندر بھی جو نوآبادیاتی کنٹرول سے باہر تھیں، تحریکیں شروع ہوگئیں۔

21.12 آزادی کی طرف (Towards Freedom)

مختلف صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں دو سال سے زیادہ اقتدار میں رہیں اور انھوں نے لوگوں کے مختلف طبقات کے مفاد میں اقدامات کیے۔ کسانوں کے لیے لگان میں کمی، سیاسی قیدیوں کی رہائی اور پریس سے پابندی کا خاتمہ

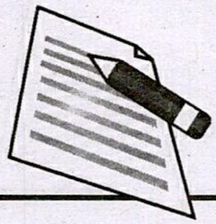

نوٹ

کچھ ایسے اقدامات تھے جو کانگریسی حکومتوں نے اٹھائے۔ ان سب کے علاوہ یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ ہندوستانی لوگ خود ایسی حکومت چلانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

1939 کے اختتام تک کانگریسی حکومتوں نے استعفےٰ دے دیے۔ 1938 میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور وائسرائے نے یکطرفہ طور پر اعلان کر دیا کہ ہندوستان برطانیہ کی ایک نوآبادی ہونے کے ناطے برطانیہ کی طرف ہے اور جنگ کا ایک حصہ بھی ہے۔ اس فیصلے کے خلاف احتجاج کے طور پر کانگریس ہائی کمان، نے کانگریس حکومتوں کو مستعفی ہوجانے کی صلاح دی۔

کانگریسی وزرا کے استعفوں سے، قومی تحریک میں ایک اہم مرحلے کا خاتمہ ہوگیا۔ ترک موالات اور سول نافرمانی کی تحریک کے نتیجے میں قومی تحریک نئے علاقوں اور نئے گروہوں تک پہنچ گئی۔ اس سے لوگوں کے دل و دماغ سے برطانوی کنٹرول مٹنے لگا۔ صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کی موثر کارکردگی نے بھی برطانوی کنٹرول کی اہمیت کو کم کردیا۔

دوسری جنگ عظیم نے برطانیہ کے لیے نیا بحران پیدا کر دیا۔ جنگ کی وجہ سے فوجیوں میں مختلف اشیاء صرف جیسے کپڑے اور غذا وغیرہ کی نئی مانگ پیدا ہوگئی۔ یہ مانگیں سوسائٹی سے چھینا جھپٹی کے ذریعے ہی پوری ہوسکتی تھیں۔ اس سے برطانیہ کے خلاف مزید ناراضگی پیدا ہوئی اور ان کی حمایت میں اور کمی آگئی۔ مثال کے طور پر جنگی ضروریات پوری کرنے کے لیے غذائی اجناس کی بڑی تعداد بنگال سے لے جائی گئیں۔ اس سے بنگال میں سخت قحط کے آثار نمودار ہوگئے اور بھکمری کی وجہ سے تیس لاکھ آدمی مرگئے۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم نے جوصورت حال پیدا کی اس سے لوگوں کے لیے سخت مشکلات پیدا ہوگئیں۔ اس سے ہندوستان میں برطانوی راج کے لیے بھی بے مثال بحران پیدا ہوگیا۔

ان حالات میں جبکہ برطانیہ کی حمایت لگاتار کم ہوتی جارہی تھی گاندھی جی نے برطانوی راج کے خلاف ایک آخری وار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اگست 1942 کو مشہور ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک شروع کی گئی۔ اس تحریک میں برطانیہ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا گیا۔ ان سے صرف ہندوستان چھوڑنے کو کہا گیا۔ ''ہندوستان چھوڑو'' کے گاندھی کے مطالبہ پر برطانیہ نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور گاندھی جی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دیگر تمام ممبران کو گرفتار کرلیا گیا۔ کانگریسی نیتاؤں کی گرفتاری کی خبر سے لوگوں میں بہت غصہ پیدا ہوا اور لوگ سڑکوں پر آگئے اور پھر جس طرح ان کے من میں آیا انھوں نے برطانوی حکومت پر حملے کیے۔ اپنے رہنماؤں کی عدم موجودگی میں لوگ خود ہی اپنے رہنما بن گئے اور انھوں نے سرکاری املاک پر حملے کیے، ان کو لوٹا اور برباد کیا۔ سرکار نے ان کے ساتھ انتہائی سختی اور بے رحمی کا برتاؤ کیا اور بہت سے لوگ پولس فائرنگ میں مارے گئے۔

انجام کار برطانوی حکومت بڑے پیمانے پر قتل اور گرفتاریاں کرکے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 1943 کے آخر تک گرفتار ہونے والے افراد کی تعداد (91,000) سے زیادہ تھی۔ اگرچہ اس تحریک کو دبا دیا گیا لیکن برطانوی حکومت کو یہ بات تو واضح ہوہی گئی کہ وہ اب زیادہ دنوں تک ہندوستان پر قبضہ باقی نہ

رکھ سکیں گے۔ اس بات کا احساس برطانیہ کو بھی ہوگیا تھا۔ اب تک وہ اپنی حکومت کے لیے حمایت اس طریقہ عمل سے چلا رہے تھے، جو انھوں نے انیسویں صدی سے ہی ہندوستان میں بنا رکھا تھا۔ اس حمایتی نظام (Support system) کو قومی تحریک نے اپنی مختلف قسم کی کوششوں اور جدوجہد سے اکھاڑ پھینکا۔ ہندوستانیوں (کسانوں، کامگاروں، درمیانی طبقات، امیروں، پولس اور فوج وغیرہ) کے مختلف طبقات کی مدد کے بغیر برطانیہ کے لیے ہندوستان پر حکومت کرنا ممکن نہیں تھا۔

جب ایک مرتبہ برطانیہ نے اس بات کو سمجھ لیا تو انھوں نے بتدریج اور پُرامن طریقے پر ہندوستان سے واپسی کی تیاری شروع کردی۔ 1945-1944 اور اس کے بعد انھوں نے تمام ہندوستانی رہنماؤں کو رہا کر دیا اور برطانیہ سے ہندوستانی ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی کے لیے گفت وشنید کا عمل شروع کر دیا۔

اور اس طرح اگست 1947 میں ہندوستان آزاد ہوگیا۔ آزادی کا حصول ہندوستانی لوگوں کے لیے بڑی خوشی کا معاملہ تھا۔ ہندوستان کے لوگ طاقتور برطانوی سامراج کے مقابلے جنگ جیت گئے تھے، لیکن یہ کوئی مطلق فتح نہ تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ یہ ملک دو قوموں ہنوستان پاکستان کے درمیان تقسیم ہوگیا۔ برطانوی حکومت نے ہمیشہ ہی اس بات کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے لوگوں میں اتحاد نہ ہوسکے۔ وہ اس بات پر کبھی متفق نہ ہوئے کہ ہندوستان کے لوگ ایک ہیں اور ان کے مشترک مفادات ہیں اور اس طرح جب وہ ہندوستان چھوڑ کر گئے تو انھوں نے مذہب کی بنیاد پر ہندوستان کو تقسیم کر دیا۔ ہندوستان کی تقسیم بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ تشدد کو ساتھ لے کر آئی۔

1947 کا سال ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ یہ ہندوستانی لوگوں کی فتح کا سال ہے کیونکہ اسی سال ان کو غیر ملکی راج سے آزادی حاصل ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی یہ ہندوستانی لوگوں کے اتحاد کے لیے ایک زبردست المیہ (Tragedy) بھی تھا کیونکہ ملک دو الگ الگ قومی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا۔

متن پر مبنی سوالات 21.5

1۔ ڈانڈی مارچ کہاں سے شروع کیا گیا تھا؟

____

2۔ 1937 کے الیکشن میں کانگریس کو کتنے صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل ہوگئی؟

____

3۔ بھارت چھوڑو تحریک میں کتنے لوگ گرفتار کئے گئے تھے؟

____

نوٹ

آپ نے کیا سیکھا

اس سبق میں مندرجہ ذیل نکات قابل ذکر ہیں:

- ہندوستانی قومی تحریک کسی ایک واقعہ کا نام نہیں بلکہ یہ ان سیاسی واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو کئی دہائیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔
- سامراج کی مخالفت اور قومی اتحاد دو ایسے موضوع ہیں جو تمام واقعات کے پس منظر میں مشترک ہیں۔ ان ہی دو موضوعات نے تمام واقعات کو متحد کر دیا ہے۔
- قومی تحریک کے ابتدائی مرحلے پر اعتدال پسند لیڈروں کا غلبہ رہا۔ ان رہنماؤں نے نوآبادیاتی حکومت کے سامنے بہت سے مطالبات پیش کیے۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ برطانوی راج ہندوستان کی معاشی ترقی کے لیے کچھ نہیں کر رہا بلکہ ان کے راج میں ہندوستانی معیشت زوال پذیر ہے۔
- اعتدال پسند رہنماؤں کے بعد جو لیڈر سامنے آئے وہ تھے بال گنگادھر تلک، بپن چندر پال اور لاجپت رائے وغیرہ جنھوں نے قومی تحریک میں عوام کی شرکت کی شروعات کی۔ انتہا پسندوں نے سودیشی تحریک شروع کی جو بنگال کی تقسیم کے برطانوی فیصلے کے خلاف شروع کی گئی تھی۔
- سودیشی تحریک کے خاتمے پر قومی تحریک میں انقلابی سرگرمیوں کی شروعات ہوگئی۔ انقلابی لیڈر جیسے خودی رام بوس اور پرفل چاکی تشدد آمیز طریقوں سے برطانوی حکومت سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ برطانوی افسروں کو انفرادی طور پر نشانہ بنایا جائے۔
- اس سے اگلا اہم قدم قومی تحریک میں گاندھی جی کا داخلہ تھا۔ مہاتما گاندھی ابتدا میں اپنے سیاسی حربوں کو چمپارن، کھیڑا اور احمد آباد کی مقامی جدوجہد میں آزما چکے تھے۔ جلدی ہی انھوں نے ملک گیر سطح پر اپنی جدوجہد کو شروع کر دیا۔
- گاندھی نے برطانوی راج کے خلاف اپنی جدوجہد کی بنیاد عدم تشدد اور عدم تعاون پر رکھی ان حربوں سے انھوں نے اپنی تین تحریکوں کی قیادت کی یعنی تحریک ترک موالات (22-1920)، تحریک سول نافرمانی (1930-34) اور ہندوستان چھوڑو تحریک (1942)۔
- ان تحریکات کا یہ نتیجہ نکلا کہ قومی تحریک کو ہندوستانی لوگوں میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ تحریک کسانوں، کامگاروں اور طلبا جیسے آبادی کے مختلف طبقات تک پہنچ گئی۔ قومی تحریک آہستہ آہستہ ملک کے بیشتر حصوں میں پھیل گئی۔

- جیسے جیسے قومی تحریک کی مقبولیت بڑھتی گئی ویسے ویسے برطانوی حکومت کی مقبولیت گھٹتی گئی۔ برطانیہ نے ہندوستان پر بہت سے ہندوستانیوں کی مدد سے حکومت کی تھی۔ ان ہی ہندوستانیوں نے ہندوستان میں برطانوی راج کے لیے ایک تائیدی نظام (Support system) بنا دیا تھا۔ قومی تحریک نے اسی تائیدی نظام کو نقصان پہنچایا اور اس کو معطل کرنے میں کامیابی حاصلکر لی۔

- انجام کار برطانیہ نے 1947 میں ہندوستان چھوڑ دیا اور ہندوستان 15 اگست 1947 کو غیر ملکی راج سے آزاد ہوگیا۔

- بہرحال، برطانیہ نے ہندوستان چھوڑنے سے پہلے مذہب کی بنیاد پر ہندوستان کو تقسیم کرنے کا فیصلہ لیا۔ ہندستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ، ہندوستان کی تقسیم بھی ہوئی۔ اس طرح آزادی اور تقسیم جدید ہندوستان کی تاریخ میں دو اہم واقعات ہیں۔

اختتامی سوالات

1۔ ابتدائی کانگریس کے اہم سروکار بیان کیجیے۔

2۔ سودیشی اور بائیکاٹ تحریک کے ارتقا پر روشنی ڈالیے۔

3۔ 1907-1914 کے درمیان ہندوستان اور ہندوستان سے باہر انقلابی تحریک کی مختلف قوتوں کو مختصر طور پر بیان کیجیے۔

4۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا حال لکھیے۔

5۔ گاندھی ارون معاہدہ کی شرائط بیان کیجیے۔

6۔ دوسری ترک موالات کی تحریک کیوں شروع کی گئی تھی؟

7۔ 1930-1934 کے درمیان بایں بازو کے کمیونسٹوں کے عروج کا بیان کیجیے۔

8۔ 1947 فتحمندی کا سال بھی تھا اور ایک عظیم المیہ بھی تھا۔

متن پر مبنی سوالوں کے جوابات

21.1

1۔ دسمبر 1885؛ اے. او. ہیوم

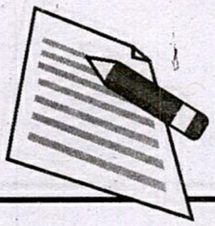

نوٹ

2۔ 1905: لارڈ کرزن

3۔ جاترا

4۔ کلکتے کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے

21.2

1۔ سوہن سنگھ بھکنا اور ہردیال

2۔ کینیڈا جانے والے کو ماگاتا مارو جہاز کے مسافروں کو کیناڈا کی حکومت نے واپس کردیا۔ جب 1914 میں وہ مسافر کلکتہ پہنچے تو وہ پولس سے بھڑ گئے اور اس میں 22 لوگ مارے گئے۔

3۔ میڈم کاما

4۔ ہوم رول تحریک

21.3

1۔ چمپارن، احمد آباد، کھیڑا

2۔ 6 اپریل 1919

3۔ اس دن جلیانوالہ باغ کے مجمع پر جنرل ڈایر نے اپنے لوگوں سے نہتے اور بے مار و مددگار لوگوں پر گولی چلائی۔ اس میں 379 لوگ مارے گئے۔

21.4

1۔ خلافت سے متعلق غلط رویہ، پنجاب سے متعلق بدسلوکی اور سوراج

2۔ 1923؛ موتی لال نہرو اور سی آر داس

3۔ ہندوستان سوشلسٹ ریپبلیکن ایسوسی ایشن

21.5

1۔ سابرمتی آشرم

2۔ سات

3۔ 91,000 سے زائد

نوٹ

اختتامی سوالات سے متعلق اشارے

1۔ دیکھیے 21.1 کا صفحہ 3

2۔ دیکھیے 21.2

3۔ دیکھیے 21.3

4۔ دیکھیے 21.8

5۔ دیکھیے 21.9

6۔ دیکھیے 21.9 پیرا 7، 8 اور 9

7۔ دیکھیے 21.10، پیرا 2 اور 3

8۔ دیکھیے 21.12

ماڈیول 5

بیسویں صدی کی دنیا

سبق 22 انیسویں صدی کا ورثہ

سبق 23 پہلی جنگ عظیم اور روسی انقلاب

سبق 24 جنگوں کی درمیانی مدت اور دوسری جنگ عظیم

سبق 25 سرد جنگ اور اس کے اثرات

سبق 26 قومی حرکیت کی تحریکیں

سبق 27 بیسویں صدی میں سماجی تبدیلیاں

سبق 28 بیسویں صدی میں تبدیلیاں

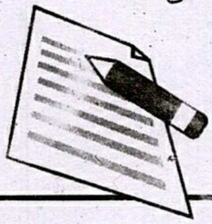

نوٹ

22

سن 1900 کی دنیا: انیسویں صدی کی وراثت
(The World in 1900 : The Nineteenth Century Legacy)

جب ہم کتابوں، فلموں، ٹی وی یا دوسرے لوگوں کے ذریعے سنی ہوئی کہانیوں سے ماضی کے بارے میں جانکاری حاصل کرتے ہیں تو ہمیں اپنے حال اور اپنے ماضی کے بیچ بہت سی مشابہتیں اور بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں۔ ہم اس بات سے تو باخبر ہیں ہی کہ بہت سی ایسی مادی چیزیں اور تکنیکیں جنھیں ہم آج استعمال کرتے ہیں وہ 1900 میں نہیں تھیں یا پھر ان کو بہت تھوڑے سے لوگ ہی استعمال کرتے تھے۔ لیکن جہاں تک انسانی زندگی کی تنظیم کا تعلق ہے تو ہمارے اور سن 1900 کے لوگوں کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اس اکائی میں اسی بات پر گفتگو ہوگی کہ 1900 میں دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگ کس طرح زندگی گذارتے تھے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ

- 1900 میں دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے لوگوں کے طرز زندگی کے بارے میں جانکاری حاصل کرسکیں گے؛
- سرمایہ دارانہ صنعتیانے (Capital Industrialisation) کی وضاحت کرسکیں گے اور اس کے سماجی نتائج کو سمجھ سکیں گے؛
- نوآبادیت کے رشتوں کی وضاحت کرسکیں گے؛
- توانائی اور وسائل کے استعمال کے جدید طریقوں کو جان سکیں گے؛
- جدید سیاسی نظریات کے ظہور نیز ان کی حرکت پذیری (Mobilization) کا تجزیہ کرسکیں گے؛

22.1 عالمی آبادی کا ڈھانچہ (Structureof World Population: 1900)

انسانی آبادیوں کے مطالع یعنی ان میں اضافے کی شرحیں اور بستیوں کی ہجرت کے طور طریقے کو آبادی کے اعداد و شمار کا علم (Demography) کہا جاتا ہے۔

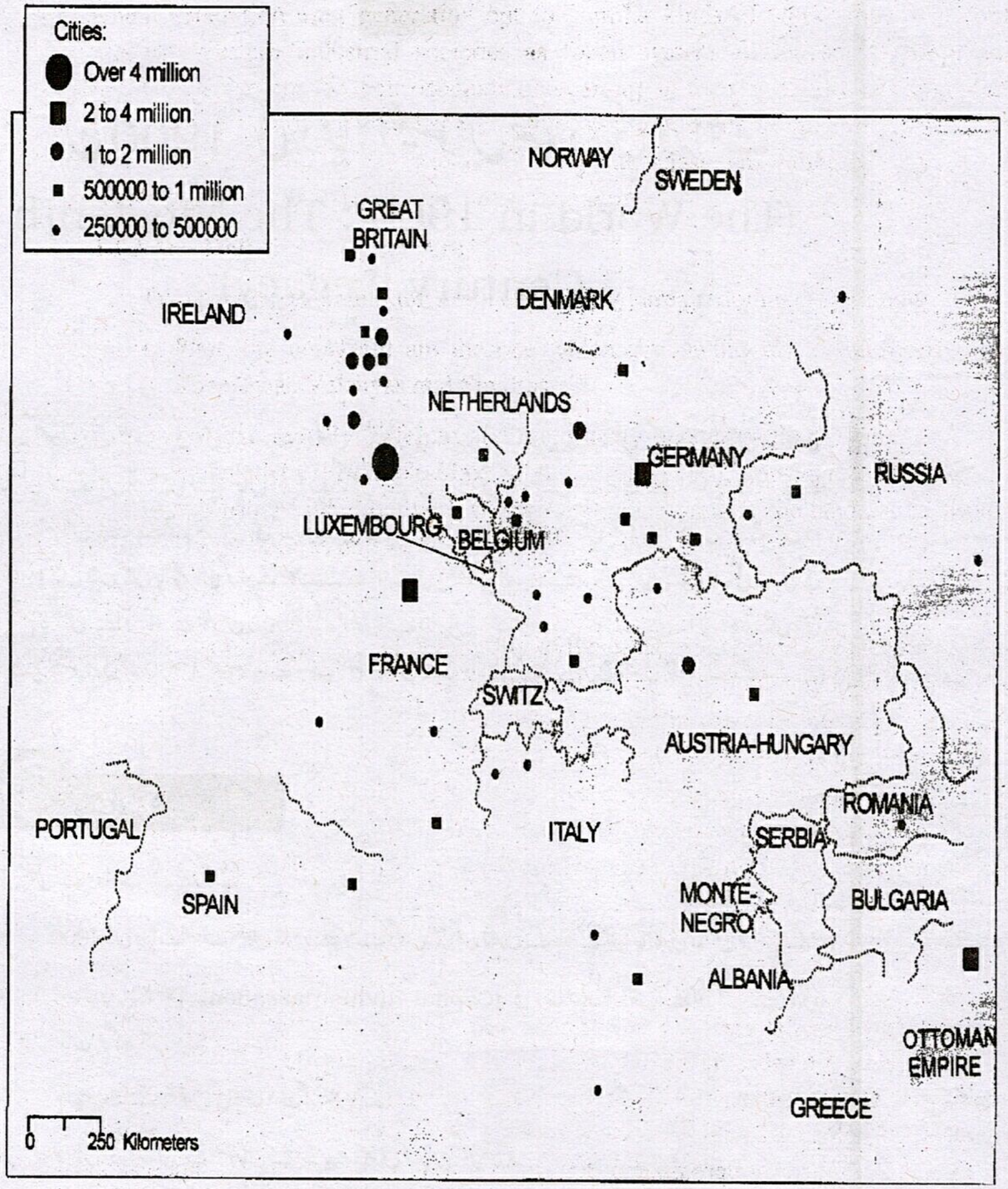

نقشہ(a) 22.1: ابتدائی صدی کے یوروپ کا شہریانہ

1900 میں انسانی آبادی تقریباً 1.5 بلین (ایک سو پچاس کروڑ) تھی۔ اس وقت بھی ہندوستان اور چین سب سے زیادہ آبادی والے ملک تھے۔ پھر بھی 1900 میں ایشیا کے اندر آج کے مقابلے دنیا کی آبادی کا نسبتاً چھوٹا حصہ (Portion) تھا۔ 1900 میں تمام دنیا میں لوگوں کی اکثر آبادیاں زراعتی تھیں اور یہ لوگ اناج بوتے، مویشی پالتے اور گاؤوں میں رہتے تھے۔ دنیا کے بیشتر حصوں میں لوگ خانہ بدوشوں کی طرح رہتے تھے، جانوروں کے گلوں کو

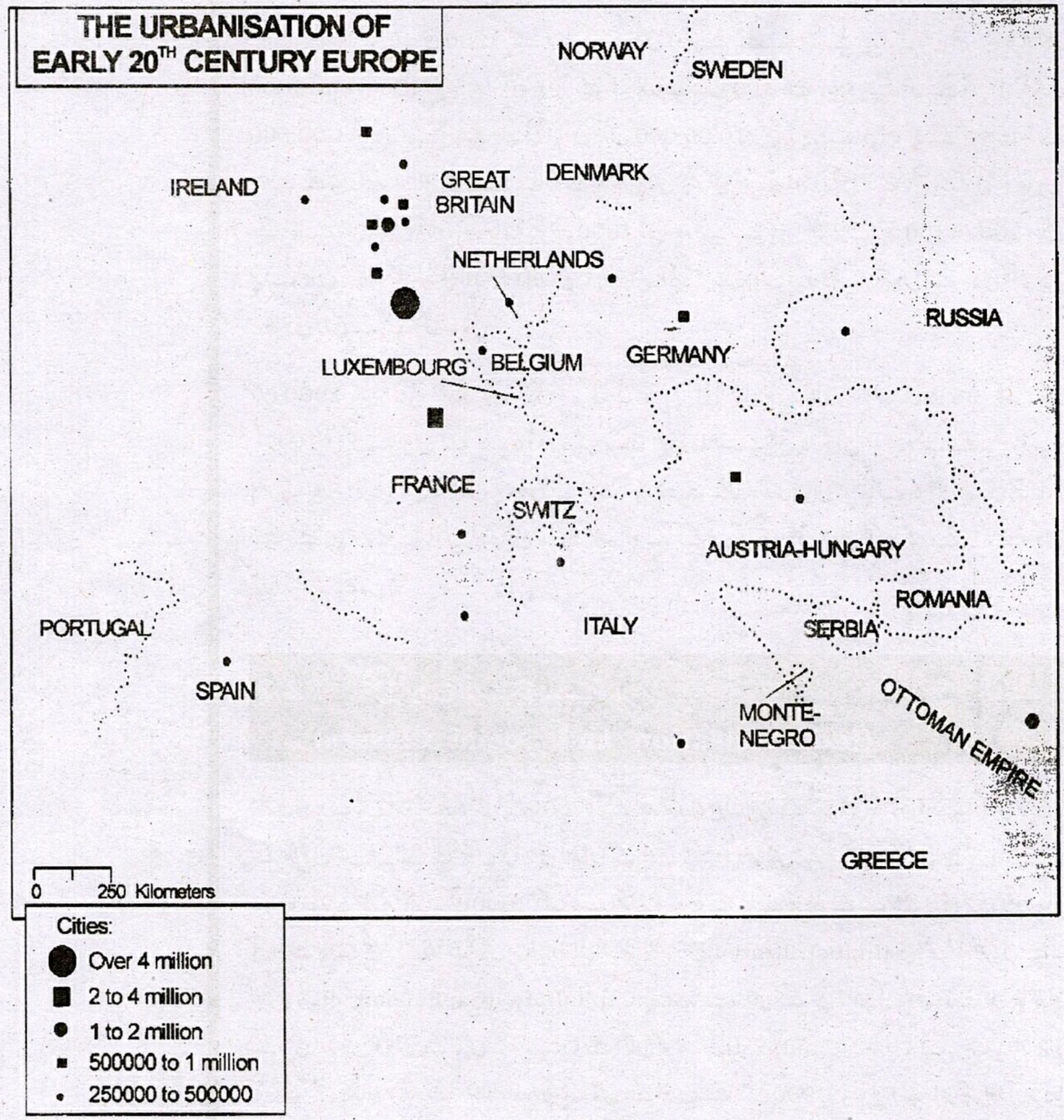

نقشہ 22.1(b) : ابتدائی بیسویں صدی کے یوروپ کا شہر

چراتے تھے اور بہت سے شکاری اور غذا اکھٹا کرنے والے(Hunter-gatherers) قبائلی تھے اگرچہ 1900 میں چندسو سال پہلے کے مقابلے ان کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی۔

دنیا کی آبادی کا تیزی سے بڑھنے والا ایک حصہ شہروں میں رہتا تھا۔ شہر دنیا کے اکثر حصوں میں قدیم زمانے سے موجود رہے ہیں۔ لیکن یہ اپنی جسامت اور آبادی کے لحاظ سے محدود تھے۔ البتہ سرمایہ دارانہ صنعتیانے (Industrialization) کے عمل سے شہریانے(Urbanization) کا عمل شروع ہوا اور شہروں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ سن 1900 تک دنیا کے کسی بھی دوسرے خطے کے مقابلے یوروپ میں شہروں کا ارتکاز (Concentration) زیادہ ہوا یعنی یوں کہیے کہ یوروپ میں 100 سے زیادہ ایسے شہر تھے جن کی آبادی 1,00,000 اور چھ ایسے شہر تھے جن کی آبادی تقریباً10,00,000 تھی۔ یوروپ اور امریکا کے شہر بہت بڑے بڑے تھے جبکہ ایشیا اور افریقہ کے بڑے بڑے علاقوں میں چند ہی شہر تھے اور وہ بھی اپنے ماضی کے کئی سو سالوں کے مقابلے میں زوال آمادہ اور جامد تھے سن 1900 میں یوروپ سے باہر اکثر بڑے شہر 100 اور 200 سال پرانے ہوں گے۔ مثلاً سڈنی اور شکاگو اور ان میں بھی یوروپی نسل کے لوگ آباد تھے کچھ شہروں جیسے بنگال کلکتہ نے برطانوی راج کے تحت نشوونما پائی۔

سن 1900 میں ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کی عام انسانی آبادیوں میں %75 سے %95 تک دیہی آبادی رہتی تھی۔ یا یوں کہیے کہ یہ گاؤوں میں رہتے اور زراعت یا کھیتی باڑی پر منحصر ہوتے تھے۔ یوروپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں (جہاں یوروپی تڑادلوگ آباد ہوگئے تھے) اور جہاں صنعتیانے کا عمل جاری تھا یا تو پہلے سے پچاس فیصد آبادی شہری تھی یا 50 فیصد ہونے کے قریب تھی یعنی وہاں لوگ چھوٹے بڑے شہروں میں رہتے تھے۔

22.2 صنعتی فروغ اور سماجی درجہ بندی (Industrilisation and Social Classes)

مغربی یوروپ میں صنعتیانے کا عمل تقریباً1700 کے بعد شروع ہوا۔ اس کے نتیجے میں توانائی اور پیداواری وسائل کے علاقوں میں غریب محنت کشوں کی بڑی تعداد اکھٹی ہوگئی تاکہ وہ دھاتیں تیار کرسکیں، مشینیں چلاسکیں اور تیزی کے ساتھ مال تیار کرسکیں۔ سن 1900 تک جب انڈسٹری کو بڑے پیمانے پر چلانے کے لیے بڑی بڑی رقموں کی ضرورت پڑنے لگی تو اس وقت ہمیں سرمایہ دارانہ انڈسٹریلائزیشن(Industrilization) کی نشوونما نظر آتی ہے۔ لفظ سرمایہ داری(Capitalism)، سرمایہ(Capital) سے بنا ہے۔ اس کے معنی اکھٹا کی ہوئی دولت اور جائیداد کے ہیں اور جن لوگوں کے پاس یہ سرمایہ ہوتا ہے انھیں سرمایہ دار(Capitalist) کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دار براہِ راست صنعتی پیداوار، تجارت، انتظام اور بینکنگ میں لگے ہوئے تھے۔ سن 1900 تک یوروپ، امریکہ اور آسٹریلیا کے بیشتر لوگ سرمایہ دارانہ صنعتیانے سے گذر چکے تھے۔

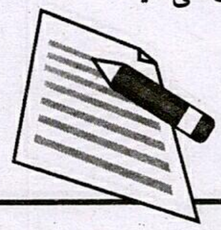

نوٹ

سرمایہ داروں کی دولت اور جائیداد یا تو تجارت اور کامرس سے یا پھر چھوٹے مالکوں کی جائیداد کو ہڑپنے سے حاصل ہوئی تھی۔ دوسری طرف وہ لوگ مرد، عورتیں اور بچے تھے جو فیکٹریوں میں کام کرتے تھے اور جن کے پاس اپنی کوئی جائیداد نہ ہوتی تھی اور وہ جو اپنی روزی روٹی کے لیے محنت مزدوری پر بھروسہ کرتے تھے اور محنت مزدوری کر کے ہی ان کو اجرت ملتی تھی۔ ان ہی کے درمیان ایک بڑی اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو 1900 میں بے جائیداد اور اجرت پانے والے تھے لیکن انھیں دولت مند نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ تنخواہ دار مڈل کلاس کے ممبر ٹیچر، ڈاکٹر، انجینئر، کلرک اور دوسری سروسز کے لوگ تھے۔

اس وقت تک اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ طبقات معمول کے مطابق ہیں اور یہ ایسے ہی رہیں گے اور لوگوں کی اکثریت ان نابرابریوں کو قبول کرلے گی کیونکہ ان کی حالت میں سدھار ہوا ہے۔ انھوں نے یہ دیکھا کہ نوآبادیوں سے دولت کی منتقلی کے ذریعے کچھ فائدے ورکنگ کلاس کے لوگوں کو بھی پہنچیں گے جیسا کہ یوروپ میں ہوا۔ سن 1900 تک کسی حد تک ایسا ہوا بھی اور اکثر لوگ اپنے اباء واجداد کے مقابلے بہتر طریقے سے زندگی گذارنے لگے۔ لیکن بے روزگاری کے مشکل حالات اس زمانے بھی موجود رہے۔

سن 1900 تک ایشیا اور افریقہ کے شہروں جیسے بمبئی، شنگھائی اور ڈکار میں تاجروں، دکانداروں اور مڈل کلاس کے لوگوں کے ساتھ ساتھ صنعتی محنت کشوں کی بڑی تعداد اکٹھی ہوگئی۔ لیکن یہاں کے دیہات اور اطراف میں رہنے والے زمینداروں، کسانوں اور زراعت محنت کشوں کی تعداد کل آبادی پر غالب تھی۔

سن 1900 کے سرمایہ دارانہ معاشروں (Societies) کے بارے میں کچھ دیگر حقائق کا بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ یوروپ کی معیشتوں کے لیے منڈیاں اور خام مال کی بڑی مقدار آبادیوں سے ہی ملتی تھی اور ان کے درمیان رشتہ بھی نابرابری کا تھا۔ ان کا تجارتی رشتہ غیر مساویانہ تھا۔ یوروپ کے معاشروں میں زمینداروں کا اب ایسا طبقہ نہیں رہ گیا جس کو غلبہ حاصل ہو۔

22.3 شہریت پسندی اور علم (Urbanism and Knowledge)

صنعتیانے کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ معاشرہ میں پیداوار اور معلومات میں شرکت کا رشتہ پہلے سے زیادہ شہری زندگی کے ساتھ ہوگیا۔ چھوٹے بڑے شہر اب نہ صرف صنعتی محنت کشوں کے مرکز بن گئے بلکہ ان میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد بھی اکٹھی ہوگئی جو ایسی نوکریوں میں لگے تھے جن کے لیے تعلیم اور خواندگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کلرک، مینیجر، ٹیچر اور سرکاری افسران وغیرہ۔ پھر یہ بات بھی جلدی ہی مان لی گئی کہ انڈسٹری میں ایسے کام کرنے والے افراد کی لیاقت اور کارکردگی بہتر ہوتی ہے جو پڑھنا لکھنا اور حساب کتاب جانتے ہوں۔ اخبارات اور جرائد سے بھی اس بات کو تقویت ملی۔ سن 1900 میں اخبارات کی اشاعت لندن، پیرس، برلن اور نیویارک جیسے شہروں میں دس لاکھ کاپیوں سے زیادہ ہوگئی تھی۔

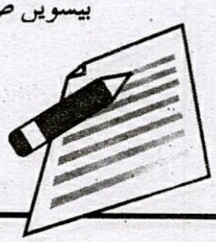

نوٹ

سن 1900 تک اکثر صنعتی معاشروں کو اس بات کی ضرورت پیش آ گئی کہ لڑکے اور لڑکیوں کو کم از کم 13 یا 14 سال کی عمر تک بنیادی تعلیم حاصل ہو۔ اسکولی تعلیم ایک ایسا جدید پیشہ (Profession) ہو گیا تھا جس میں عورتوں کی حصہ داری بہت بڑی تعداد میں تھی۔ دیہی اور شہری لوگوں کے درمیان تعلیمی اور ثقافتی خلیج پیدا ہو گئی تھی۔ مجموعی طور پر کچھ مغربی معاشروں میں بالغوں میں شرح خواندگی 1900 میں 60 فیصد اور 90 فیصد کے درمیان تھی جبکہ غیر مغربی معاشروں میں یہ بہت کم تھی۔

متن پر مبنی سوالات 22.1

1۔ سن 1900 میں یوروپ سے باہر انسانی آبادی کا دیہی تناسب کیا تھا؟

2۔ کیا سن 1900 میں دنیا کے اکثر بہت بڑے شہر (10,00,000 <) یوروپ میں تھے یا یوروپ سے باہر؟

3۔ سن 1900 تک شہری مراکز اور دیہی علاقوں کے درمیان خواندگی کی اہم خلیج کیوں موجود تھی؟

4۔ سن 1900 کی دنیا میں اونچی شرح خواندگی کی علامتیں کیا تھیں؟

22.4 توانائی اور وسائل کا استعمال: دنیا کے صنعتی بنام غیر صنعتی علاقے
(Energy and Resource Use : Industrial Versus Non Industrial Areas of the World)

سن 1900 کی صنعتی اور غیر صنعتی دنیا میں لوگوں نے نہ صرف مختلف چیزوں کو بنایا اور پیدا کیا بلکہ انھوں نے توانائی کے استعمال کے مختلف طور طریقوں کو بھی ترقی دی۔ 1900 میں غیر صنعتی دنیا کے اندر پیداوار کے لیے انسانی اور حیوانی قوت کا استعمال کیا جاتا تھا۔ امریکی کھیتوں میں بھی کسانوں کے ہل اور کھیت کاٹنے کی مشین گھوڑوں سے چلتی تھیں اور ایسے ہی شہروں میں مختلف قسم کی گاڑیاں اور بسیں وغیرہ بھی گھوڑوں سے ہی چلتی تھیں۔

صنعتی معاشروں میں بھی فیکٹریاں چلانے، گھروں اور دفتروں کو روشن کرنے اور ٹرانسپورٹ کے جدید ذرائع مثلاً ریلوے انجنوں اور آٹوموبائلز کو قوت مہیا کرنے کے لیے توانائی کے ذرائع کی ضرورت تھی۔ اس طرح 1900 میں برطانیہ، فرانس اور جرمن ایسے معاشرے تھے جہاں کوئلے کی قوت کا بڑے پیمانے پر استعمال ہوتا تھا جبکہ اٹلی نے

پن بجلی کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ امریکہ زیادہ تر پیٹرولیم کے ایندھن پر بھروسہ کر رہا تھا۔ سن 1915 تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اب نقل وحمل کے لیے گھوڑوں کی جگہ کاروں نے لے لی۔

یہ ممالک سمجھنے لگے تھے کہ ان کی معاشی اور سیاسی قوت توانائی کے ذرائع پر منحصر ہے اور اسی لیے انھوں نے اپنی نوآبادیوں کے وسائل کی کھوج شروع کردی۔ مثال کے طور پر، برطانیہ آسام اور برما میں تیل کی تلاش کر رہا تھا، ڈچ ساترا میں اور امریکی میکسکو میں یہی کام انجام دے رہے تھے۔ ان ہی عوامل نے ان کی خارجہ پالیسی کو طے کیا تھا۔

22.5 نوآبادیت، معاشی طور طریقے اور سماجی رشتے (Colonialism,Economic Patterns, and Social Relations)

سن 1900 میں مغربی دنیا کے اکثر صنعتی ملک اپنے ملک کی سرحدوں سے بہت دور علاقوں پر یا تو براہ راست حکومت کرتے تھے یا پھر معاشی طور پر ان کو کنٹرول کرتے تھے۔ ایشیا کے اکثر علاقوں میں برطانیہ کی حکومت تھی جبکہ ہالینڈ کی اس تمام علاقے پر، جو اب انڈونیشیا ہے، حکومت تھی۔ فرانس، برطانیہ، جرمن، اٹلی، پرتگال اور بلجیم کی نوآبادیاں زیادہ تر افریقہ، جاپان اور چین میں تھیں۔

نوآبادیاتی حکمرانوں کی کوشش یہ تھی کہ وہ ایشیا اور افریقہ کو ترقی یافتہ ٹیکنالوجیاں نہ حاصل کرنے دیں اور انھوں نے اسی لیے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنی نوآبادیات میں ریلویز اور ٹیلیگراف نیٹ ورکوں کو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ انھوں نے آزادی کی امنگوں اور آرزوؤں کو بھی سختی سے کچلا۔ انھوں نے انتظامیہ کی پہلے سے رائج زبانوں کو اپنی زبانوں سے بدلا۔ انھوں نے اپنی کچھ تعلیمی پالیسیوں کو بھی شروع کیا تاکہ نوآبادیاتی سماج کے کچھ طبقات کو غیر ملکی راج کے ساتھ جذب کرسکیں۔ انھوں نے انتظامیہ میں نچلی سطح کے کاموں کو انجام دینے کے لیے بھی ان طبقات میں سے کچھ لوگوں کو تیار کیا۔ انھوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی، جدید معاشی سرگرمیوں کے ارتقاء پر قدغن لگائی اور سامراجی زبان میں تعلیم حاصل کرنے والوں اور مقامی زبان میں تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان ایک سماجی خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی۔

نوآبادیاتی اور سرمایہ دارانہ اثرات نے نوآبادیوں میں سماجی رشتوں کو بدل دیا۔ انھوں نے مزاعت کے طور طریقوں (Patterns) کو بھی بدلا اور ترجیحات ان نقدی فصلوں کو دیں جن کی وہ تجارت کر سکتے تھے۔ پیداوار کے اس طریقے سے انیسویں اور اوائل بیسویں صدی کے دوران برآمد کی بہت توسیع ہوئی۔ مثال کے طور پر ہندوستانی کسان افیم اگاتے تھے جسے برطانوی تاجر چین کو برآمد کرتے تھے۔ اس میں ہندوستانی تاجروں کا بھی ہاتھ ہوتا تھا۔ بالفاظ دیگر پیداوار اور تجارت دونوں پر حکمراں طبقے کے مفادات کی چھاپ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے لوگ ان چیزوں کی پیداوار کرنے لگے جن کو وہ خود صرف یا خرچ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ ان چیزوں کو استعمال کرتے تھے جو کہیں اور پیدا یا تیار کی جاتی تھیں۔

نوٹ

اس قسم کے تجارتی طریقوں نے باہمی انحصار باہمی محرومی دونوں کو جنم دیا اور حکمراں طبقے کے اثرات اس کے ذمہ دار تھے۔ اکثر علاقوں میں کسان غذائی کفالت سے محروم ہوگئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ غذائی اجناس کی عالمی پیداوار پہلے کے مقابلے کہیں زیادہ تھی لیکن انیسویں صدی کے قحط سے لاکھوں لوگوں کی جانیں تلف ہوگئیں۔

متن پر مبنی سوالات 22.2

1۔ سن 1900 میں وہ کون سے ممالک تھے جو زمین دوز ایندھنوں کے استعمال کو اختیار کر رہے تھے؟

____

2۔ 1900 میں ان ایندھنوں کے ذخائر کہاں تھے؟

____

3۔ کیا 1900 میں بین الاقوامی تجارت سے بڑی طاقتوں کی نوآبادیوں کو بھی فائدہ پہنچا؟

____

4۔ اگرچہ غذائی اشیا کی مجموعی پیداوار انیسویں صدی کے اواخر میں تیزی سے بڑھی لیکن بہت سے لوگ غذائی تحفظ (Security) سے محروم رہے۔ کیوں؟

____

5۔ زبان کا استعمال اور تعلیم تک رسائی کا نوآبادیاتی حکومت سے کس طرح کا رشتہ تھا؟

____

22.6 ترقی یافتہ غیر ترقی یافتہ دنیا میں نظریات اور سیاسی حرکت پذیری
(Ideologies an Political Mobilization in the Developed and Undeveloped Worlds)

سن 1900 کی دنیا میں نظریات کی نشوونما بڑے زبردست پیمانے پر ہوئی اور نظریات یا معاشروں کی زندگی اور تنظیموں کے بارے مں ے مختلف سیاسی نظریات کے درمیان زبردست مقابلہ آرائی رہی۔ بڑی حد تک یہ سب کچھ ان معاشی اور سماجی تبدیلوں کا نتیجہ تھا جو صنعتیانے (Industrialization) سے جڑی ہوئی تھی۔ ان نظریات پر جسے بڑے وسیع پیمانے پر ہوئے اور طباعت اور دیگر ذرائع ابلاغ کی ترقی کی وجہ سے ان نظریات کے ماننے والوں کی تعداد بھی بڑھی اور ان کی تنظیمیں بھی بن گئیں۔ سن 1900 تک مغربی ممالک اور بہت سی نوآبادیوں میں بھی پرنٹ میڈیا نے نہ صرف بہت سے لوگوں تک معلومات (اور مصنوعات اور سروسز وغیرہ کی تشہیر) کی فراہمی شروع کردی تھی۔ بلکہ ان کے سیاسی خیالات کی تشکیل بھی شروع کردی تھی۔

نوٹ

حریت پسندی (Liberalism)

حریت پسندی کچھ ایسے معتقدات کا مجموعہ ہے جن کا ظہور تقریباً تین سو سال پہلے اس وقت ہوا جب امرا (Nobles) اور دیگر صاحب جائداد لوگوں نے (کبھی کبھی ذرا غریب لوگوں کے ساتھ لے کر) حکمرانوں کے اختیارات کو محدود کرنے کی جدوجہد کی۔ حریت پسند (Liberals) اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ افراد کے کچھ قدرتی حقوق ہوتے ہیں جن میں ظلم کی مزاحمت کرنے کا حق، جائداد کے حصول کا حق، مذہب کی آزادی اور آزادی اظہار کا حق شامل ہیں۔ ان کا یہ بھی یقین تھا کہ حکومتوں اور حکمرانوں سے ان حقوق کا احترام کروانا ضروری ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ عوامی قوانین اور دستور اساسی کے ذریعے ان حقوق کی تخلیق اور ان کا نفاذ ممکن ہے۔ حکمرانوں اور حکومتوں کی مشینری کے اختیارات کے یک طرفہ استعمال کے خلاف قوانین عامہ اور دستور اساسی کا تحفظ فراہم کرنا مسئلہ کا حل ہے۔ ان لوگوں نے ریاست کے اہل اقتدار کی اس بات کی بھی مخالفت کی کہ وہ قومی کلیساؤں کے ذریعے اپنے لوگوں کے مذہبی عقائد کو دوسروں پر تھوپیں کیونکہ مذہب خالصتاً ایک نجی (Private) معاملہ ہے۔ عوامی تحریکات کے نشوونما پانے کے ساتھ ہی ساتھ حریت پسندی پر یہ دباؤ بھی ڈالا گیا کہ وہ سماج کے تمام افراد کے لیے سیاسی اور شہری حقوق کو تسلیم کرے اور صرف صاحب جائداد لوگوں کے حقوق کی بات نہ کرے۔ ان حقوق میں تنظیموں کی تشکیل اور انتخابات میں حصہ لینے کے حقوق بھی شامل تھے۔

حریت پسندی کچھ معاشی نظریات سے بھی وابستہ ہے۔ حریت پسند سمجھتے تھے کہ لوگ معاشی عامل (Economic agents) ہیں جو اشیا اور سروسز کے پروڈیوسر اور کنزیومر ہوتے ہیں۔ وہ ان چیزوں کو شخصیات کے اہم پہلو اور افراد کی خود اظہاریت کے منسوب کرتے تھے۔ لیکن ان کے نزدیک اصل ہیرو محنت کش یا مزدور نہیں بلکہ نفع اندوز تاجر، دکاندار اور مینوفیکچرر ہوتر تھے۔ آدم اسمتھ معاشی حریت پسندی کا اہم ترجمان ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کو اپنے مفادات کی پیروی کی اجازت مل جائے تو اس سے مشترکہ مفاد کی ترقی ہوگی۔ اگر معاشی سرگرمی کو آزاد کو چھوڑ دیا جائے تو یہ رسد اور مانگ (Supply and Demand) دونوں کو خود تخلیق کرلے گی اور نتیجتاً معاشرہ میں کھلا پن (Fairness) پیدا ہوگا۔ ان لوگوں نے آزاد تجارت کی حمایت کی۔ اس طرح معیشت کے لیے سب سے اچھی حکومت وہ ہے جو کم سے کم حکومت کرے اور ہر چیز کو بازار اُتار چڑھاؤ پر چھوڑ دے۔

سن 1900 تک بہت سے حریت پسندوں نے یہ سوچنا شروع کردیا تھا کہ سماج کے غریب طبقات کے لیے کچھ فلاحی اقدامات شروع کر کے حکومت کو بہتر طور پر مداخلت کرنی چاہیے۔ مثلاً یہ فلاحی اقدامات تعلیم اور صحت کے شعبوں میں ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کے بنیادی نظریات آج بھی وہی ہیں۔ ان لوگوں نے خاص طور پر صاحب جائداد لوگوں کے مفادات کی نمائندگی کی۔ حریت پسندوں کو خاص حمایت ان پروفیشنل اور تعلیم یافتہ امراء سے ملی جو ایسے روایتی اور یک طرفہ انتظامات سے برگشتہ تھے جن کے مطابق مراعات پیدائش کی بنیاد (اعلی خاندان یا نسب) پر دی جاتی تھیں۔ ان لوگوں کو سرمایہ دار تاجروں اور صنعت کاروں کی بھی حمایت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ ان کو بہت سے ایسے کام کاجی لوگوں کی بھی حمایت حاصل تھی جو انفرادی اور قانونی حقوق کے بارے میں ان کے دلائل کو پسند کرتے تھے لیکن یہ نہ سمجھتے تھے کہ وہ لوگ کام کاجی لوگوں کے لیے معاشی مساوات یا معاشی حقوق کے بالکل قائل نہ تھے۔

قدامت پسندی(Conservatism)

قدامت پسندوں کا تعلق خاص طور پر ان زمینداروں یا دیگر افراد سے تھا جو ان مراعات اور پابندیوں کے خاتمہ کو ناپسند کرتے تھے جن سے ان کو فائدہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ یا تو زمین مالک تھے یا مرچنٹ اور تاجر تھے جنھیں ریاست کی طرف سے تحفظ اور اجارہ داریاں حاصل تھیں جو آزاد تجارت کی پالیسیوں کی وجہ سے ان کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ ان کے لیے قدرتی حقوق کا مکمل نظریہ ہی تفرقہ انگیز(Disruptive) تھا کیونکہ اس نے معاشرہ کے اس قدیم روایتی نظام کو برباد کردیا تھا جس میں سماج کے ہر طبقے کا ایک اپنا مقام تھا۔ ان کے لیے سماجی نظام اور سماجی پائداری مساوات کے مقابلے زیادہ اہم تھیں۔ وہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ خدا کے حضور تو سب برابر ہیں لیکن یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ حقیقی دنیا میں بھی ایسا ہی ہو۔ وہ قدیم سماجی نظام کو جدید دنیا کی اس بدنظمی کے خلاف ایک بہترین دفاع بناتے تھے جو سماج میں تصادموں اور آویزشوں کا موجب ہے۔ تمام مغربی ریاستوں میں مضبوط قسم کے قدامت پسند سیاسی گروہ تھے جو انتخابات میں حصہ لیتے تھے اور جن کا انتظامی مشینری میں بھی بڑا اثر تھا۔

اشتراکیت یا سوشلزم (Socialism)

اشتراکیت پسندوں یا سوشلسٹوں نے بھی حریت پسندی پر تنقید کی لیکن ان کی تنقید ان معاملات سے مختلف نہ تھی جن معاملات پر قدامت پسند تنقید کرتے تھے۔ اشتراکیت پسند(Socialists) کام کاجی لوگوں کے مفادات کی نمائندگی کرتے تھے اور یہ دلیل دیتے تھے کہ صنعتی سرمایہ دارانہ معاشروں میں مطلق العنان بادشاہوں یا اشرافیہ کی حکومتوں کے ظلم کی جگہ صاحب ملکیت سرمایہ دار بورژوا(Bourgeoisie) طبقہ لے لیتا ہے۔ کچھ ابتدائی اشتراکیت پسندوں جیسے لوئس بلانک(Louis Blonc) اور رابرٹ اوین(Robert Owen) کا یہ خیال تھا کہ صنعتی اور زراعتی پروڈیوسروں کی امداد باہمی کی انجمنیں بھی منافع کے کے مساویانہ تقسیم(Equal Sharing) میں مفید ہوں گی۔

کارل مارکس جیسے دیگر حضرات کا خیال تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ورکرز کو مناسب طور پر اجرت نہیں مل سکتی۔ ایسا تبھی ہوسکتا ہے جب تمام انٹرپرائزوں(Enterprises) میں ملکیت مشترک ہو یعنی اس کی صورت یہ ہو کہ ریاست مالک ہو اور سب کا منافع مساوی ہو۔ مارکس نے کہا کہ ایک اشتراکی سماج(Communist Society) میں جہاں پیداوار کے تمام ذرائع مشترک ہوتے ہیں اور جہاں کوئی نجی ملکیت نہیں ہوتی، ہر شخص نجی صلاحیت کے لحاظ سے اپنا کام کرتا ہے یا اپنا تعاون دیتا ہے۔ اور اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے اپنا حصہ پاتا ہے۔ اس طرح سماجی انصاف کے لیے نجی ملکیت کے خاتمہ کی ضرورت ہے۔ اگر معاشرہ میں ایسی مساوات ہے تو وہاں طبقات (Classes) بھی ختم ہو جائیں گے۔ کارل مارکس کے مطابق اشتراکی تحریکات(Cocialist Movement) کا مقصد ایک ایسے ہی معاشرہ(Society) کی تشکیل ہے۔ اس کے لیے کمیونسٹ پارٹیوں اور باعمل نیز دھن کی پکی ورکنگ کلاس تحریکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس طرح 1900 میں سوشل ڈیموکریٹک (مارکسٹ) پارٹی نے لاکھوں ورکرز کو لیبر یونینوں، کلبوں اور ایسوسی ایشنوں میں منظم کیا، انتخابات میں حصہ لیا اور ریچستاگ (جرمنی پارلیمنٹ) میں سیٹوں کے ایک بڑے بلاک پر قبضہ کرلیا اور ورکرز کی زندگیاں بہتر بنانے کے لیے قانون بھی پاس کروائے۔ سن 1900 تک مارکسٹ، سوشلسٹ اور لیبر پارٹیاں دنیا کے بہت سے حصوں میں موجود تھیں حالانکہ وہ سب ان ملکوں کی حکومتوں اور پولس کی کڑی نگرانی میں رہیں کیونکہ وہ سب ہر قیمت پر انقلابیوں کو روکنا چاہتے تھے۔ روس جیسے ملک میں سوشلسٹ تنظیموں پر پابندی عائد تھی اور مشہور سوشلسٹوں کو جیل بھیج دیا گیا تھا یا ان کو جلاوطن کر دیا گیا تھا (جیسا کہ روسی انقلابی تحریک کے لیڈر وی آئی لینن کے ساتھ ہوا)

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 22.3

1۔ حریت پسندوں کے بیان کردہ قدرتی حقوق کون سے تھے؟

2۔ حریت پسند (Liberals) اصولی طور پر معاشی سرگرمی کے سرکاری ضابطوں کے مخالف کیوں تھے؟

3۔ حریت پسندی اور قدامت پسندی کے حوالے سے انیسویں صدی کے اواخر میں کلاس کی تغیر پذیری کو بیان کیجیے۔

4۔ مارکسی تصور مساوات اور عدم مساوات کی وضاحت کیجیے۔

5۔ 1900 میں کسی ایک ملک کی مثال دیجیے جہاں ورکنگ کلاس کے لوگوں کو حرکت پذیر بنانے (Moblization) میں مارکسوادی بہت کامیاب رہے ہوں۔

6۔ سوشلسٹ (مارکسٹ) سامراج واد کے کے سب سے بڑے مخالف رہے ہیں۔ کیوں؟

سامراج واد (Imperialism)

سن 1900 کی دنیا وہ دنیا تھی جس میں زیادہ صنعتی ریاستوں کو غیر صنعتی دنیا کے لوگوں اور وسائل پر غلبہ حاصل تھا۔ صنعتی ملکوں کے بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ نوآبادیت زیرِ حکومت ملکوں کے لیے بہت سودمند ہے اور پسماندہ

نوٹ

ملکوں کے باشندے غیر ملکی راج سے تہذیب یافتہ ہو جائیں گے۔ حاکم ملکوں کے حریت پسند اس بات پر متفق نہ تھے کہ ان کے ملک نوآبادیوں پر اپنے قبضے اور تسلط کو کس طرح برقرار رکھیں۔ یہ تو کوئی بھی نہیں کہتا تھا کہ سیدھا سیاسی راج ضروری ہے لیکن نہ تو کوئی نوآبادیت کے فائدوں کو چھوڑنا چاہتا تھا اور نہ نوآبادیوں کے وسائل پر اپنا کنٹرول چھوڑنے پر رضامند تھا۔ جرمن میں حریت پسندوں نے اس بات کا اظہار کیا کہ ان کے ملک کی صنعتی قوت زیادہ سے زیادہ نوآبادیوں کے قبضہ کرنے پر منحصر ہے امریکہ کے بہت سے حریت پسندوں نے یہ کہا کہ ان کے ملک کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کیوبا اور فلپین کے لوگوں پر حکومت کرے لیکن لاطینی امریکہ میں اپنی حکومت کی مداخلت پر مشکل ہی سے کسی نے تنقید کی ہوگی۔ برطانوی، فرانسیسی، جرمنی، بیلجیئن اور امریکی سرمایہ داروں نے اپنے سامراجی علاقوں کے اندر اور باہر اقتصادی سرگرمی میں زبردست سرمایہ کاری کی۔ اس طرح انھوں نے اپنے اپنے ملکوں کی غیر ملکی پالیسیوں کو متاثر بھی کیا اور ان کی حمایت بھی کی اور دنیا کے باقی ملکوں اس میں افریقہ، لاطینی، امریکہ اور ایشیا شامل ہیں میں نوآبادیاتی غلبے کے لیے کوششیں کیں۔

1900 میں وہ سیاسی گروہ جن کے سامراجی مخالف خیالات بہت سخت تھے وہ اشتراکیت پسند(Socialists) تھے اور ان کا خیال تھا کہ نوآبادیات سے ہر جگہ فائدہ حکمراں طبقے کو ہوتا ہے اور یہ نوآبادیت کہیں بھی کام کاجی لوگوں کے مفاد میں نہیں ہوتی۔ اس لیے تمام ملکوں کے کام کرنے والے طبقات کو متحد ہونے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ چند ملکوں کے سامراجی اقتدار کو ختم کرسکیں۔

قوم پرستی(Nationalism)

قوم پرستی اور قومی حریت کا نظریہ انیسویں اور بیسویں صدی کی دنیا میں ایک دھماکہ خیز قوت تھی۔ سن 1900 کی دنیا کے تمام حصوں میں باہمی رقیب قوم پرستیوں کا بڑا عروج ہوا اور یہ لوگوں کی حرکت پذیری(Mobilization) کی اہم شکلیں بن گئیں۔ لوگوں کی حمایت اور سرپرستی کے حصول کے لیے تہذیبی زندگی کے وسیع تر نظریات نے قوم پرستی کا سہارا لیا۔ ایشیا اور افریقہ دونوں میں ان کی بہت اہمیت تھی۔ پان (کُل)-افریقیت [Pan (All)-africanism] اور پان اسلامیت نے نوآبادیوں میں آزادی کی تحریکوں کو ایندھن مہیا کیا۔ چینیوں اور ہندوستانیوں نے اپنی ثقافتی آزادی پر اور اپنی آزادی کی جدوجہد میں نوآبادیاتی پالیسیوں کی مخالفت پر بہت زور دیا۔ قومی تحریکوں کا ایک اہم پہلو حکومت میں عوامی حصہ داری تھا۔ سامراجی ملکوں کی نوآبادیاتی پالیسیوں کے خلاف احتجاج معاشی استحصال اور خودمختاری سے محرومی نے تمام دنیا میں قومی حریت کی تحریکوں کے لیے ایک اساس تیار کردی۔ اس طرح بیسویں صدی میں آزادی کی بیشتر قومی تحریکیں جمہوریت کے نظریات سے سرشار رہیں۔ قومی دولت کے پیداوار کے طور طریقوں اور ان میں حصہ داری کی فکر بھی انھیں دامن گیر رہی۔

اس کے برخلاف، صنعتی سامراجی ملکوں کے اندر قوم پرستی جارحانہ ہوگئی اور نوآبادیاتی پالیسیوں اور دوسرے ملکوں پر اقتدار کی حمایت سے وابستہ رہی جس سے ان ملکوں کے درمیان شدید مقابلہ آرائی رہی اور نتیجہ پہلی جنگِ عظیم کی شکل میں نکلا۔ (اس موضوع پر آپ اگلی اکائیوں میں پڑھیں گے)

نوٹ

آپ نے کیا سیکھا؟

سن 1900 سے پہلے کی صدی میں آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا اور یہ اضافہ یوروپ اور شمالی امریکہ میں بہت نمایاں تھا۔ ان جگہوں پر آبادی کا اضافہ صنعتیانے کے ساتھ ساتھ آگے پیچھے ہی ہوا۔ ایک صنعتی معاشرہ کے ظہور سے نظریات کی تشکیل اور ان کا استحکام ہوا یعنی ایک مطلوبہ سماجی نظام کے حصول کے لیے نظریات اور اصول کی تشکیل ہوئی۔ 1900 تک ان نظریات نے سامراجیوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے غیر صنعتی معاشروں میں لوگوں کی کوششوں کو شکل دینا شروع کر دیا تھا۔ خاص طور پر ترقی یافتہ یوروپ اور ایسے ہی غیر ترقی یافتہ نوآبادیات کی دنیا میں قوم پرستی اور سوشلزم بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

اختتامی سوالات

1۔ صنعتیانے (Industrilization) نے کن طریقوں سے انسانی وجود کے قدیم طور طریقوں کو بدل دیا؟

2۔ صنعتیانے نے عالمی پیداوار اور تجارت کے طور طریقوں کو کس طرح بدلا؟

3۔ حریت پسندی اور سوشلزم نے ایک دوسرے کی مخالفت کس طرح کی جبکہ یہ دونوں ہی انسانی حریت یا آزادی کے حامی تھے۔

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

22.1

1۔ 75-95%

2۔ یوروپ کے اندر

3۔ شہری علاقے صنعتی پیداوار اور کمرشیل تقسیم کے مقامات تھے۔ ان علاقوں میں خواندگی بہت مفید اور بہت بامعنی تھی جبکہ دیہی علاقوں میں یہ کم فائدہ مند تھی۔

4۔ پرائمری اسکول کی حاضری کی اونچی سطح اور اخبارات کی بڑی اشاعت

22.2

1۔ برطانیہ، فرانس، جرمن اور ریاست ہائے متحدہ 1900 کے کچھ زمین دوز ایندھن پر منحصر ملک تھے۔

2۔ 1900 میں یوروپ اور امریکہ سے باہر بھی زمین دوز ایندھن سے مالا مال بہت سے علاقے تھے۔

3۔ نوآبادیات غیر مساوی تجارت کی شکار تھیں۔ یہاں صنعتی طور پر ترقی پذیر ملکوں کے لیے خام مال اور کم لاگت والی غذائیں پیدا کی جاتی تھیں۔

4۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد غذائی اشیا ان لوگوں کے لیے پیدا کرتی تھی جو ان سے بہت دور تھے اور ایسے ہی ان اشیا کا بڑی مقدار میں استعمال کرتی تھی جن کو دوسرے تیار کرتے تھے۔

5۔ نوآبادیاتی حکمران نئی نئی سماجی تفریقیں پیدا کرنے کے لیے زبان اور تعلیم کا استعمال کرتے تھے اور قومی بیداری کی نشوونما میں خلل اندازی کرتے تھے۔

22.3

1۔ ظلم کے خلاف مزاحمت، نجی جائیداد، مذہب کی پسند، آزادی تقریر، اظہار رائے کی آزادی، سرکار میں حصہ داری۔

2۔ حریت پسندوں کا خیال تھا کہ معاشی سرگرمی میں اپنے مفادات کی پیروی کرنے والے افراد کسی طاقتور حکومت (واضح قانون ادارہ) کے مقابلے زیادہ اچھے نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔

3۔ 1800 کے ابتدائی سالوں میں قدامت پسند بیشتر زمین کے مالک تھے یا مالکان کے متوسل (Dependents) تھے جبکہ حریت پسند مینوفیکچرنگ اور تجارت میں بہت فعال تھے۔ 1900 تک روایتی زمین مالکوں کے طبقے کے افراد، حریت پسندی کی حمایت میں تجارت پیشہ لوگوں کے ساتھ مل گئے تھے۔

4۔ مارکس وادیوں کا خیال تھا کہ انسانی نابرابری کی وجہ ذرائع پیداوار تک رسائی کی کمی یا زیادتی ہے۔ نجی جائیداد کو ختم کر کے اور وسائل کو (قومی) ریاست کے کنٹرول میں لاکر لوگوں میں برابری قائم کی جاسکتی ہے۔

5۔ جرمن، جہاں سوشل ڈموکریٹنگ ورکرز پارٹی نے کام کاجی طبقات کے اکثر ووٹ حاصل کیے تھے۔

6۔ سوشلسٹوں کا خیال تھا کہ سماج عالمی پیمانے پر سرمایہ داروں اور پرولتاریہ (عوام) کے درمیان تقسیم ہو رہا ہے۔ اس لیے تمام ملکوں کے پرولتاری / نوآبادیوں کو یہ چاہیے کہ وہ ہر جگہ جابر سرمایہ داروں کے خلاف جدوجہد میں دلچسپی لیں۔

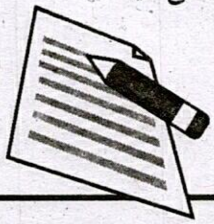

نوٹ

اختتامی سوالات کے اشارے

1- دیکھیے پیرا 22.1-22.4

2- دیکھیے پیرا 22.5

3- دیکھیے پیرا 22.6.4 اور 22.6.2

فرہنگ

1. **بورژوا(Bourgeoisie)** : وہ سماجی طبقہ جس میں ایسے لوگ شامل ہیں جن کے پاس مکانات، فیکٹریاں یا بینک کھاتوں کی شکل میں کافی دولت یا اثاثہ ہوتا ہے— ''سرمایہ دار''

2. **سی ای(C.E)** : عہد مشترک(Common Era) وہ تاریخی عہد جو عیسوی تقویم کے مطابق ہے جس کا سال 'ایک' عیسیٰ کی پیدائش کے بعد ہے۔ دیگر مذہبی روایات پر مبنی تہذیبیں یا ریاستیں (یہودی مذہب، ہندومت، اسلام) مختلف تقویموں کو مانتے ہیں لیکن عیسوی تقویم(Christian Calender) ایسا کلینڈر ہے جس کا دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر چلن ہے۔ بیسویں صدی کا مطلب ہے 1900s کی صدی۔

3. **آئیڈیالوجی(Ideology)** : اصول و نظریات کا ایک مجموعہ یا ایک عالمی نظریہ (Worldview) جو کسی سماج کی ترقی کے لیے ایک خصوصی پلان پیش کرتا ہو؛ ایک سماجی فلسفہ۔

4. **سامراج واد (Imperialism)** :
(1) ان نوآبادیوں اور خطوں(Territories) کے حصول یا ان کی دیکھ بھال کا عمل جو کسی مورث ملک (Porent Country) پر منحصر ہوں۔
(2) سلطنت(Empire) کے حاصل کرنے کی آئیڈیالوجی

5. **لیبرزم / لیبریٹ (Laborism/Laborist)** : کام کرنے والوں (Workers) کی سیاسی اور اقتصادی تنظیمیں۔ لیبرزم مالکان یا ریاست کے خلاف محنت کشوں یا مزدوروں کے حقوق کا دفاع کرتا ہے کچھ لیبریٹ مارکسوادی ہیں۔

نوٹ

6. چھاپہ کی ثقافت (Print Culture) : اس کا مطلب ہے مطبوعہ متون جیسے کتابیں اور اخبارات وغیرہ پر مبنی معلومات اور ابلاغ (Communication) کے ذرائع۔ ان متنوں کی مشینی ذرائع سے بآسانی دوبارہ نقل چھاپی جاسکتی ہے (ان کو دوبارہ ہاتھ سے نقل کی ضرورت نہیں ہوتی)۔ چھاپہ کی ثقافت خواندگی اور چھپائی ٹیکنالوجی کے سستا ہونے پر منحصر ہے۔ یوروپ، جاپان اور کوریا سب سے پرنٹ کلچر ہے۔ 1500 CE میں ان میں سے ہر جگہ قارئین کی ایک چھوٹی تعداد تھی۔ 1850 تک پرنٹ کلچر میں دنیا کے لاکھوں لوگ شامل ہوگئے جن کی بڑی تعداد چھوٹے بڑے شہروں میں تھی۔ اسٹاک مارکیٹ کی قیمتیں جاننے کے لیے اخبارات پڑھنا اور ایک ناول کا پڑھنا دونوں ہی پرنٹ کلچر کی شکلیں ہیں۔

نوٹ

23

پہلی عالمی جنگِ اور روسی انقلاب

(World War I and the Russian Revolution)

پہلی عالمی جنگ اور روسی انقلاب 1917 دونوں ایسے واقعات وحالات کا نتیجہ تھے جو انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں رونما ہوئے۔ اس جنگ اور روسی انقلاب دونوں کی بہت اہمیت ہے کیونکہ لاکھوں لوگ ان سے متاثر ہوئے۔ واقعات کے اسی سلسلے نے پوری عیسویں صدی کو متاثر بھی کیا اور اس پوری صدی کی روپ ریکھا بھی اسی سے تیار ہوئی۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ:

- ان عوامل کی نشاندہی کرسکیں گے جن کی وجہ سے 1914 کی جنگ لڑی گئی اور پھر اس بات پر بھی گفتگو کر سکیں گے کہ مخاصمت اور چپقلشوں کے ایسے عوامل کیا آج کی دنیا میں بھی موجود ہیں؛
- یہ وضاحت کرسکیں گے کہ انقلاب 1917 روسی سلطنت میں ہی کیوں ممکن ہوا اور کسی دوسرے ملک میں نہ ہوا؛
- جنگ اور روسی انقلاب دونوں کے طویل مدتی اور فوری عواقب ونتائج کا تجزیہ کرسکیں گے؛
- جنگ اور انقلاب کا ہندوستان کے لیے کیا مفہوم ومطلب تھا اس کی وضاحت کرسکیں گے۔

نوٹ

23.1 پہلی عالمی جنگ تاریخ میں رونما ہونے والی جنگوں سے کس طرح مختلف تھی؟ (How was World War I Different From Previous Wars in History)

اسپین، ہالینڈ، ناروے، سوئڈن، ڈنمارک اور سوئزرلینڈ کو چھوڑ کر جنگ میں تمام یوروپی ملک ملوث ہوئے۔ اس جنگ نے تمام دنیا کو تشدد اور مصائب و آلام میں جھونک دیا۔ اس جنگ میں لڑنے کے لیے دوسرے علاقوں خاص طور پر نوآبادیوں سے بھی فوجوں کو ان ملکوں کے واسطے بھیجا جاتا تھا جو ان نوآبادیوں پر حاکم تھے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی فوجیوں کو ہندوستانی سرحدوں سے دور برطانیہ کے لیے جنگ کرنی پڑی۔ ایک اندازہ کے مطابق کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور انڈیا کے تیس لاکھ سے زیادہ لوگ برطانیہ کی طرف سے لڑے (برطانیہ کی ان علاقوں پر حکومت تھی)۔ جنگ میں شریک علاقے یا جنگ کے زون دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور اس طرح جنگ نے یوروپ، ایشیا، افریقہ اور پیسیفک کو اپنی چپیٹ میں لے لیا تھا۔ پہلی بار تقریباً تمام دنیا جنگ میں پھنس گئی تھی اور اسی وجہ سے اس کو عالمی جنگ کہا گیا ہے۔ اس جنگ و جدل میں ہوائی جہاز، ٹینکس اور آبدوزیں جیسی نئی ٹیکنالوجیاں بھی استعمال کی گئیں لیکن یہ جنگ عام طور پر زمین پر لڑی گئی اور اکثر لوگوں نے اس کو اسی حیثیت سے یاد بھی رکھا کیونکہ جنگی تصاویر میں فوجیوں کو زمین پر خندقوں میں لڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ سمندری جنگ جنوبی ایٹلانٹک اور پیسفک میں لڑی گئی۔ امریکہ پہلی بار عالمی پیمانے پر جنگ میں ملوث ہوا اور اس کے ایک لاکھ سے زائد سپاہی برطانیہ اور اس کے حلیفوں کے شانہ بہ شانہ لڑے۔

اس عالمی جنگ کے نتیجے میں مردوں کی بڑی تعداد فوجیوں کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہوئی اور عورتوں نے شہروں میں نوکریاں شروع کر دیں اور جنگ کے علاقوں میں نرسوں کی حیثیت سے کام کیا۔ حکومت نے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے بڑے اقدامات کیے کہ ان کی فوجوں کی رسد کسی طرح کم نہ پڑ جائے۔ انھوں نے مزدوروں سے پہلی جیسی اجرت پر زیادہ وقت کام لینے کے لیے ان کے حقوق کم کر دیے تاکہ فوج اور اس کے سازوسامان نیز گولہ بارود وغیرہ کی ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ روزانہ کے استعمال کی چیزوں اور غذاؤں کی قیمتیں بڑھنے لگیں کیونکہ اب سرمایہ کاری ان صنعتوں میں ہو رہی تھی جو جنگ اور جنگی سازوسامان سے متعلق تھیں۔ لوگوں کے اندر ناامیدی اور افسردگی کا ایک عام سا ماحول تھا۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جنگ اور جنگ کی لائی ہوئی مشکلات کی وجہ سے ایک کروڑ (10 ملین) لوگ مارے گئے، دو کروڑ لوگ زخمی ہوئے اور کروڑوں لوگ شہروں اور صنعتوں کے برباد ہو جانے سے بے خانماں یا بے کار ہوئے جو لوگ بے گھر ہوئے وہ صرف ملکوں کے سرحدی علاقوں میں ہی رہنے والے نہ تھے بلکہ سبھی طرف تھے۔ شہری یا غیر فوجی آبادیاں متاثر ہوئیں اور جنگ کی تاریخ میں پہلی بار شہری بھی مارے گئے۔ شہری علاقوں پر بمباری اور جنگ کے نتیجے میں قحط اور وباؤں کی وجہ سے لاکھوں شہریوں کی جانیں گئیں۔

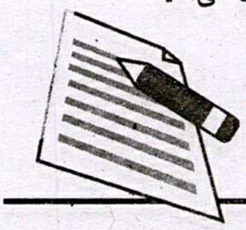

نوٹ

جب جنگ شروع ہوئی تھی تو اکثر لوگوں نے سوچا تھا کہ جنگ مختصر ہوگی۔ لیکن یہ چار سال تک چلی۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پورے چار سال چلنے والی جنگ میں پھنسے لوگوں کی زندگی کس طرح ہوگی۔ اس جنگ نے اس وقت موجود کئی سماجی اقتصادی اور سیاسی ڈھانچوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ اس جنگ نے تو پوری دنیا کی معیشت کو متاثر کیا۔ کیونکہ متحارب ملکوں نے پہلی بار بہت بڑے پیمانے پر وسائل کو جنگی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور جنگ تمام ملک میں پھیل گئی اس لیے اس کو پہلی جنگِ عظیم یا عالمی جنگ کہا جاتا ہے۔

ان ہی اسباب کی بنا پر یہ جنگ دنیا کی تاریخ میں ایک بہت اہم موڑ کی حیثیت رکھتی ہے۔

23.2 جنگ کے اسباب (Reasons for War)

اگر چہ جنگ کچھ ایسے واقعات کی وجہ سے بھڑکی تھی جو کبھی بھی اور کہیں بھی رونما ہو سکتے ہیں لیکن اس جنگ عظیم کے اسباب بہرحال پیچیدہ ہیں۔ سربیا اور آسٹریا کے درمیان دشمنی چل رہی تھی، اسی دوران آرک ڈیوک فرانز فردیناند (Arch Duke Franz Ferdinand) کو جو سلطنت ہیبس برگ (Habsburg) کا وارث تھا، 1914 میں سارایوو مقام پر قتل کر دیا گیا۔ یہی وہ واقعہ تھا جو بڑھتے بڑھتے پہلی عالمی جنگ بن گیا۔

لیکن اس ایک واقع کے اتنے بھیانک نتائج کیسے نکلے کہ اس سے چار سال تک چلنے والی ایک عالمی جنگ شروع ہوگئی۔

آپ گذشتہ کسی سبق میں نوآبادیات کے لیے مقابلہ آرائی یا دوڑ کے بارے میں پڑھ چکے ہیں اور یہ بھی پڑھا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مکمل طور پر سامراجی نظام (Imperialist system) قائم ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر 1876 میں دس فیصد سے زیادہ افریقہ یوروپی راج میں نہ تھا لیکن 1900 تک 90 فیصد سے زیادہ افریقہ نوآبادی بن چکا تھا۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ اس دوڑ میں جرمن پیچھے رہ گیا تھا اور اب اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اسے بھی حکمرانی کرنے کے لیے اپنی خود کی نوآبادیات ہونی چاہیے۔ 1914 تک یہ طاقتیں اپنے اپنے دائرہ اثر کو بڑھانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں اور چاہتی تھیں کہ ہر ایک کے کنٹرول میں زیادہ سے زیادہ علاقے آجائیں اور دنیا کے وسائل میں ان کا زیادہ حصہ ہو۔

چونکہ دنیا کا بیشتر حصہ ان ہی کے درمیان تقسیم تھا اس لیے ان میں سے ہر ایک یا تو دنیا میں ایک نیا نظم لاکر یا پھر دوسروں کے خرچ پر اپنے علاقے میں توسیع کے لیے ایک دوسرے سے لڑائی کر کے معاشی یا سیاسی طور پر اپنے کنٹرول کے علاقوں میں توسیع کر سکتا تھا۔ اگر چہ کوئی بھی کسی بڑی جنگ کے بارے میں نہیں سوچتا تھا لیکن ٹکراؤ (Conflict) کے امکانات ہمیشہ ہی رہتے تھے۔

انھوں نے دوسرے ملکوں سے نئے علاقوں کو چھیننے کے لیے یا ان علاقوں کو محفوظ رکھنے کے لیے جن جن پر وہ پہلے سے ہی قابض تھے چھوٹی چھوٹی جنگیں بھی لڑیں اور کبھی کبھی کسی دشمن کو روکنے کے لیے انھوں نے ایک دوسرے

کے ساتھ اتحاد (Alliance) بھی کیے۔ جرمن کے بسمارک نے 1879 میں ایسا ہی ایک اتحاد آسٹریا اور ہنگری کے ساتھ کیا۔ اس اتحاد کو دوہرا اتحاد (Dual Alliance) کہا جاتا ہے۔ لیکن 1882 میں اٹلی بھی اس اتحاد میں شریک ہوگیا تو اس کو اتحاد سہ گانہ (Triple Alliance) کہا گیا۔ دوسری طرف 1894 میں فرانس نے روس کے ساتھ ایک اتحاد کیا۔ فرانس نے 1904 میں ایک اور اتحاد برطانیہ کے ساتھ کیا اور 1907 میں برطانیہ نے روس کے اتھ ایک دوستانہ معاہدہ کیا۔ اس کو بھی معاہدہ سہ گانہ (Triple Entente) کہا گیا۔

یوروپ کے رہنماؤں کا خیال تھا کہ یہ اتحاد طاقت کے توازن کے ذریعے جنگ کو روک سکیں گے۔ درحقیقت ہوا یہ کہ ان اتحادوں نے ملکوں کو آپس میں باندھ دیا۔ جب ایک ملک جنگ پر جاتا تو اس کے دوسرے حلیف (Ally) اس کی مدد کو آگے آتے۔ اس طرح سامراجی ملکوں کے درمیان جھگڑے اور رقابتیں جنگ کی اصل بنیاد بن گئے۔

انیسویں صدی کی سب سے اہم خصوصیت قومی تحریکات تھیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں قوم پرستی کی بھی شکل بدلی۔ ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں میں یہ قوم پرستی مقبوضات کی توسیع اور فوجی طاقت کو بڑھانے سے جڑ گئی۔ اب اس کا بنیادی تصور وہ نہیں تھا جو فرانس کے انقلاب اور ''حریت، مساوات اور اخوت'' (Liberty, Equality, and Fratermity) کے بارے میں اس کے نظریات کے ساتھ آیا تھا۔ اب ان ممالک کا کسی قوم میں عوامی اقتدار کے (Popular Sovereignty) کے نظریہ سے بھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس کے برخلاف آسٹریا-ہنگری اور روس جیسے کثیر قومی سامراجوں (Multi National Empires) میں عوام خود کو آزاد کرانا کر اور آزاد قوم کی تشکیل کرنا چاہتے تھے جبکہ تمام بڑی اقوام اس کے مخالف تھیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی طاقتوں کے درمیان ہتھیاروں کی دوڑ شروع ہوگئی۔ بڑی بڑی فوجیں بننے لگیں اور بڑی بڑی بحری طاقتوں کی تشکیل شروع ہوگئی۔ عسکریت خارجہ پالیسی کا سب سے اہم پہلو بن گئی۔ اب اپنے خود کے شہریوں کی فلاح و بہبود کے بجائے دوسرے ملکوں کے مقابلے اپنی طاقت کو بڑھانا داخلی پالیسی کا مقصد بن گیا۔ ذرائع ابلاغ کا استعمال اسی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ بن گیا۔ جارحانہ قوم پرستی کے پھیلاؤ میں اخبارات نے ایک اہم کردار ادا کیا۔

1901 میں کچھ ہی لوگوں کو کہیں کہیں ووٹ دینے کی اجازت تھی اور عورتوں کو تو عملی طور پر کہیں بھی اجازت نہ تھی۔ اپنی حکومتوں کی پالیسی تیار کرنے میں مشکل سے ہی کچھ لوگ اثر انداز ہوتے تھے۔ حکومتیں سرمایہ داروں اور زمینداروں کے زیر اثر رہتی تھیں اور اسی اثر کے تحت علاقوں میں توسیع کے لیے ان کے درمیان مقابلہ آرائی رہتی تھی۔ اگرچہ اس مقابلہ آرائی میں عام لوگوں کی کوئی حصہ داری نہ تھی لیکن جب ایک مرتبہ جنگ پھوٹ پڑی تو لوگ اپنے اپنے ملکوں کی حمایت کے لیے آگے آگئے۔

جدید جنگ کی ہولناکیوں کو اب بھی نہیں سمجھا گیا تھا۔ یہ تو جنگ کے اثرات تھے جن کی وجہ سے لوگ جنگ کے بارے میں دوبارہ سوچنے پر مجبور ہوئے اور انھوں نے امن کا مطالبہ کرنا شروع کیا۔

23.3 جنگ کی دھار (Course of War)

ہم جنگ کے دھارے یا جنگی مہمات کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ البتہ یہ بات آپ کو معلوم ہونی چاہیے کہ آسٹریا یہ سمجھتا تھا کہ سربیا میں قتل جنگ کو بھڑکانے والا معاملہ تھا اور جب ایک بار اس نے جواب دینے یا ردعمل کا اظہار کرنے کے بارے میں فیصلہ کر ہی لیا تو اتحاد سہ گانہ (Triple Alliance) کے شرکا جرمنی اور اٹلی اس کے طرفدار ہوگئے اور دوسری طاقتیں (برطانیہ، فرانس اور روس) مخالف طرف ہوگئیں۔

جرمن نے فرانس کی طرف اپنی افواج بھیجیں اور لگتا تھا کہ وہ کامیاب ہو جائیں گی کہ اس وقت روس نے مشرق کی طرف سے جرمن اور آسٹریا پر حملہ کردیا۔ جنگ لمبی کھنچ گئی اور پیچیدہ بھی ہوگئی۔ زمین پر خندقوں میں چار سال تک لڑائی جاری رہی کیونکہ دونوں طرف کی افواج ٹکر کی تھیں۔ نوآبادیوں کی کے مزدوروں سے خندقیں کھودنے کا کام لیا گیا۔ اس کے بعد یہ جنگ ایشیا اور افریقہ میں بھی پھیل گئی۔

جنگ کے دوران ٹیکنالوجی کے استعمال کا مطلب تمام ملکوں کو بھاری نقصان اٹھانا تھا۔ مثال کے طور پر سوم (Somme) کی جنگ کے پہلے ہی دن ساٹھ ہزار برطانوی سپاہی مارے گئے یا زخمی ہوئے۔

جنگ کے دوران اٹلی نے اپنا پالا بدل لیا۔ اپریل 1917 میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے بھی جرمن کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا۔ اس مرحلے پر روسی سلطنت میں انقلابی تحریک ایک فیصلہ کن عنصر تھا۔

اکتوبر 1917 میں روسی انقلاب کامیاب ہوگیا اور جب کمیونسٹوں کی لیڈرشپ ابھری تو روسی جنگ سے باہر ہوگئے۔ انھوں نے 1918 میں جرمن کے ساتھ امن کے ایک معاہدہ پر دستخط کیے۔ یہ معاہدہ روس کے لیے بڑا سخت تھا لیکن روس کی نئی حکومت جس کی قیادت لینن کے ہاتھ میں تھی اس لیے اس معاہدہ پر راضی ہوگئی کیونکہ وہ شروع سے ہی جنگ کے خلاف تھے۔

روس کی جنگ سے علاحدگی نے معاملات کو اور پیچیدہ بنادیا۔ نیا روس نہ صرف جرمن بلکہ برطانیہ اور فرانس کو بھی بڑا دشمن لگتا تھا کیونکہ یہ سب ملک بنیادی طور پر کمیونزم کے مخالف تھے۔

اسی لیے 1918 کے آغاز میں جب جنگ کی قسمت بدلنے لگی اور جرمنی افواج نے واپسی کا سفر شروع کر دیا تو برطانیہ اور فرانس بھی امن پر متفق ہوگئے۔ روس کی طرح جرمن میں بھی کامگار انقلاب کی دھمکی دینے لگے۔ 11 نومبر 1918 کو جنگ بندی لاگو ہوئی اور اس وقت تمام طاقتوں نے مل کر روس میں انقلاب کو شکست دینے کی کوشش کی۔ اس موضوع پر آپ اگلے سیکشن میں پڑھیں گے۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 23.1

1۔ پہلی جنگ عظیم میں کون سے نئے ہتھیار استعمال ہوئے؟

2۔ 1914 میں تشکیل پانے والے دو اہم بین الاقوامی اتحادوں کے نام بتائیے۔

3۔ پہلی عالمی جنگ سے کتنے لوگ متاثر ہوئے؟

4۔ پہلی عالمی جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں نے کس کا ساتھ دیا؟

23.4 انقلاب روس 1917 (The Russian Revolution, 1917)

پہلی عالمی جنگ کے خاتمے سے پہلے 1917 میں روس میں انقلاب آ گیا۔ اسے بالشویک(Balshevik) انقلاب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کیونکہ بالشیوکوں نے ایک سیاسی گروہ کے طور پر انقلاب کی کامیابی میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا اور اس کی پالیسیوں کو بھی طے کیا تھا۔

یہ تاریخ میں پہلا سوشلسٹ(Socialist) انقلاب تھا جس کی آبیاری کمیونزم کے نظریات نے کی تھی۔ پچھلے اسباق میں آپ نے سرمایہ داری(Capitalism) اور اشتراکیت(Socialism) کے بارے میں پڑھا اور آپ کو علم ہو چکا ہے کہ سوشلزم سرمایہ داری کے مقابلے بہت زیادہ مساوات اور سماجی انصاف(Social Justice) کی نمائندگی کرتا۔ روسی انقلاب ورکنگ طبقات اور کسانوں کی تحریکوں کے نتیجے میں وجود میں آیا۔

1917 تک روسی سلطنت طویل جنگ کے نتائج اور خود ملک کے اندر سیاسی اور سماجی تحریکات کے دباؤ میں رہی۔ فروری 1917 تک روس ایک کثیر قومی سلطنت(Multinational empire) تھی جس کا سربراہ ایک مطلق العنان فرمانروا تھا جسے زار (Tsar) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کا علاقہ یا اس کے مقبوضات بہت وسیع تھے جن میں مرکزی ایشیا کا بڑا حصہ اور مشرقی یوروپ کے حصے شامل تھے۔ اس وقت روس میں عوامی نمائندگی کا کوئی ادارہ نہ تھا، نہ کسی سیاسی یا تجارتی تنظیم یا اکائی کے بنانے کی اجازت تھی اور نہ ہی انتخابات (الیکشن) ہوتے تھے۔ احتساب یا سینسر شپ (Censorship) بہت سخت تھی اور یکطرفہ طور پر گرفتاریاں ہوتی تھیں۔ مذہبی رواداری بالکل نہ تھی۔ روسی سلطنت میں دوسری قوموں یا اقلیتوں کو روسیوں کے برابر حقوق نہ تھے کیونکہ خود زار نکلس ثانی (Tsar, Nicholas II) کا تعلق روسی رامانوف(Ramanov) خاندان سے تھا۔ زار نے یوروپ میں تمام

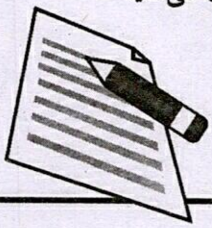

نوٹ

جمہوری تحریکوں کے خلاف اپنی فوجی اور ڈپلومیٹک طاقت کا استعمال کیا۔ اسی لیے اس کو یوروپ کا پولس مین کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں یہ حالات سخت جابرانہ تھے اور مغربی یوروپ سے مختلف بھی تھے۔

23.5 قدیم اور جدید (The Old and The New)

اگر چہ سیاسی نظام مطلق العنان اور شخصی (Autocracy) تھا لیکن معیشت اور سماج میں تبدیلیاں ہونے لگی تھیں اور ان ہی حالات نے آرزوؤں اور امیدوں کو جگا دیا تھا۔ نئے نئے نظریات بھی پیدا ہو رہے تھے اور زار حکومت کے زور و جبر کی وجہ سے لوگوں میں بے اطمینانی بھی پھیل رہی تھی۔ چونکہ نہ وہاں کوئی پارلیمنٹ کا نظام تھا اور نہ الیکشن ہوتے تھے جس کے ذریعے لوگ زار کی پالیسیوں کے خلاف اپنی ناراضگی یا مخالفت کا اظہار کر سکتے اس لیے انھوں نے انقلاب کا راستہ اپنایا۔ سماج اور پالیسیوں میں اپنی بات منوانے کے لیے انھیں خود شخصی مطلق العنان (Autocracy) کا ہی تختہ پلٹنا پڑا۔ دیگر یوروپی ملکوں اور روسی سلطنت کے درمیان یہی سب سے بڑا فرق تھا۔

23.6 زراعت اور کسانوں میں بے چینی
(Agriculture and Peasant Discontent)

کسان بھی بہت بے چین تھے۔ مغربی اور مرکزی یوروپ کی طرح روسی سلطنت میں کھیتی کرنے والے غلاموں کو آزاد کرایا گیا تھا۔ اگر چہ یہ کام بہت بعد میں یعنی 1861 میں ہوا تھا۔ لیکن اس زمینی اصلاح کے باوجود، زمیندار اشرافیہ بہت مضبوط تھی اور کسانوں پر ان کا جبر و استحصال جاری تھا۔ کسانوں کے پاس کافی زمین بھی نہیں تھی لیکن ان کی آبادی 80 فیصد سے بھی زیادہ تھی لیکن زمین کا صرف پچاس فیصد حصہ ان کے پاس تھا۔ زار کے خلاف غصہ اور ناراضگی کی بڑی وجہ یہی تھی کیونکہ زار کی ناکافی زمینی اصلاحات کی وجہ سے ان کی یہ حالت تھی۔

اس کے علاوہ آزاد کردہ کسانوں کو زمین اور آزادی دونوں کے بدلے بھاری قیمت چکانی پڑتی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ زار کو اس بات میں دلچسپی تھی کہ زمینداروں کو اچھا معاوضہ دے کر ان کی خیرخواہی اور ان کی حمایت حاصل کرتا رہے۔ کسانوں کو اتنی بھاری رقم دینی پڑتی تھی کہ وہ مستقل قرض کے بوجھ سے دبے رہتے تھے اور ان کو زمینداروں کے لیے بہت سستے داموں میں کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ ٹیکسوں کا بہت بوجھ بھی تھا۔

زراعت بہت پچھڑی رہی کیونکہ کسانوں کے پاس اتنے پیسے نہ ہوتے تھے کہ وہ اپنی زمین کو بہتر بنانے کے لیے سرمایہ لگا سکتے۔ ادھر زمیندار یہ سوچتے کہ کسانوں کی سستی محنت جب تک ان کے پاس موجود ہے تو وہ مشینری میں پیسہ کیوں خرچ کریں۔

کسانوں کے مفادات کے معاملے میں مطلق العنان شخصی حکومت(Autocracy) اور زمیندار دونوں ملے ہوئے تھے اور کسانوں کی شورشوں یا بغاوتوں کو دبانے کے لیے فوجوں کو بھیجا جاتا تھا۔ زراعت روسی معیشت کا اہم سیکٹر تھی اور آبادی میں کسانوں کی اکثریت تھی اس لیے زراعتی پسماندگی اور کسانوں کی بے چینی انقلاب کے اہم عوامل بن گئے۔ انیسویں صدی میں کسانوں کی لگاتار شورشیں ہوئیں اور بیسویں صدی کے اوائل میں وہ لوگ عام انقلابی تحریک کا حصہ بن گئے۔

23.7 صنعتیانا اور ورکرس کی بے چینی
(Industrialisation and Workers Discontent)

روسی سلطنت میں ورکرس کی تحریک یوروپ کے کسی بھی مقام کے مقابلے زیادہ مضبوط اور زیادہ سیاسی تھی۔ اس کا تعلق یہاں کے کی صنعت کاری(Industrilization) کی نوعیت اور روس کے سیاسی حالات سے تھا۔ روس میں صنعت کاری مغربی یوروپ کے مقابلے دیر میں آئی لیکن اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں چھوٹی اور بہت سی بڑی فیکٹریاں قائم ہوگئیں صنعت کاری کے ابتدائی مراحل میں ہی ان میں کام کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ مزدور طبقہ کی تحریکات مغربی یوروپی ملکوں کے مقابلے کہیں تیزی کے ساتھ نشوونما پاسکیں اور مزدور طبقہ کے مضبوط اور طاقتور ہونے تک سرمایہ داروں کو اتنا وقت نہ مل سکا کہ وہ اپنی طاقت کو مجتمع کر لیتے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں بہت سی ہڑتالیں ہوئیں اور 1905 تک مزدوروں نے انقلابی تحریک میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

روسی سلطنت میں ورکرس کی تحریک بھی دوسرے ملکوں کے مقابلے زیادہ جنگجویانہ اور زیادہ سیاسی تھی۔ یہ تحریک شخصی حکومت اور آجروں(Employers) دونوں کے خلاف تھی۔ شخصی حکومت ان کو تنظیمیں نہیں بنانے دیتی تھی اور مالکان کی حمایت کرتی تھی اور (فیکٹریوں وغیرہ) کے مالکان مزدوروں کی کم اجرتوں نیز کام کرنے کے خراب حالات اور ماحول کے لیے ذمہ دار تھے۔ ان کی اس تحریک میں دوسرے ملکوں کے مقابلے سوشلزم کی طرف جھکاؤ بہت زیادہ تھا۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں مزدور طبقے میں عورتوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور ان کی تنظیموں میں بھی اضافہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں کی مساوات اور ان کے مسائل کی بات مزدوروں کے حقوق سے متعلق مذاکرات میں موضوع بحث بننے لگی۔ مزدور طبقے کی تحریک میں مزدور طبقے کی عورتوں نے بڑے پیمانے پر حصہ لیا۔

23.8 قومیتوں کے درمیان بے چینی (DiscontenAmong Nationalities)

روس کے رامانوف خاندان اور دیگر قومیتی خطوں(Nationality Regions) کے درمیان رشتہ تقریباً نوآبادیاتی نوعیت کا تھا اور روسی خطوں میں صنعتی ترقیات کے لیے خام مال کے وسائل کے طور پر ان علاقوں کا استعمال ہوتا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ برطانوی نوآبادیات کے تحت کچھ ایسا ہی حال ہندوستان کا بھی تھا۔ ان قومیتوں مثلاً کاکشیائی

نوٹ

(Caucasians)، پولش (Polish)، قزاخ(Kazakhs)، لاتوینی(Latvians)، استونی(Estonians) وغیرہ نے روسی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

23.9 قیادت اور سیاسی فراست (Leadership and Vision)

کسی انقلابی تحریک کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ قیادت ذمہ دار اور دُھن کی پکی ہو۔ یہ قیادت نظریات کی پابند ہو اور اس کے پاس تبدیلی لانے کا ایک پروگرام ہو۔ بالفاظ دیگر، وہ کسی چیز کی بربادی ہی کو پسند نہ کرتے ہوں بلکہ ان کے پاس ایک تعمیری پروگرام ہو اور ان کو معلوم ہو کہ ان کو کیا تبدیلی لانی ہے۔ وہ اپنی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے تنظیموں کی تشکیل کر سکیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں بہت سے سیاسی گروپ فعال تھے لیکن ان کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا وہ خفیہ طور پر کام کرتے تھے، زار کی پولس ان کی تلاش میں رہتی تھی اور ان کا پتہ چل جاتا تھا تو ان کو بہت سزائیں اور ایذائیں دی جاتی تھی۔ بہرحال لوگوں اور خاص طور پر ورکرس اور کسانوں میں شعور اور بیداری پیدا کرنے کے لیے انھوں نے سیاسی تعلیم، سیاسی پروپگنڈہ اور تحریکات کے ذریعے ایک بہت بہادرانہ اور اہم کردار ادا کیا۔ سماج کے تمام طبقات مزدور، کسان، سپاہی، طلبہ، ہر قسم کے ملازمین، عورتوں اور اساتذہ کے اندر لاکھوں تنظیمیں بن گئیں۔ ان میں سے بہت سی تنظیموں کے قریبی رشتے سیاسی پارٹیوں سے بھی تھے اور سیاسی بحث و مباحثے اور نظریات کے بارے میں ان تنظیموں کا ردعمل بہت اچھا تھا۔

1917 تک عورتوں کی تنظیموں نے ورکنگ کلاس کی تنظیموں کی طرح کام کاجی خواتین کے مسائل پر بھی غور وفکر کرنا شروع کر دیا لیکن عورتوں کو اپنے مسائل کے حل کے لیے سخت جدوجہد کرنی پڑی۔ اگرچہ عوامی تحریکات میں عورتوں کا بہت بڑا حصہ تھا لیکن قائدانہ رول میں چند عورتیں ہی تھی۔

پاپولسٹس (Populists)، سوشل ریوالوشنریز (Social Revolutionaries)، لبرلس (Liberals) اور سوشل ڈیموکریٹس (Social Democrates)، (مارکسسٹ) اہم سیاسی گروپ تھے۔ سوشل ڈیموکریٹس کی دو پارٹیاں تھی ایک بولشیویک (Bolshevik)، جس کے روسی زبان میں معنی اکثریت کے ہیں اور دوسرے مین شیوک (Men Shevik) جس کے معنی اقلیت کے ہیں۔ اختلافات کی وجہ سے جب سوشل ڈیموکریٹس تقسیم ہوگئے تو ان کے یہ نام پڑ گئے۔ انقلاب کیسے لایا جائے، روسی سماج میں تبدیلی کیسے لائی جائے اور سیاسی نظام کو کیسے بدلا جائے اس بارے میں ان گروپوں کے نظریات الگ الگ تھے۔

لینن روسی انقلاب 1917 کا اہم رہنما تھا۔ دوسرا اہم رہنما ٹارٹسکی (Tortsiky) تھا۔ یہ دونوں بالشیویک تھے۔ بہرحال یہ کہنا بجا ہے کہ ہزاروں اہم رہنما تھے جن میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھی۔ یہ صورت حال بالکل ہمارے ملک کی تحریک آزادی جیسی تھی۔ ان رہنماؤں کے کارناموں، ان کی بہادری اور ان کی قربانیوں کے بغیر انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

نوٹ

23.10 انقلاب کے مرحلے (Stages of Revolution)

روسی انقلاب کی تحریک کا ظہور انیسویں صدی میں اس وقت ہوا جب اشرافیہ کہ کچھ افراد نے یہ محسوس کیا کہ زار کا سیاسی نظام جابرانہ ہے اور زار سماج بہت نامنصفانہ ہے۔ انھیں خاص طور پر کسانوں کی حالت زار پر رحم آیا۔ اگر ملک کی اکثریت کی حالت ابتر ہو تو روس کیسے ترقی کرسکتا ہے۔ اشرافیہ کے ان افراد اور نئے ابھرتے ہوئے مڈل کلاس پر مشتمل ایک دانش ور طبقہ (Intelligensia) پیدا ہوا۔ اس طبقہ نے روسی سماج اور روس کے سیاسی نظام پر تنقید کی اور اس میں تبدیلی لانے کے لیے کام شروع کیا۔ ان لوگوں نے خفیہ تنظیمیں اور چھوٹے چھوٹے سیاسی گروہ بنائے۔ انھوں نے اپنے نظریات کو پھیلانے کے لیے اعلانیہ یا کھلم کھلا کام نہیں کیا کیونکہ سینسر شپ بہت سخت تھی اور سیاسی سرگرمی پر پابندی تھی۔ ان انقلابوں نے خود کو اس کام کے لیے وقف کردیا اور ایک دستور اساسی اور الیکشن کا مطالبہ شروع کیا۔ بہت سی خواتین بھی بہت فعال قسم کی انقلابی تھیں۔ جب وہ پکڑی گئیں تو انھیں ظالمانہ سزائیں دی گئیں۔ پھر بھی تحریک آگے بڑھتی رہی۔

ورکروں اور کسانوں میں اپنی زندگیوں میں ناانصافیوں کے خلاف لڑنے کا حوصلہ اور اعتماد تھا اس لیے انھوں نے شخصی حکومت (Auto cracy) کے خلاف جدو جہد شروع کردی۔ جب ان لوگوں کا رابطہ انقلابیوں کے ساتھ بنا تو دونوں ہی تحریکوں کو تقویت ملی۔ بیسویں صدی کی ابتدا تک انقلابی تحریک ایک عوامی تحریک بن گئی اور انقلاب ایک عوامی نعرہ بن گیا۔

شخصی حکومت پر پہلا بڑا عوامی حملہ 1905 میں ہوا۔ یہ انقلابی کوشش ناکام ہوئی اور تحریک کو کچل دیا گیا۔ لیکن لوگوں نے اس تجربے سے بہت سے اہم سبق سیکھ لیے تھے اس لیے لینن نے بعد میں اس کوشش کو انقلاب 1917 کے لیے ''ڈریس ریہرسل'' کہا۔ ڈیموکریٹک جمہوریہ، عمومی انتخابات کسانوں کے لیے زمین، زیادہ اجرت اور ورکرس کے کام کے اوقات میں کمی ان کے اہم مطالبات تھے۔ عورتوں کی مساوات مختلف قومیتوں (Nationalistis) کے لیے حق خود ارادی اور سزائے موت کا خاتمہ ان کے دیگر مطالبات تھے۔ پہلی بار ایک عام ہڑتال کی گئی فوج اور بحریہ کے کچھ حصوں نے بھی بغاوت کردی اور ورکنگ کلاس کی ایک انقلابی تنظیم تشکیل دی گئی جسے سوویت (Soviet) کہا جاتا تھا۔ اس سوویت نے انقلاب میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

سالوں سال جور و جبر جاری رہا لیکن انقلابی تحریک نے بھی عالمی جنگ کے دوران شدت اختیار کرلی کیونکہ لوگوں کی اکثریت نے جنگ کے اثرات کو براہِ راست محسوس کرلیا تھا اور زار کی پالیسیوں کی نوعیت کو سمجھ لیا تھا۔ کٹھ پتلی کابینہ نے کچھ کرکے نہ دیا اور کمزور پارلیمنٹ (ڈوما) سے عوام کی ضرورتیں پوری نہ ہوئیں۔

1917 تک روسی لوگوں کی اکثریت نے شخصی حکومت (Autocracy) کو اکھاڑ پھینکنے اور معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لینے کا عزم راسخ کرلیا تھا۔ اسی ماحول میں روٹی کی کمی اور عورتوں کے ایک مظاہرے نے فروری کے انقلاب کو بھڑکا دیا۔ ان عورتوں نے فوجیوں سے کہا کہ وہ اس زار کے خلاف اپنے بھائی بہنوں کی حمایت کریں جس نے ایک کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ فوجیوں نے بھی جو جنگ سے عاجز آچکے تھے مظاہرہ کرنے والے لوگوں پر گولی نہیں چلائی۔

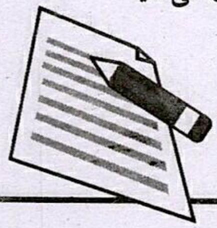

نوٹ

چند روز کے بعد ایک اور مطالبہ ہوا "شخصی حکومت مردہ باد"۔ لال جھنڈے راجدھانی پیٹرس برگ کے ہر طرف لہرانے لگے اور سلطنت کے تمام علاقے انقلاب کے نعروں سے گونج گئے۔ شخصی حکومت کا تختہ پلٹ گیا اور ایک عارضی حکومت (Provisional Goverement) نے کام کاج سنبھال لیا۔ اس تبدیلی میں ورکروں اور کسانوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا اور بورژوا (Bourgeoisie) نے بھی اس کی حمایت کی۔ فوجیوں نے بھی انقلابی قوتوں کا ساتھ دیا۔ سینٹ پیٹرس برگ کا نام بدل کر پیٹروگریڈ (Petrograd) کر دیا گیا۔ عارضی حکومت نے سیاسی آزادیوں، تنظیمیں بنانے کا حق اور آزادی تقریر کے حق کے لیے حالات ہموار کیے لیکن پالیسیوں میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہ کی جن کا لوگوں پر اثر پڑتا۔ یہ حکومت ایسا کر بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس میں ان پارٹیوں کا غلبہ تھا جو زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مفادات کی نمائندہ تھیں۔ اسی لیے ورکروں، کسانوں اور سپاہیوں نے بالشیویک پارٹی کے شانہ بہ شانہ اپنی تحریکوں کو جاری رکھا جس کا نتیجہ اکتوبر میں بالشیویک انقلاب 1917 کی شکل میں نکلا۔

بالشیوکوں کا تنہا ایسا سیاسی گروہ تھا جو 1917 میں لوگوں کی توقعات سے ہم آہنگ تھا۔ انھوں نے جنگ کے فوری خاتمے کا مطالبہ کیا، انھوں نے کسانوں کے لیے زمین، صنعتوں پر ورکروں کے کنٹرول، تمام ملک میں یہ ورکروں، کسانوں، سپاہیوں کے عوامی نعرے بن گئے اور پھر ان میں سے اکثر تنظیموں میں بالشویکوں کو رہنما چن لیا گیا۔

اس طرح اکتوبر 1917 کے انقلاب کی ایک عوامی بنیاد تھی۔ یہ صرف ایک فوجی انقلاب نہیں تھا جس نے عارضی حکومت کا تختہ پلٹ دیا ہو۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ یہ اکتوبر کا انقلاب کہلاتا ہے۔ لیکن یہ انقلاب 7 نومبر کو آیا اور اسی روز یعنی 7 نومبر کو ہی یہ منایا بھی جاتا ہے کیونکہ اس انقلاب کے بعد روس نے بین الاقوامی کیلنڈر اپنا لیا۔ اس سے قبل روس میں اپنا کیلنڈر رائج تھا جو بین الاقوامی کیلنڈر سے دس دن پیچھے تھا۔

23.11 پالیسیاں اور انقلاب کا اثر
(Policies and Impact of the Revolution)

انقلابی روس نے نہ صرف زار روس کی پالیسیوں کو تبدیل کر دیا بلکہ ایسی بہت سی باتیں بھی کیں جو یوروپ کے سرمایہ دار ملکوں میں موجود باتوں سے مختلف بھی تھیں اور زیادہ منصفانہ بھی تھیں۔ انقلاب کی پالیسیوں نے روس میں سوشلزم کی بنیاد رکھی۔

یہ بات اچھی طرح جانتے ہوئے کہ لوگ جنگ سے عاجز ہیں اور امن چاہتے ہیں اور یہ بھی کہ جنگ لوگوں کے مفاد میں نہیں ہے، اس انقلاب نے سب سے پہلے جو کام کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ خود کو جنگ سے پیچھے کر لیا۔

بالشویکوں نے پیداوار کے ذرائع یعنی زمین، فیکٹریوں اور بینکوں میں نجی ملکیت (Private property) کا خاتمہ کر دیا اور ان سب کو قومیا لیا گیا۔ یہ اب ریاست کی ملکیت ہوگئی نجی مالکوں کی نہ رہی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان

ذرائع کا استعمال دوسروں کی محنت کے استحصال یاس کسی کے نجی فائدے کے لیے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ورکروں کی تنظیموں کا فیصلہ کرنے کے عمل میں بڑا ہاتھ تھا۔

زمین کے بارے میں نومبر 1917 کے فیصلے کے مطابق زمینداری کا خاتمہ کر دیا گیا اور موروثی استعمال کے لیے کسانوں کو سونپ دی گئی۔ کسان زمین کو نہ فروخت کر سکتے تھے اور نہ رہن رکھ سکتے تھے اور نہ ہی دوسروں کی محنت (Labour) کے استحصال کے لیے اس کا استعمال کر سکتے تھے لیکن وہ اپنی زمین کے کرتا دھرتا تھے اور اپنی محنت کا پورا پھل پاتے اور زمین سے پیدا کرتے تھے۔ اب وہ کسی بھی طرح سابقہ زمینداروں پر منحصر نہیں تھے۔ دیہی معیشت اور سوسائٹی پر ان کے اختیارات کو ختم کر دیا گیا تھا۔

ان سب تدابیر کا مطلب یہی تھا کہ روسی لوگ ملک کی معیشت کے وسائل میں برابر کے حصہ دار تھے۔ اب ملک کے تمام حصوں اور لوگوں کے تمام سیکشنوں کے لیے ایک مرکزی منصوبہ بنانا ممکن ہو گیا تھا۔ مرکزی منصوبہ بندی کو بہت اہم خیال کیا گیا اور اسے ہندوستانی سمیت بہت سے ملکوں میں اپنایا گیا۔

نئے دستور اساسی میں مفت طبی نگہداشت، سب کے لیے مفت اور مساوی تعلیم، بے روزگاری بھتہ، ثقافت (Culture) اور ثقافت کی ترقی تک سب کی رسائی کی ضمانت دی گئی۔ یہی نہیں کہ سب چیزیں فوری طور پر مہیا کردی گئیں بلکہ ان کو سب کا حق بنا کر نئی حکومت نے اپنی پالیسی اور ایفاء عہد کی راہ بھی دکھا دی۔ مڈل کلاس ٹائپ کی نوکریاں کرنے والے لوگوں اور کسانوں یا فیکٹریوں میں کام کرنے والے لوگوں کے درمیان تنخواہوں یا ریاست کے ذریعے مہیا کرائی گئی دیگر سہولتوں کے فرق دوسرے ملکوں کے مقابلے بہت کم تھے۔ معیار زندگی اس بات پر منحصر نہ تھی کہ کوئی کتنی قیمت ادا کر سکتا ہے کیونکہ بہت سی ایسی چیزیں تھیں جن کی قیمت ہی ادا نہیں کرنی ہوتی تھی۔

عورتوں کو یہی نہیں کہ مساوی حقوق حاصل تھے بلکہ سیاسی اور سماجی زندگی میں ان کی مساوی ساجھے داری کو ممکن بنانے کے لیے بہت سے قدم مثلاً زچہ بچہ چھٹی، پبلک کینٹین، کام کی جگہوں پر بچہ پالن مراکز کا قیام اٹھائے گئے۔

انھوں نے ریاست کو ورکنگ کلاس کی آمریت (Dictatorship) سمجھا کیونکہ کام کرنے والے عالوگ اور ان کی فلاح و بہبود ہی ریاست اور اس کی پالیسیوں کی بنیاد تھی۔

نئی ثریم نے جہاں تہاں نوآبادیاتی حکومت کے خلاف آزادی کے جدوجہد کو اخلاقی اور مادی حمایت دی اور اپنے مستقبل کو طے کرنے کے لیے تمام قومیتوں کے حقوق کو تسلیم کیا۔ اسی وجہ سے تمام ایشیائی ملکوں میں روسی انقلاب کی تعریف ہوئی اور تمام دنیا کے لوگوں کو اس سے حوصلہ ملا۔ اس انقلاب سے ہندوستان اور چین بھی بہت متاثر ہوئے اور یہاں سوشلسٹ نظریات کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

ہندوستان کے قومی رہنماؤں نے سیاسی جدوجہد میں کسانوں اور ورکرس کی مداخلت کی اہمیت کو سمجھ لیا۔ ہندوستان کے لوگوں کو ایسا لگا کہ روس میں کسان مزدور راج قائم ہو گیا۔ اس طرح 1920 اور اس کے بعد آنے والے سالوں

نوٹ

نوٹ

میں یہاں ورکرز پارٹی، کسان پارٹی، آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس وغیرہ بنیں اور ورکرز نیز کسانوں کو منظم کرنے کے لیے یہاں کوششوں میں اضافہ ہوگیا۔

بہر حال سامراجی ملک (Imperialist Countries) انقلاب کے مخالفت تھے اور انھوں نے نئی بالشویک حکومت کو شکست دینے کے لیے فوجیں بھی بھیجیں۔ لیکن یہ لوگ کامیاب ہوئے اور نئی انقلابی حکومت باقی رہی اور اس کی خاص وجہ لوگوں کی حمایت اور انقلابیوں کی قربانی اور لگن تھی۔ روسی انقلاب اور پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد روس اور یوروپ میں کیا ہوا یہ ایک علاحدہ موضوع بحث ہے جسے آپ آئندہ سبق میں پڑھیں گے۔

متن پر مبنی سوالات 23.2

1۔ انقلاب سے پہلے روس میں کون سا سیاسی نظام تھا؟

____

2۔ 1917 کے روسی انقلاب کو اور کس نام سے جانا جاتا ہے؟

____

3۔ زار کے عہد میں روس کے اہم سیاسی گروہوں کے نام بتایئے۔

____

4۔ نجی جائیداد کے خاتمے کا کیا مطلب ہے؟

____

آپ نے کیا سیکھا

پہلی عالمی جنگ تاریخ میں پچھلی جنگوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جنگ نے اپنے تشدد اور دکھوں میں تمام دنیا کو لپیٹ لیا۔ اس جنگ و جدل میں ان نئی ٹیکنالوجیوں کا بھی استعمال ہوا جو اس سے پہلے نہ دیکھی گئی تھیں اور اس کی وجہ سے اس جنگ کا اثر زندگی کے مختلف پہلوؤں پر پڑا۔

اس جنگ کے اسباب فوری بھی تھے اور طویل مدتی بھی۔ نوآبادیوں اور دنیا کے وسائل پر کنٹرول کرنے کے لیے مقابلہ آرائی اس جنگ کی اہم وجوہات تھیں۔ یہ جنگ 1914 سے 1918 تک چلی اور جرمن اور اس کے حلیفوں (Alies) کی شکست پر اس کا خاتمہ ہوا۔ روسی انقلاب 1917 میں جنگ ختم ہونے سے پہلے آگیا۔

روسی انقلاب جنگ کے دباؤ اور روسی سماج کی آویزشوں (Confliets) کا نتیجہ تھا۔ یہ انقلاب تاریخ میں پہلا سوشلسٹ انقلاب تھا۔

اس انقلاب کے تین مرحلے تھے: ایک 1905 کا انقلاب جو ناکام ہوا، دوسرا فروری 1917 کا انقلاب جس کے نتیجے میں روس میں مطلق العنان شخصی حکومت(Autocracy) کا تختہ پلٹ ہوا اور تیسرا اکتوبر 1917 کا انقلاب جس کی رہنمائی بالشیویکوں نے کی اور جس کے نتیجے میں ایک سوشلسٹ ریاست قائم ہوئی۔

اس انقلاب نے ایک ایسے نئے سیاسی اور سماجی نظام کی تخلیق کی جو سماجی انصاف پر مبنی تھا۔ اس انقلاب کا باقی دنیا پر بھی زبردست اثر ہوا اور اس سے وہ ملک بھی متاثر ہوئے جو اپنی قومی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔

اختتامی سوالات

1۔ عہدزار کے روس میں سیاسی نظام کیا تھا؟ کسان مطلق العنان شخصی حکومت(Autocracy) سے کیوں مطمئن نہ تھے؟

2۔ مختلف قومیتوں نے بغاوت کیوں کی؟

3۔ 1905 کا انقلاب کیوں اہم تھا؟

4۔ روس میں فروری 1917 میں کیا واقعہ ہوا؟

5۔ بالشویکوں کے ذریعے لائی گئی اہم تبدیلیوں کو بیان کیجیے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ تبدیلیاں روسی لوگوں کے مفاد میں تھیں؟

6۔ ہندوستان انقلاب کے اثرات پر چند سطور لکھیے۔

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

23.1

1۔ ہوائی جہاز، ٹینک اور آبدوز

2۔ معاہدۂ سہ گانہ(Triple Entente)، اتحاد سہ گانہ(Triple Alliance)

3۔ ایک کروڑ لوگ مارے گئے، دو کروڑ زخمی ہوئے، کروڑوں لوگ اپنے گھروں سے اجڑ گئے۔

4۔ برطانیہ

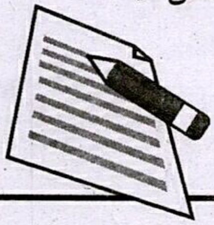

نوٹ

23.2

1۔ (مطلق العنان) شخصی حکومت(Autocracy)

2۔ بالشیویک انقلاب(Bolshevik Revolution)

3۔ سوشل ڈیموکریٹس، لبرلس(Lberals)، سوشل ریوالوشنریز کی(Social Revolutionaries)

4۔ پیداوار کے ذرائع پر ریاست کا قبضہ

اختتامی سوالات کے اشارے

1۔ دیکھیے 23.4، پیرا2

2۔ دیکھیے 23.8

3۔ دیکھیے 23.10، پیرا3

4۔ دیکھیے 23.10 پیرا5، 6

5۔ دیکھیے 23.11 پیرا1-7

6۔ دیکھیے 23.11 پیرا9 اور10

فرہنگ

شخصی حکومت(Autocracy) : ایسا سیاسی نظام جس میں حکومت کسی بادشاہ کی ہو، جس کے ہاتھ میں تمام اختیارات ہوں اور جہاں ایسے مؤثر نمائندہ ادارے ہوں جو سیاسی اقتدار میں شریک ہوں۔

سوشل ڈیموکریٹس (Social Democrats) : وہ لوگ جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ صرف قانونی اور سیاسی مساوات کافی نہیں بلکہ معاشی اور سماجی مساوات بھی ضروری ہے۔ اس لیے یہ لوگ سوشلزم میں یقین رکھتے تھے۔

نوٹ

سرمایہ داری(Capitalism) : بازار اور نجی جائیداد کے حقوق پر مبنی نظام، جو نجی منافع میں یقین رکھتا ہے اور جس میں جائیداد کا مالک اپنا منافع ان لوگوں کی محنت(Labour) کا استحصال کر کے حاصل کرتا ہے جو اس جائیداد پر کام کرتے ہیں۔

سوشلزم(Socialism) : ایسا نظام جو پیداوار کے ذرائع کی ریاستی ملکیت پر مبنی ہو تا کہ چند لوگ اپنے نجی منافع کے لیے ان لوگوں کی محنت (Labour) کا استحصال نہ کر سکیں جو ان ذرائع پر کام کرتے ہیں اور جہاں کا سیاسی نظام ایسا ہو کہ اس میں کام کرنے والے لوگوں کا غلبہ ہو۔

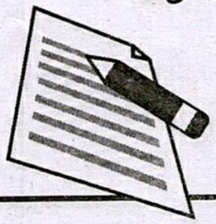

نوٹ

24

دو جنگوں کی درمیانی مدت اور دوسری عالمی جنگ

(The Inter-War Period and the Second World War)

تاریخ میں بیسویں صدی کے نصف اول کو عالمی جنگوں کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ پہلی جنگ ''تمام جنگوں کو ختم کرنے والی جنگ'' تھی لیکن اگلے بیس سال میں جو حالات پیش آئے انھوں نے دنیا کو ایک اور جنگ میں جھونک دیا جو پہلی سے زیادہ تباہی خیز تھی اور اس سے کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر پھیلی بھی۔ اس جنگ کے پھوٹ پڑنے کے اسباب کو سمجھنے ے لیے ہمیں ان جنگوں کے درمیان وقفے کے حالات کا مطالعہ تفصیل سے کرنا ضروری ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے نے یوروپی قوموں کے درمیان رقابتوں کا خاتمہ نہیں کیا حتیٰ کہ صلح کے جو معاہدے ہوئے وہ بھی صلح کو یقینی نہ بنا سکے۔ یہ سب معاہدے شکست خوردہ ملکوں کے لیے بہت سخت تھے اور اس طرح ان معاہدوں نے آئندہ جھگڑوں کے لیے تخم ریزی کی۔ ان معاہدوں سے حلیف طاقتوں کی اپنے اپنے مقبوضات کی توسیع کی توقعات پوری نہ ہوئیں۔ ان میں سے بہت سے ملکوں میں طاقتور قسم کے ڈکٹیٹر (Dictators) اقتدار میں آئے اور انھوں نے شاونیت (Chauvinism) یعنی جارحانہ قوم پرستی کی تبلیغ کی۔ سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ جنگ کی بنیادی وجہ یعنی سامراجیت کی جڑ نہیں کٹی۔

روسی انقلاب اور سوویت یونین کے ظہور نے دنیا کو دو دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک طرف تو وہ ملک تھے جو انقلاب کے حامی تھے اور دوسرے وہ ملک تھے جو اس کے اثرات سے خائف تھے۔ مغربی یوروپ کے اکثر ملکوں کا تعلق دوسرے گروہ سے تھا وہ سوشلزم کو اپنے سماجی اور معاشی نظاموں کے لیے خطرہ سمجھ رہے تھے۔ سوویت روس بھی سامراج مخالف تھا اور افریقہ اور ایشیا کی نوآبادیوں میں آزادی کے لیے ہو رہی جدوجہد کی حمایت و پاسداری کرتا تھا۔ اس باب میں آپ پڑھیں گے کہ ان تمام واقعات و حالات نے مل کر ایک اور جنگ کے حالات پیدا کر دیے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالع کے بعد آپ :

- امن معاہدوں اور یوروپ کے بدلے ہوئے نقشے کا تحلیل و تجزیہ کرسکیں گے؛
- کلیت پسند(Totalitarian) حکومتوں اٹلی، جرمنی اور جاپان کے عروج کی نشاندہی کرسکیں گے؛
- جارحیت(Aggression) اور خوشنودی(Appeasement) کے باہمی رشتے کو بیان کرسکیں گے؛
- اور جنگ کے دھارے کی وضاحت کرسکیں گے۔

24.1 امن معاہدے (The Peace Theaties)

پیرس میں منعقدہ کانفرنس میں ہونے والے امن معاہدوں پر دستخط کے ساتھ ہی پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ امریکی صدر ووڈرو ولسن، برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج اور فرانسیسی وزیر اعظم جارج George Clemenceau اس کانفرنس کے اہم لیڈر تھے۔

لیگ آف نیشن(League of Nations)

اس امن کانفرنس کا پہلا کام بین الاقوامی تعاون اور صلح و سلامتی کی ترقی کے لیے ایک عالمی تنظیم کے قیام کا فیصلہ تھا۔ اس لیگ کی ایک رسمی قرار داد(Coveernant) اپریل 1919 میں منظور ہوئی۔

اس قرارداد کی رو سے تمام ممبروں کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ امن کی خاطر اسلحہ میں تخفیف کریں۔ اگر کوئی ممبر ملک جنگ کا سہارا لیتا ہے تو اس ملک کے خلاف ایک اجتماعی قدم اٹھایا جائے گا۔ جارح ملک کے ساتھ تجارتی تعلقات بھی منقطع کرلیے جائیں گے۔ لیکن یہ لیگ آف نیشن کوئی مؤثر تنظیم نہ بن پائی۔ دو اہم ملک سوویت یونین اور جرمنی کو بہت سالوں تک اس کا ممبر بننے کی اجازت نہ ملی۔ لیگ کی تشکیل میں ایک ممتاز کردار ادا کرنے والے ملک امریکہ نے اس میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اسی لیے جب 1930 کی دہائی میں جارحیت شروع ہوئی تو لیگ اس کو روک نہ پائی۔

معاہدہ ورسیلز(The Treaty of Versailles)

امن معاہدوں کی بنیاد صدر ولسن کی امن تجاویز یا چودہ نکات پر مبنی تھی۔ یہ تجاویز امن، آزادی، جمہوریت (Democracy) اور حق خودارادیت(Self-determination) یعنی اپنی حکومت میں اپنی بات کہنے کا حق کی

نوٹ

ضامن تھیں لیکن جب اتحادیوں (Allies) نے جرمنی کے ساتھ معاہدۂ ورسیلز (Treatry of Versailles) پر دستخط کیے تو ان اصولوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔

اس معاہدہ کے مطابق:

1۔ جرمنی پر جارحیت کا الزام لگایا گیا اور اسے جنگ کے دوران اتحادیوں کو پہنچنے والے نقصان کی ذمہ داری قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

2۔ جرمنی کو ہرجانے کے طور پر 6,600 ملین ڈالر اتحادیوں کو دینے تھے۔

3۔ سارووادی میں جرمنی کی کوئلہ کانوں کا علاقہ 15 سال تک لیگ کے تحت دے دیا گیا اور اس مدت کے لیے کانیں فرانس کو منتقل کر دی گئیں۔

4۔ نئی قائم کردہ پولینڈ کی ریاست (دیکھیے نقشہ 1) کو ایک گیلری (Corridor) دے دی گئی جس سے اس کو بالٹک سمندر میں نکاس مل گیا۔ اس کاریڈور نے مشرقی پروشیا کو باقی جرمنی سے جدا کر دیا۔ ڈینزگ (Danzig) کی بندرگاہ جو اس کاریڈور میں پڑتی تھی اسے ایک آزاد شہر بنا دیا گیا۔

5۔ جرمن فوج کی تعداد 100,000 تک محدود کر دیا گیا اور اس کو یہ اجازت دی گئی کہ وہ کوئی بھی ہوائی فوج یا بحری فوج رکھ سکتا ہے۔

6۔ جرمنی کے نوآبادیاتی مقبوضات فاتح طاقتوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ جرمن کے ہاتھ سے علاقے نکل گئے ہم ان کے بارے میں یوروپ کے نقشے کے مطالعے کے بعد پڑھیں گے۔

جرمنی کو حملے کی دھمکی کے تحت اس معاہدے پر دستخط کرنے پڑے۔ درحقیقت اس کانفرنس میں شرکت کے لیے جرمنی کے کسی نمائندے کو نہیں بلایا گیا تھا۔ اسی لیے جرمن نے اس کو ایک ''تحکمانہ صلح'' (Dictated Peace) کہا۔

اس طرح دوسری جنگ کے کچھ بیج ورسیلز (Versailles) میں ہی بوئے گئے۔

یوروپ کی ساحلی جنگ کے نقشے کا مطالعہ ہم کو یہ دکھاتا ہے کہ تقریباً تمام یوروپی ممالک کی سرحدیں جنگ کے نتیجے میں بدل گئیں۔ جرمنی نے السیک لارین (Alsace Loraine) فرانس کو سونپ دیا جس پر اس نے 1871 میں قبضہ کیا تھا۔ شمال میں جرمن نے کچھ علاقے بیلجیم اور ڈنمارک کو دیے۔ جو علاقہ جرمنی نے پولینڈ کو دیا تھا اس کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ جرمنی افریقی نوآبادیوں اور چین میں اپنی مراعات کے حقوق پہلے چھوڑ چکا تھا۔ اس طرح جنگ کے بعد جرمن لوگ بہت غیر مطمئن تھے۔

اٹلی نے اسٹریا میں اپنی علاقائی توقعات کی تکمیل کے لیے جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ دیا۔ لیکن اس معاہدہ سے اٹلی کو جو کچھ حاصل ہوا وہ صرف آسٹریا کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔

نوٹ

نقشہ 24.1 : پہلی عالمی جنگ کے نتیجے میں علاقائی تبدیلیاں

نوٹ

نقشہ 24.2 : یوروپ کے بلاک 2 کا بدلا ہوا نقشہ

نوٹ

پولینڈ جو آسٹریا، پروشیا اور روس کی تین سلطنتوں کے ذریعے الحاق کے بعد 1815 میں نقشے سے غائب ہو گیا تھا اب ان تینوں سلطنتوں کے زوال کے بعد دوبارہ ظاہر ہوا بہرصورت، نئے پڑوسی ملکوں کے ساتھ پرانی دشمنی اتنی آسانی سے ختم ہونے والی نہ تھی۔

ایک الگ معاہدہ کے ذریعے آسٹریا ایک چھوٹی سی ریاست بن کے رہ گئی اور اس کی ساری شاہی شان وشوکت ختم ہوگئی۔ آسٹریا نے ہنگری، پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور یوگوسلاویہ کے نئے تشکیل شدہ ملکوں کی آزادی کو تسلیم کرلیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اٹلی کو بھی آسٹریا کی قیمت پر کچھ علاقہ حاصل ہو گیا تھا۔ ان سبھی نئے تشکیل شدہ ملکوں کو سرحدی جھگڑوں، سیاسی تغیرات اور معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

فلسطین اور عراق کو عارضی تفویض شدہ علاقے(Mandates) کے طور پر برطانیہ کو دے دیا گیا اور شام ،فرانس کو تفویض کر دیا گیا۔ ان کو ان ملکوں کا نظم ونسق اس وقت تک چلانا تھا جب تک کہ یہ ملک خود اپنے اوپر حکومت کرنا نہ سیکھ لیں۔ لیکن ان تفویض شدہ ملکوں پر بھی نوآبادیات کے طور پر ہی حکومت کی گئی۔

ترکی کے ساتھ معاہدہ کے نتیجے میں ترکی سلطنت کے بھی مکمل طور پر حصے بخرے ہوگئے۔ جنوب مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں تمام عرب مقبوضات ترکی کے ہاتھ سے نکل گئے اور یوروپ کے بھی تمام علاقے ترکی کے ہاتھ سے چلے گئے۔ ان میں سے کچھ علاقے تفویضی علاقے(Mandates) کے طور پر برطانیہ اور فرانس کے تحت آگئے اور کچھ علاقے روس اور یونان کے ہاتھ آئے۔ اس طرح ترکی ایک چھوٹی سی ریاست ہو کے رہ گئی۔ اس معاہدہ کے خلاف مصطفیٰ کمال کی قیادت میں ترکوں نے بغاوت کی۔ سلطان ترکی کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا اور 1923 میں وہاں ایک جمہوری حکومت قائم کردی گئی جس کے پہلے صدر مصطفیٰ کمال تھے۔ انھوں نے ملک میں جدید کاری(Modernization) کا عمل شروع کیا۔ لوگوں نے ان کو ''اتاترک'' یعنی ''ترکوں کا باپ'' کہا۔

آپ نے ابھی ان تبدیلیوں کے بارے میں پڑھا جو مختلف یوروپی ملکوں میں رونما ہوئیں ان تبدیلیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر ملک امن معاہدوں سے ناخوش تھے۔ کیا دنیا کی ایک اور تقسیم جدید کی ضرورت تھی؟ کیا جنگ اس تمام مسئلہ کا اکیلا حل تھی؟

اس باب میں آپ کو ان سوالات کا جواب پانے میں مدد ملے گی۔

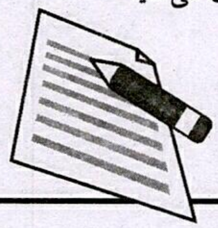

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 24.1

A. درج ذیل کے صحیح جوڑے ملائیے:

1۔	معاہدہ ورسیلز	بالٹک سمندر میں نکاس
2۔	انقلاب روس	رسمی قرارداد (Covenant)
3۔	لیگ آف نیشن	تحکمان صلح (Dictated Peace)
4۔	عراق و فلسطین	تفویض شدہ علاقے
5۔	پولش کوریڈور	اتحادی مداخلت

B. درج ذیل جملوں کو مکمل کیجیے:

1۔ ________ کے لیے لیگ آف نیشن بنائی گئی تھی۔

2۔ ولسن کی چودہ نکاتی تجاویز ________ کی ضامن تھیں۔

3۔ روس نے ________ کر کے خود کو جنگ سے الگ کر لیا۔

4۔ بالٹک ریاستیں جنھوں نے جنگ کے بعد آزادی حاصل کی وہ ________ تھیں۔

5۔ پولینڈ کی تشکیل ________ اور ________ کے زوال کے بعد ہوئی۔

24.2 کلیت پسند حکومتوں کا عروج (Rise of Totalitarian Regimes)

جنگ کے فوراً بعد آنے والے سال سبھی یوروپی ملکوں کے لیے مسائل سے بھرپور تھے۔ یہ مسائل، معیشت کی تنظیم نو، جنگ سے بچ جانے والوں کی بازآبادکاری اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری تھے۔ بہت سے ملکوں میں ورکنگ طبقات نے سوویت نمونے پر سوشلسٹ انقلاب کی تنظیم کی لیکن ان سب کو بے رحمی سے کچل دیا گیا۔ ان کے بدلے ہنگری، پولینڈ، اٹلی، پرتگال، جرمن اور اسپین میں مضبوط جمہوریت مخالف تحریکیں اٹھیں۔ ان کو عام طور پر ''فاشسٹ'' کہا جاسکتا ہے۔

اٹلی میں فاشزم کا ظہور (Emergence of Fascism in Italy)

فاشزم کی اصطلاح اٹلی سے آئی اور پہلی مرتبہ اس کا استعمال اس تحریک کے لیے کیا گیا جسے بنی ٹو موسولینی (Beni to Mussolini) نے اٹلی میں شروع کیا تھا۔ فاشسٹوں نے ''ڈنڈوں کے بنڈل'' (The Fasces) کو اپنا نشان بنایا۔ یہ نشان ریاستی اقتدار کی نمائندگی کرتا تھا۔ ان تحریکوں کی اہم خصوصیات تھیں جمہوریت

نوٹ

(Democracy) اور سوشلزم کی مخالفت، آمرانہ(Dictatorial) حکومت کا قیام، انتہا درجہ کی قوم پرستی اور عسکریت پسندی(Militarism)۔

مسولینی نے قدیم رومی سلطنت کی عظمت و شان کے بارے میں بڑی زوردار تقریریں کیں اور لوگوں پر زور دیا کہ وہ اپنے عزت و افتخار کو بحال کریں۔ اس کی تقریروں کو سن کر بہت سے سابق سپاہی اس کے مسلح ٹولوں میں شامل ہوگئے۔ یہ ٹولے (Gang) پرائیوٹ فوج تھی جسے بلیک شرٹس(Black Shirts) کہا جاتا تھا۔ مسولینی نے ہڑتالیں توڑنے اور سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں میں خوف و دہشت پھیلانے کے لیے ان مسلح گروہوں کو استعمال کیا۔ اٹلی کے حکمراں طبقات نے بھی ان کی سرگرمیوں کو نہیں دبایا کیونکہ وہ بھی سوشلسٹ انقلاب کو روکنا چاہتے تھے۔

1921 میں مسولینی نے نیشنل فاشسٹ پارٹی قائم کی۔ اگلے سال اکتوبر میں اس نے اپنے تیس ہزار بلیک شرٹوں کو روم پر ایک حملہ کے لیے بھیجا۔ وہاں کی حکومت نے بغیر جنگ کے ہتھیار ڈال دیے اور بادشاہ نے مسولینی سے حکومت بنانے کے لیے کہا۔ 1928 تک تمام پارلیمنٹری اپوزیشن کا خاتمہ کر دیا اور ڈکٹیٹر کی حیثیت سے حکومت شروع کردی۔ تمام غیر فاشسٹ پارٹیوں پر پابندی لگادی گئی۔ اس نے سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو کچلنے کے لیے قید و بند ایذا رسانی اور منظم قتل کا استعمال کیا۔ اس نے ایک فاشسٹ گرانڈ کونسل شروع کی اور لیڈر ڈیوچے دوم (II Due Duce of the Leader) کا لقب اختیار کیا۔ اس نے جنگ اور توسیع کی پالیسی کی حمایت کر کے اٹلی کو ایک عظیم طاقت بنانے کی کوشش کی۔

ہٹلر اور نازی جرمنی(Hitler and Nazi Germany)

آپ جرمنی کی ذلت آمیز شکست اور اس کی بادشاہت کے زوال کے بارے میں پڑھ آئے ہیں۔ 1919 میں ایک نئے دستور اساسی کے تحت حکومت کی ایک ریپبلکن شکل قائم ہوئی جس میں ایک صدر ایک چانسلر اور ایک منتخب پارلیمنٹ ہوتی تھی۔ عالمی جنگ کے دوران ایڈولف ہٹلر جرمنی میں ایک سپاہی رہا تھا اور سالوں تک اس نے بہادری سے جنگ میں حصہ لیا تھا اور ایک آئرن کراس بھی جیتا تھا۔ جرمنی کی شکست سے دل شکستہ ہوکر اس نے اب سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ہٹلر کی پرزور تقریروں اور اس کی تنظیمی صلاحیتوں نے اس کو نیشنل سوشلسٹ جرمن ورکرز پراٹی کا لیڈر بنا دیا یا مختصراً کہیے تو اس کو نازی پارٹی کا لیڈر بنا دیا۔ فاشسٹوں کی طرح اس کی بھی اپنی فوج تھی جنھیں طوفانی سپاہی(Storm Troopers) یا براؤن شرٹس(Brown shirts) کہا جاتا تھا۔ 1930 تک براؤن شرٹس کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔

> اٹلی میں فاشسٹوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کے بعد کارپورل ایڈولف ہٹلر نے 1923 میں جرمن کے اندر بھی ویسی ہی ایک کوشش کی۔ یہ کوشش ناکام ہوئی اور ہٹلر کو جیل ہوگئی۔ جیل میں ہٹلر نے اپنی کتاب میری جدوجہد(Mein Kampf) لکھی۔ اس کتاب میں اس نے دور حاضر کی انتہائی وحشیانہ ڈکٹیٹرشپ قائم کرنے کے منصوبے پیش کیے۔

نازی پالیسیوں کا مقصد ورسیلز (Versailles) کی ذلتوں کو مٹانا اور جرمنی کو دنیا کا ایک طاقتور ملک بنانا تھا تاکہ اس سے دنیا خوف کھائے۔

جمہوریت، شہری آزادی اور سوشلزم کی مخالفت میں نازی لوگ فاشزم کی طرح تھے انھوں نے کسی بھی مخالت کو کچلنے کے لیے سخت اور ظالمانہ طاقت کا استعمال کیا۔

ہٹلر نے جنگ میں جرمنی کی شکست کے لیے یہودیوں پر الزام رکھا اور اسی لیے یہودی نسل کا استقبال نازی ازم کی اہم خصوصیت بن کر رہ گیا۔ ہٹلر نے جنگ میں جرمنی نسل کی برتری اور اس کے خالص ہونے میں یقین کرتا تھا اور ان کو خالص خون والا آرین مانتا تھا اور عظیم جرمن کی تخلیق کے لیے تمام جرمنیوں کے اتحاد کا خواہشمند تھا۔ لوگوں کا کافی بڑا ابقہ نازی سیاست سے متاثر ہوا اور انھوں نے جرمن لوگوں کے قومی غرور کو ابھار اور نازی سیاست کے لیے دان کی حمایت حاصل کی۔

1936 کے اولمپک کھیل برلن میں منعقد ہوئے تھے۔ ہٹلر آریاؤں کی نسل برتری کے اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے کھیلوں کا استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ دراصل کھیلوں کا سب سے اہم مقبول ہیرو ایک افروامریکی کھلاڑی جیسی ایمس (Jesse Owems) تھا۔

ہٹلر کے عروج اور اس کے اقتدار تک پہنچنے مَیں 1930 کی دہائی کی معاشی حالت نے بڑی مدد کی۔ اس وقت امریکا اور یوروپ زبردست مندی کا شکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی میں اسّی لاکھ لوگ بے روزگار ہوگئے۔ اب نازی پارٹی نے اپنے اثرات کو پھیلانا شروع کیا۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ لوگ نازیوں کے خلاف لوگوں کو متحد نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نازی پارٹی جسے 1928 میں پارلیمنٹ کے اندر صرف 12 سیٹیں ملی تھیں 1932 میں اکیلی سب سے بڑی پارٹی کے روپ میں ابھری۔ صدر ہنڈس برگ (Hundsburg) نے ہٹلر کو چانسلر مقرر کیا اور اس سے نئی حکومت تشکیل دینے کے لیے درخواست کی۔

اقتدار میں آنے کے بعد جلدی ہی ہٹلر نے خوف و دہشت کا دروازہ کھول دیا۔ تمام جمہوری اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا۔ فروری 1933 میں نازیوں نے پارلیمنٹ بلڈنگ کو آگ لگادی اور الزام سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں پر رکھا۔ تقریباً ساٹھ ہزار لوگوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا یا کنسنٹریشن کیمپوں (Concentration Camps) میں بھیج دیا گیا۔ 1933 کے وسط میں نازی پارٹی کے علاوہ ساری پارٹیوں پر پابندی لگادی گئی۔ 2 اگست 1934 میں ہنڈس برگس کی موت کے بعد ہٹلر جرمن کا صدر (President) بن گیا۔ یہودیوں کے مکمل استیصال (Extermination) کے لیے ایک منظم مہم شروع کی گئی۔ ساتھ ہی فوجی نظام (Militarization) کے منصوبے کو بھی شروع کیا گیا۔ نازی ازم کی فتح کے نتیجے میں دنیا جنگ کے قریب پہنچ گئی۔

ہٹلر اتنا بے رحم اور شقی القلب تھا کہ اس نے ایک ہی رات میں ان ہزاروں اسٹارم ٹروپرس (Storm Tropers) کے قتل کا حکم بھی دے دیا جنھوں نے اس کے اقتدار تک پہنچانے میں مدد کی تھی۔ 30 جون 1934 کو لمبی چھریوں (Long Kinves) کی رات کہا جاتا ہے۔

نوٹ

جاپان کا فوجی فاشزم (Military Fascism in Japan)

جاپان ایشیا کا وہ تنہا ملک ہے جو نوآبادی بننے سے بچا رہا۔ انیسویں صدی کے آخر تک جاپان کی توسیع پسند پالیسی کے نتیجے میں چین کے ساتھ اس کی جنگ ہوگئی۔ جنگ میں چین کی شکست کی وجہ سے ملک میں جاپان کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ 1905 میں جاپان نے جنگ میں روس کو شکست دی اور منچوریا پر قبضہ کر لیا جو چین میں روسی دائرہ اثر (Sphere of influence) تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ایک ایشیائی ملک نے جنگ میں ایک طاقتور یوروپی قوم کو شکست دی۔ اس کے بعد جاپان نے کوریا کا بھی الحاق کر لیا۔

پہلی جنگ عظیم کے شروع ہو جانے سے جاپان کو موقع مل گیا اور اس نے چین میں جرمنی مقبوضات اور بحرالکاہل میں جرمنی کے کچھ مقبوضہ جزیروں پر قبضہ کر لیا۔ جنگ کے بعد لیگ نے یہ جزائر جاپان کی تحویل (Mandate) میں دے دیے۔ اس وقت تک جاپانی فوج سماج میں ایک زبردست طاقت بن گئی تھی۔ اس نے ملک میں جمہوریت کو ختم کر دیا اور انتہا پسند قوم پرستی اور توسیع پسندی کی حمایت کی۔ پچاس سال سے کم عرصہ میں ہی جاپان ایک پرامن ملک کے بجائے ایک جارح فوجی طاقت بن گیا۔ 1930 کی دہائی میں جاپان کے قریبی تعلقات اٹلی اور جرمن کی فاشسٹ حکومت سے قائم ہوگئے اور دنیا ایک نئی تقسیم کے دہانے پر پہنچ گئی۔

متن پر مبنی سوالات 24.2

A. غلط اور صحیح بتائیے :

1۔ 1920 کی دہائی میں بہت سے ملکوں میں سوشلسٹ انقلاب کامیاب ہوئے۔

____

2۔ فاشزم کی اصطلاح جمہوری تحریکوں کے بیان کرنے کے لیے استعمال ہوئی۔

____

3۔ ہٹلر نے عہد حاضر کی سب سے وحشیانہ حکومت قائم کی۔

____

4۔ یوروپی حکومتوں نے سوشلزم کے عروج کی حمایت کی۔

____

5۔ جاپان نے چین کے تئیں ایک پرامن پالیسی اختیار کی۔

____

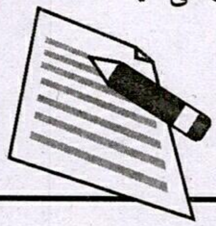

نوٹ

B. خالی جگھوں کو پُر کیجیے:

1۔ مسولینی کے مسلح ٹولوں (Armed gangs) کو __________ کہا جاتا تھا۔

2۔ ہٹلر نے جیل میں اپنی کتاب __________ لکھی۔

3۔ فاشسٹوں کی طرح نازی بھی __________ اور __________ کے مخالف تھے۔

4۔ مسولینی __________ پر ایک __________ کو منظم کر کے اقتدار میں آیا۔

5۔ جنگ میں روس کو شکست دینے کے بعد جاپان نے __________ میں __________ پر قبضہ کرلیا۔

24.3 عظیم کساد اور اس کے اثرات
(The Great Depression and Its Effects)

پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ یوروپ کی برتری کو زوال آیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اہمیت بڑھ گئی۔ یوروپی ملکوں کی معیشت کمزور اور امریکہ کی معیشت مضبوط ہوگئی۔ امریکہ کی سرزمین پر کوئی جنگ نہ ہوئی اور وہاں جنگ کے دوران بھی صنعتی توسیع جاری رہی اور امریکہ اتحادیوں کو جنگی ساز وسامان فراہم کرتا رہا۔ بہرحال، ایک دہائی کے بعد بہت سنجیدہ معاشی مسائل نے ملک میں سر ابھارا جو بعد میں باقی یوروپ میں بھی پھیل گئے۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ امریکہ پیداوار کے سرمایہ دارانہ نظام کا ہیرو تھا۔ اس نظام میں صنعت کے مالکان ہی زیادہ سے زیادہ منافع کماتے ہیں۔ بیشتر کام کرنے والے خط افلاس سے نیچے ہی رہتے تھے۔ اس طرح صنعتیں جو مال بنا رہی تھیں اس کے خریدنے کے لیے زیادہ لوگوں کے پاس وسائل نہ تھے۔ اس طرح ایک طرف تو پیداوار کی زیادتی (Overproduction) اور دوسری طرف قوتِ خرید کی ناقص تقسیم (Maldistribution) عظیم کساد بازاری (Great depression) کے دو اہم سبب بن گئے جن کا پہلا نشانہ اکتوبر 1929 میں امریکہ بنا اور پھر ساری دنیا میں یہ سرد بازاری پھیل گئی۔

یہ بحران شیئر قیمتوں میں زوال کے ساتھ شروع ہوا اور اس کے نتیجے میں امریکی اسٹاک مارکیٹ شکست و ریخت کا شکار ہوگئی۔ ایک ہی دن میں نیویارک اسٹاک ایکسچینج میں تقریباً سولہ ملین شیئر بیچے گئے۔ اگلے چار سالوں میں نو ہزار بینکوں میں کام کاج بند ہوگیا اور لاکھوں لوگوں کی زندگی بھر کی بچتیں ختم ہوگئیں۔

چونکہ سامان کی بکری نہ رہی اس لیے ہزاروں فیکٹریاں بھی بند ہوگئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ بے روزگاری، افلاس اور بھکمری بھی پھیل گئی۔

نوٹ

سوویت روس کے علاوہ اکثر یوروپی ملک اس کساد بازاری سے متاثر ہوئے کیونکہ یہ سب امریکی معیشت اور خاص طور پر امریکی بینکوں پر منحصر تھے۔ ان ملکوں میں بحران کے اثرات یکساں تھے۔ دنیا میں بے روزگار لوگوں کی تعداد پچاس ملین سے زیادہ تھی، صرف امریکہ میں یہ تعداد پندرہ ملین تھی۔

معاشی بحران نے ان ملکوں میں سیاسی حالات کو بھی متاثر کیا۔ امریکہ میں ڈیموکریٹک پارٹی اقتدار میں آئی اور فرینکلن ڈی روزویلٹ صدر بنے۔ انھوں نے معاشی اصلاح اور سماجی بہبود کا ایک پروگرام شروع کیا جس کا نام نئی قرارداد(New Deal) تھا۔ برطانیہ اور فرانس میں لیبر دوست حکومتیں اقتدار میں آئیں۔ اگرچہ برطانیہ اور فرانس میں فاشسٹ تحریکیں اٹھیں لیکن وہ کامیاب نہ ہوئیں۔

آپ پہلے پڑھ آئے ہیں کہ جرمن اور اٹلی میں مابعد جنگ بے چینی اور مندی کے سبب ہی فاشسٹ پارٹیوں کو فتح نصیب ہوئی تھی۔

1930 کی دہائی میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی خارجہ پالیسیاں بھی ایک جیسی تھیں۔ انھوں نے فاشسٹوں کے خلاف کوئی مضبوط پوزیشن نہ اختیار کی۔ ان کا تو سارا سروکار یہ تھا کہ سوشلسٹوں کے نظریات اور ورکرز کی تحریکوں کو پھیلنے کو روک سکیں۔ اس طرح جب فاشسٹوں کی جارحیت شروع ہوئی تو انھوں نے اس کو روکنے کے لیے کوئی تدبیر نہ کی بلکہ اس کے بجائے انھوں نے اس امید میں فاشسٹوں کو خوش کرنے کی کوشش کی کہ وہ کمیونزم کا توڑ کر سکیں گے۔

یو ایس ایس آر میں ہونے والے تغیرات(Developments in the USSR)

جنگ میں روس کی شرکت اور روسی انقلاب کے بارے میں پہلے ہی پڑھ آئے ہیں۔ اس کے بعد خانہ جنگی اور اتحادی فوج کی مداخلت شروع ہوگئی اور ان سب کے نتیجے میں روسی معیشت بکھر گئی۔ غذائی اشیا کی سخت قلت پیدا ہوگئی اور صنعتی پیداوار بہت تیزی سے گرنے لگی اور نتیجہ کے طور پر آنے والے قحط نے حالات کو اور خراب کر دیا۔

لینن کو سخت اقدامات اٹھانے پڑے۔ سوویت حکومت نے زائد غذائی اشیا(Surplus food) بقیہ آبادی کو کھلانے کے لیے امیر کسانوں(Kulaks) سے زبردستی لے لیں۔ بازاروں میں نہ کچھ بیچا جاتا تھا اور نہ خریدا جاتا تھا۔ اجرتوں کے بدلے ورکرز کو صنعتی پیداوار تقسیم کر دی جاتی تھی۔ لوگوں کو حوصلہ ملا اور وہ اپنے مفاد کے بجائے اپنے ساتھیوں کی بھلائی کے لیے کام کرنے پر مجبور بھی ہوئے۔ یہ سنگین صورت حال جو 1918 سے 1921 تک باقی رہی وار کمیونزم(War Communism) کہلاتی ہے۔

کسانوں اور خود لینن کی پارٹی کے کچھ ممبروں نے اس نظام کی سخت مخالفت کی تو لینن نے 1921 میں نئی معاشی پالیسی لاگو کی۔ وار کمیونزم کے سخت اقدامات واپس لے لیے گئے۔ اب کسان اپنی پیداوار کا دسواں حصہ دینے لگے اور ان کو یہ اجازت مل گئی کہ وہ باقی پیداوار کو کھلے بازار میں بیچنے لگے۔ اگرچہ اکثر صنعتیں سرکار کے سخت کنٹرول میں رہیں لیکن چھوٹی صنعتیں نجی مالکان کو واپس کر دی گئیں۔ اجرتوں کی نقد ادائیگی کو پھر سے شروع کر دیا گیا۔

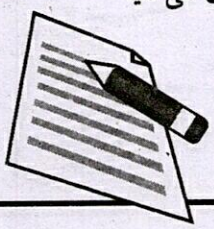

نوٹ

1924 میں ایک نیا دستور اساسی لاگو کیا گیا جس کے تحت روس یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس (USSR) قرار پایا۔ لیکن 1924 میں لینن کے مرنے کے بعد پارٹی میں اقتدار کی زبردست رسہ کشی شروع ہوگئی۔ ملک کی آئندہ پالیسیوں کو لے کر سینئر لیڈروں کے درمیان زبردست اختلاف پیدا ہوگئے۔ آخرکار جیت اسٹالن کی ہوئی اور وہ کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سکریٹری بنا اور جلدی ہی اس کے ہاتھ میں بڑے اختیارات آ گئے۔

چند ہی سال کے عرصے میں سوویت روس نے پنچ سالہ منصوبوں کے ذریعے صنعتیانے کا ایک بڑا پروگرام شروع کیا۔ پہلا منصوبہ 1929 میں شروع ہوا۔ اس منصوبہ کا ایک اہم مقصد زراعت میں تبدیلیاں لانا تھا۔ پیداوار بڑھانے کے لیے حکومت نے چھوٹے کسانوں کی ''اجتماعیت'' (Collectivization) کے نظریہ کو فروغ دیا۔ کھیتوں کی نجی ملکیت چھوڑ دینے کے لیے کسانوں کو ترغیب بھی دی گئی اور ان پر دباؤ بھی ڈالا گیا۔ زمین کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا گیا اور سب کسان اجتماعی کھیتوں کے ممبر اور مشترک مالک بن گئے۔ وہ مالدار کسان (Kulaks) جنھوں نے اس اجتماعیت کی مخالفت کی ان کے ساتھ بہت سخت رویہ اختیار کیا گیا۔ ایک تخمینہ کے مطابق اس مدت میں ہزاروں لوگ ضائع ہوگئے۔

اس منصوبے کا خاص مقصد صنعتیانے کو بڑھاوا دینا تھا۔ اس میدان میں جو کامیابی ملی وہ بہت بڑی تھی اور اس طرح سوویت روس جلدی ہی دنیا کی ایک بڑی صنعتی طاقت بن گیا۔ یہ بات یاد رکھنے قابل ہے کہ اس وقت سرمایہ دارانہ معیشتیں سخت معاشی بحران سے دوچار تھیں۔ البتہ سوویت روس کی کامیاب معیشت کی مثال ایک ممتاز مثال تھی جسے آزادی کے بعد بہت سی نوآبادیوں نے اپنایا۔ بہرحال ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور بہت سے یوروپی ملکوں نے 1933 تک روس کو تسلیم نہیں کیا۔ روس 1934 میں ہی لیگ آف نیشنز کا ممبر بن سکا۔ سوویت یونین کے تئیں یہ دشمنی اس کے بعد بھی چلتی رہی۔ جب 1930 کی دہائی میں فاشسٹوں کی جارحیت شروع ہوئی تو اس وقت سوویت روس وہ اکیلی بڑی طاقت تھا جس نے فعال طور پر اس کی مخالفت کی۔

متن پر مبنی سوالات 24.3

A. صحیح جوڑے ملائیے:

1۔ نئی قرارداد (New Deal)	روس (U.S.S.R)
2۔ مالدار کسان	امداد باہمی سے وابستہ کھیت
3۔ نئی معاشی پالیسی	ریاست ہائے محدہ امریکہ (USA)
4۔ اجتماعیت	کُلک (Kulak)
5۔ زیادہ پیداوار (Overproduction)	عظیم کساد (مندی)

B. صحیح / غلط بتائیے :

1۔ اکثر یوروپی ملک امریکی معیشت پر منحصر تھے۔

2۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ورکرس کو کم اجرت ملتی تھی۔

3۔ لینن کی وار کمیونزم کی پالیسی سے لوگ خوش تھے۔

4۔ روس نے تیز رفتار انڈسٹریلائزیشن کے لیے پنچ سالہ منصوبے شروع کیے۔

5۔ آزادی کے بعد متعدد نو آبادیوں نے سوشلسٹ معیشت کی مثال کو اختیار کیا۔

24.4 جارحیت اور خوشنودی (Aggression and Appeasement)

1930 کی دہائی میں اٹلی، جرمنی اور جاپان کے کئی جارحانہ اقدام نظر آتے ہیں۔ اس سیکشن میں ہم یہ پڑھیں گے کہ اکثر مغربی طاقتیں ان اقدامات پر نہ صرف خاموش رہیں بلکہ ان میں سے بعض اقدامات کی انھوں نے حمایت بھی کی اور اس طرح فاشسٹوں کو جنگ کا اسٹیج تیار کرنے میں مدد ملی۔

> خوشنودی (Appeasement) کمزور طبقوں کے مفادات کے خلاف کسی جارح کو مراعات دینے کی ایک پالیسی کا نام ہے۔

منچوریا پر جاپانی حملہ (Japanese Invasion of Manchuria)

منچوریا پر جاپان کا حملہ پہلی بڑی جارحیت تھی۔ جاپان ریلوے لائن پر دھماکے کے ساتھ ہی یہ ہنگامہ شروع ہوا اور جاپانی افسروں نے اس کو منچوریا پر حملہ کرنے کا ایک بہانہ بنایا۔ چین نے لیگ آف نیشنز سے اپیل کی لیکن لیگ نے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ جاپان نے لیگ آف نیشنز کو چھوڑ دیا اور 1937 میں چین پر ایک اور حملہ کیا۔

ایتھوپیا پر اٹلی کا قبضہ (Italy Takes Over Ethiopia)

1935 میں اٹلی نے ایتھوپیا پر حملہ کیا۔ لیگ سے اپیل کی گئی۔ لیگ نے اٹلی کو حملہ آور قرار دیا اور اس کی مذمت کی اور اس کے ہاتھوں ہتھیار بیچنے پر پابندی لگادی۔ بہرحال 1936 تک اٹلی نے ایتھوپیا کی فتح کو مکمل کر لیا اور لیگ ایک مرتبہ پھر جارحیت کو روکنے میں ناکام رہی۔

نازی جرمنی کی توسیع (Expansion of Nazi Germany)

ہٹلر کے عروج اور اس کے حصول اقتدار کی ہم نے جو کہانی بیان کی ہے اس میں ہم نے دیکھا کہ وہ جرمن کا چانسلر بھی بنا اور صدر بھی۔ پھر اس نے معاہدہ ورسیلز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عسکریت کی تجدید کا عمل شروع کر دیا۔

جرمن فوجی رین لینڈ(Rhineland) میں داخل ہوگئے جبکہ معاہدہ کی رو سے وہاں سے فوجوں کا انخلا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ معاہدہ کے تحت فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ مقرر کر دی گئی تھی لیکن وہاں 8 لاکھ فوجی داخل ہوئے چونکہ برطانیہ اور فرانس نے ہٹلر کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہ کی جس سے ہٹلر کو اپنی بحریہ اور ہوائی فوج بنانے کے لیے اعتماد اور بھی بڑھ گیا۔ وادی سار(Saar) بھی جرمن کے ساتھ متحد ہوگئی۔ 1936 میں ہٹلر اور مسولینی نے روم برلن محور(Rome-Berlin Axis) پر دستخط کیے اور 1937 میں انھوں نے جاپان کے ساتھ کمنٹرن مخالف معاہدہ (Anti-Comintern Pact) پر دستخط کیے۔

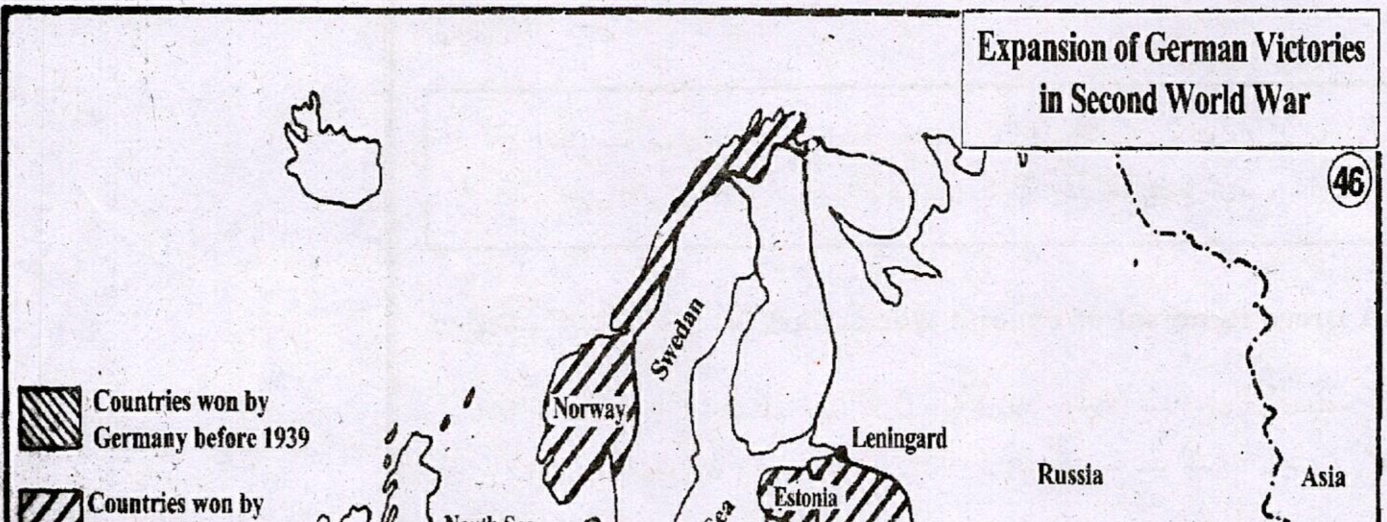

نقشہ24.3 : دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کی توسیع

نوٹ

ہٹلر کا دوسرا منصوبہ آسٹریا کا الحاق تھا۔ آسٹریا اور جرمن کا اتحاد یا آنس سلوس(Anschluss) 1938 میں مکمل ہوا۔ اس سال میونخ کی ایک کانفرنس میں برطانیہ اور فرانس نے میونخ معاہدہ پر دستخط کیے۔ اس معاہدہ کے ذریعے یہ ملک چیکوسلواکیہ میں سودے ٹین لینڈ(Sude tenland) پر جرمنی کے قبضے پر متفق ہوئے۔ ان مذاکرات میں چیکوسلواکیہ کے لوگوں کا کوئی کردار نہ تھا۔ جرمنی سودے ٹین لینڈ کو اس لیے حاصل کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس علاقے میں بہت بڑی جرمن آبادی تھی اور یہ کوئلہ، کیمکل اور لوہا اور فولاد انڈسٹریز کا مرکز تھا۔ چند مہینے کے بعد جرمنی نے پورے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کرلیا۔ میونخ معاہدہ مغربی طاقتوں کی خوشنودی پالیسی کا آخری قدم تھا۔

5 اکتوبر 1938 کے نیشنل ہیرلڈ(National Herald) میں شائع ایک مقالہ میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے لکھا تھا کہ برطانیہ اور فرانس کو میونخ معاہدہ پر دستخط کے لیے اپنے سر شرم سے جھکا لینے چاہئیں۔

دوسری جنگ عظیم کی ایک ڈریس ریہرسل(A Dress Rehersal of Second World War)

جرمنی اور اٹلی کی مشترکہ جارحیت کی پہلی مثال اسپین کی خانہ جنگی (39-1936) کے دوران نظر آتی ہے۔ تمام دنیا پر اس کے بہت گہرے نتائج مرتب ہوئے اور اس کو دوسری جنگ عظیم کے لیے ایک ڈریس ریہرسل سمجھا جاتا ہے۔

1936 میں اسپین میں پاپولر فرنٹ کی حکومت برسراقتدار آئی جس میں سوشلسٹ، کمیونسٹ اور دوسری فاشسٹ مخالف پارٹیاں شامل تھیں۔ انھوں نے جنرل فرانکو(Franco) کی قیادت میں ایک ڈیموکریٹک جمہوریہ(Republic) بنائی۔ فوج کے ایک حصے نے اس حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا۔ جرمنی اور اٹلی نے فرانکو کے آدمیوں کی حمایت کی اور جرمنی کے ہوائی جہازوں نے اسپین کے شہروں اور گاؤں پر حملے کیے۔ انھوں نے ملک کے بہت سے حصوں پر قبضہ کرلیا اور لوگوں کو اطاعت کرنے کے لیے خوفزدہ کیا۔

ریپبلکن حکومت نے مدد کی اپیل کی لیکن برطانیہ، فرانس اور امریکہ نے عدم مداخلت کی پالیسی کو اختیار کیا۔ تمام دنیا کے فاشسٹ مخالف لوگ ایک ساتھ آئے اور انھوں نے ریپبلکن لوگوں کے لیے لڑنے کے واسطے ایک بین الاقوامی بریگیڈ بنائی۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس ریپبلک کو ہندوستانی تحریک آزادی کی طرف سے حمایت پیش کرنے کے لیے اسپین گئے۔ اسپین کی خانہ جنگی اب صرف اسپین کا معاملہ ہی نہ تھی بلکہ اس میں فاشسٹوں سے ریپبلک کو بچانے کے لیے ہزاروں غیر اسپینی لوگوں نے اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ اسپین کی خانہ جنگی تین سال چلی۔ 1939 میں اسپین فاشسٹوں کے ہاتھوں میں چلا گیا اور نئی حکومت کو اکثر مغربی طاقتوں نے تسلیم کرلیا۔

پولینڈ کی جانب(Towards Poland)

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مغربی طاقتوں نے خوشنودی(Appeasement) کی جو پالیسی اپنائی اس نے فاشسٹوں کو مزید جارحیت کا حوصلہ دیا۔ سوویتوں نے ایک فاشسٹ مخالف اتحاد(Anti Fascist Alliance) کا مطالبہ کیا لیکن مغربی طاقتیں راضی نہیں ہوئیں۔ سوویت روس(USSR) نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اگست 1939 میں جرمنی کے ساتھ ایک عدم جارحیت(Non Aggression) کا معاہدہ کیا۔

اب ہٹلر نے اپنی توجہ پولینڈ کی جانب مبذول کی۔ ہٹلر ڈینزگ فری سٹی(Danzig Free City) اور پولش کو ریڈور دونوں ہی چاہتا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ کوریڈور(Corridor) مشرقی پروشیا کو باقی جرمنی سے جدا کرتا تھا۔ برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں نے یہ اعلان کر دیا کہ اگر جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کیا تو وہ جرمنی پر حملہ کر دیں گے۔ لیکن اب ہٹلر کو روکا نہیں جاسکتا تھا۔ یکم ستمبر 1939 کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ دو دن کے بعد برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی۔

متن پر مبنی سوالات 24.4

درج ذیل جملوں کو مکمل کیجیے۔

1۔ لیگ ________ کو روکنے میں ناکام رہی۔

2۔ 1931 میں جاپان نے ________ پر حملہ کر دیا۔

3۔ اٹلی نے ________ پر قبضہ کرنے کے لیے لیگ کی خلاف ورزی کی۔

4۔ جرمن کے فوجی ________ غیر فوجی علاقے میں داخل ہوگئے۔

5۔ میونخ معاہدہ جرمنی کو ________ پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔

6۔ ان شلوس(Anschluss) کا مطلب ہے ________ اور ________ کا اتحاد۔

7۔ اسپین میں پاپولر فرنٹ کی حکومت میں ________ شامل تھے۔

8۔ دوسری عالمی جنگ ________ پر حملے سے شروع ہوئی۔

9۔ کوم ان ٹرن مخالف معاہدہ(Anti Comimtern Pact) پر دستخط ________ کے درمیان ہوئے۔

10۔ خوشنودی کی پالیسی سے ________ کو حوصلہ ملا۔

نوٹ

24.5 دنیا جنگ کے دہانے پر (The World at War)

ہم نے ابھی پڑھا ہے کہ پولینڈ پر حملہ دوسری جنگ عظیم کی شروعات تھی۔ جرمن فوج نے مغرب سے پولینڈ کی سرحد کو پار کر لیا اور تین ہفتوں میں پولینڈ کی فتح کو مکمل کر لیا۔ اعلان جنگ کے بعد بھی پولینڈ کو کوئی مدد نہ پہنچی۔ سوویت روس کی لال فوج کو اپنے وہ علاقے واپس لینے کا موقع مل گیا جو اس سے قبل روسی سلطنت کا حصہ تھے۔ 1940 میں روسیوں نے استونیا، لاتویا اور لتھوانیا کی بالٹک ریاستوں کو واپس لے لیا اور فن لینڈ پر ایک معاہدہ تھوپ دیا۔ چونکہ ابتدائی چھ مہینوں میں عملی لڑائی بہت معمولی سی تھی اس لیے اس کو بے پیکار جنگ کی مدت (The Period of Pohony War) کہا جاتا ہے۔

9 اپریل 1940 کو جرمنی افواج نے ناروے اور ڈنمارک پر حملہ کر دیا اور ان پر قبضہ کر لیا اس کے بعد جن ملکوں کا سقوط ہوا وہ بیلجیم، ہالینڈ اور لکسمبرگ کے ناطرفدار ملک تھے۔ اس کے بعد ہی فرانس نے حملہ کیا۔ جرمنی افواج نے

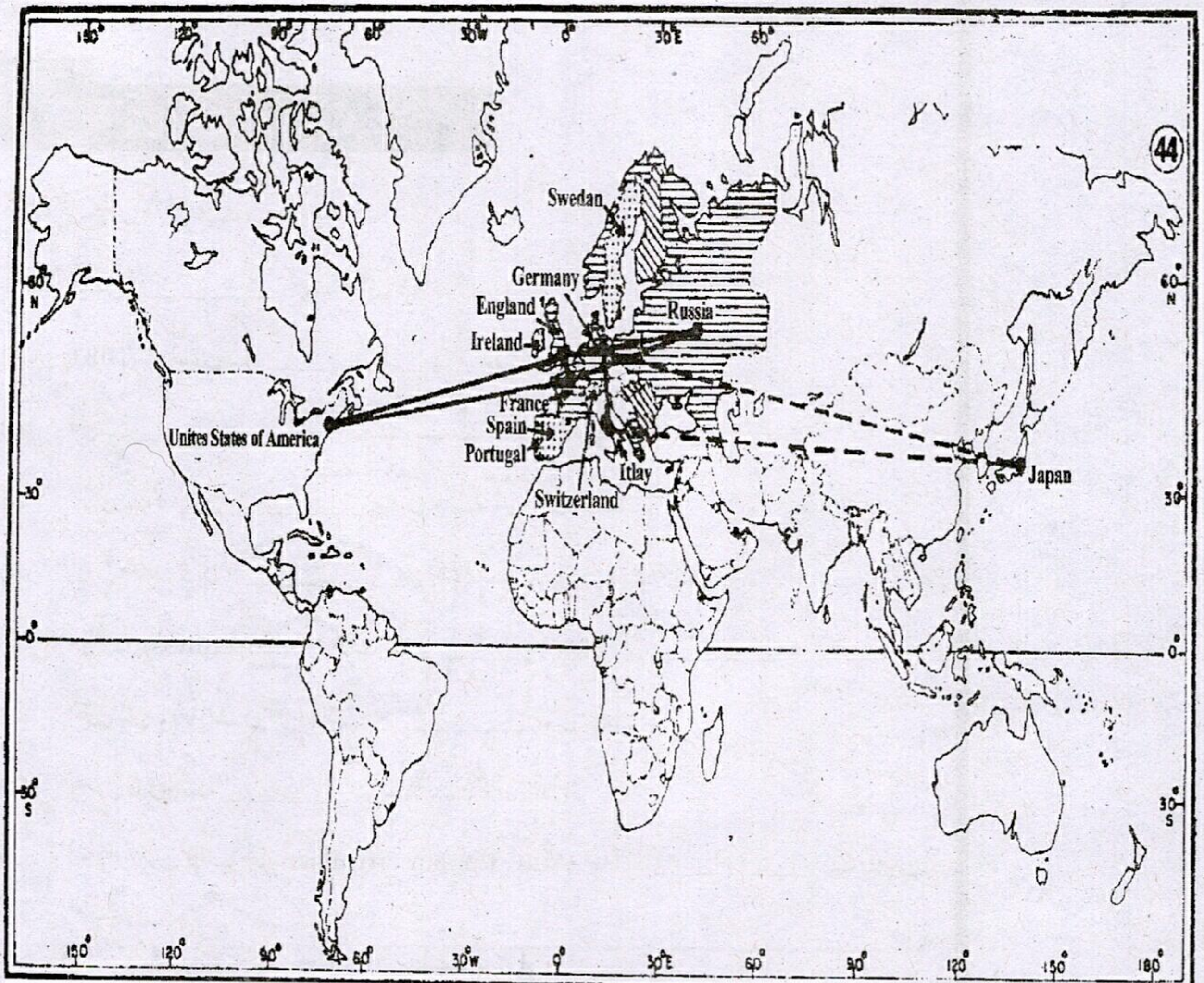

نقشہ 24.4 : دنیا جنگ کے دہانے پر

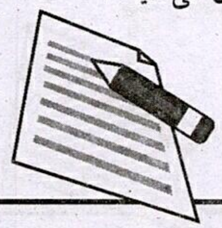

نوٹ

14 جون 1940 کو تقریباً بنا کسی لڑائی کے راجدھانی پیرس پر قبضہ کرلیا۔ فرانسیسی سرکار نے اطاعت قبول کرلی اور جرمنی نے آدھے شمالی فرانس پر قبضہ کرلیا۔ آدھا فرانس کے زیرنگیں رہا جسے وکی فرانس(Vicky France) کہا گیا۔ انھوں نے نازیوں کے ساتھ ہاتھ ملا لیے۔ ہٹلر نے یوروپی ملکوں پر جس تیزی سے قبضہ کیا اس کو ''برق وار جنگ'(Lighting war) کہا جاتا ہے۔

اسی دوران تقریباً ساڑھے تین لاکھ برطانوی اور فرانسیسی فوجی جنھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے ڈنکرک (Dunkrik) پہنچ گئے جو فرانس کے شمالی ساحل پر واقع ہے اور پھر یہاں سے انھوں نے برطانیہ کی طرف مارچ کیا۔ ان ہی میں چارلس بھی تھا جو فرانسیسی فوج میں ایک کرنل تھا۔ اس نے نازی جرمن سے لڑنے کے لیے برطانیہ میں ''فری فرانس'' تحریک شروع کی تھی۔

برطانیہ کے لیے لڑائی(The Battle for Britain)

تقریباً سارے مغربی یوروپ کی مکمل فتح کے ساتھ ہی ساتھ ہٹلر برطانیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ برطانیہ پر حملہ یا ''آپریشن سی لاین'' اسی وقت ممکن تھا جب جرمنی فوج انگلش چینل کو عبور کرتی۔ اس کا مطلب رایل ایرفورس اور رایل نیوی کو بے عمل کرایا جانا تھا۔

مذکورہ بالا تغیرات اور حالات ے دوران برطانیہ کی حکومت بھی بدلی۔ برطانوی وزیر اعظم چیمبرلین نے جنھوں نے میونخ معاہدے پر دستخط کیے تھے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور ایک اتحادی حکومت کے نئے وزیر اعظم کے طور پر ونسٹن چرچل نے چارج سنبھالا۔

اگست 1940 میں جرمن ایرفورس(Luftwaffe) نے برطانوی فضاؤں پر اپنی مہم شروع کی اور برطانوی شہروں اور بندرگاہوں پر ہوائی حملے کیے۔ رایل ایرفورس (RAF) نے اپنے اسپٹ فایروں (Spit fires) اور ہری کینوں (Hurricanes) کے ساتھ برطانوی بندرگاہوں اور شہروں پر حملے کا بچاؤ کیا۔ جرمنوں نے بڑے بڑے شہر خاص طور پر لندن پر رات میں حملے کیے۔ رایل ایرفورس اور لفت ویفے کے درمیان جو ہوائی لڑائیاں ہوئیں انھیں ڈاگ فائٹس(Dogfights) کہا جاتا ہے۔ چرچل کی پُرزور تقریروں نے لوگوں کا حوصلہ بلند رکھا اور برطانوی ایرفورس نے لفت ویفے(Luftwaffe) کو بہت نقصان پہنچایا۔

نومبر 1940 میں آپریشن سی لاین(Operation Sea-lion) کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔

> رایل ایرفورس کی تعریف میں چرچل نے کہا تھا ''اتنے بہت سے لوگ اتنے کم لوگوں کے رحم وکرم پر کبھی نہیں ہوئے ہوں گے۔''

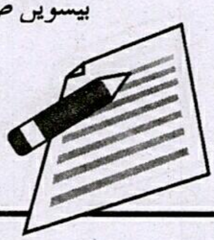

نوٹ

جنگ کا پھیلاؤ (The Expansion of War)

27 ستمبر 1940 میں جرمن، اٹلی اور جاپان نے برلن میں ایک سہ فریقی معاہدہ کیا جس میں انھوں نے کسی حملے کی صورت میں ایک دوسرے کے لیے مکمل حمایت کا عہد کیا۔ ان تینوں محوری طاقتوں نے یوروپ میں ایک نئے نظام کے قیام میں اٹلی اور جرمنی کی قیادت اور ایشیا میں اس طرح کی جاپانی قیادت پر اتفاق کیا۔ ہنگری، رومانیہ اور بلغاریہ جیسے دیگر ملک بھی اس معاہدہ میں شریک ہوگئے۔

اس دوران، جنگ یوروپ اور افریقہ کے دیگر ملک بھی اس معاہدہ میں شریک ہوگئے لیکن وہاں مقابلہ سخت ہوا۔ بہرحال جرمن فوجیں یونان یوگوسلاویہ اور شمالی افریقہ کے کچھ حصوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئیں۔ اٹلی اور برطانوی فوجوں کے درمیان افریقہ کے کچھ علاقوں کو لے کر جھڑپیں ہوئیں اور یہ کشمکش اگلے دو سال تک جاری رہی۔

جرمنی کا سوویت یونین کے خلاف ہونا

سوویت یونین پر حملہ کرنے کے ہٹلر کے ارادے کے ساتھ ہی جنگ کا ایک نیا باب کھل گیا۔ عدم جارحیت (Non Aggression) معاہدہ بھلا دیا گیا اور 22 جون 1941 کو بغیر کسی باقاعدہ اعلان جنگ کے ''آپریشن باربروسا'' (Operation Barborossa) شروع کر دیا گیا۔ جرمن فوج تیزی کے ساتھ تین اطراف لینن گراڈ، ماسکو اور کیف (Kiev) سے آگے بڑھی اور اس طرح روسی فوج دم بخود رہ گئی۔ مدد کے لیے سوویت اپیل کے مثبت نتیجے نکلے اور برطانیہ اور امریکہ نے حمایات کا اعلان کر دیا۔

ہٹلر کو امید تھی کہ جنگ موسم سرما کے آنے سے پہلے ختم ہو جائے گی۔ اکتوبر کے اوائل تک ماسکو کا محاصرہ باقی رہا لیکن اس کے بعد روس میں سردیوں کا زمانہ شروع ہوگیا اور ایک ہی مہینے میں درجۂ حرارت 40° تک گر گیا۔ اس سخت سردی کا مقابلہ نہ جرمن فوجی کر سکتے تھے اور نہ جرمنی کا جنگی سازوسامان۔ دسمبر میں روسیوں کا جوابی حملہ شروع ہوا اور جرمن فوجوں کو پسپا ہونا پڑا۔ ماسکو پر منڈلانے والا خطرہ ختم ہوگیا۔ آپریشن باربروسا ناکام ہوا لیکن جرمنی نے روس کی اگلی سردیوں کی مشکلات اور سوویت لال فوج کے بہادرانہ مقابلے کے بعد ہی مکمل ہار مانی۔

ایک عالمی جنگ (A Global War)

جنگ کی ابتدا سے ہی امریکہ برطانیہ کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا اور اول تو نقد اور پھر قرض اور لیز (Lease) کی بنیاد پر امریکہ نے اس کو ہتھیار خریدنے کے مواقع فراہم کیے۔ پھر نومبر 1941 میں اس قرارداد کی توسیع سوویت یونین تک کردی گئی۔ بہرصورت امریکہ جنگ میں براہِ راست شرکت کا مخالف تھا۔

بہرحال 7 دسمبر 1941 کو جاپان نے ہوائی (Hawaii) میں پرل (Pearl) کھاڑی میں امریکی بحری ٹھکانے پر حملہ کر دیا۔ اس کے نتیجے میں امریکہ کا پاسیفیک بیڑا برباد ہوگیا اور دو ہزار سپاہی کام آگئے۔ 8 دسمبر کو امریکہ نے جاپان

نوٹ

کے خلاف اور پھر چند روز کے بعد جرمن اور اٹلی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اب جنگ حقیقت میں عالمی بن گئی۔

پرل ہاربر کے بعد جاپانی تیزی کے ساتھ مشرق بعید کی طرف بڑھے اور 1942 کے وسط میں تھائی لینڈ، ملیشیا، سنگاپور، ہانگ کانگ، فلپین اور برما پر قبضہ کر لیا۔ فاشسٹ ملک اپنی طاقت کے عروج کو پہنچ چکے تھے۔

اسٹالن گراڈ کی لڑائی (The Battle of Stalingard)

1942 کی گرمیوں میں ہٹلر کی فوج نے سوویت یونین میں اپنا حملہ جاری رکھا۔ ہٹلر کو اس مرتبہ بھی فتح کی توقع تھی لیکن جرمن کی افواج کو اسٹالن گراڈ میں ہی روک دیا گیا۔ نومبر میں جرمن افواج اسٹالن گراڈ اور اس کے آس پاس تھیں لیکن سوویت سپاہ نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ جرمن افواج کی رسد منقطع ہوگئی۔ روس کی سردی نے بھاری جانی نقصان پہنچایا اور 31 جنوری 1943 میں جرمن فوج بکھر گئی۔ اس لڑائی میں جرمن اور اس کے اتحادیوں کے تقریباً ڈھائی لاکھ آدمی ضائع ہوئے اور یہیں سے جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔ مرنے والوں اور زخمی ہونے والوں کی تعداد کے لحاظ سے سوویت یونین کو بڑے بھاری نقصانات اٹھانے پڑے۔

انجام کی شروعات (The Beginning of the End)

اسی دوران شمالی افریقہ کا جنگی ماحول جنرل منٹگمری کی زیرِ قیادت مغربی ہشتم فوج اور جنرل رومیل (General Rommel) کی زیرِ قیادت افریقہ کورپس (Afrika Korps) کے درمیان ایک میدان کارزار میں بدل گیا۔ جنرل رومیل کو ہٹلر نے اٹالین فوجیوں کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔ اگست 1942 میں رومیل نے مصر کی طرف آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اکتوبر 1943 میں مصر کے شمالی ساحل پر العالمین کے مقام پر ایک فیصلہ کن لڑائی لڑی گئی۔ لیکن نتیجے کے طور پر رومیل کو پسپا ہونا پڑا۔

1943 کے موسم گرما میں اتحادیوں نے شمالی افریقہ پر قبضہ کر لیا اور جولائی میں انھوں نے سسلی پر حملہ کیا۔ سولنی کی حکومت پلٹ گئی اور اٹلی نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ جرمن افواج نے فوراً ہی شمالی اٹلی میں پیش قدمی کی اور مسولینی کو بچا لیا جس نے جرمنی کے زیرِ تحفظ حکومت قائم کی۔

مغربی یوروپ کے بیشتر ملک جیسے پولین، رومانیہ، بلغاریہ، چیکوسلواکیہ اور ہنگری آزاد ہو گئے تھے۔ یونان، یوگوسلاویہ اور البانیہ سے بھی فاشسٹ نکال دیے گئے تھے۔

جون 1944 میں اتحادیوں نے مغربی یوروپ میں دوسرا محاذ کھول دیا۔ 6 جون کو D-Day کو پہلی اتحادی فوج فرانس کے شمالی ساحل نارمنڈی (Normandy) کی بیچوں پر اتری ان فوجوں کی یہاں آمد کو مکمل طور سے راز رکھا گیا تھا اور اس طرح انھوں نے جرمن کو حیرت زدہ کر دیا۔ جنرل ایزن ہاور (Eisenhower) کی کمان میں انھوں نے جرمن ی دفاعی لائن کو توڑ دیا اور شہر میں بروسیلز، پیرس اور لیکزمبرگ (Luxemburg) کو آزاد کرا لیا۔

نوٹ

فاشسٹ قوتوں کا زوال (Surrender by the Fascist Powers)

1945 کے موسم بہار میں جنگ کے خاتمے کے آثار نظر آنے لگے۔ اتحادی افواج نے اٹلی کے بہت سے شہروں پر قبضہ کرلیا۔ اپریل کے مہینے میں فاشسٹوں کے مقبوضہ علاقوں میں شورش ہوئی۔ 28 اپریل کو مسولینی پکڑا گیا اور اس کو مار دیا گیا اور اس طرح اٹلی میں فاشزم کا خاتمہ ہوگیا۔

اب جرمن کا زوال بھی یقینی تھا۔ اتحادی فوجیں جرمن میں تین اطراف یعنی شمال، شمال مغرب اور مشرق سے داخل ہوئیں اور جب سوویت فوج برلن پہنچ گئی تو ہٹلر نے خودکشی کرلی۔ 7 مئی کو جرمن نے قطعی طور پر ہتھیار ڈال دیے۔

جاپان کا زوال (The Fall of Japan)

ایشیا اور بحرالکاہل میں جرمن کے ہتھیار ڈالنے کے بعد بھی جنگ جاری رہی۔ پیسفک اور مشرق بعید میں امریکیوں اور برطانیہ کی فتح مندیوں کے باوجود جاپان ڈٹا رہا۔ 6 اگست 1945 کو امریکہ نے پہلا ایٹم بم جاپان کے شہر ہیروشیما پر ڈالا۔ اس سے پچاس ہزار لوگ مر گئے اور شہر کے بڑے حصے مسمار ہوگئے۔ دو دن کے بعد دوسرے بم نے ناگاساکی شہر کو تہس نہس کردیا اور جاپان کو ہتھیار ڈالنے کے لیے مجبور کردیا۔

دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ ہوگیا۔ اس جنگ میں پچاس سے زیادہ ممالک ملوث ہوئے۔ دنیا میں امن کی برقراری کے لیے ایک دوسری تنظیم اقوام متحدہ (The United Nations Organizations) قائم کی گئی لیکن دو بڑی طاقتوں یعنی امریکہ اور روس نے دنیا کو طاقت کے دو بڑے بلاکوں میں تقسیم کرکرنے کی کوشش کی اور اس طرح ایک سرد جنگ شروع کردی۔ ہم اگلے باب میں اس کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔

متن پر مبنی سوالات 24.5

A. درج ذیل کے صحیح جوڑے ملائیے:

1۔ فری فرانس مومینٹ	آپریشن باربروسا
2۔ جنگ برطانیہ	ونسٹن چرل
3۔ سوویت یونین (USSR) کا حملہ	آپریشن سی لاین
4۔ برطانوی وزیر اعظم	نارمنڈی (Normandy)
5۔ دوسرا محاذ	اسپٹ فایر اور ہری کین
6۔ برطانوی ہوائی جہاز	چارلس ڈی گال

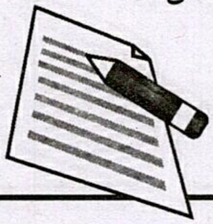

نوٹ

B. درج ذیل کو مکمل کیجیے :

1۔ دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی __________

2۔ آپریشن سی-لاین بھی اسی وقت ممکن تھا __________

3۔ پرل ہاربر(Pearl Harbor) پر حملے کے نتیجے میں __________

4۔ آپریشن باربروسا اس لیے ناکام ہوا کیونکہ __________

5۔ اسٹالن گراڈ کی لڑائی سے __________

6۔ ایشیا اور بحرالکاحل میں جنگ ختم ہوئی __________

آپ نے کیا سیکھا

1۔ پہلی جنگ عظیم امن معاہدوں پر دستخط نے اور لیگ آف نیشن کی تخلیق کے ساتھ ہی ختم ہوئی۔ یہ لیگ دنیا کو جنگ سے بچانے کے لیے بنائی گئی تھی۔

2۔ ان معاہدوں نے یوروپ کا نقشہ بدل دیا۔ روس، پروشیا اور آسٹریا، ہنگری جیسی بڑی سلطنتیں ٹوٹ گئیں اور کئی چھوٹی قومی ریاستیں(Nation States) ان کی جگہ وجود میں آگئیں۔

3۔ روسی انقلاب کے نتیجے میں سوشلسٹ نظریات کا پھیلاؤ ہوا اور تقریباً تمام یوروپی ملکوں میں سوشلسٹ پارٹیوں کا عروج ہوا۔

4۔ اکثر یوروپی ملکوں کے لیے زمانہ مابعد جنگ معاشی مشکلات سے بھرا تھا اور ان ملکوں کی حکومتوں نے اپنے ملکوں میں ایسے انقلابات کے وقوع کو روکنے کے لیے بہت سے قدم اٹھائے۔

5۔ اٹلی اور جرمنی میں حکمراں پارٹیوں نے فاشسٹ تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی اور اس کے نتیجے میں طاقتور ڈکٹیٹروں(Dictator) جیسے اٹلی میں مسولینی اور جرمن میں ہٹلر کا ظہور ہوا۔ فاشسٹ لیڈروں نے سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو بے رحمی سے دبایا۔ یہ توسیع اور جنگ میں یقین رکھتے تھے۔ جاپان نے جرمنی اور اٹلی کے ساتھ اتحاد کیا اور تین محوری طاقتوں نے 1937 میں کم ان ٹری مخالف معاہدہ (Anti Comintery Pact) پر دستخط کیے۔

6۔ جب فاشسٹوں کی جارحیت شروع ہوئی تو مغربی طاقتوں نے خوش کرنے کی پالیسی (Appeasement Policy) کو اختیار کیا۔ ان کا یقین تھا کہ یہ جارحیت سوویت روس کے خلاف رخ اختیار کرلے گی۔ لیکن ہٹلر کے منصوبے دوسرے تھے اور پھر جلدی ہی جنگ یوروپ میں پھیل گئی۔

7۔ دوسری عالمی جنگ (45-1939) زیادہ تباہی اور بربادی لے کر آئی اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب جاپان کے ہیروشیما اور ناگاسا کی شہروں پر ایٹم بم گرائے گئے۔

اختتامی سوالات

1۔ معاہدہ ورسیلز کی شرائط کیا تھیں؟ کیا اس نے ایک اور جنگ کی تخم ریزی کو روکا؟

2۔ اٹلی میں مسولینی کے اقتدار میں آنے کا حال لکھیے۔ اس نے مخالفوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

3۔ نازی پالیسیوں کے مقاصد کیا تھے؟ ہٹلر نے ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے کس طرح جدوجہد کی؟ کیا اس کے طور طریقے صحیح تھے؟

4۔ 1930 کی دہائی میں مغربی طاقتوں نے خوشنودی کی پالیسی (Appeasement Policy) کیوں اپنائی؟ فاشسٹوں پر اس کا کیا اثر پڑا؟

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

24.1

A. 1۔ تحکمانہ صلح (Dictated Peace)

2۔ اتحادی مداخلت

3۔ رسمی قرارداد (Convenant)

4۔ تفویض شدہ علاقے (Mandates)

5۔ بالٹک سمندر میں نکاس

B. 1۔ بین الاقوامی تعاون، امن اور تحفظ کا فروغ

2۔ امن، آزادی، جمہوریت اور حق خود ارادیت کا عہد

3۔ جرمنی کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط

4۔ استونیا، لاتوریا اور لتھوانیا

5۔ آسٹریا، پروشیا اور روس

24.2

A. 1- غلط

2- غلط

3- صحیح

4- غلط

5- غلط

B. 1- بلیک شرٹس

2- Mein Kampf (میری جدوجہد)

3- ڈیموکریسی، سوشلزم

4- مارچ، روم

5- منچوریا، چین

24.3

A. 1- ریاست ہائے متحدہ امریکہ

2- کلک(Kulaks)

3- سوویت یونین(USSR)

4- کوآپریٹو فارم

5- عظیم کساد بازاری

B. 1- صحیح

2- صحیح

3- غلط

4- صحیح

5- صحیح

نوٹ

24.4

1۔ جارحیت

2۔ منچوریا

3۔ ایتھوپیا

4۔ رائن لینڈ(Rhineland)

5۔ سودے ٹین لینڈ(Sudetenland)

6۔ آسٹریا- جرمنی

7۔ سوشلس، کمیونسٹ اور فاشسٹ مخالف

9۔ پولینڈ

9۔ جرمن، اٹلی اور جاپان

10۔ فاشسٹ

24.5

A. 1۔ چارلس ڈی گال

2۔ آپریشن سی-لاین

3۔ آپریشن بار باروسا

4۔ ونسٹن چرچل

5۔ نارمنڈی

6۔ اسپٹ فاریس اور ہری کینس

B. 1۔ پولینڈ پر حملہ

2۔ جرمنی فوج نے انگلش چینل کو عبور کرلیا

3۔ جنگ میں امریکہ کی شرکت

4۔ جرمنی لوگ روسی موسم سرما کو برداشت نہ کر سکے

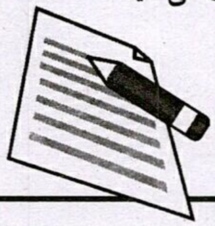

نوٹ

5۔ جنگ کا نقشہ بدل گیا

6۔ جنگ ہیروشیما اور ناگاسا کی پر ایٹم بم کا گرانا

اختتامی سوالوں کے لیے اشارے

1۔ 24.1 پیرا 2، 3

2۔ 24.2 پیرا 3، 4

3۔ 24.2 پیرا 7-9

4۔ 24.4 پیرا 1

فرہنگ

الحاق(Annexed) : کسی دوسرے ملک کے علاقوں کو اپنے ملک کے علاقوں میں شامل کر لینا۔

کم ان ٹرن(Comintern) : کمیونسٹ پارٹی کے ملکوں کے ذریعے قائم کردہ کمیونسٹ انٹرنیشنل۔ اس میں ساری دنیا کی کمیونسٹ پارٹیوں کے ممبر شریک تھے اور اس کا مقصد تمام دنیا میں انقلابات لانے تھے۔

فصیح و بلیغ تقریر (Eloquent Speech) : رواں، پرزور، موثر اور ہمنوا بنا لینے والی تقریری

ہولوکاسٹ(Holocaust) : دوسری عالمی جنگ میں اور اس کے بعد نازیوں کے ذریعے 60 لاکھ سے زائد یوروپی یہودیوں کا منظم قتل

سامراجیت(Imperialism) : نوآبادیوں یا آزاد علاقوں کو حاصل کر لیے اور ان پر حکومت کرنے کی پالیسی مثلاً ہندوستان برطانوی سامراج کی نوآبادی تھی۔

جارحانہ قوم پرستی (National Chauvimism) : غیر معقول یا جارحانہ حب وطن، اپنی قوم سے زیادہ وفاداری۔

سوشلزم(Socialism) : ایک سیاسی اور معاشی نظام جس میں ریاست ذرائع پیداوار پر کنٹرول رکھتی ہے اور جس میں دولت کی منصفانہ تقسیم ہوتی ہے۔

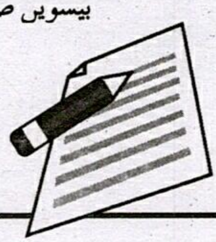

کلیت پسند حکومت (Totalitarian Regime) : ایک ایسا نظام جس میں حکومت میں ایک ہی پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ ہوتی ہے۔ ریاست سب سے زیادہ طاقت رکھی ہے اور فرد ریاست کا تابعدار ہوتا ہے۔

تاریخی واقعات ایک نظر میں (1919-1945)

28 اپریل 1919	—	لیگ آف نیشنز کا قیام
28 جون 1919	—	معائدہ ورسیلز پر دستخط ہوئے
29 جولائی 1921	—	ہٹلر نازی پارٹی کا لیڈر بنا
29-28 اکتوبر 1922	—	روم کی طرف مارچ، مسولینی نے حکومت بنائی
29 اکتوبر 1922	—	ریاست ہائے متحدہ کی اسٹاک مارکیٹ میں زبردست گراوٹ
30 جنوری 1933	—	ہٹلر جرمن کا چانسلر بنا
2 اگست 1934	—	ہٹلر صدر بھی بنا
7 مارچ 1936	—	جرمن فوجوں نے رائن لینڈ (Rhimeland) پر قبضہ کرلیا
9 مئی 1936	—	مسولینی کی اطالوی (Italian) افواج نے ایتھوپیا پر قبضہ کیا
18 جولائی 1936	—	اسپین میں خانہ جنگی (Civilwar) شروع
12 مارچ 1938	—	انشلوس (Anschluss) نازیوں نے آسٹریا پر قبضہ کیا
30 ستمبر 1938	—	میونخ معاہدہ پر دستخط ہوئے
23 اگست 1939	—	نازی سوویت معاہدہ پر دستخط ہوئے
یکم ستمبر 1939	—	نازیوں کا پولینڈ پر حملہ
3 ستمبر 1939	—	جرمنی کے خلاف برطانیہ اور فرانس نے جنگ کا اعلان کیا
اپریل-مئی 1940	—	نازیوں نے ناروے، ڈینمارک، بیلجیم، ہالینڈ، لکثرمبرگ اور فرانس پر حملہ کیا
10 جولائی 1940	—	برطانیہ کی جنگ شروع
13 ستمبر 1940	—	اٹلی نے مصر پر حملہ کیا
12 اکتوبر 1940	—	آپریشن سی-لاین ملتوی ہوا
22 جون 1941	—	آپریشن باربروسا شروع ہوا
5 دسمبر 1941	—	ماسکو پر جرمنوں کا حملہ چھوڑ دیا گیا

7-8 دسمبر 1941	—	جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا، امریکہ جنگ میں کودا، اسٹالن گراڈ کی جنگ شروع
2 فروری 1943	—	جرمن نے اسٹالن گراڈ میں ہتھیار ڈالے۔ سوویت فوجیوں نے جرمن فوج کو پیچھے دھکیلا
25 جولائی 1943	—	مسولینی گرفتار ہوا، اٹلی کی فاشسٹ حکومت کا زوال
6 جون 1944	—	دوسرا محاذ، اتحادی افواج کا نارمنڈی میں داخلہ
16 اپریل 1945	—	برلن پر سوویت کا آخری حملہ
28 اپریل 1945	—	ہٹلر نے خودکشی کی
7 مئی 1945	—	جرمن نے ہتھیار ڈالے
6، 9 اگست 1945	—	ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بم گرائے گئے
2 ستمبر 1945	—	جاپان نے ہتھیار ڈالنے کے معاہدہ پر دستخط کیے

25

سرد جنگ کا زمانہ اور اس کی سیاست

(The Cold War Era and Its Politics)

دوسری عالمی جنگ کے بعد، جنگ کے اتحادی یعنی ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت روس سرد جنگ میں پھنس گئے۔ یہ دونوں ہی ملک جنگ کے دوران فاشسٹ ڈکٹیٹروں (جرمنی اور اٹلی) اور جاپان کی سلطنت کو شکست دینے کے لیے برطانیہ اور فرانس کے اتحادی اور طرفدار تھے۔ دونوں ہی ملکوں نے 1941 میں ایک پانچ سالہ عدم جارحیت معاہدہ (Non-Aggression Treaty) پر دستخط کیے تھے اور فروری 1945 کی یالٹا کانفرنس (Yalta Conference) تک بھی دونوں ملکوں کے درمیان کچھ نہ کچھ ہم آہنگی موجود تھی لیکن جلدی ہی یہ صورت حال مکمل طور سے دگرگوں ہوگئی اور امریکہ و روس ایک جنگ جیسی صورت حال میں ایک دوسرے کے بالمقابل ہوگئے۔ اس جنگ جیسی صورت حال کو ہی سرد جنگ کہا جاتا ہے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ:

- سرد جنگ کے معنی بیان کرسکیں گے؛
- سرد جنگ کے لیے ذمہ دار عوامل کی نشاندہی کرسکیں گے؛
- اس کشمکش کے مختلف امور کی نشاندہی کرسکیں گے؛
- سرد جنگ کے مرحلوں کو بیان کرسکیں گے؛
- اور سرد جنگ کا موازنہ نئی سرد جنگ سے کرسکیں گے؛

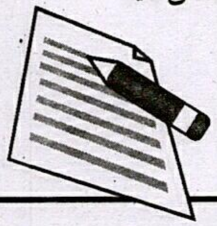

نوٹ

25.1 سرد جنگ کے معنی (The Meaning of Cold War)

سرد جنگ کو نئی بڑی طاقتوں (New Superpowers) کے درمیان ''زمانہ امن کی غیر مسلح جنگ و جدل'' (Peace time unarmed warfare) کہا جاتا ہے۔ یہ بڑی طاقتوں کے درمیان ایک سیاسی جنگ تھی نہ کہ کوئی مسلح محاذ آرائی، یہ کشمکش، یہ نظریاتی نفرت اور سیاسی عدم اعتماد پر مبنی تھی۔ فلیمنگ (Flemming) نے اس کو ''ایک ایسی جنگ کہا ہے جو میدان جنگ میں نہیں لڑی گئی بلکہ لوگوں کے دماغوں میں لڑی گئی۔ اس میں ایک طاقت دوسروں کے دماغوں پر کنٹرول کرنے کے لیے کوشاں ہوتی ہے۔'' سرد جنگ ایک کھلی جنگ (Open War) سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ کھلی جنگ میں دشمن جانے پہچانے ہوتے ہیں اور جنگ بھی کھلے میں لڑی جاتی ہے۔ سرد جنگ میں اعلانِ جنگ کبھی نہیں ہوتا اور ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات (Diplomatic Relations) بھی برقرار رہتے ہیں۔ سرد جنگ میں کچھ فوجی مقابلہ آرائی (Military confrontation) اور جانی نقصان بھی ہوتا ہے بلکہ یہ ایک نفسیاتی جنگ و جدل ہے جس کا مقصد دشمن کے دائرہ اثر کو کم کرنا اور اپنے خیمہ کے حامیوں کی تعداد کو بڑھانا ہوتا ہے۔

سرد جنگ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت روس کے درمیان ایک دوقطبی (Bipolar) کشمکش تھی لیکن اس میں دونوں بڑی طاقتوں کے حمایتی یا طرفدار بھی ملوث ہو گئے تھے۔ سرد جنگ کو دو نظریوں اور دو مختلف معاشی نظاموں کے درمیان جنگ کہا جاسکتا ہے یا یوں کہیے کہ یہ سوسائٹی کمیونزم اور لبرل ڈموکریسی یا سوشلسٹ طرز معشیت اور سرمایہ دارانہ طرز معیشت کے درمیان جنگ تھی۔ اگرچہ تاریخ میں بہت سی دوقطبی محاذ آرائیاں ہوئی ہیں لیکن ایسا پہلی بار ہوا کہ سماجی تنظیموں کی دو مختلف شکلوں کے درمیان دنیا کے لیے متبادل نظریات کی عملداری کے لیے ٹکراؤ ہوا ہو۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی سوویت یونین اور امریکہ بڑی طاقتوں کے روپ میں ابھرنے لگے تھے۔ 1932 میں عظیم بحران (Great depression) کے فوراً بعد مینوفیکچرنگ میں مختلف ملکوں کے حصوں کا موازنہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ امریکہ کا حصہ تقریباً 32 فیصد اور اس کے بعد سوویت روس کا حصہ 11.5 فیصد تھا لیکن دیگر ممتاز ممالک اس میں بہت پیچھے تھے مثلاً برطانیہ (10.9 فیصد)، جرمنی (10.6 فیصد) اور فرانس (6.9 فیصد)۔ بہرحال دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی اور جاپان کی مسلح طاقت کو شکست ہوگئی لیکن برطانیہ و فرانس کی مسلح طاقت کی کوئی زبردست نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ اب صرف دو ملک یعنی امریکہ اور سوویت یونین باقی بچے جو بڑی طاقتوں یا سپر پاور کی شکل میں ابھرے۔ جنگ میں غیر معمولی نقصانات کے باوجود بھی سوویت یونین نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور اس کا سبب سوشلسٹ معیشت تھی۔ ان دونوں ملکوں کی غیر معمولی ترقی کے نتیجے میں ان کے درمیان ایک مسابقت یا مقابلہ آرائی شروع ہوگئی جس کا انجام سرد جنگ کی شکل میں نکلا۔

سوویت یونین نے ''کمیونسٹ انفارمیشن بیورو'' (Communist Information Bureau) اور ریڈیو ماسکو قائم کیا اور دیگر ملکوں میں کچھ کمیونسٹ پارٹیوں کی حمایت کی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ریڈیو نیوز پروگرام شروع کیا جسے وائس آف امریکہ کہا جاتا تھا اور اس طرح اس نے دیگر ملکوں میں کمیونسٹ مخالف پارٹیوں اور تنظیموں کی حمایت اور طرفداری شروع کردی۔

ان دونوں ملکوں کے درمیان محاذ آرائی ان دو مختلف نظریوں کا تصادم بن گئی جو ان دونوں ملکوں نے اپنا رکھے تھے۔ ایک نظریہ سیاسی اور معاشی لبرلزم(Liberalism) کا تھا جسے امریکہ نے اختیار کیا تھا تو دوسرا نظریہ مارکسزم لینن ازم کا تھا جسے سوویت یونین نے اپنایا تھا۔

متن پر مبنی سوالات 25.1

1۔ سرد جنگ میں کن دو نظریوں کا تصادم تھا؟

____

2۔ امریکہ اور سوویت یونین نے کون کون سی نیوز سروسیز شروع کیں؟

____

25.2 سرد جنگ کے لیے ذمہ دار عوامل (Factors Responsible for the Cold War)

دوسری عالمی جنگ کے بعد نئی بڑی طاقتوں یعنی روس و امریکہ نے اپنی پوزیشن اور اپنے نظریے کی برتری قائم کرنے کی کوشش کی اور یہ ٹکراؤ (Conflict) بین الاقوامی تعلقات کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ اس طرح دو مخالف دھڑوں یا بلاکوں کی تشکیل ہوگئی جس سے دونوں بڑی طاقتوں کی رقابت میں اور زیادہ شدت پیدا ہوئی۔ بیشتر مغربی ممالک امریکہ کی طرفداری اور کمیونزم کی سخت مخالفت کرنے لگے۔ نیوکلیر ہتھیاروں کا مالک بن جانے سے امریکہ کی بڑی طاقت کی حیثیت مزید پکی ہوگئی لیکن دوسری طرف سوویت روس بھی ایک حریف اور ٹکر دینے والی طاقت کے روپ میں سامنے آگیا اور اس نے 1949 میں نیوکلیر ہتھیار تیار کر لیے اور امریکی برتری کا خاتمہ کر دیا۔

ایک طویل عرصہ تک سوویت یونین اور مغربی ممالک کے بیچ شکوک وشبہات اور عدم اعتماد کی فضا قائم رہی اور سوویت یونین کبھی اس بات کو نہ بھلا سکا کہ مغربی ریاستیں (برطانیہ، فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ) نے بالشیوک انقلاب کو ناکام کرنے کی کوشش کی تھی اور (جاپان کے ساتھ مل کر) خانہ جنگی میں دخل اندازی کی تھی۔ ادھر مغربی ممالک بھی نہ بھول سکے کہ سوویت یونین کا علانیہ مقصد دنیا بھر میں سرمایہ داری کا خاتمہ کرنا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران باہمی شک کی یہ فضا اور بھی مکدر ہوگئی۔ 1941 میں سوویت روس پر جرمنی کے محلے کے بعد مغربی جمہوریتوں نے جرمنی کے خلاف مزید دوسرے محاذ کے کھولنے میں تاخیر کی۔ برطانیہ اور امریکہ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسا کریں گے لیکن تاخیر سے سوویت روس کے اس شک کی تائید ہوگئی کہ مغرب، جرمنی اور روس کے درمیان ایک لمبی کشمکش کے چلتے رہنے کا خواہش مند ہے اور اس طرح یہ امر دونوں ہی کا خاتمہ کر دے گا۔

جنگ کے دوران طرفین نے محوری طاقتوں (جرمنی، اٹلی اور کچھ دیگر چھوٹی ریاستوں) سے آزاد شدہ ملکوں میں مخالف عناصر کو اکسانے کی کوششیں کیں۔ اٹلی میں فاشسٹ ڈکٹیٹر مسولینی کے اقتدار سے ہٹائے جانے کے بعد مغربی طاقتوں نے اٹلی کی حمایت کی اور اٹلی کو 'تعمیر نو کے لیے امداد' حاصل ہوگئی (اٹلی کو روپے پیسے کی جو امداد حاصل ہوئی وہ لاکھوں کروڑوں امریکی ڈالر کے برابر تھی)۔ سوویت روس سے باہر کمیونسٹ پارٹی اٹلی میں چونکہ سب سے بڑی تھی اس لیے سوویت لیڈروں نے اس امداد کو سرمایہ دار کیمپ یا سرمایہ دار ملکوں کے بلاک کو مضبوط کرنے کی ایک کوشش سمجھا۔ یونان اور پولینڈ کے مسائل ایک ہی جیسے تھے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے یونان میں کمیونسٹ طاقتوں کو شکست دینے میں مدد کی۔

1945 کے بعد دونوں بڑی طاقتوں نے باہمی شک وشبہ کو کم کرنے کے لیے کچھ قدم اٹھائے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے جرمنی اور آسٹریا کے صرف مغربی علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے اتفاق رائے کیا اور پولینڈ، چیکوسلواکیہ اور دیگر مشرقی یوروپ کے ان علاقوں سے دور رہنے کا فیصلہ کیا جنھیں سوویت سرخ فوج نے آزاد کرایا تھا۔ سوویت یونین نے کمنٹرن (کمیونسٹ انفارمیشن بیورو) کو برخاست کردیا اور سرمایہ دار طاقتوں کو یونان پر کنٹرول کرنے دیا۔ 1952 میں سوویت یونین نے فن لینڈ کو خالی کردیا اور 1955 میں آسٹریا سے بھی اپنی فوج کو ہٹا لیا۔ یوروپ اور دیگر علاقوں کے بارے میں روس اور امریکہ کے درمیان اختلاف رائے باقی ہی رہا۔ سوویت یونین نازی جرمنی سے آزاد ہوئے مشرقی یوروپی ملکوں میں "دوستانہ" سرکاریں قائم کرنے کا خواہاں تھا "دوستانہ سرکاروں" سے سوویت روس کا مطلب ایسی کمیونسٹ حکومتوں سے تھا جن کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ متفق ہوتے۔ سوویت یونین نے ترکی میں بھی اپنی ایک قلمرو قائم کرنے کی کوشش کی اور اسی لیے اس نے ایران سے اپنی فوجوں کو واپس بلانے میں تاخیر بھی کی جبکہ مغربی ممالک کو یہ بات بہت بری لگی۔

سرد جنگ کے لے دونوں فریق ذمہ دار تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران دونوں ہی فریقوں کے درمیان عارضی جنگ بندی دونوں کے درمیان کشیدہ تعلقات میں بہتری لانے کی ایک کوشش تھی کیونکہ تعلقات میں کشیدگی جنگ سے پہلے بھی تھی اور جنگ کے بعد بھی برقرار رہی۔

متن پر مبنی سوالات 25.2

1۔ کون کون سے ملک محوری طاقت کا حصہ بنے؟

____

2۔ کون کون سے ملک اتحادیوں کی طاقت کا حصہ بنے؟

____

3۔ یوروپ کے کون کون سے حصے ریاست ہائے متحدہ اور سوویت یونین سے متاثر ہوئے؟

____

25.3 سرد جنگ کے مختلف مرحلے

سرد جنگ ہمیشہ غیر اعلانیہ نوعیت کی رہی اور اس کے علاوہ جو غیر اعلان شدہ حملے بھی ہوئے وہ طویل مدتی نوعیت کے تھے۔ ابتدائی مرحلے (47-1945) کے بعد جسے انگریزی میں(Ossification Phase) کہتے ہیں، سرد جنگ باقاعدگی سے شروع ہوگئی اور اس کا مرکزی نقطہ ایک مابعد جنگ یوروپی نظام کی تخلیق تھا۔ سرد جنگ شروع ہونے کا مطلب ہی یہ تھا کہ مختلف طاقتیں مسلسل طور پر ان اصولوں کا احترام کرنے میں ناکام رہیں جن پر انھوں نے دوران جنگ یالٹا(Yalta) اور پوٹس ڈم(Potsdam) کانفرنسوں میں اتفاق کیا تھا۔

پہلا مرحلہ(First Phase)

ابتدائی مرحلے میں پولینڈ کا معاملہ بہت نازک مسئلہ بن گیا۔ پولینڈ کے معاملے میں سارے ہی ملکوں کو خاص دلچسپی تھی۔ جب ہٹلر کی افواج نے ستمبر 1939 میں پولینڈ کی سرحد کو پار کیا تھا تو فرانس اور برطانیہ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کردیا تھا۔ روس کے لیے پولینڈ ایک تاریخی دشمن تھا۔ دوسری طرف پولینڈ کی سرزمین مغرب کی طرف سے روسی حملے کے لیے ایک روایتی راستے کی حیثیت رکھتی تھی۔ 1944 میں جب روسی کی افواج پولینڈ میں داخل ہوئیں تو انھوں نے رسمی طور پر اقتدار لبلن (Lublin) سرکار کو سونپ دیا جو قومی آزادی کی کمیونسٹ حامی کمیٹی تھی۔ پولینڈ کے مستقبل کے بارے میں اسٹالن، چرچل اور روزویلٹ کی یالٹا کانفرنس میں غور وخوض ہوا لیکن پولینڈ کی ٹھیک ٹھیک سرحد کے بارے میں کوئی اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ بالاخر پولینڈ سوویت کیمپ میں شامل ہوگیا۔ پولینڈ کا ایک سوویت ہمنوا بن جانا سرد جنگ کی شروعات میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

بلقان دوسرا متنازع اور حساس علاقہ تھا۔ برطانیہ اور سوویت یونین نے بلقان(Balkan) کے علاقے میں اپنے اپنے دائرہ اثر طے کر رکھے تھے۔ لیکن یونان کے علاوہ تمام ملکوں میں کمیونسٹ حکومتیں قائم تھی اور جب ایک مرتبہ کمیونسٹ حکومتیں قائم ہو جاتی تھی تو سوویت یونین ان کی علانیہ طور پر حمایت کرتا تھا۔ یونان کو چھوڑ کر جو برطانوی کنٹرول کے تحت تھا تمام مشرقی یوروپ کے ملک سوویت تسلط(Domination) کے تحت آچکے تھے۔ اس صورت حال کے بارے میں چرچل کا کہنا یہ تھا کہ یوروپ کے اوپر ایک آہنی پردہ(Iron Curtain) پڑا ہوا ہے۔ اس صورت حال کے نتیجے میں مشرق ومغرب اور روس وامریکہ کے درمیان رشتے انتہائی کشیدہ ہوگئے۔

اتحادی فوجوں کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کے بعد جرمنی چار زونوں (Zones) میں تقسیم ہوگیا۔ ان میں سے ایک زون سوویت یونین کے کنٹرول میں، دوسرا امریکہ، تیسرا برطانیہ اور چوتھا فرانس کے قبضے میں آیا۔ برلن جو جرمنی کی راجدھانی تھا، سوویت فوجوں کی عارضی نگرانی کے تحت آیا۔ فوجی قبضہ اس وقت تک کے لیے ایک عارضی انتظام تھا جب تک کہ امن معاہدہ(Peace Treaty) نافذ نہ ہوا۔ جرمنی کے ساتھ امن معاہدہ کو آخری شکل دینے کے لیے پوٹس ڈم کانفرنس بلائی گئی تھی۔ کچھ حساس امور کے بارے میں اتحادیوں کا ذہن صاف نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ کیا جرمنی کو غیر مسلح کیا جائے یا وہاں سے فوجوں کا انخلا کردیا جائے اور پھر اس کو تقسیم کردیا جائے۔ یا یہ کہ جرمن

انڈسٹری کو تعمیر نو کی کس حد تک اجازت دی جائے۔ سوویت یونین ایک ایسا جرمنی چاہتا تھا جو نادار و مفلس بھی ہو اور کمزور بھی تاکہ جرمنی کی طرف سے اس کے مفادات کے لیے کوئی خطرہ نہ رہے۔ سوویت یونین نے جرمنی سے تاوان جنگ کے طور پر 20 بلین امریکی ڈالر کا مطالبہ کیا لیکن مغربی اتحادی ان تجاویز پر رضامند نہ ہوئے۔ بعد میں برطانوی، امریکی اور فرانسیسی زونوں (Zones) کا ادغام (Merged) ہوگیا اور ایک وفاقی جرمنی جمہوریہ (مغربی جرمنی) وجود میں آگئی۔ نئی ریاست میں الیکشن کے بعد ایک مغرب نواز حکومت برسر اقتدار آئی۔ اس حکومت کو امریکہ سے بھاری مالی امداد ملنے لگی۔ پھر جلدی ہی سوویت مدد سے دوسرے زون کی بھی ایک ریاست بن گئی جسے ''جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک'' (مشرقی جرمنی) کہا گیا۔

مغربی اتحادی جرمنی میں مالی اصلاحات شروع کرنا چاہتے تھے۔ سوویت یونین ایسا نہیں چاہتا تھا اور اس نے اس کا جواب برلن ناکہ بندی (Berline Blockade) کی شکل میں دیا۔ سوویت یونین نے برلن اور مغربی زونوں (Zones) کے درمیان تمام ٹریفک پر چاہے وہ سڑک ہو، ٹریفک ہو، ریل ٹریفک ہو یا پھر ہوائی ٹریفک سب پر مکمل پابندی عائد کردی۔ یہ ناکہ بندی بروسلز پیکٹ (Brussels Pact) کے خلاف بھی تھی جو برطانیہ، فرانس اور بیلجیم کے درمیان باہمی معاہدۂ دفاع کی شکل میں مرتب کیا گیا تھا۔ اس معاہدہ کی رو سے جرمنی یا کسی دوسرے یوروپی ملک کے ذریعے کسی ممبر ملک پر حملے کی صورت میں یہ ممالک ایک دوسرے کی فوجی مدد کرتے۔ اگرچہ اس معاہدہ کے متن میں سوویت یونین کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن یہ تھا سوویت یونین ہی کے خلاف نہ کہ جرمنی کے۔

ایران میں بحران اس وقت شروع ہوا جب سوویت فوجیں مارچ 1946 تک واپس نہ ہوئیں۔ جنگ کے دوران سوویت یونین کو مغربی امداد کے لیے ایران عام راستہ تھا۔ ایران تیل کے معاملے میں بھی بہت امیر تھا۔ سوویت یونین کا مطالبہ یہ تھا کہ اس کو ایرانی تیل تک رعایتی رسائی (Privilaged Access) حاصل ہو۔ خود اس نے سوویت علاقوں میں ایرانی فوجوں کے داخلے کی بھی اجازت نہیں دی تھی۔ ایسے میں امریکہ نے اقوام متحدہ کو سلامتی کونسل پر یہ دباؤ بنایا کہ وہ سوویت فوجوں کو ایران چھوڑنے پر مجبور کرے۔

سوویت یونین ترکی میں یہ چاہتا تھا کہ آبنائے باسپورس (Bosporous Strait) کو بین الاقوامی بنا دیا جائے لیکن مغربی اتحادیوں نے اس کی مزاحمت کی۔ امریکہ اور سوویت یونین نے یونان میں حریف گروہوں کی سرپرستی کی۔ یونان کی قدامت پسند (Conservative) افواج نے امریکہ سے مدد چاہی۔

ان حالات میں امریکی صدر ٹرومین (Truman) نے ایک حکمت عملی تیار کی جسے ٹرومین اصول (Truman Doctorine) کہا جاتا ہے۔ ٹرومین اصول دبانے یا روکنے کی ایک پالیسی تھی یوں کہیے کہ یہ کمیونزم کو ان علاقوں تک محدود رکھنے یا روکنے کی پالیسی تھی جہاں اس کو پہلے ہی کامیابی حاصل تھی اور کمیونزم کو مزید آگے بڑھنے سے روکنا تھا۔ اس طرح امریکی خارجہ پالیسی علاحدگی پسندی (Isolationism) کے بجائے ایک مداخلت کار (Intervention) کی ہوگئی۔ اس مداخلت پسندی کا مقصد دنیا میں ہر جگہ کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنا تھا۔

نوٹ

مغربی یوروپ کے کچھ ملکوں میں بھی کمیونزم کو بہت عروج حاصل ہوا۔ یوروپ کے جنگ زدہ ملکوں کو امید تھی کہ جنگ کے بعد ان کی تقدیر سنور جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ یوروپ کی قومی معیشتیں اور صنعتیں جدوجہد میں مصروف تھیں اور ان ملکوں میں کمیونسٹ پارٹیوں کے ممبران کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان ہی حالات کے تحت امریکی وزیر خارجہ مارشل(Marshall) نے یوروپی معیشت کی تعمیر نو کے اپنے منصوبے کو آگے بڑھایا۔ اسی منصوبے کو مارشل پلان کہا جاتا ہے۔ اس منصوبے میں بیس سال کی مدت کے لیے یوروپ کو ایک بلین ڈالر سے زیادہ کی امریکی رقم منتقل کرنے کی تجویز تھی اور یہ امید کی جاتی تھی کہ اس عظیم مالی امداد سے یوروپ جنگی نقصانات کی تلافی

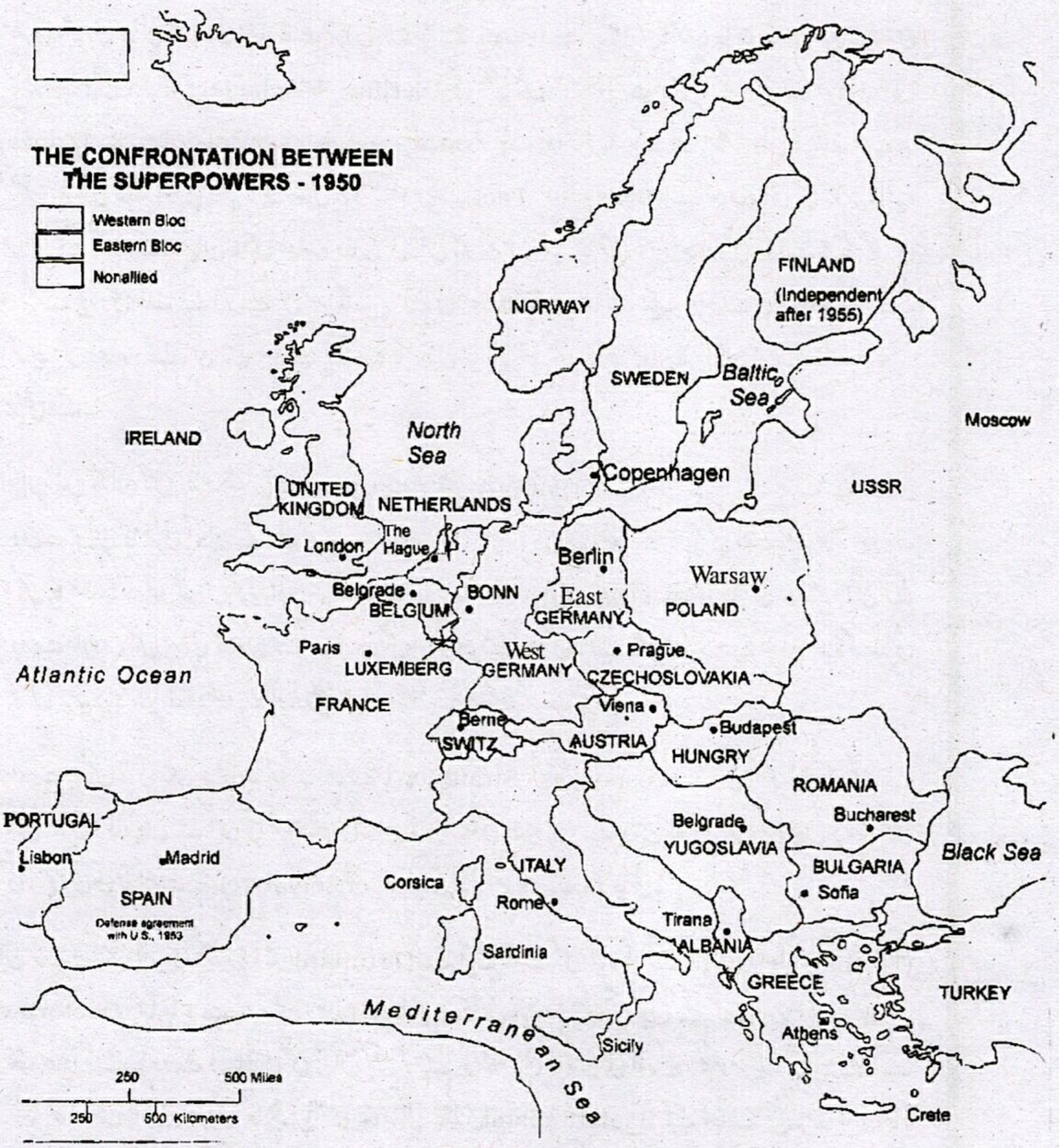

نقشہ 25 : بڑی طاقتوں کے درمیان محاذ آرائی–1950

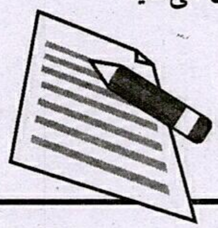

نوٹ

کر سکے گا اور اس طرح اپنے مادی حالات اور سیاسی ماحول کو مضبوط بنا سکے گا۔ یہ اس بات کا یقین تھا کہ ایک مضبوط یوروپ ہی بیرونی اور بدیسی کمیونسٹ چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ امداد کی یہ پیش کش مشرقی یوروپ کے ملکوں کے لیے بھی تھی۔

ٹرومین اصول اور مارشل پلان کے جواب میں سوویت یونین نے بھی کم ان فارن (کمیونسٹ انفارمیشن بیورو) کا احیا(Revival) کیا۔ سوویت دائرہ اثر میں کمیونسٹ حکومتوں کو ماسکو کی پالیسیوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس بیورو کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ اس طرح یہ مشرقی یوروپ میں کمیونزم کو مزید مستحکم کرنے کے لیے ایک کوشش تھی۔

4 اپریل 1949 میں نارتھ اٹلانٹک ٹری ٹریٹی آرگنائزیشن (NATO) پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدہ پر کمیونزم کو دبانے(Containment) کی پالیسی کی تکمیل کے طور پر دستخط ہوئے تھے۔ یہ معاہدہ امریکہ اور دیگر یوروپی ممالک برطانیہ، فرانس، بلجیم، کینیڈا، ڈینمارک، آئس لینڈ، اٹلی، نیدرلینڈ، لکسمبرگ، ناروے اور پرتگال کے درمیان تھا۔ یہ معاہدہ سوویت بلاک کے خلاف ایک فوجی اتحاد تھا۔ معاہدۂ ناٹو کی دفعہ کی ایک مرکزی شرط ہے جس کے مطابق کسی بھی ناٹو ممبر پر حملہ دیگر تمام ممبر ملکوں پر حملہ سمجھا جائے گا۔ البتہ اس فیصلے کا حق ممبر ملک کو ہے کہ وہ ممبر ملک کو کس قسم کی امداد کی پیش کش کرے گا۔ بعد میں یونان اور مغربی جرمنی بھی اس معاہدہ (ناٹو) میں شریک ہو گئے۔

چین اور کوریا میں 1945 کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے سرد جنگ میں اور شدت پیدا کر دی۔ چین میں کمیونسٹوں نے 1949 میں ماؤزے تنگ کی قیادت میں اقتدار پر قبضہ کر لیا اور وہاں عوامی جمہوریہ چین (Peoples Republic of China) قائم ہو گئی (دیکھیے اکائی 5.5.7)۔ امریکہ نے چین کی عوامی جمہوریہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لاس کے علاوہ اس کو اقوام متحدہ میں داخلہ نہ ملا۔ صرف تائیوان نے (قوم پرست چین) کو تسلیم کیا گیا۔ چین کو اقوام متحدہ سے باہر رکھنے کے لیے امریکہ نے اپنے ویٹو کے حق کا استعمال کیا اور اس لیے پھر سوویت یونین نے موثر طور پر اقوام متحدہ کا بائیکاٹ کیا۔ بہرحال اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سوویت یونین (USSR) اور عوامی جمہوریہ چین (PRC) کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ 1950 کے بعد تو ان دونوں کے تعلقات بد سے بدتر ہو گئے تھے۔

دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی شکست کے بعد کوریا پوٹس ڈم کانفرنس کی قرارداد کے مطابق شمالی کوریا (سوویت کنٹرول کے تحت) اور جنوبی کوریا (امریکی کنٹرول کے تحت) میں تقسیم ہو گیا۔ جنوبی کوریا کو براہِ راست امریکی حمایت حاصل تھی اور وہاں ایک ڈکٹیٹرشپ قائم ہو گئی۔ شمالی کوریا میں ایک سوویت نواز حکومت قائم ہو گئی۔ امریکہ یا سوویت یونین نے ان حکومتوں کو تسلیم نہیں کیا۔ جو ان کے خلاف تھیں۔ 1950 میں شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کیا۔ اقوام متحدہ نے (جس کی مستقل سلامتی کونسل پر سرمایہ دار ریاستوں کا غلبہ تھا) شمالی کوریا کو حملہ آور قرار دیا اور شمالی کوریا نے حملے کا جواب دینے کے لیے اقوام متحدہ کی ایک مشترکہ کمان قائم کر دی۔ امریکہ کے جنرل میک ارتھر اس مشترکہ کمان کے کمانڈر نامزد کیے گئے۔ اقوام متحدہ کی فوجوں نے شمالی کوریا کی فوجوں کو جنوبی کوریا سے نکال باہر

نوٹ

کیا اور پھر وہ دور تک شمالی کوریا کے علاقوں میں چلی گئیں اور چینی سرحد تک پہنچ گئیں۔ تب اقوام متحدہ کی فوجوں کو جنوبی کوریا میں دھکیلنے کے لیے چین شمالی کوریا کی افواج کے ساتھ مل گیا۔ بالآخر 1953 میں دوبدو جنگ سے بچنے کے لیے التوائے جنگ کے ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ کوریا کا بحران سرد جنگ کی پہلی فوجی کشمکش تھی۔ (اگرچہ شمالی کوریا کے ہوائی جہازوں کے پائلٹ درحقیقت روسی تھے) لیکن امریکہ (USA)، سوویت یونین (USSR) اور چین (PRC) نے براہِ راست ایک دوسرے کے مقابلے آنے سے گریز کیا اور ایک دوسرے کی حاشیہ بردار طاقتوں (ریپبلک آف کوریا اور ڈیموکریٹک ریپبلک آف کوریا) سے ہی لڑتے رہے۔ (ریپبلک آف کوریا اور ڈیموکریٹک ریپبلک آف کوریا میں سے کوئی بھی درحقیقت ڈیموکریسی نہ تھی)

متن پر مبنی سوالات 25.3

1۔ یالٹا کانفرنس میں کس ملک کے مستقبل پر غور وفکر ہوا؟

2۔ ''آہنی پردہ'' کی مشہور اصطلاح کس نے وضع کی؟

3۔ ''ٹرومین اصول'' کا کیا مقصد تھا؟

4۔ ناٹو کس اصطلاح کا مخفف ہے؟

25.4 سرد جنگ کا دوسرا مرحلہ: ٹرومین اور اسٹالن کے بعد کا زمانہ (Second Phase of the Cold War : Post Truman-Stalin Era)

دوسرے مرحلے میں کشیدگی کافی کم ہوگئی لیکن سرد جنگ کا خاتمہ نہ ہوا۔ دونوں ہی ملکوں میں اعلیٰ سطح پر قیادت میں تبدیلی آگئی۔ امریکہ پر 1953 میں صدر ٹرومین کا دور ختم ہوا اور سوویت یونین کے اندر اسی سال اسٹالن کا انتقال ہوگیا۔ نیکتا خروشچیف (Niketa Khrushcheve) اسٹالن کے جانشین ہوئے۔ خروشچیف نے اسٹالن کی بہت سی پالیسیوں سے گریز اختیار کیا۔ پالیسی کے محاذ پر خروشچیف نے یوروپ میں کشیدگی کم کرنے کی حکمت عملی اختیار کی اور یوروپ کے کچھ معاملات میں سوویت یونین کی ذمہ داری کو تسلیم کیا۔ دوسری طرف خروشچیف نے پولینڈ اور ہنگری کے سوویت مخالف رہنماؤں اور نظریات کو علانیہ طور پر دبانے کی پالیسی اختیار کی۔ خروشچیف نے رہنماؤں کی سرگرمیوں کو فاشسٹ قرار دیا اور ان کی کھلے طور پر مذمت بھی کی جنھوں نے پولینڈ اور ہنگری کی قوم پرستی کا اظہار

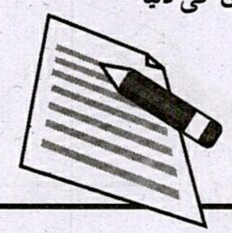

نوٹ

کیا۔ اسی مدت میں سوویت لیڈروں نے امریکہ میں نسلی تصادم پر تنقید کی اور کہا کہ یہ سرمایہ دارانہ عدم مساوات کے لازمی نتائج ہیں۔ ادھر امریکہ اور اس کے حلیفوں نے مشرقی یوروپ کے ملکوں میں سوویت مخالف جذبات کو بھڑکانے کی خوب کوشش کی۔

سوویت یونین(USSR) میں قیادت کی تبدیلی اور خروشچیف کے ذریعے اسٹالن ازم کو روکے جانے کے نتیجے میں ہنگری اور پولینڈ میں بغاوتوں کو ہوا ملی۔ 1956 میں پولینڈ کے شہر پوزنام(Poznam) میں بغاوت کی پھوٹ پڑی لیکن اس کو دبا دیا گیا۔ پولینڈ کی کمیونسٹ پارٹی دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی ایک اسٹالن نواز اور دوسری گوملکا (Gomulka) کی وفادار۔ گوملکا کا گروپ کامیاب ہوا اور پولینڈ کی کمیونسٹ پارٹی نے ''سوشلزم کی ایک قومی راہ'' (National Road to Socialism) کو اپنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تمام مشرقی یوروپ میں سوویت تسلط (مثلاً معاشی اور فوجی امور میں) کے ساتھ ہی ساتھ اب پولینڈ کو اپنے معاملات میں زیادہ کنٹرول حاصل ہوگا۔ اس طرح پولینڈ یوگوسلاویہ کے بعد ایسا دوسرا ملک ہوگیا جس نے قوم پرستانہ کمیونزم کا راستہ اپنایا جس کو بیشتر سوویت یونین نے کچھ اصلاحات پر رضامندی ظاہر کی لیکن جب ہنگری کے لوگوں نے سوویت فوجوں کی مکمل واپسی اوز وارسا پیکٹ (جس کی تشکیل ناٹو کے جواب میں سوویت یونین کی تھی) سے ہنگری کی علاحدگی کا مطالبہ کیا تو اس نئے دھارے(New Course) سے سوویت قیادت پریشان ہوگئی۔ ہنگری کی غیر جانبداری اور وارسا پیکٹ سے علاحدگی کا حتمی اعلان اس وقت کے ہنگری حاکم امرے ناگی(Imre Nagy) کی ہلاکت اور ہنگری پر سوویت یونین کے حملہ شکل میں ظاہر ہوا۔ اس طرح سوویت یونین نے واضح کر دیا کہ وہ پولینڈ میں کثیر جماعتی(Multiparty) ڈیموکریسی یا لبرل جمہوریت کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ اس موقع پر امریکہ نے کوئی اقدام نہیں کیا کیونکہ اس کی طرف سے کسی قسم کے اقدام کا مطلب سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان براہِ راست محاذ آرائی ہوتا۔

چینی انقلاب کے بعد جنرل چیانگ کائی شیک نے اپنے مقلدین کو آبنائے تائیوان عبور کرائی اور جمہوریہ چین (Republic of China) کی تشکیل کی جس نے 1971 تک اقوام متحدہ میں چین کی نمائندگی کی۔ 1950 سے ہی تائیوان میں امریکی پالیسی کمیونسٹ چین (پیپلز ریپبلک آف چائنا) کے حملے کی صورت میں مداخلت کرنے کی نہ تھی لیکن 1950 میں کوریا کی جنگ کے بعد امریکی پالیسی میں تبدیلی آئی اور 1953 کے بعد امریکی صدر ائزن ہاور اس بات پر متفق ہوگئے کہ تائیوان کی بڑے پیمانے پر اسلحہ بندی کی جائے۔

1954 میں PRC یعنی عوامی جمہوریہ چین نے یہ اعلان کر دیا کہ تائیوان کو آزاد کرایا جائے گا۔ چنانچہ فوجی مشقیں شروع ہوگئیں۔ ادھر امریکہ نے نیوکلیر ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکی دے دی اور ایسا معلوم ہوا کہ امریکہ اور عوامی جمہوریہ چین کے درمیان جنگ نزدیک ہی ہے۔ کمیونسٹ چین نے دست برداری کا اظہار کیا اور ناٹو ریاستوں نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ امریکہ کے ذریعے نیوکلیر ہتھیاروں کے استعمال کی حمایت نہیں کریں گی۔ اسی دوران چینی لیڈر سمجھتے تھے کہ نیوکلیر ہتھیاروں کی لمبی دوری کے ڈیلوری سسٹم کے ارتقا میں سوویت روس کی پیشرفت نے طاقت کے یوروپی توازن کو مشرقی بلاک کے حق میں جھکا دیا ہے۔ چینی لیڈروں کو یہ یقین نہ تھا سوویت روس کے فوجی احیا کا

ان کے لیے کیا مطلب نکلے گا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس سے امریکہ چین کو دھمکیاں دینے میں تامل کرے گا۔ جب چین نے 1957 میں کوئے موئے(Quemoy) پر بمباری کی تو یہ سوویت روس ہی تھا جس نے بمباری روکنے کے لیے چین پر دباؤ ڈالا۔ انجام کار امریکہ اور چین کے درمیان براہِ راست ٹکراؤ ٹل گیا لیکن امریکہ اور سوویت روس کے بارے میں چینی کمیونسٹوں کے شکوک بڑھ گئے۔

سوئز نہر(Suez Canal) کو برطانیہ اور فرانس نے انیسویں صدی کے وسط میں بنایا تھا۔ سوئز نہر کمپنی کو نہر چلانے اور 1989 سے آئندہ 99 سال تک اس سے منافع کمانے کا حق حاصل تھا۔ مصر نے سوئز نہر کو قومیانے یعنی اس کو مصری قومی علاقہ(Egyption National Territory) بنانے کا فیصلہ کیا تو اس نے1956 میں کئی بحران پیدا ہوگئے۔ برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مصر کے خلاف ایک متفقہ فوجی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ امریکہ طاقت کے استعمال کے خلاف تھا لیکن اسرائیل نے برطانیہ اور فرانس کی خفیہ ملی بھگت سے مصر پر حملہ کردیا۔ اس کے نتیجے میں امریکہ کو خود اپنے اتحادیوں کی مذمت کرنی پڑی اور سرد جنگ شروع ہونے کے بعد پہلی مرتبہ امریکہ اور سوویت روس اس مسئلہ پر ایک ساتھ ہوگئے۔ برطانیہ اور فرانس نے سوئز نہر کے لیے اقوام متحدہ کی ایک محافظ مسلح فوج رکھنے پر اتفاق کرلیا۔ فرانس نے یہ کوشش کی تھی کہ وہ امریکہ کے سیکیوریٹی بلاک سے آزاد رہے لیکن سوئز نہر کے بحران کے بعد اس کا شاہی زوال تیز تر ہوگیا۔ اب برطانیہ کو بھی عام طور پر ایک دوسرے درجہ کی طاقت اور امریکہ کا جونیر پارٹنر(Junior Partner) سمجھا جانے لگا تھا۔

کیوبا کے فیڈل کاسترو برسوں کی جدوجہد کے بعد 1959 میں برسراقتدار آئے اور چند ہی سال کی مدت میں کیوبا کو سوویت روس کے قریب لے آئے۔ امریکہ نے کیوبا سے اپنے سفارتی تعلقات توڑ لیے کیوبا کی شوگر خریدنے سے انکار کردیا اور 1961 میں کیوبا کے ان کاسترو مخالف لوگوں کے حملے کی حمایت کی جو امریکہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان جلاوطنوں نے خلیج پگس(Bay of Pigs) پر اترنے کی کوشش کی لیکن ان کا ''حملہ'' مکمل طور پر اس لیے ناکام ہوگیا کیونکہ ان کو کیوبا کے لوگوں کی کچھ بھی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ تب سوویت یونین نے کیوبا میں نیوکلیائی بمبار اور زمین سے زمین تک مار کرنے والے میزائل نصب کرنے کا فیصلہ کیا۔ (ان میں سے کچھ میزائل ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے صرف 150 کلومیٹر دوری پر تھے) سوویت یونین نے لمبی دوری پر مار کرنے والے درجنوں میزائل کیوبا کو بھیجے۔ (1949 کے بعد سے امریکہ نے اس کے جواب میں کیوبا کی ناکہ بندی کا اعلان کردیا اور اس طرح دو بڑی طاقتوں کے درمیان جنگ کے زبردست خطرات پیدا ہوگئے۔ ابتدائی طور پر سوویت روس نے اس ناکہ بندی کی مذمت کی لیکن بعد میں اس شرط پر میزائل ہٹانے پر راضی ہوگیا کہ امریکہ کیوبا پر حملہ نہیں کرے گا اور ترکی سے اپنے درمیانی دوری تک مار کرنے والے نیوکلیر میزائلوں کو ہٹالے گا۔ امریکہ پہلی شرط پر راضی ہوگیا۔ امریکہ نے جلدی ہی ترکی سے اپنے میزائل اس بہانے سے ہٹا لیے کہ وہ پرانے (Outdated) ہو چکے تھے۔ یہ شاید ایسا موقع تھا جب دونوں بڑی طاقتیں سرد جنگ کے زمانے میں نیوکلیر جنگ کے بہت قریب آ گئی تھیں۔

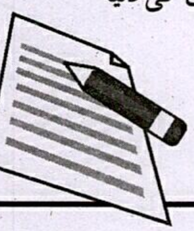

نوٹ

سوویت یونین نے فی الواقع مغربی طاقتوں کو ایک الٹی میٹم دے دیا اور مطالبہ کیا کہ چھ مہینے کے اندر وہ برلن کو اپنی فوجوں سے خالی کر دیں۔ اگر دوسرے قابض ملکوں نے اپنے قبضے کو ہٹا لیا تو سوویت یونین بھی اپنے فوجیوں کو ہٹا لے گا۔ اگر چھ مہینے کے اندر اتفاق رائے نہ ہوا تو سوویت یونین مشرقی برلن میں اپنے قابضانہ حقوق کو جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک (مشرقی جرمنی) کو منتقل کر دے گا۔ جب سوویت فوجیوں نے شہر کا محاصرہ کر لیا تو مغربی برلن والوں اور غیر ملکی قابضوں کو ایک ایر برج (Air-bridge) کے ذریعے رسد پہنچائی گئی۔ آخر کار سویت رہنماؤں، نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مغربی طاقتوں کو آسانی کے ساتھ برلن سے باہر نہیں کر سکتے یعنی اس شہر سے جس پر قبضہ کرنے کے لیے دوسری عالمی جنگ کے آخر میں ان کو اپنے تین لاکھ فوجیوں سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ برلن بحران اتنا زیادہ مدہم نہیں پڑا جتنا کہ یہ مغربی قابض فوج کی فتح بن گیا۔

1950 کی دہائی میں سوویت یونین کی پریشانیاں کم نہ ہوئیں کیونکہ اس کے بہت سے ورکر اور پیشہ ور برلن کے راستے مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی کو چلے گئے۔ برلن کے سوال پر جب انھوں نے مغربی قابضوں کے خلاف دوبارہ دباؤ بنانا شروع کیا تو مغربی قابضوں نے قبضہ کی کچھ شرائط کو اس لیے بدل دیا تا کہ جرمنی کے معاملے میں کسی بڑی محاذ آرائی میں نہ پھنس جائیں۔ مغربی جرمنی یا جرمن وفاقی جمہوریہ (German Federal Republic) کو 1955 کے بعد دوبارہ مسلح کیا گیا اور بہت سے مغربی قبضے والے ان زونوں پر ان کو موثر کنٹرول دے دیا گیا جہاں کچھ وقت کے لیے کمیونسٹوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا۔ 1961 میں مشرقی برلن کے سوویت قابضوں نے ایک پکی دیوار بنا دی تا کہ مشرقی جرمنی والے مغربی جرمنی کی ریاست کو نہ بھاگ سکیں۔ دیوار برلن سرد جنگ کی سیاست کی ایک علامت بن گئی اور یہ دیوار اس وقت تک باقی رہی جب 90-1989 میں جرمنوں نے اس کو ڈھا نہ دیا۔

سرد جنگ کے دوسرے مرحلے کے دوران دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان برف بھی پگھلی لیکن کچھ مواقع پر یہ کشیدگی کچھ زیادہ ہی ہوگئی مثلاً 1962 میں کیوبا کے میزائل بحران کے موقع پر نیوکلیر جنگ کے امکانات اور اس جنگ کے تباہ کن امکانی اثرات وہ اہم عوامل تھے جنھوں نے دونوں بڑی طاقتوں کو اپنے رویہ میں تبدیلی پیدا کرنے پر مجبور کر دیا۔ دونوں ہی ملکوں میں فوجی اخراجات کے کم کرنے کے لیے بڑا دباؤ بھی رہا۔

دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان سدھرتے ہوئے رشتوں کی کچھ بنیادیں تو پہلے ہی تیار کر دی گئی تھیں۔ 1963 میں سوویت یونین، امریکہ اور برطانیہ نے نیوکلیر ٹیسٹ پر پابندی کے ایک معاہدہ پر دستخط کر دیے اور یہ سب اس بات پر راضی ہوگئے کہ صرف ماحول کو مزید آلودگی سے بچانے کے لیے نیوکلیر ٹیسٹ زیر زمین انجام دیں گے۔ اسی سال فوری مشاورت کو یقینی بنانے کے لیے ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان ایک ٹیلیفونک رابطے (نام نہاد ہاٹ لائن) کو بھی شروع کیا گیا۔

متن پر مبنی سوالات 25.4

1۔ کس سویت لیڈر نے بیک وقت یوروپ کے بارے میں کشیدگی کم کرنے اور سوویت مخالف لیڈروں اور نظریوں کو دبانے کی پالیسی کو شروع کیا۔

____

2۔ PRC کا ہے کا مخفف ہے؟

____

3۔ دیوارِ برلن کب گری؟

____

25.5 رفع کشیدگی (The Detente)

اب امریکہ اور سوویت یونین کے رشتے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئے جسے مفاہمت یا دفع کشیدگی (The Detente) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح Detente مشرق و مغرب کی محاذ آرائی میں تخفیف یا کمی کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس مفاہمت یا رفع کشیدگی کا دائرہ چین تک وسیع کرنا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور چین کے درمیان رشتے پچھلے چند سالوں سے بہت کشیدہ تھے۔ چین کے ساتھ مفاہمت ایک قابل ذکر کامیابی تھی۔ اس مدت میں سرد جنگ تو ختم نہ ہوئی لیکن مفاہمت کی سطح میں بہت سدھار ہوا۔ ایک امریکی اہلکار ہنری کسنجر (Henery Kissenger) نے اس مفاہمت (Detente) کو ''حریف طاقتوں کے سمجھوتے کا ایک انداز'' بنایا ہے۔ لیونڈ بریژنیف (Leonid Brezhnev) نے جو کیوبا کے میزائل بحران کے بعد سوویت رہنما کی حیثیت سے خروشچیف کا جانشین ہوا، کہا ہے کہ ''مفاہمت (Detente) کسی طاقت آزمائی، تیغ زنی یا دھمکی آمیز انداز بیان کے بغیر صرف کانفرنس ٹیبل پر بیٹھ کر امن پسندانہ ذرائع سے اختلافات اور جھگڑوں کو حل کرنے کی خواہش کا نام ہے اس میں دونوں فریقوں کے جائز قانونی مفادات کی رعایت کرنے کی صلاحیت اور اعتماد بھی شامل ہے۔'' امریکی صدر نکسن کو اس اصطلاح رفع کشیدگی کا موجد (Author of Detente) کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ اصطلاح امریکہ و چین کے رشتوں کے سیاق و سباق میں زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ نکسن نے 1940 اور 1960 کی درمیانی دہائیوں میں کمیونسٹ مخالف انتہا پسند رہنما کی حیثیت سے اپنی سیاسی زندگی کی بنیاد رکھی تھی لیکن 1968 میں جب وہ صدر بنے تو انھوں نے چین کے ساتھ امریکی رشتوں کو سدھارنے کے لیے قدم اٹھائے۔

کشیدگی کو کم کرنے کے لیے دونوں ہی ملکوں نے کئی قدم اٹھائے۔ 1968 میں برطانیہ سوویت یونین اور امریکہ نے NPT یعنی نیوکلیر ہتھیاروں کی عدم توسیع کے معاہدہ پر دستخط کیے۔ دونوں بڑی طاقتوں کے درمیان جھگڑے کی ایک اہم بنیاد دونوں جرمنی اور برلن کا معاملہ تھا۔ 1969 میں مغربی جرمنی کی حکومت نے آسٹپولیٹک

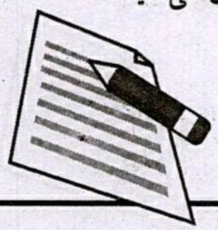

نوٹ

(Ostpolitic) کی پالیسی شروع کی۔ اس اصطلاح کا مطلب تھا ''مشرق کے لیے حکمت عملی'' مغربی جرمنی نے مشرقی یوروپ کے ملکوں کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے کوشش کی۔ دونوں جرمن ملکوں (Germaneys) نے ایک دوسرے کو تسلیم کرلیا اور بڑی طاقتوں نے بھی ان کو جداگانہ اور قانونی طور پر جائز ریاستوں کی حیثیت دے دی۔ 1973 میں دونوں نے اسٹریٹجک ہتھیاروں پر تجدید کے معاہدے (Strategic Arms Limitation Treaty) پر دستخط کیے۔ اس معاہدہ سے ہتھیاروں کی تعداد کم ہوئی لیکن اسلحہ کی دوڑ (Arms race) میں کمی آئی۔ اس وقت کے سوویت یونین نیز امریکہ کے صدر (یعنی بریژنیف اور نکسن) جولائی 1975 میں 35 ملکوں کے ساتھ ہیلسنکی (فن لینڈ) کانفرنس کے لیے اکھٹے ہوئے۔ فائنل ایکٹ (Final Act) پر دستخط کو یہ سمجھا گیا کہ وقتی طور پر سرد جنگ دفن ہوگئی۔ اس فائنل ایکٹ میں دس اصول تھے جن میں سب سے زیادہ اہم یہ اصول تھا کہ تمام اقوام اس یوروپی سرحد کو تسلیم کرلیں جو دوسری عالمی جنگ کے بعد کھینچی گئی تھی۔ اس طرح جرمنی کی تقسیم کو قبول کرلیا گیا۔ کمیونسٹ ممالک نے بھی وعدہ کیا کہ وہ اپنے عوام کو ''انسانی حقوق'' (Human Reghts) کی اجازت دیں گے۔ ان انسانی حقوق میں آزادی تقریر (Freedom of Speech) اور ملک چھوڑنے کی آزادی بھی شامل تھی۔

رفع کشیدگی (Detente) کے دوران امریکہ اور چین کے تعلقات میں کافی سدھار آیا۔ امریکی صدر نکسن اور وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے چین کے ساتھ کشیدگی دور کرنے کے لیے خصوصی کوششیں کیں۔ 1971 میں چین کو اقوام متحدہ میں داخل کرلیا گیا اور تائیوان کو باہر کر دیا گیا۔ 1978 میں امریکہ نے قوم پرست چین (Nationalist China) کی منظوری (Recognition) کو واپس لے لیا اور 1979 میں امریکہ نے عوامی جمہوریہ چین (People Republic of China) کو تسلیم کرلیا اور اس طرح سفیروں کا تبادلہ عمل میں آیا۔

متن پر مبنی سوالات 25.5

1۔ رفع کشیدگی (Detente) کیا تھی؟ اس کا موجد کون تھا؟

____

2۔ NPTs یعنی نیوکلیر ہتھیاروں کی عدم توسیع کا معاہدہ کیا تھا؟

____

3۔ SALT-I (مہلک ہتھیاروں کی تحدید کا معاہدہ) کیا تھا؟

____

4۔ اسٹپولی ٹک (Ostpolitik) کی پالیسی کیا تھی؟

____

نوٹ

25.6 نئی سرد جنگ

ہیل سنکی (Helsinki) کانفرنس کے بعد رفع کشیدگی (Detente) کی چمک دمک ماند پڑ گئی اور امریکہ اور سوویت یونین کے تعلقات میں اتنی تلخی آ گئی کہ 1980 میں تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ سرد جنگ پھر لوٹ آئی۔ نئی کشیدگی کو نئی سرد جنگ کا نام دیا گیا ہے۔ نئی سرد جنگ پرانی سرد جنگ سے اس مفہوم میں مختلف تھی کہ یہ (نئی سرد جنگ) کسی نظریاتی اختلاف پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق طاقت کے توازن سے تھا۔ نئی سرد جنگ میں طاقت کا ایک نیا بلاک یعنی چین ایک نئی طاقت کے روپ میں ابھرا جسے نہ شکست دی جا سکتی تھی اور نہ جسے نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ 1979 میں افغانستان کے اندر سوویت فوجوں کی مداخلت ایک اہم موڑ تھا۔ نئی سرد جنگ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے تحت دونوں ملکوں نے خاص طور سے یوروپ سے باہر اپنے اپنے دائرہ اثر کو پھیلانے کی کوشش کی۔ یوروپ سے باہر جو جھگڑے تھے وہ پہلے کے مقابلے زیادہ اہمیت اختیار کر گئے تھے۔ سوویت یونین کے لیے رفع کشیدگی کا مطلب یہ تھا کہ وہ صرف یوروپ میں موجود حالات سے سمجھوتہ کر لے۔ ہندوستان، چین، افریقہ اور افغانستان وغیرہ میں دونوں ملک ہم مخالف گروپوں کی حمایت کرتے رہے۔ سوویت یونین افغانستان صدر کو بدل کر اپنی پسند کا صدر لے آیا۔ افغانستان میں تقریباً ایک لاکھ سوویت فوجی تعینات کیے گئے۔ امریکہ نے افغانستان میں سوویت یونین کے فوجیوں کی تعیناتی کو ایران کے لیے ایک خطرہ سمجھا اور خلیج میں اپنے جنگی جہازوں کی نقل و حرکت شروع کر دی۔ دونوں ہی ملک نئے مہلک ہتھیاروں کے فروغ میں لگ گئے۔ امریکی صدر رونالڈ ریگن نے ہتھیاروں کے ایک نئے سسٹم اسٹرٹیجک دفاعی پہل قدمی یا SDI (Strategic Defence Initative) بھی کہا جاتا ہے۔

25.7 سرد جنگ کا خاتمہ (The End of the Cold War)

مشرقی یوروپ کے مختلف ملکوں میں کمیونزم کی شکست و ریخت کے ساتھ ہی سرد جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اس شکست و ریخت کی رفتار بہت تیز تھی۔ انجام کار کمیونزم خود اپنی جائے پیدائش سوویت روس (USSR) میں ہی بکھر گیا۔ یہ عمل پولینڈ کے اندر 1988 میں اس وقت شروع ہوا جب وہاں سالیڈیریٹی ٹریڈ یونین (Solidarty Trade Union) نے بڑی بڑی حکومت مخالف ہڑتالیں ترتیب دیں اور سرکار پر زور ڈالا کہ وہ آزادانہ انتخابات کی اجازت دے۔ ان انتخابات میں کمیونسٹوں کو مکمل شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ہنگری، بلغاریہ اور چیکوسلواکیہ میں بھی یہی ہوا۔ مشرقی جرمنی میں کمیونسٹ لیڈر ایرک ہونیکر (Eric Honecker) مظاہرین کو طاقت سے منتشر کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے ساتھیوں نے اس بات کو نامنظور کر دیا۔ 1989 کے اختتام تک مشرقی جرمنی میں کمیونسٹ حکومت کو استعفیٰ دینا پڑا اور سرد جنگ کی علامت برلن کی دیوار بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ گرا دی گئی۔ برلن کی دیوار کے گرائے جانے کو سرد جنگ کا خاتمہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس دیوار کی تعمیر کو ہی سرد جنگ کا آغاز سمجھا جاتا تھا۔ 1990 میں مشرقی جرمنی میں مغربی جرمنی کی کرنسی شروع کی گئی اور بالآخر دونوں جرمنی دوبارہ مل گئے۔ جرمنی کی وفاقی جمہوریہ کے چانسلر کو متحدہ ملک کی حکومت کا سربراہ چن لیا گیا اور اس متحدہ ملک نے منڈی معیشت (Market

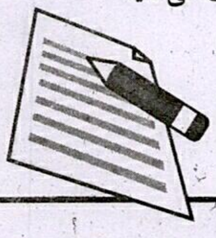

نوٹ

(Economy) اور مغربی طرز کی جمہوریت کو قبول کر لیا۔

سوویت یونین میں بھی کمیونزم کا زوال ہوگیا۔ میخائل گرباچوف نے اپنی گلاس نوسٹ (کھلے پن) اور پریسترویکا کا (جدید ساخت یعنی سماجی اور معاشی اصطلاحات) کی پالیسیوں کے ذریعے ملک میں تبدیلیاں لانے اور ملک میں ایک نئی جان ڈالنے کے لیے کوششیں کیں۔ لیکن ان کے اقدامات کامیابی سے ہم کنار نہ ہوئے اور 1991 تک سوویت یونین(USSR) دو جداگانہ ریپبلکوں(Republics) میں بٹ گیا اور تنہا روس بھی اس پوزیشن میں نہ رہا کہ اپنے اس اثر کو کام میں لاسکے جو قدیم سوویت یونین لایا تھا۔ سرد جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ بہت سے سیاسی مبصرین کی رائے تھی کہ سرد جنگ کے خاتمے سے عالمی مسائل ختم ہوجائیں گے لیکن اب نئے مسائل اور اختلاف ونزاع کے نئے معاملات ابھر کر سامنے آگئے ہیں۔

متن پر مبنی سوالات 25.6

1۔ SDI سے کیا مطلب ہے؟

____

2۔ گلاس نوسٹ(Glasnost) اور پریسترویکا(Perestroika) سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

____

3۔ سرد جنگ کے خاتمہ کی علامت کیا تھی؟

____

آپ نے کیا سیکھا؟

سرد جنگ دوسری جنگ عظیم فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی حالانکہ اس کی نشانیاں یا علامتیں جنگ کے دوران ظاہر ہونے لگی تھیں۔ سرد جنگ کے پہلے مرحلے میں امریکہ اور سوویت یونین نے اپنے اپنے دائرہ اثر اور اپنے نظریات کے پھیلانے کے لیے کوششیں کیں۔ ان دونوں طاقتوں کے درمیان بے اعتمادی اور شکوک وشبہات کی فضا قائم رہی۔ جنگ عظیم کے دوسرے مرحلے میں دونوں ملکوں کے درمیان کشیدگی میں کچھ کمی آئی لیکن شک اور بے اعتمادی دونوں کے درمیان بہرحال باقی رہی۔ رفع کشیدگی(Detente) کے فوراً بعد ایک نئی سرد جنگ شروع ہوئی۔ اس مدت میں طاقت کے ایک نئے ملک یعنی عوامی جمہوریہ، چین کا ظہور ہوا۔ USSR اور مشرقی یوروپ کے ملکوں میں کمیونزم کے شعوط کے ساتھ سرد جنگ ختم ہوگئی۔

نوٹ

اختتامی سوالات

1۔ سرد جنگ سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ یہ سرد جنگ کھلی جنگ سے کس طرح مختلف تھی؟

2۔ سرد جنگ کے لیے کچھ ذمہ دار عوامل کو بیان کیجیے۔

3۔ سرد جنگ کے پہلے مرحلے کے دوران پولینڈ کے مسئلہ کی وضاحت کیجیے۔

4۔ برلن کی ناکہ بندی (Blockode) سے کیا مطلب ہے؟

5۔ سرد جنگ کے دوسرے مرحلے کے دوران سوئز نہر کے بحران کا جائزہ لیجیے۔

6۔ سرد جنگ میں رفع کشیدگی کے مرحلے (Phase of Delente) کا جائزہ لیجیے۔

7۔ نئی سرد جنگ کیا ہے؟ یہ سرد جنگ سے کس طرح مختلف ہے؟

متن پر مبنی سوالوں کے جوابات

25.1

1۔ سیاسی اور معاشی آزادی اور مارکسزم۔لینن ازم

2۔ وائس آف امریکہ اور ریڈیو ماسکو

25.2

1۔ 25.2 کا تیسرا پیرا دیکھیے

2۔ 25.2 کا تیسرا پیرا دیکھیے

3۔ دیکھیے 25.2 کا آخری دوسرا پیرا مشرقی یوروپ سوویت یونین کے ذریعے اور مغربی یوروپ امریکہ کے ذریعے

25.3

1۔ پولینڈ

2۔ چرچل

نوٹ

3۔ دبانا یا کچلنا

4۔ نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن (North Atlantic Treaty Organisation)

25.4

1۔ نکیتا خروشچیف

2۔ عوامی جمہوریہ چین (People's Republic of China)

3۔ 1989-90

25.5

1۔ Detente ایک ایسی اصطلاح تھی جو مشرق و مغرب کے جھگڑے کم کرنے کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ اس کے موجد امریکی صدر نکسن تھے۔

2۔ نیوکلیر عدم پھیلاؤ معاہدہ (Nuclear Non-proliferation Treaty)

3۔ اسٹراٹیجک ہتھیاروں پر تجدید کا معاہدہ (Strategic Arms Limitation Treaty)

4۔ مغربی جرمنی کی پالیسی جس کا مطلب تھا مشرق کے لیے حکمت عملی (Policy for the East)

25.6

1۔ اہم دفاعی اقدام (Strategic Defense Initiative)

2۔ کھلا پن اور نئی ساخت

3۔ دیوار برلن کا انہدام

اختتامی سوالوں کے اشارے

1۔ دیکھیے 25.1

2۔ دیکھیے 25.2

3۔ دیکھیے 25.3 پیرا 2

نوٹ

4- دیکھیے 25.3 پیرا5

5- دیکھیے 25.4 پیرا6

6- دیکھیے 25.5

7- دیکھیے 25.6

فرہنگ

Comminform : کمیونسٹ انفارمیشن بیورو اسے 1947 میں سوویت یونین نے اس مقصد سے قائم کیا تھا کہ بینالاقوامی کمیونسٹ اتحاد(International communist solidarity) کوفروغ دیا جائے۔

Ossification Phase : 1945-47 کے درمیان سرد جنگ کا ابتدائی مرحلہ اس مرحلے کے بعد سرد جنگ زور وشور کے ساتھ ہونے لگی۔

آہنی پردہ(Iron Curtain) : یہ اصطلاح برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل نے وضع کی تھی۔ چرچل نے یہ اصطلاح بلقان کے احوال کو بیان کرنے کے لیے استعمال کی تھی جہاں یونان کے علاوہ تمام ملک سوویت تسلط کے تحت آگئے تھے۔

برلن کی ناکہ بندی (Burlin Blockade) : سوویت یونین نے یہ پابندی عائد کی تھی اور مغربی زونوں (Zones) سے اس کے رابطے کو منقطع کر دیا تھا۔ مغرب کے اتحادی جرمنی میں مالی اصلاحات شروع کرنا چاہتے تھے۔

بروسیل پیکٹ (Brussels Pact) : یہ پیکٹ جرمنی کے خلاف برطانیہ، فرانس اور بیلجیم کے درمیان ایک باہمی دفاعی معاہدہ تھا۔ بہرحال، یہ پیکٹ خاص طور سے سوویت یونین کے خلاف تھا نہ کہ جرمنی کے۔

Truman Doctrine : ٹرومین اصول دبانے کی ایک حکمت عملی تھی جس کا مقصد کمیونزم کو فقط ان علاقوں تک محدود رکھنا یا روکنا تھا جہاں اس کی جڑیں پہلے ہی پھیل چکی تھیں۔

مارشل پلان(Marshale Plan) : اس پلان کا مقصد بیس سال کی مدت میں دس بلین ڈالر سے زیادہ یوروپی ملکوں میں منتقل کرنا تھا تاکہ وہ جنگ کی تباہیوں سے ابھر سکیں۔

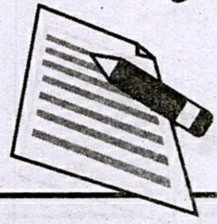

نوٹ

ناٹو(NATO) : نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن 1949 میں یہ امریکہ اور کچھ یوروپی ملکوں کے درمیان تشکیل دی گئی تھی۔ یہ سوویت یونین کے خلاف ایک فوجی بلاک تھا۔

رفع کشیدگی یا مفاہمت (Detente) : اس اصطلاح کا استعمال مشرق و مغرب کے جھگڑوں اور ان کے درمیان کشیدگی کو کم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ مفاہمت کی اس مدت کے دوران دونوں طاقتوں کے درمیان مفاہمت کی سطح بڑھ گئی تھی۔ اس مدت میں امریکہ اور چین کے درمیان بھی رشتوں میں سدھار ہوا تھا۔

SALT-I : یعنی Strategic Arms Limation Treaty۔ تجدید اسلحہ کے اس معاہدہ پر امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان دستخط ہوئے تھے۔ اس معاہدہ سے اسلحہ کی دوڑ میں کمی آئی۔

SDI : اس کی مکمل شکل ہے Strategic Defence Initative۔ یعنی اہم دفاعی اقدام اسے اسٹاروارس (Star wars) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

گلاس نوسٹ(Glosnost) : یہ کھلے پن کی پالیسی تھی۔ اس پالیسی کو سوویت یونین کے صدر میخائیل گرباچوف نے ملک میں تبدیلی لانے اور اس کو نئی زندگی دینے کے لیے شروع کیا تھا۔

پریسٹروئیکا(Presetroika) : سوویت یونین کے صدر میخائل گرباچوف نے اس پالیسی کو شروع کیا تھا اس کا مطلب تھا معاشی اور سماجی حلقوں کی نئی ساخت۔

آسٹپولی ٹک(Ostpolitik) : اس پالیسی کو مغربی جرمنی کی حکومت نے شروع کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا ''مشرق کے لیے حکمت عملی''۔ مغربی جرمنی نے مشرقی یوروپ کے ملکوں کے ساتھ معمول کے تعلقات کی تجدید کی اور دونوں جرمنیوں نے ایک دوسرے کو تسلیم کرلیا اور اس کے علاوہ بڑی طاقتوں نے بھی ان کو جداگانہ اور قانونی طور پر جائز ریاستوں کی حیثیت سے تسلیم کیا۔

نوٹ

26

قومی آزادی کی تحریکات، نوآبادیوں کے خاتمے کا عمل اور ترقی 1945 سے زمانۂ حال تک

(National Liberation Movements, Decolonization & Development 1945-Present)

انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران استعماری راج کے تحت رہنے والے لاکھوں لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ ''قومی آزادی'' کے جدوجہد میں شریک تھے۔ 1945 کے درمیان ایشیا، افریقہ اور اوشیانا (مغربی بحرالکاہل کے جزائر) اور کیری بین(Carrebbean) کے سبھی وہ حصے جو یوروپ، جاپان اور امریکی راج کے تحت تھے آزاد ہوگئے اور انھوں نے کئی آزاد قومی ریاستوں کی حیثیت اختیار کرلی۔

دوسری جنگ عظیم (1945-1939) کے دوران جرمنی اور جاپان کی شکست خوردہ طاقتوں کے حکومت کے توسیع پسندانہ منصوبے خاک میں مل گئے، یہاں تک کہ عظیم برطانیہ، فرانس اور نیدرلینڈ جیسی فتح مند طاقتیں بھی اپنے سامراجی وعدوں کو پورا کرنے میں ناکام رہیں اور ان کے رہنماؤں کو ''خاتمہ استعمار(Decolonisation)'' کے لیے زبردست دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ خاتمۂ استعمار کے لیے یہ دباؤ صرف نوآبادیوں میں رہنے والی رعایا اور قومی شہریوں(National Citizens) کی طرف سے ہی نہ تھا بلکہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین کی طرف سے بھی تھا۔ 1945 کے بعد مغربی افریقہ کے بیشتر حصوں، فلپین (ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایشیائی نوآبادی) اور چھ دیگر علاقوں نے بغیر کسی خاص تشدد کے آزادی حاصل کرلی۔ الجیریا، انڈوچائنا، ملایا انگولا اور موزمبیق مسلح جدوجہد آزادی کے کچھ ہی سال بعد قومی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

سیاسی آزادی حاصل ہوگئی لیکن اس آزادی سے نوآبادی میں رہنے والے لوگوں نے جن فائدوں کی توقعات قائم کی تھی وہ فوراً ہی حاصل نہ ہو پائے۔ نئی ریاستوں کو اقتصادی ترقی اور جدیدیت(Modernisation) کے مسائل کا

سامنا کرنا پڑا اور ضرورت یہ آپڑی کہ ''جدید استعمار'' (Neocolonisation) سے محفوظ رہنے کے لیے ان مسائل کو جلدی حل کیا جائے۔ بیشتر نئی آزاد ریاستوں (New Independent States) کا معیار زندگی مغربی یوروپ اور شمالی امریکہ کے ترقی یافتہ ملکوں جیسا نہ تھا اور زمانہ حال کے بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ نوآبادیاتی تسلط کی شکلیں یا استحصال کے قدیم طور طریقے آزاد قومی ریاستوں میں آج بھی رسمی طور پر موجود ہیں۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ:

- قومی آزادی کی کچھ تحریکات سے واقف ہو سکیں گے؛
- ان عالمی سیاسی قوتوں کا تجزیہ کر سکیں گے جو خاتمۂ نوآبادیات کے عمل پر اثر انداز ہوئیں؛
- خاتمۂ استعمار کے بعد کی دنیا میں ماتحتی (Depen dency) اور نابرابری کے رشتوں پر گفتگو کر سکیں گے؛
- اور قومی ترقی کے کچھ مسائل نیز ان کے مجوزہ حلوں کی نشاندہی کر سکیں گے۔

26.1 قومی آزادی اور قومی ترقی کی مثالیں، ترک نوآبادیات کی شروعات (Models of National Liberation and National Development Beginnings of Decolonisation)

مثالیں (Models)

بیسویں صدی میں رونما ہونے والی قومی آزادی کی جدوجہد کے رہنما قومی آزادی اور قومی ترقی کی ان سابقہ مثالوں سے متاثر تھے جنھوں نے شہریت (Citizenship) کے جدید تصور یعنی یہ کہ قوم کے تمام افراد کو مساوی حقوق اور فرائض حاصل ہونے چاہئیں، کو متعارف کرایا تھا۔

امریکی جنگ آزادی کے بعد امریکہ کی نئی متحدہ ریاستوں میں پائدار جمہوری حکمراں اداروں کا ظہور ہوا اور امریکی قوم کے تمام افراد کو رفتہ رفتہ مکمل شہریت کے حقوق حاصل ہوئے۔ اس کے علاوہ امریکی فوج بھی کم رہ گئی اور وہ شہری اداروں کے کام کاج میں مداخلت بھی نہ کرتی تھی۔ یہ بات ایشیا اور افریقہ کی ان نوآبادیوں کے لوگوں کو بہت بھائی جہاں آبادی پر کنٹرول کرنے کے لیے باقاعدہ فوج کا استعمال کیا جاتا تھا۔

1789 کا فرانسیسی انقلاب کسی غیر ملکی طاقت کے خلاف جدوجہد کے طور پر شروع نہیں ہوا تھا بلکہ انقلاب پسند لوگوں نے حریت، مساوات اور اخوت (Fraternity) ہمہ گیر اصولوں کو یوروپ کے دوسرے حصوں تک پہنچانے

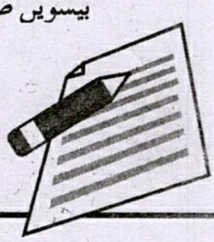

نوٹ

کے لیے ایک مہم شروع کی تھی۔ فرانسیسی انقلاب نے یوروپ اور فرانسیسی نوآبادیات میں لوگوں کو اس بات کا حوصلہ بخشا کہ وہ اصولوں کے نام پر فرانسیسی تسلط کے خلاف بغاوت کریں۔ ان میں سے سب قوم پرست انقلابی جمہوریت یا مساوات میں کوئی گہرا یقین نہ رکھتے تھے بلکہ اکثر لوگوں کا یقین تھا کہ لوگوں کو غیر ملکی تسلط کے خلاف جنگ کے لیے تیار کرنے کی ضرورت ہے۔

کچھ اور بھی اسباب تھے جن کی وجہ سے نوآبادیاتی راج کے تحت زندگی گزارنے والے لوگ قومی آزادی اور ترقی کے امریکی نمونے(Models) کی تعریف وستائش کرتے تھے۔ 1865-1950 کے درمیان امریکہ ایسی سب سے بڑی معیشت بن کے ابھری تھی جس کی بنیاد سرمایہ دارانہ زراعت، بھاری صنعت اور عوامی صارف اخراجات (Mass Consumer Spending) پر تھی۔ پوری دنیا کے لوگوں کا یقین تھا کہ یو ایس اے (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) پورے خلوص کے ساتھ جمہوریت کے راستے اختیار حکومت(Self govrenance) کا عالمی پیمانے پر پابند ہے اور وہ قومی آزادیوں کے لیے چل رہی جدوجہد میں شاید نوآبادیاتی رعایا کی براہ راست مدد کرکے نوآبادیت کے خلاف ایک قوت کے طور پر اپنا کردار نبھائے گا۔

1917-1921 کے روسی (بالشویک) انقلاب کا عالمی پیمانے پر زبردست اثر ہوا۔ بالشویک کا نظریہ یہ تھا کہ تمام عالم کی مختلف قومیں(Nationalities) آزادی اور اپنے مستقبل کے فیصلے کا حق رکھتی ہیں۔ ایک تیز رفتار سماجی اور اقتصادی ترقی کا ایک اور متبادل روسی انقلاب نے پیش کیا تھا جو مغربی سرمایہ دارانہ ریاست کے نظریہ سے قطعاً مختلف تھا۔ 1941 میں بہت سے سوویت شہریوں کا مادی معیار زندگی اپنے اجداد کے معیار زندگی سے بہت بلند تھا۔

سوویت رہنماؤں نے بہت سے سیاسی اور معاشی طور پر مغلوب(Dominated) ملکوں اور نوآبادیوں کے لوگوں کی مادی طور پر حمایت کی۔ مارکسٹ نظریہ یہ سکھاتا تھا کہ دنیا بھر کے چھوٹے کسانوں اور پرولتاریہ (Proletarians) کے مفادات یکساں ہیں اور ضرورت یہ ہے کہ وہ بورژوائیوں اور سامراجیت پسندوں کو شکست دینے کے لیے تعاون دیں۔ کچھ نوآبادیاتی قوم پرستوں نے قومی آزادی کی تحریکات کو منظم کرنے کے لیبا تو سوویت یونین کا سفر کیا یا وہاں جاکے مطالعہ کیا۔ ان قوم پرستوں میں ویت نامی قومی رہنما ہوچی منہ، چینی قومی رہنما چیانگ کائی شیک (1887-1975) اور انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما پنڈت جواہر لعل نہرو شامل تھے جو جمہوری سوشلزم میں یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں سوویت معیشت کی نقل کی جاسکتی ہے۔

ترک نوآبادیات کی شروعات(Beginning of Decolonisation)

عظیم برطانیہ اور فرانس خود اختیار حکومت(Self governance) اور ہوم رول(Home rule) کی ابھرتی کچھ تحریکات کے آگے مجبور ہوگئے۔ 1867 میں ہی برطانیہ نے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور کناڈا کے کچھ حصوں نیز ان علاقوں کے لیے موثر ہوم رول کی منظوری دینی شروع کردی تھی جہاں 1600 کی دہائیوں میں بڑی

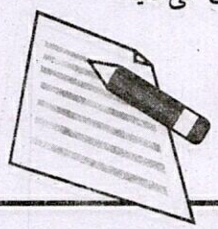

نوٹ

تعداد میں یوروپی لوگ آ کر بس گئے تھے اور انھوں نے وہاں کے دیسی لوگوں کو قتل کرنا یا ان کو بے خانماں کرنا شروع کردیا تھا۔ ان جگہوں پر بستیاں آباد کرنے والے سفید فام لوگوں کو منتخب مجالس مقننہ اور پارلیمینٹوں کے ذریعے ''داخلی'' امور کے بارے میں فیصلے لینے کی اجازت تھی لیکن دوسری نوآبادیوں اور قومی ریاستوں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں قواعد وضوابط لندن کا شاہی مقتدرہ ہی بناتا تھا۔ 1910 کے بعد ان قومی ریاستوں کو ڈومینین (Dominions) یا باہمی طور پر معاون اقوام کی برطانوی کامن ویلتھ (British Commonwealth of Co-operation Nations) کیا جانے لگا۔ برطانیہ نے جنوبی افریقہ کی یونین کو بھی کامن ویلتھ کا درجہ عطا کردیا (جہاں یوروپی لوگوں کی تعداد سیاہ فام افریقیوں سے زیادہ ہوگئی تھی لیکن سیاہ فاموں کو ووٹ وغیرہ دینے کی اجازت نہ تھی)۔ برطانیہ اور دیگر مغربی ملکوں کی طرح بہت سے فرانسیسیوں کا خیال تھا کہ بہت سی نسلیں اور معاشرے خاص طور پر ان کے اپنے معاشرے اور ان کی اپنی نسلیں ترقی یافتہ ہیں جبکہ دوسرے سماج وحشی (Primitive) تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ ترقی یافتہ سوسائٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ وحشی سماجوں کی رہنمائی کریں اور ان کو سکھائیں۔ 1914 کے بعد فرانسیسی کالونیوں میں رہنے والی غیر فرانسیسی لوگوں کی تھوڑی سی تعداد کو یہ اجازت مل گئی کہ وہ قانون ساز اسمبلیوں کے لیے ووٹ دے کر یا ان کونسلوں میں پہنچ کر اپنے سماجوں پر حکومت کرنے میں شریک ہو جائیں۔

برطانوی، فرانسیسی اور ڈچ حکمرانوں کو اس بات کا یقین تھا کہ نوآبادیوں کے لوگ یا تو جذباتی وجوہات (مثلاً یوروپی تمدن کو قبول کرنے وغیرہ) کی بنا پر یا پھر اس وجہ سے جزوی آزادی کو قبول کرلیں گے کہ ان کو حاکم ملک سے غیر منقطع وابستگی کے نتیجے میں معاشی منفعتیں حاصل ہیں۔ بہت سی نوآبادیوں نے یوروپ کی زیر نگرانی ڈھیلی ڈھالی فیڈریشنوں کے پروگراموں کو یہ سمجھ کر قبول کرلیا کہ یہ مکمل قومی آزادی کی طرف پہلا قدم ہے۔ بہر حال ہندوستان جیسی کچھ نوآبادیوں میں قوم پرستوں نے اپنی تحریکات کو جاری رکھا اور مکمل آزادی کے لیے لڑتے رہے۔

ہمیں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ 1945 سے پہلے نوآبادیاتی راج کی اصلاحوں نے حقیقت میں یوروپی نوآباد کاروں کی پوزیشن کو کمزور نہیں کیا اور نوآبادیوں کے دیسی لوگوں کی تھوڑی تعداد کو ہی فائدہ پہنچایا۔

26.2 نوآبادی مخالف تحریکات پر دوسری عالمی جنگ کے اثرات (Impact of World War II on Anti Colonial Struggl

دوسری عالمی جنگ نے نوآبادیاتی دنیا کے بہت سے ان لوگوں کو بھی انتہا پسند (انقلابی خیالات کا) بنا دیا جو ابھی تک قومی آزادی کی تحریکات سے متاثر نہ ہوئے تھے۔ ایسی صورتیں بھی پیش آئیں کہ نوآبادیوں کے لوگوں کی نئے حملہ آوروں (خاص طور پر جاپان) کے خلاف جدوجہد ان یوروپی لوگوں کے خلاف ہوگئی جنھوں نے نوآبادیوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ دنیا کے دور دراز علاقوں میں جرمنوں، اطالویوں اور جاپانیوں سے

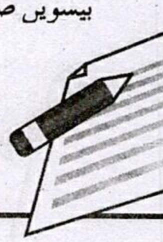

نوٹ

لڑنے کے لیے نوآبادیوں کی فوج میں افریقی اور ایشیائی لوگوں کو بھرتی کی گئی تھی اور یہ لوگ سمجھ گئے تھے کہ یوروپ کے لوگ دنیا کے ناقابل شکست مالک نہیں ہیں۔ جنگ کے دوران تقریباً پچاس لاکھ ہندوستانی سپاہی برطانیہ کی زیرکمان افواج میں تھے۔ ان افریقی اور ایشیائی سپاہیوں کے رابطے دوسری نوآبادیوں کے لوگوں سے بھی تھے اور یوروپی اور امریکی سپاہیوں نیز غیرفوجی لوگوں سے بھی تھے۔ یہ لوگ جن کو جرمن اور جاپانی ''ظلم'' کے خلاف تربیت دی گئی تھی اب خود اپنے ہی نوآبادیاتی حاکموں کے لیے ایک قسم کا خطرہ بن گئے تھے۔ 1940 کی دہائی کے دوران ایشیا، افریقہ اور کیری بین(Caribbean) میں پولس اور سپاہیوں (بشمول اپنے ہی اہل ملک) کے حملوں کے باوجود بھی نوآبادیاتی رعایا ہڑتالوں اور عوامی مظاہرے کرنے لگی۔ 1945 کے آتے آتے نوآبادیوں کے اور زیادہ لوگ مکمل شہری حقوق اور قومی آزادی پر اصرار کرنے لگے تھے اور ان لوگوں کی تعداد زمانہ ماقبل جنگ کے مقابلے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ یہ لوگ اپنے مطالبات کے مخالفین سے جنگ کرنے میں بہت پراعتماد بھی تھے۔

1939 سے پہلے افریقہ کے دانشوروں، پیشہ وروں اور سول ملازمین نے قوم پرست تحریکات کی ایک اساس بنادی تھی۔ 1945 کے بعد ان لوگوں کو اپنے ہی ملک میں کسانوں اور محنت کش طبقات کے مردوزن کی طرف سے جمہوری(Democratic) اصلاحات اور آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں پر یہ بھی دباؤ تھا کہ قومی آزادی کی جدوجہد میں اقتصادی برابری کے مطالبات بھی شامل کیے جائیں۔

فرانسیسی، انڈوچائنا میں ہوچی منہ نے 1930 کی دہائی میں کمیونسٹ نظریات پھیلانے کی کوشش کی۔ 41-1940 میں جاپانیوں نے فرانسیسیوں کو انڈوچائنا سے نکال دیا اور اس علاقہ پر خود قبضہ کرلیا۔ ان کو نکال باہر کرنے کے لیے انھوں نے ایک نیشنل پیپلز فرنٹ(VietMinh) کی تشکیل کی اور جب 1945 میں برطانیہ اور امریکہ کی رضامندی سے فرانسیسی انڈوچائنا کے حاکم بن گئے تو ہو(Ho) اور ویت منھ(Veit Minh) نے فرانسیسیوں سے مقابلہ جاری رکھا اور 1954 تک آتے آتے انڈوچائنا کے کافی حصے پر کنٹرول کرلیا۔ اسی سال ویت نام دوحصوں میں بٹ گیا جو برائے نام آزاد ریاستیں بن گئیں۔ ایک حصہ شمالی علاقے کا تھا جس پر ہو(Ho) اور اس کے اتحادیوں کا کنٹرول تھا اور دوسرا حصہ سیاسی، فوجی اور معاشی موجودگی والا ویت نام کا جنوبی حصہ تھا۔ اس کشمکش میں پچاس ہزار امریکی اور لاکھوں ویتنامی لوگوں کی جانیں گئیں۔ لیکن ویتنامیوں نے دنیا کی سب سے بڑی سامراجی طاقت کو 1975 میں پسپا ہونے پر مجبور کردیا۔

کانگریس کی رہنمائی میں ہندوستان میں چاروں طرف برطانیہ کے خلاف عوامی تحریکات شروع ہوگئیں۔ اس کے علاوہ کسانوں اور محنت کش طبقوں کے آزاد تحریکات بھی تھیں جن کی قیادت کمیونسٹ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ نوجوانوں، طلبا، مصنفین، خواتین اور پسماندہ طبقات کی تنظیمیں بھی برسرپیکار تھیں۔ 1947 میں انگریز ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ آزادی ملی لیکن تقسیم کے ساتھ یعنی ہندوستان دو آزاد ریاستوں ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہوگیا۔

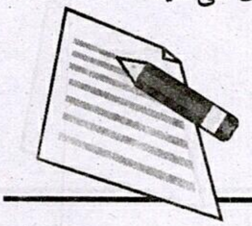

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 26.1

1۔ کچھ ایسے ملکوں کے نام بتایئے جو 1867 اور 1914 کے درمیان آزاد یا نیم آزاد ہوئے۔

2۔ دوسری عالمی جنگ نے نوآبادی بنائے گئے ملکوں کے لوگوں کو کس طرح انقلابی بنادیا؟

3۔ کچھ ایسے ملکوں کے نام بتایئے۔ جنھوں نے 1945 کے بعد مسلح جدوجہد کے ذریعے قومی آزادی حاصل کی۔

26.3 نوآبادیاتی قوم پرستی، آزادی کی جدوجہد اور بین الاقوامی تعاون (Colonial Nationalism, Freedom Struggles and International Co-Operation)

1945 کے بعد ایشیا اور افریقہ کے کچھ نوآبادیاتی قوم پرست رہنماؤں نے سوویت اور امریکی مدد کا یا تو مطالبہ کیا یا پھر ان کو یہ مدد حاصل ہوئی۔ ان رہنماؤں کو یہ بھی امید تھی کہ نئی بین الاقوامی تنظیمیں جیسے (1945 کے بعد امریکہ میں قائم تنظیم اقوام متحدہ ایمانداری کے ساتھ مذاکرت شروع کریں گی۔ انھوں نے قومی آزادی اور ترقی کے اپنے مفادات کے لیے آزاد ریاستوں کی علاقائی تنظیمیں بھی بنائیں۔ ان ہی تنظیموں میں تنظیم وحدت افریقہ (Organization for Africa Unity) بھی شامل تھی جو نئی ریاستوں کے بیچ ہونے والے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے اور نوآبادی قوتوں پر یہ دباؤ ڈالنے کے لیے بنائی گئی تھی کہ وہ افریقہ میں اپنی نوآبادیات کے باقیماندہ اثرات کو بھی ختم کردیں۔ ایک اور بہت اہم پیشرفت ناوابستگی کی تحریک (Non-Aligned Movement) تھی جس میں ہندوستان، پاکستان، چین، انڈونیشیا، ایران اور مصر بھی شامل تھے۔ 1955 میں 29 ملکوں کی ایک کانفرنس سامراجیت، قومی جارحیت، نسل پرستی اور جوہری ہتھیاروں کی مذمت کرنے کے لیے بنڈونگ (انڈونیشیا) میں منعقد ہوئی۔

ناوابستگی کی تحریک نے تیسری دنیا کی ریاستوں کی باہمی صلح اور باہمی تعارف کی ضرورت پر ہی نہیں بلکہ دونوں بڑی طاقتوں کے ساتھ بھی تعاون کی ضرورت پر زور دیا۔

ناوابستہ ممالک کی تحریک نام(NAM) میں شریک اکثر ممالک ایک ایسا درمیانی راستہ تلاش کرنا چاہتے تھے جو نہ تو خالص کمیونزم پر مبنی ہو اور نہ خالص سرمایہ داری پر۔ 1950 اور 1970 کی دہائیوں میں سوشلزم اور ڈیموکریسی کے افریقی اور ایشیائی ''راستوں'' پر بہت بحث و مباحثہ ہوا۔ آزادی کے بعد افریقہ کی بہت سی ریاستوں میں آمریت (Dictator Ship) قائم ہوگئی مثلاً بیلجیم کی سابق نوآبادی زائرے میں موبوتو سی سیکو (صدر1997-1965) کی

نوٹ

اور سابق برطانوی نوآبادی یوگنڈا میں عیدی امین دادا(2003-1924) کی آمریت قائم ہوئی۔ (عیدی امین کو 1979 میں عہدے سے ہٹا دیا گیا تھا)

صحارا افریقہ (جیسے مصر اور لیبیا) کے کچھ رہنماؤں نے اقتصادی ترقی کے امور میں مشرق وسطیٰ کی ریاستوں کے ساتھ تعاون کیا اور اسرائیلی ریاست (سابقہ برطانوی فلسطین) پر اس بات کے لیے زور ڈالا کہ وہ فلسطینی اراضی پر قبضے کو ختم کردے۔ اس قبضے کو وہ غیر قانونی اور نیم نوآبادیانہ قبضہ سمجھتے تھے۔ یہ تعاون پان عرب تحریک کا ایک حصہ تھا۔ بلیک افریقہ کے رہنما 1970 اور 1980 کی دہائیوں میں رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ کی سفید فام اقلیت کی حکومتوں پر یہ دباؤ ڈالتے رہے کہ وہ نسل پرستی اور کالوں کے خلاف امتیاز کو ختم کردیں۔ انھوں نے آزادی کی ان تحریکوں (جنوبی افریقہ میں افریقی نیشنل کانگریس) کو مدد دی جنھیں سفید فام اقلیتی حکومتوں نے خلاف قانون قرار دیا۔ سرد جنگ کے دوران (91-1945) نئی آزاد شدہ ریاستوں کو قومی آزادی اور ترقی کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جو لیڈر کمیونزم کے ہمدرد تھے یا کم از کم کمیونزم کے مخالف نہ تھے انھیں اکثر عوامی حمایت حاصل ہوئی۔ لیکن جب انھوں نے قدیم نوآبادیاتی دیسی اشراف (Native Elite) کی پوزیشن کو کمزور کرنے کی کوشش کی تو ان کو بھی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

انڈونیشیا میں جنگ آزادی کے سپاہی احمد سکارنو (Achmeed Sukarno, 1901-1970) نے 1920 کی دہائی میں (انڈین نیشنل کانگریس کی طرح) ایک نیشنل پارٹی آف انڈونیشیا بنائی تھی۔ سکارنو نے قومی آزادی کے پانچ اصولوں کا اعلان کیا تھا۔ خدا پر یقین، انسانیت، قومی آزادی، جمہوریت اور سماجی انصاف (موخر الذکر کا کچھ تعلق مرکزی معاشی رہنمائی اور دولت کی تقسیم جدید سے تھا) مسلمان (مذہبی اکثریتی فرقہ) اس شرط پر ایک مرکزی انڈونیشی ریاست کی حکومت پر راضی ہوگئے کہ تھوڑا مقامی کنٹرول خاص طور پر مذہبی معاملات ان کے ہاتھ میں رہے گا۔ 1950 کی دہائی میں سوکارنو نے چین کی پروردہ کمیونسٹ پیپلز مومینٹ کے ساتھ بھی کام کیا لیکن 1959 میں سوکارنو نے ڈکٹیٹر شپ قائم کرلی البتہ انھوں نے کمیونسٹ مومینٹ کی قانونیت کو تسلیم کیا۔ 1965 میں سوکارنو کے داخلی دشمن (خاص طور پر فوجی افسران) نے ان کو قتدار سے ہٹادیا اور انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی پر شکنجہ کس دیا اور ہزار ہا ہزار کمیونسٹوں کو قتل کردیا۔ جب یہ واقعہ ہوا تو سوویت یونین (USSR) الگ رہا جب کہ امریکیوں نے فوجی افسران کی خفیہ حمایت کی۔ کچھ ہی عرصہ پہلے تک انڈونیشیا میں ایک فوجی ڈکٹیٹر شپ رہی ہے۔

متن پر مبنی سوالات 26.2

دونوں کالموں کے صحیح جوڑے ملایئے۔

(1)	عیدی امین	1945 میں قائم
(2)	سکارنو	میں ہندوستان شامل ہے
(3)	ناوابستہ تحریک (نام)	افریقی ڈکٹیٹر
(4)	تنظیم اقوام متحدہ	انڈونیشیا

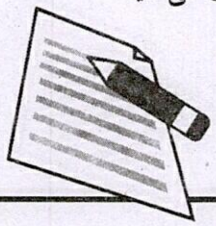

نوٹ

26.4 نوآبادیت کا خاتمہ اور عالمی سیاست (Decolonization and Global Politics)

نوآبادیت کی مخالفت کے جرم میں ہزار ہا ہزار مرد وزن کو سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک تو حبیب بورقیبہ (1903-2000) تھے جو فرانسیسی ٹیونس (شمالی افریقہ) میں تحریک آزادی کے رہنما تھے جو گھانا (برطانوی مغربی افریقہ) میں جدوجہد آزادی کی اہم شخصیت تھے۔ بہرحال اور بھی لوگ تھے جو جنگ کے زمانے میں اپنے نوآبادیاتی حاکموں کے ہوم لینڈ میں رہتے تھے اور وہیں انھوں نے سیاسی نظریات اور تنظیم کی تکنیکیں سیکھیں۔ ہوچی منھ (1894-1969) 1918 اور 1930 کے درمیان فرانس میں رہا اور اس نے وہاں فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی قائم کرنے میں مدد کی پھر وہ ویتنام کی آزادی کی لڑائی لڑنے کے لیے فرانسیسی انڈونیشیا میں لوٹ آیا۔ لیوپولڈ سیڈر سینگھو (Leopold Sedar Senghor, 1960-2001) ایک یونیورسٹی کا پروفیسر تھا اور شاعر بھی تھا۔ وہ سینیگال کے ڈیموکریٹک فرنٹ کی قیادت کرنے کے لیے اپنے وطن مغربی افریقہ لوٹ آیا۔ سینگال کا پہلا صدر بنا (1960 تا 1980)۔

1945 کے بعد کچھ علاقوں میں محدود پیمانے پر تشدد اور جانوں کے اتلاف کے ساتھ ہی نوآبادیوں کی آزادی کا عمل تیزی سے شروع ہوگیا۔ مثال کے طور پر 1958 کے بعد فرانسیسی مغربی افریقہ، سینگال، موریطانیہ، مالی، آئیوری کوسٹ، گنی اور دیگر آزاد ریاستوں کے درمیان تقسیم ہوگیا اور ایسے ہی برطانوی مغربی افریقہ 1957 اور 1961 کے درمیان گھانا، سیرالیون اور نائیجیریا کی آزاد قومی ریاستوں میں بٹ گیا۔

برطانیہ نے 1942 کی ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران ہزاروں ہندوستانیوں کو جیل میں ڈال دیا تھا لیکن اس کے بعد ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان تشدد کم ہوگیا۔ البتہ برصغیر کی ہندوستان اور پاکستان کے بیچ ہونے والی تقسیم کے نتیجے میں سرحد پار لاکھوں جنوب ایشیائی مارے گئے یا بے گھر ہوئے۔ سابقہ برطانوی راج کے کچھ پڑوسی خطوں یعنی سیلون (موجودہ سری لنکا) اور برما (موجودہ میانمار) کی آزادی تھوڑے تشدد کے بعد ہی حاصل ہوگئی۔

1950 کی دہائی میں شمالی افریقہ میں مراقش اور ٹیونس پرامن طور پر فرانس سے آزاد ہوگئے لیکن پڑوسی الجیریا آٹھ سال کی جدوجہد کے بعد ہی 1962 میں آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکا۔ اس جنگ آزادی میں ہزار ہا الجیریائی اور فرانسیسی لوگ کام آگئے۔ موجودہ انگولا اور موزمبیق (جنوبی افریقہ میں) کو پرتگالی راج سے پوری ایک دہائی کی سخت جنگ کے بعد 1975 میں آزادی ملی لیکن افریقیوں اور قابض پرتگالیوں کا کا بڑا جانی نقصان ہوا۔

آزادی یا خاتمہ نوآبادیت کے عمل کا بڑا تعلق سرد جنگ کی سیاست سے بھی تھا۔ سرد جنگ سے مطلب 1945 کے بعد دو سپر پاور بلاکوں کے درمیان دشمنی سے تھا۔ ''پہلی دنیا'' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی زیر قیادت تھی اور وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت کی حامی تھی جبکہ ''دوسری دنیا'' کے نظام کا نمائندہ ملک سوویت یونین اور دیگر ابھرتی ہوئی ریاستیں جیسے پیپلز ریپبلک آف چائنا وغیرہ تھیں۔ تیسری دنیا کی نئی آزاد شدہ ریاستوں نے کسی ایک سپر پاور کے ساتھ اتحاد کرکے منفعتیں بھی حاصل کیں۔

نوٹ

1945 میں کوریا سے جاپانیوں کے اخراج کے بعد جزیرہ نمائے کوریا کا شمالی حصہ سوویت یونین اور چین کی عوامی جمہوری (People Republic of China) کے زیر اثر آ گیا جبکہ شمالی حصہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے زیر اثر رہا۔ امریکیوں نے 1953 اور 1970 کے بیچ دس بلین ڈالر سے زیادہ کی ترقیاتی امداد جنوبی کوریا میں بھیجی۔ 1970 کی دہائی کے ماہرین معاشیات جنوبی کوریا، تائیوان، ہانگ کانگ اور سنگاپور کو ایشیا کے چھوٹے ڈریگن اور چین و جاپان کو بڑے ڈریگن کہتے تھے اور اس کی وجہ ان ملکوں کی تیزی سے ابھرتی ہوئی معیشت تھی جس کی بنیاد برآمداتی صنعتی سامان (جیسے اسٹیل، جہاز سازی اور الیکٹرانک سازوسامان) کی پیداوار تھی۔ چھوٹے ڈریگنوں نے بڑی بڑی امداد، قرضوں اور ترقی یافتہ ملکوں جیسے امریکہ، جاپان اور برطانیہ کے ساتھ تجارتی قراردادوں کے ذریعے بہت صنعتیں حاصل کیں۔

بہرحال یوروپی ریاستوں نے اپنے افریقی مقبوضات میں تعلیم، صحت اور دیگر ترقیاتی ضرورتوں کے لیے صرف چھوٹی چھوٹی رقوم کی سرمایہ کاری کی۔ لاطینی امریکہ میں بھی جہاں 1900 تک چند رسمی نوآبادیاں باقی رہ گئی تھیں لوگ ایسے ہی غریب، غیر تعلیم یافتہ اور سیاسی طور پر بے اقتدار رہے جیسے انیسویں اور بیسویں صدی میں ان کے اجداد رہے تھے۔

متن پر مبنی سوالات 26.3

1۔ 1945 کے بعد بڑی طاقتوں (Superpowers) نے نوآبادی مخالفت جدوجہد میں کس طرح اپنی دلچسپی کا اظہار کیا؟

____

2۔ 1953-1980 کے دوران ایشیا کے کچھ چھوٹے ڈریگنوں کے نام بتائیے۔

____

3۔ کون سے براعظموں نے 1945 کے بعد بھی بہت کم ترقی کی؟

____

26.5 چین: قومی آزادی، دو ریاستیں
(China : National Liberation, Two States)

چین کے شخصی نظام حکومت کا جس کی باگ دوڑ کسی شہنشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی 1911-17 میں رسمی خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ ایک جمہوریہ نے لے لی لیکن نئی جمہوریہ غیر ملکی تسلط ختم کرنے کی اہل نہ تھی۔ 1920 کی دہائی کے

اواخر سے ماؤ زے ڈونگ(Mao Zedong, 1976-1893)، ژاو این لائی(Zhou Enlai)، ڈینگ ژیاؤ پنگ اور دوسرے رہنماؤں کی قیادت میں کمیونسٹوں نے چینی قوم پرستوں(Guonmindang) کا مقابلہ کیا اور دونوں گروہوں کے جاپانیوں کو باہر نکالنے کی کوشش کی۔ جاپانیوں کو 1890 کی دہائی سے ہی وہاں کے مقبوضات اور معیشت پر کنٹرول حاصل تھا۔

ماؤ کا یہ نظریہ تھا کہ چینی قوم پرست سماجی اور معاشی تبدیلیاں نہیں لانا چاہتے جبکہ یہی چیزیں چینی عوام کی نجات کے لیے ضروری ہیں اور اس کے علاوہ ان کی بدعنوانیاں اتنی بڑھی ہوئی ہیں کہ وہ غیر ملکوں کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چینی کمیونسٹوں نے 1949 تک بیشتر قومی خطے(National territory) سے نہ صرف جاپانیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا بلکہ اپنے حریف چینی قوم پرستوں(Goumindang) کو بھی جزیرۂ فارموسا (موجودہ تائیوان) کی طرف جو براعظم چین سے ایک تنگ آبنائے کے اس پار ہے، بھگا دیا۔ ہانگ کانگ 1977 تک تاج برطانیہ کی ایک نوآبادی رہا۔ ان کا اہم مقصد تائیوان کو جو ایک جداگانہ ریاست بن گیا تھا چین کی براعظم کے ساتھ متحد کرنا تھا۔

1945 کے بعد شاید تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب چین میں آیا۔ وہاں کسانوں کی اکثریت والا سماج جس میں دیسی اشراف(Native Elites) کا غلبہ تھا (اور جہاں ملکی تجارت بیشتر انگریزوں، فرانسیسیوں اور امریکیوں کے ہاتھ میں تھی) ایک سوشلسٹ ریاست میں تبدیل ہوگیا جسے عوامی جمہوریہ چین پیپلز ریپبلک آف چائنا یاPRC) کہا جاتا ہے۔ سوشلسٹ ریاست میں صنعتی پیداوار اور تجارت پر ریاست کی ملکیت ہوتی ہے اور وہاں کی پالیسی اشتراکیت پر مبنی زراعت کی حامی ہوتی ہے اور زمین کی ملکیت بھی اجتماعی یا اشتراکی ہوتی ہے۔

1980 کی دہائی سے CCP کی قیادت نے مینوفیکچرنگ اور کمرشیل سرگرمیوں میں آزاد انٹرپرائز کو فروغ دیا ہے۔ 1993 تک عوامی جمہوریہ چین کی صنعتی پیداوار کا دس فیصد سے بھی کم حصہ مرکزی منصوبہ بندی کے تحت تھا۔ 1980 کی دہائی سے عوامی جمہوریہ چین نے ان ملکوں کی ہزاروں بلین امریکی ڈالر غیر ملکی سرمایہ کاری کو قبول کیا ہے جو نظریاتی طور پر چین کے مخالف ہیں۔ کچھ ماہرین معاشیات کا اندازہ ہے کہ 2020 تک عوامی جمہوریہ چین کی معیشت دنیا کی سب سے بڑی معیشت ہوگی جیسا کہ 1800 سے پہلے تھا لیکن معاشی نرم پسندی (Liberalization) اور کچھ سرکاری قاعدے قانون میں تخفیف نے 1980-1949 کے ہیں رجحان کو الٹ دیا ہے جب کہ C.C.P کا مقصد چینیوں کو ہر ممکن طور پر زیادہ مساوی بنانا تھا۔

ایک طرف تو عوامی جمہوریہ چین نے مغربی جارحیت اور نیوکلیر ہتھیار بنانے کی مذمت کی لیکن دوسری طرف وہ 1960 کی دہائی کے شروعاتی سالوں میں ایک نیوکلیر ریاست بن گیا۔ چینی رہنماؤں نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے فوجی تعمیرات کو جائز ٹھہرایا کہ امریکی رہنماؤں نے کوریا کی جنگ (1953-1950) کے دوران عوامی جمہوریہ چین پر نیوکلیر بم گرانے پر غور کیا تھا۔ اسی زمانے میں عوامی جمہوریہ چین اور سوویت یونین کے تعلقات 1950 کی دہائی میں اور زیادہ خراب ہوگئے۔ اسی لیے ماؤ یہ کہتے تھے کہ مارکسزم اور لینن ازم دونوں کو

نوٹ

چینی حالات اور ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے ان کو نیز دیگر رہنماؤں کو بھی سوویت غلبہ کا اندشیہ تھا۔ 1960 اور 1970 کی دہائیوں میں سوویتوں نے امریکہ کے خلاف ویت نامی کمیونسٹوں کو ان کی جدوجہد میں مدد دی تھی لیکن عوامی جمہوریہ چیلی نے ویتنامی کمیونسٹ تحریک کی مدد سے انکار کرلیا۔ اسی زمانے میں عوامی جمہوریہ چین نے افریقہ میں کمیونسٹ حامی عوامی جدوجہد کی مدد کر رہا تھا۔ چین کی ترقیاتی مدد تیسری دنیا کے بہت سے ملکوں تک وسیع تھی۔

متن پر مبنی سوالات 26.4

1۔ ایسے دوملکوں کے نام بتایئے جنھیں CCP نے 1930 کی دہائی سے چین کا دشمن سمجھا؟

2۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کمیونسٹ قیادت نے 1980 کی دہائی سے سوشلزم اور ترقی کے اپنے تصورات میں سدھار پیدا کیا؟

3۔ عوامی جمہوریہ چین (PRC) نے ویتنام کی جدوجہد آزادی کی مدد کی یا اس کی حوصلہ شکنی کی؟

26.6 مابعد نوآبادیاتی دنیا میں "ترقی" کے مسائل (Problems of Development in The Post-Colonial World)

دوسری عالمی جنگ کے دوران اور اس کے بعد بڑی طاقتوں کے رہنماؤں نے اس بات کو تسلیم کرلیا تھا کہ دنیا میں امن اور ثبات کے لیے دولت کی مساوی عالمی تقسیم ضروری ہے۔ 1945 کے بعد دولت کی پیداوار اور تجارت تک رسائی کے معاملات کے نپٹارے کے لیے یو این او، بین الاقوامی مانیٹری فنڈ اور عالمی بینک جیسے ادارے قائم کیے گئے۔ بین الاقوامی مانیٹری فنڈ ان ریاستوں کے لیے قرض کا انتظام کرتی ہے جو اپنی برآمدات سے اتنا حاصل نہیں کر پاتے کہ اپنی درآمد پر آنے والے اخراجات کو توازن میں رکھ سکیں۔ عالمی بینک اکثر ترقیاتی امداد کے ایک اضافے کے طور پر روپیہ قرض دیتا ہے تاکہ قرض پانے والے ممالک آبپاشی اور ہائڈرو الیکٹرک نظاموں اور ایسے ہی ان دوسرے بنیادی ڈھانچوں میں سدھار لا سکیں جن سے پیداواریت اور معاشی تحفظ میں اضافے کی امید ہو۔

بہرحال بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ ادارے ان ممالک کے مفادات کی پاسداری کرتے ہیں جو پہلے سے ہی ترقی یافتہ ہیں۔ عالمی مانیٹری فنڈ قرض لینے والے ملکوں سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے خساروں کو کم کریں یہ اور اپنے

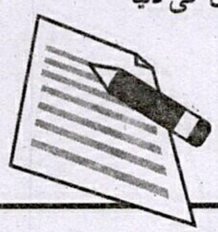

نوٹ

خساروں کو کم کرنے کے لیے ''سماجی خرچوں'' (مثلاً صحت و تندرستی، تعلیم اور ہاؤسنگ وغیرہ) میں کٹوتی نہ کریں۔ عالمی مانیٹری فنڈ حکومتوں کو اپنی کرنسی کی قیمت کم کرنے (Devalue) کا بھی مشورہ دیتے ہیں جس سے ان کی برآمداتی مصنوعات عالمی منڈی میں سستی ہو جائیں۔

1945 کے بعد یو این او کی مستقل سلامتی کونسل میں سوویت یونین، ریاستہائے متحدہ امریکہ، نیشنلسٹ چین (1970 کی دہائی تک)، عظیم برطانیہ اور فرانس شامل تھے۔ سرد جنگ کے زمانے میں لگ بھگ دو تہائی ایسے معاملات میں جن پر سلامتی کونسل میں ووٹنگ ہوتی تھی برطانیہ اور فرانس امریکہ کا ساتھ دیتے تھے اور عالمی سیاست نیز عالمی معاشی مسائل پر امریکی ترجیحات اور فیصلوں کی تائید کرتے تھے۔

آزادی اور انصاف کے حوالے سے ترقی یافتہ ملکوں اور سرمایہ دار سوسائٹیوں کے رہنماؤں کے دعوے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے کچھ لوگوں کو بناوٹی اور صرف مکاری کی ایک تدبیر لگتے تھے اور جو سیاست وہ ترتیب دیتے تھے وہ ان کو منافقانہ لگتی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ سنیما، اخبارات و جرائد اور ٹیلی ویژن وغیرہ کے ذریعے تمام دنیا کے لوگوں کا مغربی سرمایہ دارانہ طرز زندگی سے رابطے اور شناسائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ معاشی اور دیگر سرگرمیوں کی تنظیم کے مغربی اور خاص طور پر امریکی طریقوں کے دل دادہ ہوگئے۔ ایک امریکی ماہر معاشیات ڈبلیو. ڈبلیو. روسٹو کا ماننا تھا کہ سابقہ نوآبادیات برطانیہ جیسی صنعتی ریاستوں کے طریقے پر چل کر اور اپنی زراعتی پیداوار بڑھا کر اور آزاد تجارت کی پالیسیوں کو اپنا کر صنعت کو ترقی دینے کے لیے سرمایہ جمع کر سکتی ہیں اور اس طرح معاشی جدیدیت (Economic Modernity) کو حاصل کر سکتی ہیں۔ ترقی کے اس تصور کو ''ماڈرنائیزیشن تھیوری'' کہتے ہیں۔

ارجنٹائنا اور برازیل جیسے کچھ ملکوں نے اسی نمونے (Model) کو اپنا لیا اور اپنی صنعت کو ترقی دی لیکن بہت سے لاطینی امریکی، افریقی اور ایشیائی ملکوں میں 1960 اور 1980 کی دہائیوں کے درمیان ترقیاتی بحران کی علامتیں نظر آئیں یعنی وہاں صنعتیانے کا عمل بھی جامد رہا اور غریبی بھی بڑھی۔ 1960 کے بعد لاطینی امریکہ میں غیر ملکی کمپنیوں نے جتنا پیسہ لگایا تھا اس سے کہیں زیادہ (منافع کے طور پر) نکال لیا۔ پرائیویٹ بینکوں اور آئی ایم ایف جیسے اداروں سے لیے گئے قرضوں سے صورت حال میں کچھ سدھار نہ ہوا اور 1980 کی دہائی میں لاطینی امریکہ کی ریاستوں کو دو سو بلین امریکی ڈالر سے زیادہ کی رقوم کی واپسی یا ادائیگی کرنی پڑی۔ 1990 کی دہائی کے شروع میں لاطینی امریکہ میں 60 فیصد سے زیادہ ایسے خاندان تھے جن کو روٹی، کپڑا اور مکان کی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہ تھیں۔ افریقہ میں یہ معاشی حالت اور بھی ابتر تھی۔ 1980 کی دہائی میں کچھ افریقی ریاستوں (جیسے زائرے اور برونڈی) کو منفی نمو (Negative Growth) کا سامنا کرنا پڑا۔

لاطینی امریکہ کے معاشی اور سیاسی مبصرین نے روستو جیسے ماہرین معاشیات کے دلائل پر اور کچھ مغربی رہنماؤں کی ترقیاتی پالیسیوں پر سخت تنقید کی ہے۔ اس تنقید کو کبھی کبھی ماتحتی نظریہ (Dependncy theory) یا کم ترقی کا نظریہ (Under development theory) بھی کہا جاتا ہے۔ راؤل پربش (Raul Prebisch) اور ماتحتی

نوٹ

نظریہ کے دیگر حامیوں کا یہ دعوا ہے کہ اسپین اور پرتگال کے صدیوں کے راج اور پھر کئی دہائیوں تک برطانیہ، امریکہ اور دوسری حکومتوں کے اقتصادی غلبہ نے لاطینی امریکہ کو اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ اپنی آزادی سے استفادہ کر سکے اور خاص طور پر مادی ضروریات جیسے نوکریوں اور اقتصادی وسائل سے استفادہ کے معاملات میں آزادی کے ثمرات سے بہرہ مند ہو سکے۔ پریبش (Prebisch) ہی کی طرح افریقہ میں والٹر روڈنی (Walter Rodney) نے 1970 کی دہائی میں یہ مشاہدہ کیا کہ نوآبادیاں اس ماتحتی کے طور طریقوں (Dependency Patterns) سے جسے صدیوں کی نوآبادیت پسندی نے جنم دیا ہے آسانی کے ساتھ نکل نہیں سکتیں۔ (دیکھیے اکائی 5.1، سامراجیت پر مباحثہ)۔ انھوں نے یہ ادعا بھی کہا کہ جب تک بڑے زمیندار یا مالکان زمین غریب کسانوں اور محنت کشوں کا استحصال بند نہیں کریں گے اس وقت تک زراعت کا پچھڑاپن ختم نہیں ہوگا۔ بڑی بڑی جائیدادوں (جیسے ہندوستان میں زمینداری) کو توڑ دیا جائے اور زمین کسانوں کو دوبارہ تقسیم کردی جائے۔

تیسری دنیا کے بہت سے کامیاب سیاسی رہنماؤں نے سوویت یونین اور چین کے تجربات سے متاثر ہوکر ریاستی ملکیت یا اینٹر پرائزز اور وسائل پر ریاستی کنٹرول پر مبنی معاشی ترقی کی پالیسی کو اختیار کرلیا۔ انھوں نے یہ بھی کوشش کی کہ بہت زیادہ منافع غیر ملکوں اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کو نہ جانے پائے اور آزاد تعلیم اور قابل برداشت طبی سہولیات وغیرہ کے ذریعے غریبوں کی حالت کو سدھارا جائے۔ مثال کے طور پر کیوبا میں فیڈل کاسترو (-1927) نے 1950 کی دہائی کے اواخر میں ایک قومی انقلاب کی رہنمائی کی اور ایسی پالیسیوں کو اپنایا جو کیوبا کے لوگوں کے مفاد میں تھی۔ کاسترو کا یہ انقلاب لاطینی امریکیوں میں بہت مقبول ہوا جو اپنے اپنے ملکوں کی آمریت جسے امریکہ مدد دے رہا تھا مسلسل غیر ملکی اثرات سے ناخوش تھے۔ کیوبا کے لوگوں کی اکثریت امیر ملکوں کے لوگوں کے مقابلے بہتر معیار زندگی رکھتی ہے۔

1960 کے بعد لاطینی امریکہ کے دیگر رہنماؤں نے کچھ معاملات میں کیوبا کی مثال کو اپنایا۔ 1970 میں ایک سوشلسٹ رہنما سلواڈور ایلنڈی (Salvador Allende) چلی کے صدر منتخب ہوئے۔ اپنی مختصر حکومت میں انھوں نے چلی کے ان معدنی وسائل کو قومیانے کی کوشش کی جن پر غیر ملکی کارپوریشنوں کا کنٹرول تھا۔ بہر صورت سلواڈور ایلنڈی کو ہٹا دیا گیا اور امریکہ کی مدد سے اندرونی دشمنوں نے ان کو 1970 میں قتل کردیا۔ ان کی جگہ جنرل پنوشے (General Pinochet) نے 1990 تک ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے حکومت کی۔ حال ہی میں ایک فوجی افسر ہیوگو شاویز (1954) کو 1998 میں وینزوئیلا کا صدر منتخب کیا گیا۔ شاویز نے وینزوئیلا سے غریبی کے خاتمے کے لیے ریاستی ملکیت کی تیل کمپنیوں کے ریوینیو کا استعمال کیا۔ شاویز کی صدارت کے اولین سالوں میں سماجی پروگراموں پر حکومت نے ڈرامائی طور پر زیادہ رقوم خرچ کیں اور اس طرح اس کو زیادہ موثر طور پر امریکہ کی مزاحمت کرنے کا موقع ملا۔ کیوبا میں کاسترو کی حکومت اور وینزوئیلا میں شاویز کے عروج سے ترقی پذیر دنیا کے ملکوں میں قوم پرستانہ اور عوام پسند طرز ترقی کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 26.5

دونوں کالموں کے صحیح جوڑے بنائیے:

1۔ ڈبلیو ڈبلیو روستو(W.W. Rostow)	''ادائیگی کے توازن'' کے مسائل کا بندوبست کرنا
2۔ عالمی مانیٹری فنڈ(IMF)	کیوبا
3۔ پریبوش(Prabisch)	وینزوئیلا کا عوام پسند رہنما
4۔ فیڈل کاسترو	ماڈرنائزیشن تھیوری
5۔ شاویز	ماتحتی کا نظریہ(Dependency theory)

آپ نے کیا سیکھا

آج دنیا ایسی قومی ریاستوں(Nationstates) میں بدل گئی ہے جو رسمی طور پر اپنے معاملات کی آزادانہ طور پر دیکھ بھال کر سکتے ہیں یوروپی طاقتیں اب اپنے سے بڑے اور اپنے سے زیادہ آبادی والے علاقوں یا مقبوضات (Terriories) پر حکمراں نہیں رہیں قومی آزادی کی سیکڑوں تحریکیں جن میں سے کچھ دوسری جنگ عظیم سے پہلے شروع ہوئی تھیں، جنگ کے بعد کامیاب ہوگئیں۔ اگرچہ کچھ قوموں کی اور کچھ ایسے لوگوں کی قوم پرستانہ علاحدگی پسند تحریکیں بھی باقی رہیں (جو دوسری قوموں کے ساتھ مل جانا چاہتے تھے یا اپنی الگ قوم بنانا چاہتے تھے) لیکن ایسے بین الاقوامی ادارے اور تنظیمیں بھی موجود ہیں جو ان تنازعات کو کم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تنظیمیں تو اس لیے بنی تھیں کہ یہ سابقہ نوآبادیوں اور دنیا کے غریب خطوں کی ترقی میں مدد کریں۔ آزادی کی قومی جدوجہد کے پچاس سال بعد بھی پانچ یا چھ ریاستیں باقی دنیا کی دولت سے زیادہ دولت پر قابض ہیں۔ دنیا میں نامساوی معاشی قوت کے بارے میں مباحثہ بھی جاری ہے۔

اختتامی سوالات

1۔ (امریکہ اور فرانس کے) قدیم ماڈران انقلاب اور 1917 کے روسی انقلاب، نے بیسویں صدی کی قومی آزادی کی تحریکات کو کس طرح متاثر کیا؟

2۔ نوآبادی مخالف تحریکات کے کچھ ایسے رہنماؤں کی نشاندہی کیجیے جو اپنے نوآبادیاتی آقاؤں کے ملکوں میں رہتے اور کام کرتے تھے؟

3- دوسری عالمی جنگ سے یا اس کے نتیجے میں کون سی نوآبادیاتی مخالفت یا قومی آزادی کی جدوجہد شروع ہوئی؟

4- یہ کہنا کیوں صحیح ہے کہ بیسویں صدی کا چینی انقلاب تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب ہے؟

5- قومی ترقی کا کچھ اہم اور مختلف تدابیر یا طریقۂ کار بیان کیجیے۔

6- عالمی تجارت اور ترقی کو یکساں بنانے کے لیے کون سے بین الاقوامی ادارے وجود میں آئے؟

نوٹ

متن پر مبنی سوالوں کے جوابات

26.1

1- آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، کناڈا

2- سامراجی افواج میں نوآبادیات کے لوگوں کو ہمنوا بنانے اور جنگی صنعتوں میں ان کے شریک ہونے سے نوآبادیات میں بسے لوگوں کو یہ حوصلہ ملا کہ وہ مکمل شہریت کے حقوق اور قومی آزادی کے طلبگار ہوگئے۔

3- الجیریا، ملایا، انگولا، موزبیق، ویتنام

26.2

1- افریقی ڈکیٹٹر

2- انڈونیشیا

3- ہندوستان پر مشتمل ہے

4- 1945 میں قائم ہوئی

26.3

1- سوویت یونین(USSR) نے 1945 کے بعد قومی آزادی کی کئی تحریکوں میں مدد کی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے قومی آزادی کی کئی تحریکوں کو دبایا اور کئی دوسری تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی۔ بڑی طاقتوں نے قومی آزادی کی رحتیکات یا جدوجہد کو دبانے کی کوشش کی البتہ اس بات کا انحصار اس بات پر رہا کہ وہ اپنے مخالفین پر کتنا دباؤ بنا سکتے ہیں۔

2- جنوبی کوریا، تائیوان، ہانگ کانگ، سنگاپور

3- افریقہ اور لاطینی امریکہ

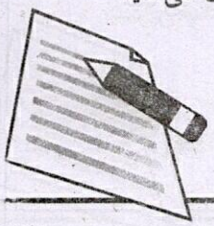

نوٹ

26.4

1۔ جاپان اور امریکہ - 1957 سے قبل عوامی جمہوریہ چین کے تعلق سوویت یونین سے بھی اچھے تھے۔ PRC کے تعلقات عظیم برطانیہ سے اس لیے خراب تھے کہ برطانیہ نے (1997 تک) ہانگ کانگ پر قبضہ برقرار بنائے رکھا۔

2۔ پچھلی تین دہائیوں کے مقابلے CCP نے 1980 کی دہائی میں قومی صنعت کے ایک چھوٹے حصے پر کنٹرول کرلیا۔ اس نے غیر ملکی سرمایہ کی دعوت بھی دی اور بڑے پیمانے پر اسے یہ غیر ملکی سرمایہ حاصل بھی ہوا۔

3۔ عوامی جمہوریہ چین نے امریکہ کے مقابلے میں ویتنام کی مدد نہ کی (حالانکہ سوشلسٹ نظریہ کے مطابق اس کو ایسا کرنا چاہیے تھا۔

26.5

1۔ ماڈرنائزیشن تھیوری

2۔ ادائیگی کے توازن کے مسائل کو درست کرنا

3۔ ماتحتی نظریہ (Dependenncy Theory)

4۔ کیوبا

5۔ وینزونیلا کا عوام پسند قومی رہنما

اختتامی سوالات کے اشارے

1۔ دیکھیے پیرا 26.1

2۔ دیکھیے پیرا 26.4

3۔ دیکھیے پیرا 26.2، 26.4

4۔ دیکھیے پیرا 26.5

5۔ دیکھیے پیرا 26.6 ذیلی پیرا 4 سے 9

6۔ دیکھیے پیرا 26.6، ذیلی پیرا

نوٹ

فرہنگ (Glossary)

ترک نوآبادیات (Decolonization) — سامراج کے برعکس عمل، اس میں نوآبادیاں سیاسی طور پر آزاد ریاستیں بننے لگتی ہیں۔ تاریخی طور پر ترک نوآبادیات کا عمومی زمانہ 1945 سے 1990 کے درمیان ہے۔

سرد جنگ (Cold War) — 1945 سے 1990 کا زمانہ جب دونئی بڑی طاقتوں (سوویت یونین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ) نے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکر جنگ نہیں کی (جسے گرم جنگ کہہ سکتے ہیں) بلکہ اس کے برخلاف غائبانہ جنگ (Proxy war) کے ذریعے ایک دوسرے کی توسیع پسندی کی مخالفت کی۔ سرد جنگ کے اہم بنیادی جھگڑے یہ تھے کہ سوویت ویت نام کی قومی تحریک آزادی کا مددگار تھا اور امریکہ افغانستان میں سوویت یونین کے قبضے کے خلاف آزادی کے لیے لڑنے والے افغانیوں کی مدد کر رہا تھا۔

ناوابستہ کی تحریک (Non-Aligned Movement) — سابقہ نوآبادیاتی ریاستوں کی انجمن -1950 کی دہائی سے یہ انجمن بڑی طاقتوں یعنی امریکہ اور روس کی نئی ماتحتی سے بچنے کے لیے قائم ہوئی۔ نام (Non Aligned Movement) ممالک میں ہندوستان، پاکستان، مصر، کیوبا اور انڈونیشیا شامل ہیں۔ ناوابستگی کے عہد کے باوجود نام ریاستیں فوجی دفاع یا تجارت اور معاشی مبادلہ جیسے معاملات میں کسی نہ کسی بڑی طاقت کی ماتحت ہوگئیں۔

تیسری دنیا (Third World) — 1950 کی دہائی کے شروع میں استعمال ہونے والی ایک اصطلاح۔ اس اصطلاح سے ترقی (معاشی ماڈرنائزیشن) کی ضرورت مند سابقہ نوآبادیاتی علاقوں یا مقبوضات کا اظہار ہوتا ہے۔ پہلی دنیا (First World) سے دولت مند سرمایہ دار یا غیر سوشلسٹ ریاستیں، مراد ہیں جن میں برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا شامل ہیں جبکہ دوسری دنیا میں (1990 تک) سوویت یونین اور وہ دوسری یوروپی ریاستیں مراد ہیں جو سوشلسٹ ترقی کے راستے پر گامزن تھیں۔ ان میں پولینڈ اور بلغاریہ شامل تھے۔

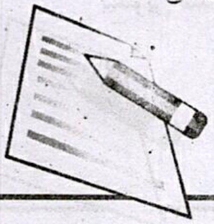

نوٹ

ترقیاتی امداد (Developmet Assitance) — دولت مند ریاستوں (یا ایسی ریاستوں کی انجمنوں) کے ذریعے معاشی ماڈرینائزیشن کے لیے غریب ملکوں کو دی جانے والی امداد یا قرض۔ سرد جنگ کے زمانے میں ترقیاتی امداد بڑی طاقتوں یا ان کے اتحادیوں کے ذریعے اس لیے دی جاتی تھی تا کہ سابقہ نوآبادیاتی ریاستیں سوویت یونین یا امریکہ کے ساتھ تعاون کریں۔

نظریہ جدیدیت (Modernization Theory) — معاشی ترقی کا ایک نظریہ جسے امریکی ماہر معاشیات ڈبلیوڈبلیو روسٹو نے 1950 کی دہائی میں متعارف کرایا۔ روسٹو اس بات میں یقین رکھتا تھا کہ معاشی ترقی اور ماڈرنائزیشن میں صنعتیانے (Industrializations) کا عمل بھی شامل ہے لیکن اس سے پہلے سرمایہ دارانہ زراعتی ترقی ہونی ضروری ہے۔ موٹے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ برطانیہ، امریکہ اور جرمنی ایسی مثالیں تھیں جن کو تیسری دنیا کے ملکوں نے اپنی ترقی کے لیے نمونہ بنایا۔

مارکیٹ سوشلزم (Market Socialism) — اس اصطلاح کو عوامی جمہوریہ چین کے رہنماؤں نے 1980 سے اپنی مخلوط یا متحدہ ترقی کی حکمت عملی کو بیان کرنے کے لیے استعمال۔ تمام ملک میں ایک مضبوط (معاشی) منصوبہ بندی اور وسائل (ذرائع پیداوار) کی ریاستی ملکیت کے بجائے (جیسا کہ 1980 سے پہلے ہوتا تھا) مارکیٹ سوشلزم میں سرمایہ داروں کو یہ اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنے سرمایہ کاروں نیز غیر ملکی شریکوں کے لیے منافع پیدا کریں۔ ایسے خصوصی ''آزاد انٹر پرائز زون'' تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ جن میں چینی ریاست نے سرمایہ داری (Capitalism) کو یہ اجازت دے دی ہے کہ وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتی ہے۔

27

سماجی بدلاؤ

(Social Transformation)

سبق 26 میں آپ نے ان تبدیلیوں کے بارے میں پڑھا ہے جو انیسویں صدی میں نوآبادیاتی توسیع اور سرمایہ دارانہ صنعتیانے (Industrialization) کے ساتھ آئیں۔ اس سبق میں ہم اس گفتگو کو بیسویں صدی تک آگے لے جائیں گے کیونکہ دراصل انیسویں صدی جن سماجی اعمال (Social Processes) کے لیے مشہور ہے وہ سماجی اعمال بیسویں صدی میں بہت تیز رفتار اور بہت گہرے ہوگئے۔ ان میں سے کچھ سماجی اعمال تو بالکل ناقابل تغیر یا اٹل تھے اور انسانی زندگی پر ان کے اثرات بھی بہت گہرے ثابت ہوئے۔

بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں نہ صرف یوروپ میں سوشلسٹ سماجوں کی شکست وریخت (Collapse) ہوئی بلکہ سرمایہ دارانہ خوشحال ریاستیں بھی بکھر گئیں۔ ہم آئندہ سطور میں ان میں سے کچھ امور کی طرف اشارے کریں گے اور سرمایہ دار اور سوشلسٹ دونوں سماجوں میں جو سماجی بدلاؤ آئے ان کے فرق کو بھی واضح کریں گے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ:

- یہ بتا سکیں گے کہ دنیا کے بڑے حصوں میں صنعتیانے (Industrializaiton) کا جو عمل ہوا اس سے ہر جگہ مختلف سماجوں میں کون کون سی بنیادی تبدیلیاں واقع ہوسکیں۔
- یہ بھی سمجھ سکیں گے کہ ترقی یافتہ ملکوں اور بیسویں صدی میں نوآبادیت سے آزاد ہوئے ملکوں کے درمیان رونما ہونے والے اعمال میں بھی فرق ہے۔

نوٹ

- ترقی یافتہ ملکوں میں بھی وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ جو سماجی تبدیلیاں آئیں ان کا پتہ لگا سکیں گے؛
- سوشلسٹ اور سرمایہ دار ملکوں کے درمیان جو فرق ہیں ان کی نشاندہی کر سکیں گے۔

27.1 موت اور پیدائش کی شرح میں آنے والی تبدیلیاں (Demographic Changes)

انیسویں صدی میں موت اور پیدائش کی شرح کی جو صورت حال تھی وہ بیسویں صدی میں بھی رہی۔ 1990 کی دہائی میں دنیا میں پانچ یا چھ بلین انسان تھے اور شاید یہ تعداد پہلی عالمی جنگ کی شروعات کے مقابلے میں تین گنا تھی۔ یہ تعداد اسی صدی میں ان 187 ملین اموات کے باوجود تھی جو فطری اور دیگر اسباب کی بنا پر واقع ہوئی تھیں۔

بیسویں صدی میں دنیا کی آبادی میں ایک پائدار بڑھوتری ہوئی۔ مغربی یوروپ اور شمالی امریکہ میں اس پائدار بڑھوتری کی وجہ خاص طور پر اچھی صحت کی سہولتیں، شیر خوار بچوں کی شرح اموات میں گراوٹ اور سماجی تحفظ کے ان نظاموں کی توسیع تھی جن کے سبب طویل زندگی ممکن ہوئی۔ مشرقی یوروپ اور دوسرے براعظموں میں اس اضافے کا سبب شرح پیدائش کا زیادہ ہونا تھا۔ لیکن

1930 سے اس سلسلے میں مشرقی یوروپ میں ایک روبہ کمی کا رجحان نظر آتا ہے اور 1960 کی دہائی تک پہنچتے پہنچتے سارے یوروپ میں شرح پیدائش میں کمی آجاتی ہے لیکن شرح اموات میں کمی سے اس کی تلافی ہوجاتی ہے۔ اس طرح تمام ترقی یافتہ دنیا میں آبادی میں بڑھوتری ہوئی ہے۔

بہر حال، بیسویں صدی کی دونوں عالمی جنگوں نے یوروپ میں آبادی کے اضافے پر منفی اثرات مرتب کیے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ لوگ بڑی تعداد میں مارے گئے بلکہ شادیوں میں تاخیر اور خاندانی زندگیوں میں دخل بھی اس کا سبب ہے۔

1945 کے بعد ترقی پذیر ممالک میں تیزی کے ساتھ آبادی میں اضافہ ہوا اور اس اضافے میں آبادی کی شرح بھی مغرب کے مقابلے زیادہ تھی۔ ان ملکوں میں بہتر طبی سہولتیں بھی بیسویں صدی میں میسر آئیں لیکن ساتھ ہی ساتھ زراعت پر منحصر پرانے دھرّے پر چلنے والے سماج کی شرح میں اضافہ تیزی سے ہوا۔ (زراعت کے غلبے والے سماجوں میں تصور یہ ہوتا ہے کہ زیادہ بچے ہوں گے تو خاندان میں کام کرنے والے بھی زیادہ ہوں گے اور والدین کو تحفظ بھی زیادہ ملے گا)۔

ایک موازنہ کے مطابق بیسویں صدی کے آخر میں مغربی دنیا میں عالمی آبادی کا صرف 1/6 حصہ آباد تھا۔

انسانی موت و پیدائش کی شرح میں تبدیلیوں کا تعلق اس بات سے بھی ہے کہ انسان کس طرح بستیاں بسا کر رہتے ہیں اور ان کی آبادی کی تقسیم کس طرح ہے۔ مثال کے طور پر مسلسل ہجرتوں اور انتقال آبادی نے بیسویں صدی میں

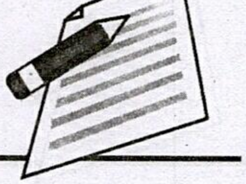

آبادی کی تقسیم پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ 1915-1901 تک بڑے پیمانے پر یوروپ سے مہاجرت ہوئی۔ شمالی اور مشرقی یوروپ ایسے خاص علاقے تھے جہاں سے مہاجرت ہوئی۔ جبکہ شمالی یوروپ سے لوگ گئے بھی اور وہاں آئے بھی۔ البتہ مغربی یوروپ سے ہجرت کرنے والوں کے مقابلے وہاں ہجرت کر کے آنے والوں کی تعداد زیادہ رہی۔ سیاسی عوامل کے ساتھ ساتھ مہاجرت کی ایک اہم وجہ محنت کشوں (Labour) کی ضرورت اور اس ضرورت کے نتیجہ میں ان کا ایک جگہ سے دوسری جگہ آنا جانا بھی ہے۔ مثال کے طور پر نازی پالیسیوں کی وجہ سے یہودیوں، اقلیتوں اور سیاسی قیدیوں کو جرمنی سے مجبور آ کر ہجرت کرنی پڑی لیکن جنگ کے بعد جب جرمنی کی تعمیر نو شروع ہوئی تو ترکی ورکروں نے جرمنی کا رخ کیا۔ روس اور اسپین کی خانہ جنگیوں کے نتیجے میں بھی لوگ اسی طرح سے ہجرت کر کے وہاں سے دوسرے مقامات کو چلے گئے۔

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آبادی میں بڑھوتری اور آبادی کے انتقال یا مہاجرت پر مختلف عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ آج غریب ملکوں کے لوگ مغرب کی طرف ہجرت کر رہے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ ماہر فن کاریگر یا تعلیم یافتہ مڈل کلاس کے لوگ ہیں اور غریب لوگوں کی اس قسم کی مہاجرت کے مواقع نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مغربی ممالک نے سخت قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ البتہ غریب آبادی مشرقی وسطی (Middle East) کی طرف مہاجرت کر رہی ہے۔

ہندوستان اور چین جیسے بہت سے ملکوں میں بیٹے کی چاہت یا بیٹی پر بیٹے کو ترجیح نے بھی سماج میں صنفی توازن (Gender Balance) کو برباد کر رہا ہے اور یہ مسئلہ بھی بہت سنگین بن گیا ہے۔

27.2 شہریانا (Urbanization)

جدید شہری زندگی مخصوص طور پر سرمایہ دارانہ صنعتیانے (Industrialization) سے جڑی ہوئی ہے۔ شہریانے کا مطلب ہے دیہی آبادی کے مقابلے شہروں کی اور شہری آبادی کی تیز رفتار نشوونما۔ اسی لیے شہریانا صرف آبادی کی فطری نشوونما (Growth) کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ دیہات سے شہروں کی طرف انتقال آبادی کا بھی نتیجہ ہے۔ دیہات سے شہروں کی طرف آبادی کا انتقال شہروں میں صنعتوں کے پھیلاؤ اور زیادہ معاشی مواقع کی فراہمی کے سبب ہوتا ہے۔ آپ نے اکائی 1 میں ان عملوں (Processes) کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ شہریانے کا عمل ساری دنیا میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ یہ یوروپ یا کسی ایک ملک میں بھی یکساں نہیں رہا اور نہ ہی یہ عمل اچانک رونما ہوتا ہے۔

صنعتی اور غیر صنعتی علاقوں کے درمیان اور ایسے ہی ان علاقوں میں جہاں زراعت میں مشینوں کا استعمال ہوتا ہے اور جہاں زراعت مشینوں سے نہیں ہوتی اس تبدیلی کی باقاعدگی یا اس کے تواتر میں بڑا اختلاف ہوتا ہے۔ صنعتوں کے پھیلاؤ اور صنعتوں کی ترقی سے بہت سے لوگوں کو خدمات اور مصنوعات کی پیداوار میں ملازمت حاصل کرنے آنا پڑا جن کی مرکزیت قصبوں اور شہروں دونوں میں تھی۔

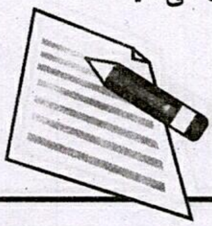

نوٹ

انگلینڈ (UK) سب سے پہلے صنعتی (Industrialized) ملک بنا۔ وہاں 1900 میں بھی شہریانے کا سب سے زیادہ عمل ہو چکا تھا اور وہاں کی شہری آبادی 77 فیصد تھی جبکہ جرمنی کی شہری آبادی 56 فیصد تھی حالانکہ وہاں صنعتیانے کا عمل اس حد تک زیادہ تیزی سے ہو چکا تپا تھا۔ شہری مراکز کی آبادی کے مقابلے دیگر ملکوں کی آبادی آدھی سے بھی کم تھی۔ اگر ہم پوری دنیا پر نظر دوڑائیں تو اس صدی کی شروعات تقریباً 70 فیصد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی تھی۔

بیسویں صدی کا زمانہ وہ ہے جب سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے پیداوار میں زبردست تبدیلی آئی۔ اس زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ شہریانا یا اربنائزیشن (Urabanization) بہت وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ 1975 کے آس پاس ریاستہائے متحدہ امریکہ اور انگلینڈ میں 95 فیصد سے زیادہ نوکر پیشہ آبادی مینوفیکچرنگ اور خدمات (services) میں لگی ہوئی تھی اور 5 فیصد سے بھی کم کھیتی باڑی میں لگی تھی۔ یوروپ کے اندر (روس کو چھوڑ کر) 1980 کی دہائی کے وسط تک 70 فیصد سے زیادہ آبادی شہری علاقوں میں رہتی تھی، جاپان میں 80 فیصد سے زیادہ آبادی مینوفیکچرنگ اور خدمات میں لگی تھی جبکہ 20 فیصد سے کم زراعت میں مشغول تھی۔

شہریانے (Urbanization) کے عمل سے بہت بڑے بڑے شہروں کی نشوونما بھی ہوئی اور ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں میں چھوٹے شہروں کی نشوونما ہوئی۔ 1900 میں 16 بڑے شہر تھے جن کی آبادی دس لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ 1950 میں شہروں کی تعداد 67 اور پھر 1985 میں 250 سے بھی زیادہ ہوگئی۔ ایک کل کی حیثیت سے دنیا میں 1980 تک کم از کم 40 فیصد لوگ بڑے شہروں میں رہنے لگے اور آج ان کی تعداد 50 فیصد ہے۔ آپ اپنے ہی ملک کا رجحان دیکھتے ہوں گے کہ ہزاروں لوگ نوکریوں اور روٹی کی تلاش میں بڑے شہروں کی طرف آتے ہیں۔ درحقیقت ترقی پذیر ملکوں میں دنیا کے کچھ بہت بڑے شہر آباد ہیں جیسے کولکاتا، دہلی، ممبئی، قاہرہ، شنگھائی، نیروبی، سیول اور بنکاک وغیرہ۔

متن پر مبنی سولات 27.1

1۔ دنوں عالمی جنگوں نے آبادی کی نشوونما پر کس طرح اثر ڈالا؟

2۔ جرمنی میں سیاسی عوامل نے آبادی کی مہاجرت کو کس طرح متاثر کیا؟

3۔ شہریانے (Urbanization) سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

4۔ ترقی بذیر ملکوں کے کچھ بڑے شہروں کے نام بتایئے۔

نوٹ

27.3 جدید طبقاتی سماج (Modern Class Society)

سرمایہ دارانہ انڈسٹریلائزیشن کے نتیجے میں ایک جدید طبقاتی سماج کی نشوونما ہوئی۔ جدیدی طبقاتی سماج سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اس سے قبل جو سماجی طبقات تھے وہ ایک سرمایہ دارانہ معیشت اور سوسائٹی میں تبدیل اور ضم ہوگئے۔ دو نئے سماجی طبقے بھی وجود میں آئے ایک بورژوا اور دوسرا کام کاجی طبقہ(Working Class)۔ ماقبل سرمایہ داری سماجوں پر جاگیرداروں اور زمیندار اشرافیہ کا قبضہ تھا۔ دنیا کے مختلف حصوں جب اور جہاں سرمایہ دارانہ انڈسٹیریلائزیشن شروع ہوا تو یہ لوگ غیر معمولی طور سے متاثر ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے شہر وجود میں آنے لگے اور ان کی آبادی میں بھی اضافہ ہونے لگا اور فطری طور پر سماجی ڈھانچے میں بھی تبدیلیاں آئیں لیکن یہ سماجی ڈھانچوں میں تبدیلیاں نہ تو تمام دنیا میں یکساں طور پر وجود میں آئیں اور نہ ہی اچانک طور پر۔

یوروپ کے بیشتر حصے کے لیے انیسویں صدی کا زمانہ بہت اہم رہا ہے کیونکہ اس زمانے میں جاگیردار اور زمیندار اشرفیہ کی زندگی میں تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ انگلینڈ میں یہ لوگ جدید مالکان زمین(Land lords) بن گئے اور زمین کے اور دیگر سرمایہ دارانہ کام کاجوں مثلاً تاجرانہ لین دین، کان کنی اور ریلوے وغیرہ سے دولت حاصل کرنے لگے۔ بیسویں صدی میں یوروپ کی اشرافیہ نے اپنی بالادستی کو برقرار رکھا۔

سرمایہ دارانہ انڈسٹیریلائزیشن اور زراعت میں سرمایہ داری کی نشوونما کے بعد بھی کسان(Peasant) سماجوں کا ایک اہم رکن رہے۔ لیکن چونکہ سرمایہ دارانہ معیشت ان کی زندگی میں داخل ہوچکی تھی اس لیے کسان بھی کئی طبقوں یعنی دولت مند، غریب اور متوسط (Middle) میں بٹ گئے اور جائداد، خطاکاری اور ریاستی اقتدار کو مختلف انداز سے دیکھنے لگے۔ بے زمین زراعتی محنت کشوں کا ایک اور طبقہ بھی وجود میں آگیا۔ 1940 کی دہائی میں زراعت کے اندر مشینوں کا استعمال شروع ہونے تک بھی یوروپ میں محنت کشوں کی بڑی تعداد میں کمی نہ آئی۔ مالکان زمین کے ساتھ ان کا رشتہ ان کے سماجی اور سیاسی تجربات کا اہم پہلو رہا۔

بہر حال بیسویں صدی کے نصف آخر میں تقریباً تمام مغربی دنیا سے کسانی(Peasentry) غائب ہوگئی اور جاپان جیسے ملکوں اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں عام طور سے ان کسانوں کی تعداد میں ایک ڈرامائی گراوٹ آئی۔ البتہ صحرائی افریقہ(Sub-Saharn Africa) ہندوستان اور چین میں کسانوں کی بڑی تعداد موجود رہی۔

تیسری دنیا اور خاص طور پر ایشیا اور افریقہ میں حکومتوں نے کسانوں کو جو مراعات دیں اس کے نتیجے میں بحران پیدا ہوئے اور ان علاقوں میں کسانوں کے لیے ایک بہت بیچارگی کی حالت پیدا ہوگئی بے زمینی میں اضافہ ہو رہا ہے اور کارپوریٹ زراعت کے بڑے بڑے کھیتوں میں برآمداتی فصلیں اگائی جانے لگیں۔ مغرب کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کی طرف سے برآمداتی فصلوں کی مانگ سے غذائی فصلوں کی پیداوار میں کمی آگئی اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ کسانوں کی اکثریت کو غذا کی قلت کا سامنا کرنا پڑا۔ صورت حال یہ پیدا ہوگئی کہ ہزاروں کسانوں نے خودکشی کرلی اور امدادی قیمتوں، زراعت کے لیے ضروری اشیا کی کم لاگت اور آبپاشی کے لیے بجلی اور پانی کو لے کر

کسانوں نے تحریکیں شروع کردیں۔ چین نے اپنے کسانوں کو بڑی تیزی کے ساتھ سیاسی نظام سے ہم آہنگ کرلیا اور جونکہ وہاں صنعتی مقاصد کے لیے زراعتی زمین کی مانگ بھی چل رہی ہے اس لیے پچھلی دو دہائیوں میں بازار کے اصلاحات کے نتیجہ میں بے چینی بھی پیدا ہوئی ہے۔

بیسویں صدی میں ایک ابھرتے ہوئے اور بالاخر طاقتور سماجی طبقے کی حیثیت سے بورژوا(Bourgeosie) کا ظہور ہوا۔ انیسویں صدی کے اواخر سے تمام مغربی یوروپ میں بورژوا کے درمیان سب سے دوست منداور بااثر سرمایہ دارلوگ تھے جن میں صنعت کار، کارخانوں کے مالکان، ساہوکار اور کان مالکان شامل تھے۔ متوسط طبقے (مڈل کلاس) میں بھی دکاندار، منیجر، وکیل، ڈاکٹر، انجینئر، ٹیچر اور نوکری پیشہ لوگ شامل تھے۔ تعلیم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس طبقے میں بھی توسیع ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے دوران اس میں نچلے متوسط طبقے (Lower Middle Class) کے وہ لوگ بھی شامل ہونے لگے جو کم تنخواہوں والے درجات کی نوکریاں کرتے تھے۔ سماج کا یہ حصہ مالی اعتبار سے بہت غیر محفوظ تھا اور بازار کے نشیب و فراز خاص طور سے کساد بازاری سے بہت متاثر ہوتا تھا۔

محنت یا کام کی اجرت پر انحصار کرنے والے کام کا جی طبقے(Working Class) کی تشکیل براہِ راست سرمایہ دارانہ صفت کی نشوونما سے جڑی ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے تمام یوروپ میں کام کاجی طبقے کی الگ سے شناخت رہی۔ دراصل مشینیت(Mechanization) اچانک نہیں آئی اور نہ ہی ساری صنعتوں میں بیک وقت شروع ہوئی۔ بڑے کارخانوں کے ظہور میں آنے سے کچھ فنی یا ہنرمندانہ دستکاریاں ختم بھی ہوگئیں لیکن ساتھ ہی کچھ دوسرے دستی کام اور بھی شروع ہوگئے جن کے لیے ہنرمند ورکر کی ضرورت پڑی۔ مثلاً نئے ہنرمند کا کاریگر دھاتوں کے کام، بجلی کے کام اور بعد میں الیکٹرانک کے کاموں سے جڑ گئے۔ بعد میں تو ہنرمند دستکار، گھریلو ورکر، درزی، لانڈری کا کام کرنے والے، چھاپہ کا کام کرنے والے، معمار اور تعمیراتی کام سے جڑے لوگ، پوسٹ اور ٹیلیگراف ورکر، ریلویز میں مختلف کام کرنے والے، کان کنی کرنے والے، کارخانوں میں ہنرمند اور غیر ہنرمند کاریگر یہ سبھی لوگ بڑے بڑے شہروں میں ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ ان ہی کاریگروں کے ساتھ عورتوں کا بھی بڑا اہم کردار تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ان کی تعداد بہت بڑی تھی اور دوسرے اس وجہ سے کہ اس سے قبل ان کاموں کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوئے نہ تھے۔ یہ ساری باتیں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی نوآبادیاتی دنیا پر بھی صادق آتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ جب وہ آزاد ہوگئیں تب بھی کام کاجی لوگوں اور عورتوں کی صورت حال یہی رہی۔

27.4 بڑے شہر اور سماجی زندگی (City and Sociallife)

بڑے شہروں اور سماجی زندگی نے امیر وغریب کے درمیان کی تقسیم کو اور نمایاں کردیا۔ رہنے کے لیے امیر اور غریب دونوں کے پاس الگ الگ جگہیں تھیں اور وہاں میسر آنے والی سہولتیں بھی قطعاً مختلف تھیں۔ کئی کئی منزلہ عمارتوں،

بڑے بڑے اسٹورز، شاپنگ مال، پارک اور سایہ دار سڑکوں، جدید ترین شہروں کے منظر کو بالکل بدل کے رکھ دیا ہے لیکن ان ہی سب چیزوں کے ساتھ آلودگی، گندے نالے، جھگی جھونپڑی والی گندی بستیاں، ایک ایک کمرے والے رہائشی مکان جن میں دو دو تین خاندان آباد رہیں اور بے گھر لوگ بھی ان ہی بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ جدید شہروں کی صورتحال آج بھی یہی ہے۔ اس کے علاوہ بے کاری یا بے روزگاری آج کی سب سے بھیانک حقیقت ہے۔

27.5 خاندان (Family)

سرمایہ دارانہ انڈسٹریلائزیشن کی آمد کے ساتھ مشترکہ اور وحدانی (Nuclear) دونوں ہی خاندانوں میں بہت اہم تبدیلیاں آئی ہیں اس معاشی انقلاب سے پہلے کسی گھرانے کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ اس کے خاندانی کاموں اور اس کی محنت مزدوری کو اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بھلے ہی مرد اور عورتیں غیر مساوی طور پر مختلف کام انجام دیتی ہوں۔ اگرچہ خاندان (Family) اشیائے صرف کے استعمال اور ان کے خرچ کے معاملے میں آج بھی ایک اکائی ہوسکتی ہے لیکن سرمایہ دار انڈسٹریلائزیشن کے ساتھ ساتھ اب خاندان پیداوار کی ایک اکائی نہیں رہا۔

کارخانوں اور مینوفیکچرنگ کرنے والوں کو اجرت پر کام کرنے والوں کی ضرورت تھی اور خاندان کا ہر فرد جداگانہ طور پر کماتا تھا۔ بورژوا اقدار کے غلبے کی وجہ سے ایک مرد کی اجرت کو ''خاندان کی اجرت'' سمجھا جانے لگا یعنی یہ کہ پورے خاندان کو اس پر گذارا کرنا تھا اور عورت کا کام گھر میں رہنا اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ بہرحال، یہ متوسط طبقے کے طور طریقے تھےجن کو کام کاج کرنے والے خوشحال خاندان پسند کرتے تھے لیکن یہ بیشتر کام کاجی لوگوں کے طور طریقے نہ تھے۔

کام کاجی طبقے کی عورتیں بھی مردوں ہی کی طرح اجرت پر کام کرتی تھیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سی صنعتیں عورتوں اور بچوں کو اس لیے ملازم رکھنا پسند کرتی تھیں کیونکہ ان کو کم پیسے دے کر بھی کام چل جاتا تھا۔ مساوی کام کی مساوی اجرت کا اصول عملاً لاگو نہ تھا۔

عملی طور پر

جدید دنیا میں عورتوں کو عام طور پر دوگنی ذمہ داری نبھانی پڑتی ہے۔ وہ کام کاج کرکے کماتی بھی ہیں اور اپنے گھر کے کام کاج کی بنیادی ذمہ داری بھی پیدا کرتی ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے آپ سب بھی واقف ہیں۔

متن پر مبنی سوالات 27.2

1۔ وہ کون سے دو نئے طبقے تھے جو صنعتی انڈسٹریلائزیشن کے ساتھ ظہور میں آئے؟

____

2۔ متوسط طبقے (Middle Class) میں کون کون لوگ شامل ہیں؟

____

3۔ بڑی فیکٹریوں کے ظہور میں آنے سے کام کرنے والوں (Workers) پر کس طرح اثر پڑا؟

____

4۔ صنعتی انڈسٹریلائزیشن کا عورتوں کی ملازمت (Employment) پر کیا اثر پڑا؟

____

27.6 عورتوں کی مساوات اور نسائیت پسندی
(Womens Equality and Feminism)

بیسویں صدی میں معیشت کی توسیع اور خواندگی کی شرح میں اضافے سے کام کاجی عورتوں اور متوسط طبقے کی عورتوں دونوں کے لیے کئی راہیں کھل گئیں۔ گھریلو خدمات کے علاوہ اب عورتیں دکانوں اور بازاروں میں کام کرنے لگیں، نرسیں اور اسکول ٹیچر بننے لگیں اور ان کاموں کو تو عملاً عورتوں کا کام سمجھا جانے لگا دونوں عالمی جنگوں نے عورتوں کے لیے نئے امکانات پیدا کر دیے۔ کیونکہ جنگ میں جانے والے مردوں نے جن کاموں یا نوکریوں کو چھوڑا پھر عورتوں نے ان ہی کاموں کو کرنا شروع کر دیا۔ اس صورت حال سے عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کی توقعات دونوں میں تبدیلیاں آگئیں۔

متوسط طبقے کی عورتوں نے حق رائے دہی کا مطالبہ کیا۔ عورتوں کے حق رائے دہی کی حامی عورتوں کی تحریکیں ان کے مطالبۂ مساوات کا ایک حصہ بن گئیں۔ مغربی دنیا میں محنت کشوں کے عروج اور سوشلسٹوں کی تحریکوں نے عورتوں کی آزادی کے لیے مہمیز کا کام کیا کیونکہ یہ تحریکیں تمام مظلوم طبقوں کے لیے تھیں اور عورتوں سمیت تمام لوگوں کے لیے مساوات کو یقینی بنا کر پورے سماج میں بدلاؤ لانا چاہتی تھیں اس بات کو عورتوں نے زیادہ حقیقت پسندانہ سمجھا۔ عورتوں نے بڑی تعداد میں یونین اور دیگر سوشلسٹ تنظیموں کی رکنیت قبول کی لیکن قائدانہ کردار ان عورتوں کو کم ہی ملا۔ ان تنظیموں میں بھی عورتوں کی مساوات پر زور دینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مساوی تنخواہ کے مطالبات بھی اس وقت سامنے آئے جب عورتوں یا دانشور سوشلسٹ قیادت نے اس پر زور دیا۔

نوٹ

روزالگزمبرگ(Roza Luxemburg) اور بیٹرس ویب(Beatrice Webb) جانی مانی سوشلسٹ رہنما تھیں۔ اسی طرح کولیٹ(Coletter) اور سلما لاگرلوف(Selma Lagerlof) مشہور قلمکار تھیں۔ ان کے علاوہ ٹینس ٹورنامینٹوں ملاومبلڈن اور فرنچ اور امریکی اوپن میں عورتیں بیسویں صدی کے اوائل سے ہی حصہ لیتی آرہی تھیں۔ عورتوں نے صحافت اور فوٹوگرافی کو بھی اپنا پیشہ بنایا اور اس کے علاوہ ڈاکٹری اور انجینئرنگ میں بھی آگے آئیں۔ سوویت یونین کی عوامی تنظیموں میں عورتیں بڑی تعداد میں شامل تھیں۔ یہی نہیں بلکہ مرکزی پارلیمنٹ اور سائنسی اداروں میں بھی عورتوں کی نمائندگی تھی۔

روس میں کام کاجی طبقے کی تحریک میں عورتوں کی ایک اہم تعداد موجود تھی۔ کسان عورتیں عام انقلابی تحریک کا ایک حصہ بن چکی تھیں۔ روس اور نوآبادی مخالف تحریکوں میں عورتوں کو اس بات کا ایک موقع اور ماحول میسر آگیا تھا کہ وہ ان تحریکات میں بڑے پیمانے پر شرکت کریں۔ ہندوستان اور چین جیسے ملکوں میں عورتوں کی تعلیم کی حمایت اور ان کی سماجی پسماندگی کے خلاف سوالات جدوجہد آزادی کا حصہ بن چکے تھے اور ان عورتوں کے مسائل کو عورتوں اور مردوں دونوں ہی نے بہت زور وشور سے اٹھایا تھا۔ یہ بات 1917 کے روسی انقلاب کے بعد روس کی عورتوں پر بھی صادق آئی۔

1990 میں عورتیں سولہ ریاستوں میں حکومت کی سربراہ بن چکی تھیں۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ملکوں میں کام کاج کے مختلف میدانوں میں عورتوں کی تعداد میں غیر معمولی طور پر اضافہ ہوگیا۔ اس سلسلے میں ماریشس کی مثال نمایاں ہے۔ چین اور مشرقی یوروپ کے ملکوں میں عورتوں کو تقریباً 100 فیصد روزگار حاصل ہو چکا ہے۔

ان سب باتوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مساوات کے لیے عورتوں کی جنگ ختم ہوگئی ہے۔ یہ بات تو کسی بھی ملک کے لیے نہیں کہی جاسکتی۔ 1990 کی دہائی سے جدید لبرل معاشی پالیسیوں (Neo-liberal economic policies) نے بے روزگاری یا بیکاری کو بڑھاوا دیا ہے۔ ان معاشی پالیسیوں کے اثرات عورتوں پر بھی مرتب ہوئے ہیں۔ خود سابق سوشلسٹ ملک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں عورتوں کو غیر منظم سیکٹر میں کام کرنا پڑ رہا ہے جہاں نہ تو کاریگروں کے حقوق کا کوئی تحفظ ہے اور نہ ہی کم سے کم اجرت کی کوئی ضمانت۔ آج بھی عورتوں کے لیے گھریلو نوکریاں روزگار کا اہم ذریعہ ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہندوستان کے اندر صنفی بنیاد پر شیرخوارکشی (Infanticide) اور جنین کشی (Foeticide) میں اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں جہیز کے لیے عورتوں کو مار دینے کے واقعات اور تمام دنیا میں عورتوں پر گھریلو تشدد کے واقعات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔

27.7 کام کے ماحول میں تبدیلیاں (Changes in Work Patterns)

جیسے جیسے فیکٹری نظام نے ترقی پائی، کام کاج کے ماحول بدلتے گئے۔ یوروپ میں تو ایسا انیسویں صدی میں ہوا لیکن باقی ساری دنیا میں یہ عمل بیسویں صدی میں ہوا۔ اس کاریگر کے لیے کام کی جگہ فیکٹری ہوگئی اور ہر کاریگر یا

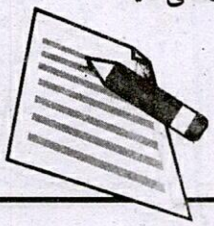

نوٹ

ورکر کے لیے کام کے اوقات مقرر ہوگئے۔ عورتوں اور بچوں کو بھی کارخانے جانا پڑتا اور فیکٹری کے قواعد وضوابط کی پابندی کرنی پڑتی۔ فیکٹری کے نظم وضبط کے (Discipline) کے اصول وضوابط کا ایک مرتب نظام تھا۔ کام کی کیا شکل ہوگی اور کام کی جگہ کیا ہوگی اس کا فیصلہ کرنا کسی کاریگر کا کام نہ تھا بلکہ مشین کا کام تھا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا کہ نئی ٹیکنالوجی کی شروعات کرنے سے کاریگروں کی بڑی تعداد فاضل ہوگئی۔ اس طرح بے کاری میں اضافہ بھی ہوا۔ اس کے علاوہ کام کرنے والوں کو نئی مشینری سے واقف ہونے اور اس کے مطابق خود کو ڈھالنے میں نئی مہارتوں کو سیکھنا پڑا۔

بیسویں صدی کے آخری حصے میں کام کے ماحول کے حوالے سے کچھ اور بھی تبدیلیاں آئیں۔ مغربی یوروپ کی کچھ کمپنیوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے لیے کام کو گھر پر ہی انجام دینا ممکن بھی ہے اور سستا بھی کیونکہ اس طرح ان کو دفتر کے رکھ رکھاؤ کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ سب تبدیلیاں ایسی تھیں جن سے مالکان کو بہت نفع تھا۔ مالکان سمجھتے تھے کہ ملازمین کام کو کبھی پورا انجام نہیں دیتے لیکن اب اس طرح وہ نہ چھٹی کا مطالبہ کرسکتے ہیں اور نہ دیگر سہولتوں کا کیونکہ اب تو وہ دفتر میں کام ہی نہیں کرتے۔ اب وہ کوئی ٹریڈ یونین بھی نہیں بناسکتے اور نہ دیگر ملازمین کی پریشانیوں اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوسکتے ہیں۔ پھر ایسے سافٹ ویر بھی دستیاب ہوگئے جن کے ذریعے مالکان ملازمین کے کام کی بہت قریب سے نگرانی کرسکتے ہیں اور کمپیوٹر نیٹ ورک کے ذریعے یہ جان سکتے ہیں کہ کس ملازم نے کتنے گھنٹے کام کیا یا وہ کب آیا اور کب گیا۔ آپ نے اخبارات میں ان لوگوں کے کام کرنے کا ماحول دیکھا ہوگا جو BPOs میں یا کال سینٹروں میں کام کرتے ہیں جن کی تعداد ہمارے ملک میں غیر معمولی طور پر بڑھ رہی ہے۔

ایک اور قسم کی تبدیلیاں بھی ہیں جو آوٹ سورسنگ (Out-sourcing) کے ذریعے آئیں ہیں۔ بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیوں نے یہ پتا چلایا ہے کہ اپنے کچھ کام تیسری دنیا کے ملکوں میں کرانا نسبتاً آسان اور سستا ہے کیونکہ ان ملکوں میں اجرتیں کم ہیں اور وہاں حکومتوں پر دباؤ بنا کر یہ باور کرایا جاسکتا ہے کہ یہ انٹرپرائز الجھنیں یا مسائل نہیں پیدا کرتیں اور ان کو ٹیکس کی مراعات حاصل ہیں۔ اس طرح کی آوٹ سورسنگ سے مغربی ملکوں میں کام کرنے والوں کو بے روزگاری کا سامنا ہے۔ اس سے تیسری دنیا کے لوگوں کو کچھ کام تو ضرور ملتا ہے لیکن بہت ہی کم اجرت پر۔

یوں کہیے کہ اس طرح بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں نے خون چوسنے والی دکانوں کا دور دوبارہ کردیا ہے۔ یہ کمپنیاں چھوٹے انٹرپرائزوں کو کام سپرد کردیتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پیداوار اپنے گھر میں ہوتی ہے۔ اس میں تنخواہیں یا اجرتیں کم سے کم ہوتی ہیں اور کاریگروں کا زیادہ سے زیادہ استحصال کیا جاتا ہے۔ کاریگروں کا یہ گروہ تیسری دنیا کے لوگوں میں بہت ہے اور ان میں زیادہ تر کام کرنے والی عورتیں ہوتی ہیں۔

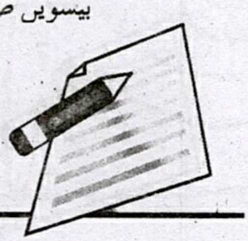

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 27.3

1۔ وہ کون سی نوکریاں تھیں جو بیسویں صدی میں عورتوں نے اختیار کیں؟

____

2۔ 1990 کی دہائی کی جدید لبرل (Neo liberal) معاشی پالیسیوں نے عورتوں کو کس طرح متاثر کیا؟

____

3۔ فیکٹری سسٹم نے کام کے ماحول کو کس طرح تبدیل کر دیا؟

____

4۔ آؤٹ سورسنگ سے کون سی تبدیلیاں آئیں وضاحت کیجیے۔

____

27.8 سماجی اور سیاسی تنظیمیں (Social and Political Organisation)

بیسویں صدی میں سیاسی اور سماجی تنظیموں کی حدود میں زبردست توسیع ہوگئی ہے۔ ملازمین، خواتین، طلبا اور مصنفین کی مختلف ٹریڈ یونینوں اور سیاسی پارٹیوں کے علاوہ اب ہر قسم کے نقطۂ نظر اور تعلیم، عوامی صحت اقلیتوں کے حقوق، انسانی حقوق، امن و آشتی کی تحریکات، کلچر، ماحولیات اور اس کا تحفظ، کریڈٹ اور اپنی مدد آپ گروپوں وغیرہ کے حوالے سے ہر قسم کی امنگوں اور آرزوؤں کا اظہار تنظیموں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اب زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس کی نمائندگی تنظیموں کے ذریعے نہ ہوتی ہو۔ ان میں سے بہت سی تنظیمیں اس بات کی بھی تنقید کرتی ہیں کہ سوسائٹیوں کی تنظیم کس طرح ہوتی ہے۔

27.9 سرمایہ داری سوشلزم اور نابرابری (Capitalism, Socialism and Inequality)

بیسویں صدی کی سائنٹفک اور ٹیکنالوجیکل کامیابیوں نے انسانوں کے لیے بڑی بڑی ترقی اور بڑے بڑے منافعوں کو ممکن بنا دیا۔ اب تمام دنیا کی آبادی کے لیے وسائل کی برقراری اور عام لوگوں کے معیار زندگی میں سدھار کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔ پھر بھی عالمگیریت (Globilization) اور بڑی بڑی مشینوں نے امیر و غریب کے درمیان خلیج کو وسیع کر دیا ہے۔ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود سوشلسٹ سماج مزید مساوی سوسائٹیاں عالم وجود میں لانے پر کامیاب ہوگئے جن میں بڑی بڑی خلیجیں نہ تھی ایسی خلیجیں جو ہمیں آج سرمایہ دار ملکوں میں اوا امیر و غریب کے درمیان نظر آتی ہیں۔

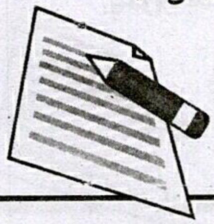

نوٹ

سوویت یونین اور مشرقی یوروپ میں سوشلزم کی شکست وریخت کے بعد، سرمایہ دار ریاستوں نے ہر جگہ فلاح و بہبود میں بڑے بڑے گھاؤ لگا دیے ہیں۔ اس کے نتائج اس دنیا کے لوگوں کی اکثریت کے لیے بہت مہیب ہیں۔

آپ نے کیا سیکھا

اس سبق میں آپ نے سیکھا کہ انیسویں صدی میں شروع ہوئے سماجی عمل (Social Processes) بیسویں صدی میں کس طرح گہرے اور تیز رفتار ہوگئے۔ ان ہی اعمال میں، انسانی موت اور پیدائش کی شرحوں میں تبدیلیاں، شہریانے (Urbanization) کا عمل اور شہری زندگی کی تبدیلیاں تھیں۔ سرمایہ دارانہ انڈسٹریلائزیشن سے تمام دنیا میں جدید طبقاتی سوسائٹی کا ظہور ہوا اور خاندانی نیز کام کے ماحول میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ سرمایہ دارانہ انڈسٹریلائزیشن سے عوامی تحریکوں اور ایسی سماجی و سیاسی تنظیموں کی نشوونما ہوئی جو سماج کے مختلف گروپوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔

سرمایہ دارانہ انڈسٹریلائزیشن بیسویں صدی میں توسیع ہوئی۔ اس سے عظیم ترقی کے امکانات پیدا ہوگئے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے دنیا میں نابرابری بھی پیدا ہوئی۔

اختتامی سوالات

1۔ مغربی یوروپ اور شمالی امریکہ کی آبادی بڑھنے کی اہم وجوہات بیان کیجیے۔

2۔ جدید طبقاتی سماج (Modern Class Society) سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

3۔ تیسری دنیا کے ملکوں میں زرعی بحرانوں کے اثرات کو بیان کیجیے۔

4۔ بڑے شہروں سے امیروں اور غریبوں کی الگ الگ زندگی کا کس طرح اظہار ہوتا ہے؟

5۔ محنت کش (Labour) اور سوشلسٹ تحریکوں نے عورتوں کو کس طرح متاثر کیا؟

6۔ کام کے ماحول میں کمپیوٹر کی وجہ سے جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کو بیان کیجیے۔

7۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کو کس طرح متاثر کیا ہے اس بات کو مثالیں دے کر سمجھائیے۔

8۔ کیا آج امیروں اور غریبوں کے درمیان خلیج بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ اس موضوع پر تفصیل سے بحث کیجیے۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالوں کے جوابات

27.1

1۔ بڑی تعداد میں لوگ مارے گئے، شادیوں میں تاخیر، خاندانی زندگیوں میں خلل

2۔ نازی پالیسیوں کی وجہ یہودیوں، اقلیتوں اور سیاسی قیدیوں کو جرمنی سے ہجرت کرنی پڑی۔ مابعد جنگ تعمیرات کی وجہ سے ترکی ورکروں نے جرمنی کی طرف ہجرت کی۔

3۔ انڈسٹریلائزیشن اور شہروں میں بہتر معاشی مواقع کی وجہ سے دیہات سے شہروں کی طرف آبادی کا انتقال

4۔ کولکاتا، دہلی، ممبئی، قاہرہ، شنگھائی، نیروبی، سیول، بنکاک وغیرہ

27.2

1۔ بورژوا (متوسط طبقہ)، کامکاجی طبقہ(Working Class)

2۔ صنعت کار، ساہوکار، وکیل، ٹیچر اور سروس سیکٹر کے دیگر پروفیشنل

3۔ کچھ لوگوں کے لیے نوکریاں یا روزگار کے مواقع بڑھے، کچھ لوگوں کو بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑا، فیکٹریوں میں اجرت پر کام کرنے والے مزدور یا ورکر، کام کاجی لوگ (Workers) کے اجزائے ترکیبی میں تبدیلی آگئی۔

4۔ گھر سے باہر نوکری، غیر مساوی تنخواہ، فیکٹری کا ڈسپلن

27.3

1۔ فیکٹریوں میں کام، اساتذہ

2۔ بیکاری میں اضافہ، پر منظم سیکٹر میں کام کرنے پر مجبور اور گھریلو کام کاج

3۔ جگہ، ماحول، کام کے اوقات، ڈسپلن کے قاعدے قانون

4۔ کچھ بڑی بین الاقوامی کمپنیاں کام تیسری دنیا میں کراتی ہیں جہاں اجرت کم ہے اور جہاں وہ حکومتوں کو آسانی سے یہ یقین دلا دیتی ہیں کہ ''یہ انٹر پرائز کوئی مشکل پیدا کرنے والے نہیں ہیں'' اور ان کو ٹیکسوں کی مراعات حاصل ہیں۔

اختتامی سوالات کے اشارے

1۔ دیکھیے 27.1 پیرا2

2۔ دیکھیے 27.3 پیرا1

3۔ دیکھیے 27.3 پیرا5

4۔ دیکھیے 27.4

5۔ دیکھیے 27.6 پیرا2

6۔ دیکھیے 27.7 پیرا2 اور 3

7۔ جواب کے لیے غور وفکر کیجیے۔

8۔ اپنے اپنے خیالات لکھیے۔

نوٹ

28

بیسویں صدی میں ثقافتی تبدیلی
(Cultural Change in The Twentieth Century)

بیسویں صدی کا تذکرہ اکثر اس صدی میں پیش آنے والے اہم واقعات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً بالشویک انقلاب، دو عالمی جنگیں، فاشزم اور نوآبادی راج سے ایشیائی اور افریقی ملکوں کی آزادی۔

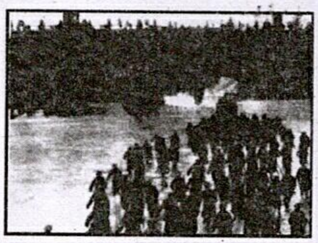

شکل 28.1.1: بالشویک انقلاب

شکل 28.1.2: افریقی آزادی

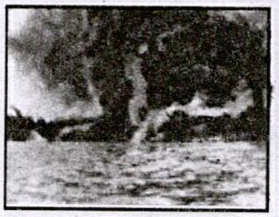

شکل 28.1.3: پرل ہاربر پر حملہ، دوسری عالمی جنگ

شکل 28.1.4: اٹلی میں فاشزم

شکل 28.1.5: ایتھوپیا کی آزادی

شکل 28.1.6: پہلی عالمی جنگ میں خندق (Trench)

درحقیقت یہ سارے واقعات بہت اہم تھے اور معاصر دنیا پر ان کے اثرات بھی بہت گہرے مرتب ہوئے۔ بہرحال یہ یاد رکھنا اہم ہے کہ سماج میں بدلاؤ صرف غیر معمولی واقعات سے نہیں آتا بلکہ معیشت، ثقافت اور موت وحیات کی شرح میں بہت سی سست رفتار اور طویل مدتی تبدیلیاں بھی اس معاملے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بیسویں صدی کا زمانہ بھی ایسا ہی تھا جس میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ ان میں سے کچھ تبدیلیاں بہت غیر محسوس طور پر بھی آئیں لیکن ان تبدیلیوں نے بالآخر دنیا کو موجودہ شکل دینے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

گذشتہ باب میں آپ نے کچھ ایسی ہی ارتقائی تبدیلیوں جیسے موت وحیات کی شرح میں غیر معمولی تبدیلیاں تیز رفتار شہرکاری (Urbanization) اور متوسط اور محنت کش طبقات میں زبردست اضافہ وغیرہ کے بارے میں پڑھا ہے جو پچھلی صدی میں رونما ہوئیں۔

مختلف ملکوں کے سماجی ڈھانچوں یا اہم سماجی گروپوں کے درمیان رشتوں میں تبدیلیوں کے ساتھ ہی ساتھ ثقافتی بدلاؤ بھی آیا۔ ثقافتی بدلاؤ (Cultural Transformation) کا مطلب ہے لوگوں کی اقدار، رویوں اور فنی ذوق (Artistic taste) میں تبدیلی۔ یہ ثقافتی بدلاؤ بھی اس زمانے میں سست رفتار اور طویل مدتی تبدیلیوں کے ساتھ آیا۔ درج ذیل باب میں ہم کچھ ثقافتی تبدیلیوں کا مطالعہ کریں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ کیا ان تبدیلیوں کا رخ ایک وسیع پیمانے پر پھیلی مشترکہ عالمی ثقافت کی طرف ہے یا ان ثقافتوں کے درمیان تناؤ اور کشمکش موجود ہیں۔

مقاصد

اس باب کے مطالعے کے بعد آپ:

- لفظ ثقافت کے مختلف مفاہیم کی وضاحت کرسکیں گے؛
- ثقافت کی توضیح وتشریح کی خصوصیات اور اس سے وابستہ مسائل کو بیان کرسکیں گے؛
- بیسویں صدی میں سائنس، آرٹ، مذہب، تعلیم، میڈیا، ذرائع تفریح، رویوں اور اقدار میں جو اہم تبدیلیاں آئیں ہیں ان کی نشاندہی کرسکیں گے؛
- اور عالمگیریت یعنی یک یکجہت عالمی معیشت وثقافت اور آج کے مغربی اقتدار و غلبہ کے خلاف مسلسل مزاحمت کے درمیان توازن کا جائزہ لے سکیں گے۔

28.1 ثقافت کی تعریف (Culture Defined)

بیسویں صدی کی ثقافتی تبدیلیوں کی بات شروع کرنے سے پہلے اس بات کا بھی احتیاط کے ساتھ جائزہ لینا مفید ہوگا کہ مختلف شعبوں میں اصطلاح ثقافت کے کیا کیا معنی ہیں؟

نوٹ

درحقیقت، سماجی علوم میں ثقافت بہت ہی پیچیدہ اصطلاح ہے۔ اس کی پیچیدگی صرف اس وجہ سے نہیں کہ لفظ ثقافت کا اطلاق رسوم و رواج، عادات و خصائل اور اقدار جیسی بہت سی صفات یا نسبتوں(Attributes) پر ہوتا ہے جن کی پیائش بہت مشکل ہے بلکہ اس وجہ سے یہ اصطلاح بہت پیچیدہ ہے کہ مختلف دانشوروں نے اس کو مختلف معانی کے لیے استعمال کیا ہے۔

مثال کے طور پر سرکاری اعلانات اور اخباری خبرناموں میں اس لفظ کا استعمال بنیادی طور پر فنی تخلیقات (Artistic creations) اور دانشورانہ کارناموں کے لیے ہوتا ہے۔ اس طرح اصطلاح ہندوستانی ثقافت (Indian Culture) سے عوامی موسیقی، مختلف قسم کے رقص وسرور اور ادبیات کا اظہار ہوتا ہے۔

اس معنی ومفہوم کے بالکل برخلاف ماہرین بشریات(Antropologists) نے لفظ ثقافت یا کلچر کو کسی فرقے یا سماج کے مکمل طرز زندگی کے لیے استعمال کیا ہے جس میں خوردنوش، ملبوسات، کام کاج، تفریحی مشاغل، عوامی رسم ورواج اور تیوہار وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ اس طرح کے استعمال میں اس لفظ کا مرکزی نقطہ عظیم فنکاروں اور مفکرین کے کلاسیکل کارنامے اور ان کی اعلیٰ تخلیقات نہیں رہتیں بلکہ اس میں روزمرّہ کے ان تمام اعمال وافعال اور رسوم ورواج پر زور دیا جاتا ہے جو کسی فرقے یا کسی سماج میں روایتی طور پر مقبول اور مروج ہوں۔ اس تعریف کے تحت ہندوستانی کلچر کے مطالعے میں مقبول عام تیوہار، روایات اور مذہب نیز ذات پات کی روایت کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔

لفظ کلچر کی ایک اور تشریح کے مطابق یہ کسی سماج میں بڑے پیمانے پر مروجہ اور تسلیم شدہ تمام اقدار، عقیدے اور رویےّ ہیں جن کو کسی بھی کلچر کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح ہندوستانی کلچر سے یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ اس میں مغربی دنیا سے کہیں زیادہ خاندانی رشتوں کی روایتی اقدار اور بڑوں کا احترام ضرور ہوگا کیونکہ مغربی دنیا میں اولاد اکثر و بیشتر اپنے والدین کو چھوڑ دیتی ہے اور ازدواجی رشتے بھی بہت کمزور ہوتے ہیں۔

سیرت، آدرش اور اعتقادات کے اس نظام سے قطع نظر مختلف ماہرین آثار قدیمہ جس چیز کو اہمیت دیتے ہیں وہ مادی کلچر یا یوں کہیے کہ قدیم سماجوں کے برتن، زیورات اور عمارتیں جیسی مشترکہ طور پر استعمال میں آنے والی مصنوعات (Artifacts) ہیں جن کے آثار کو یہ لوگ کھدائیوں(Excavations) کے ذریعے پتہ لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

اگر آپ ان تمام تعریفوں پر ایک مرتبہ اور غور سے نظر ڈالیں گے تو محسوس کریں گے کہ آپ دو مختلف معیاروں کو ذہن میں رکھ کر کلچر کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک معیار فنکارانہ اور دانشورانہ شائستگی کا ہے اور دوسرا تاریخی طور پر مقبول و مروجہ روایات کا۔ مؤخرالذکر معیار کی نشاندہی ہم مختلف سطحوں پر کر سکتے ہیں جیسے مادی اشیا، رسوم و رواج یا اقدار اور رویے۔ کلچر کے ان مختلف پہلوؤں کے پیش نظر ہم یہاں مختصر طور پر سائنس، فنون، تفریحی ذرائع، تفریحی مشاغل، اقدار، مذہب اور تعلیم کے شعبوں میں ہونے والی ان نمایاں تبدیلیوں اور ترقیوں کا جائزہ لیں گے جو بیسویں صدی میں ہم کو نظر آتی ہیں۔

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 28.1

1۔ بیسویں صدی میں رونما ہونے والی انقلابی تیز سست رفتار تبدیلیوں کی دو دو مثالیں لکھیے۔

2۔ لفظ کلچر (ثقافت) کی مختلف تشریحات کا موازنہ اور مقابلہ کیجیے۔ کیا ان تشریحات میں آپ کو کچھ مشترکہ خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔

3۔ سماجی علوم میں کلچر ایک مشکل اصطلاح کیوں ہے؟

28.2 سائنس اور ٹیکنالوجی (Science and Technology)

بیسویں صدی کا سب سے نمایاں کارنامہ یا کامیابی شاید سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبردست ترقی ہے جس نے اس مدت میں تعلیم اور ذرائع تفریحات سے لے کر مواصلات اور ذرائع حمل ونقل تک زندگی کے ہر پہلو کو بڑی برق رفتاری کے ساتھ متاثر ہی نہیں کیا بلکہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ کاریں، ہوائی جہاز، ریڈیو اور ٹرانسسٹر، فلمیں اور ٹیلیفون، کیلکولیٹر اور کمپیوٹر، مصنوعی سیارچے، موبائل فون، لیزرس اور اعضا کی تنصیب وتقلیب وغیرہ کچھ ایسی نئی مصنوعات اور خدمات (Products & Services) ہیں جن کو پچھلی صدی میں جدید ٹیکنالوجی نے ہمارے لیے ممکن اور میسر بنا دیا ہے۔

ان سائنسی اختراعات وایجادات کے پیچھے ان پیچیدہ ترقیات کا ہاتھ ہے جو ایٹمی طبیعات (Atomic physics)، جینیٹک (Genetic) اور سالماتی بائیولوجی (Molecular biology) اور فضائی تحقیقات کے سائنسی میدانوں میں انجام دی گئی ہیں۔ میری کیوری (Marie Curie)، البرٹ آئن اسٹائن، فن مین (Fynman) اور ہومی جے بھابھا کچھ ایسے مشہور سائنس داں ہیں جنھوں نے یہ عظیم انکشافات کیے ہیں۔

شکل 28.2.1: میری کیوری، ریڈیو ایکٹیویٹی کی دریافت

شکل 28.2.2: ریچرڈ پی فن مین نیوکلر سائنٹسٹ

شکل 28.2.3: البرٹ آین اسٹائن نیوکلیر سائنٹسٹ

شکل 28.2.4: ہومی جے بھا بھا

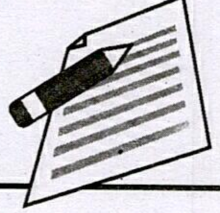

نوٹ

لیکن اب رفتہ رفتہ سائنسی ترقیاں کسی ایک انفرادی شخصیت کی رہین منت نہیں رہیں بلکہ دنیا بھر کے ملکوں کے سائنس دانوں کی ٹیمیں ترقی یافتہ ملکوں خاص طور پر امریکہ میں تحقیقاتی کاموں میں مشغول ہیں اور وہ ان تحقیقاتی مراکز میں محو تحقیق ہیں جن پر زبردست طریقے سے روپیہ پیسہ خرچ کیا جاتا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جہاں عصری سائنس اور ٹیکنالوجی نے لوگوں کو زبردست فائدے پہنچائے ہیں وہیں ساتھ ہی ساتھ سائنس سے لوگوں کے دلوں میں خوف اور اندیشے بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ جزوی طور پر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جدید سائنس کی جدید ترین پیش رفتوں کی سمجھ تعلیم یافتہ عام آدمی کو بھی نہیں ہے جس چیز نے جدید سائنس کو خوفناک بنا دیا ہے وہ ایک طرف تو مہلک اور تباہ کن ہتھیاروں کی تیاری ہے اور دوسری طرف روئے زمین پر نازک ماحولیاتی توازن کو اس سے لاحق ہونے والا خطرہ۔ ظاہر ہے کہ موجودہ عہد میں ان سائنس دانوں اور حکومتوں کی سماجی ذمہ داری اور جوابدہی بہت زیادہ ہے جو سائنسی تحقیقات کے فروغ میں لگے ہوئے ہیں۔

فنون اور ادب (Art and Literature)

بیسویں صدی میں سائنس کے علاوہ ادبیات، موسیقی اور مصوری (Painting) وغیرہ جیسی فنکارانہ تخلیقات کا میں قابل ذکر عروج ہوا اور اس کے علاوہ جیسے انوکھے اور فنکارانہ میڈیا کا بھی۔ اس عہد میں مختلف ممالک میں جن بڑی فنی تحریکوں (Art movements) نے جدید تخلیقی شہپاروں کو جنم دیا ان میں جدیدیت (Modernism)، سماجی حقیقت نگاری (Socialist Realism) اور مابعد جدیدیت (Post Modernism) بہت اہم ہیں۔ درحقیقت جدیدیت نے یوروپ کے اندر انیسویں صدی کے اواخر میں ایک ممتاز ادبی وفنی رجحان (Avantgarde) کی حیثیت سے ارتقا پایا اور بیسویں صدی میں یہ ایک عالمی رجحان بن گیا۔

اگرچہ جدیدیت کے مختلف شعبے (Streams) مثلاً علامت پسندی (Symbolism)، تاثر پسندی (Impressionism) اور سریت پسندی (Surrealism) وغیرہ ہیں لیکن ان سب کا ایک مشترکہ رجحان یہ رہا ہے کہ عالم اشیا اور عالم افراد کی تصویر کشی کے بجائے تحت الشعوری احساسات وخیالات کی زیادہ گہری دنیا سے پردہ اٹھانے پر زیادہ زور دیا جائے۔ اس کے علاوہ اس جدت پسندانہ توجیہہ کا داخلیت اور تحت الشعوری عناصر کے ساتھ اظہار کرنے کے لیے فنکارانہ اظہار (Artistic expression) کے روایتی طریقوں سے ماورا ہوکر نئے اور جرأت مندانہ تجربات کی کوشش کرنی چاہیے جو اکثر ناتجربہ کار ناظر (Viewer) کو بہت زیادہ تجریدی اور ناقابل فہم لگتے ہیں۔

کچھ ایسے ہی عظیم جدیدیت پسندوں میں جنھوں نے اس رنگ میں خود اپنے اسالیب کو ترقی دی ایک تو اسپین کا مصور پیبلو پکاسو (Pablo Picasso) ہے جو اپنی مصوری (Painting) میں کعبی مصوری (Cubism) یا اشکال کے کثیر جہتی مناظر (Multi dimensional view) کو متعارف کرانے کے لیے مشہور ہے یا دوسرا آئرلینڈ کا قلم کار جیمس جوائس (James Joyce) ہے جس نے اپنے شاہکار Ulysses میں شعور کی رو (The Stream of Conciousness) کی تکنیک کو شروع کیا۔

نوٹ

شکل 28.3: پکاسو

ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طرف تو اکثر جدت پسند فنکارانہ اظہار کے کی نیت نئی شکلوں کے ارتقا کے معاملے میں بڑے جرأت مند تھے اور نئے نئے تجربات کرتے رہتے تھے لیکن دوسری طرف وہ سماجی اور سیاسی نظریات کے معاملے میں اپنے دور کے سیاسی چیلنجوں کے تئیں بالکل ہی سرومہر(Apathetic) تھے اور جدید تہذیب یا خود انسانی حالات کے بارے میں بحیثیت مجموعی بہت زیادہ قنوطیت پسند رہے تھے۔

اسی زمانے میں فنکاروں کی ایک اور شاخ نے اشتراکی حقیقت پسندی(Socialist Realism) کے ذریعے اپنے کاموں میں سماجی بدلاؤ لانے کے لیے زیادہ ترقی پسندی اور زیادہ رجائیت پسندی کا اظہار کیا۔ جرمنی کے برٹولڈ بریلش(Bertold Brecht) اور برطانیہ کے جارج برنارڈ شا جیسے ڈرامہ نگاروں اور روس کے میکسم گورکی جیسے ناول نگار اور الیگزینڈر بلوک جیسے شاعروں کو اس رجحان کا منارۂ نور کہا جاسکتا ہے یہ شاعر اور مصنف سماج کے اجتماعی اور اشتراکی بدلاؤ کے آدرشوں سے متاثر تھے۔

بالشویک انقلاب اور سوویت یونین کی تخلیق نے بہت سے لوگوں اور ملکوں کو متاثر کیا اور نتیجتاً ان بہت سے غیرکمیونسٹ ملکوں میں جو نوآبادیاتی، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصال کے خوفناک جالوں میں پھنسے ہوئے تھے اشتراکی حقیقت پسندی(Socialist Realism) نے تخلیقی کام کو ایک فنی رجحان کے طور پر متاثر کیا۔ ہندوستان کی مثال دیکھیں تو یہاں 1940 میں مجاز اور جوش جیسے بڑے شاعروں نے انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کی جن کے جھکاؤ صریح طور پر بائیں بازو کی طرف تھا اور دوسرے بڑے مصنفین جیسے پریم چند نے اپنے دور کے کی دیہی زندگی کے واقعات کا حقیقت پسندانہ بیان کرکے اپنے گہرے سماجی تعلق اور تشویش کا اظہار کیا۔ چین میں بھی یہی ہوا وہاں ایک عظیم مصنف لوسُن(Lu-Husn) کی تحریروں میں اشتراکی جھکاؤ نمایاں تھا اور اسی طرح لاطینی امریکہ میں امریکہ مخالف جدوجہد نے پیبلونرودا(Pablo Neruda) کو حوصلہ مندی عطا کی۔

درحقیقت انیسویں اور بیسویں صدیوں میں ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکی ملکوں کے ادب اور فنون کی بہار عہد حاضر کی سب سے اہم ارتقائی تبدیلی ہے۔ ایک طرف تو ان ملکوں کے ادیبوں نے قوم پرستی کے جذبوں کو پروان چڑھایا تو دوسری طرف اپنے معاشروں میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ استحصال کے مسائل کا پامردی سے مقابلہ کیا

اور جدت پسندی کی تیز رفتار لہر کے ساتھ اپنی روایات کو ہم آہنگ کرنے کے چیلنج کو بھی قبول کیا۔ ایک سو سال قبل رابندرناتھ ٹیگور کی تخلیقی ذہانت سے لے کر لاطینی امریکہ کے گبریل گارشیا مارکوس (Gabrial Graaia Marques) اور افریقہ کے چن ہُوا ایسیبی (Chinhua Acebe) کی مابعد نوآبادیات شعری تخلیقات تک اشترا کی حقیقت پسندی سے وابستگی نے عہد جدید کی ادبیات کے کچھ بہترین شہپاروں کی تخلیق کی۔

فلسفہ اور علوم انسانی (Philosophy and the Human Science)

بیسویں صدی اور خاص طور سے دوسری عالمی جنگ کے بعد دنیا کے زیادہ تر ملکوں پر یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ اور اخبارات و رسائل سے وابستہ لوگوں نے انسانی علوم (سماجی علوم اور نفسیات) پر مظہری تبدیلیوں کو دیکھا۔

تاہم کتابوں کی نشر و اشاعت میں مقابلہ آرائی اور سماجی علوم کے ماہرین کے فروغ کے ساتھ ہی ساتھ تخصص اور بھاری بھرکم اصطلاحات یا بوجھل زبان کے استعمال کا رجحان بھی بڑھا۔ بھاری بھرکم الفاظ والی یہ زبان آج کی بیشتر علمی زبان کی خصوصیت بن گئی ہے۔

درحقیقت یوروپ میں سماجی اور فلسفیانہ سوالات اور تحقیقات کے بارے میں جامع اور غیر تخصصی طرز فکر سے تخصصی (Specialized) شعبوں کا جنم ابتدائی انیسویں صدی میں ہوا جب معاشیات، پولیٹکل سائنس، سوشیالوجی، انسانیات اور نفسیات کا ظہور ان کے خصوصی طریقوں اور غیر محدود سروکاروں کے ساتھ نمایاں شعبوں کی حیثیت سے ہو رہا تھا۔

اسی دوران اے جے ایّر (A.J Ayer) اور وِٹ جین اسٹائن (Wittgen stain) جیسے مفکرین کے زیر اثر فلسفہ نے اخلاقیات اور سیاسیات کے بارے میں وسیع تر سوالات کی تحقیق سے اپنی توجہ ہٹا کر مسائل کے اظہار کے لیے لگاتار زبان و علامات کی نوعیت کی وضاحت کے تنگ اور سخت اندازِ فکر پر مبذول کر دی۔

عظیم مفکر

شکل 28.4.1: ای پی تھامپسن

شکل 28.4.2: امرتیہ سین

نوٹ

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آج تحسیب(Causation)، انسانی فطرت اور تبدیلی کے بارے میں وسیع تر سوالات نہیں اٹھتے برٹرینڈ رسل، نوم چومسکی اور لوئس آلتھوسر جیسے عظیم مفکر متعلقہ مسائل پر لکھتے رہے ہیں۔

متن پر مبنی سوالات 28.2

1۔ بیسویں صدی کے چار ممتاز سائنس دانوں اوران کی دریافتوں کے نام بتائیے۔

2۔ ایسی اہم فنی تحریکات کے نام بتائیے جنھوں نے بیسویں صدی میں دنیا بھر کے فنکاروں اور قلم کاروں کو متاثر کیا؟

3۔ چند ایسے مفکرین کے نام بتائیے جو اخلاقی اور سیاسی موضوعات پر اس وقت بھی جدت پسندانہ آواز میں لکھتے رہے جب پچھلی صدی میں بیشتر عالمانہ اور تحقیقی تحریروں پر لفاظی اور انفرادیت پسندی کا غلبہ ہو چکا تھا۔

28.3 کلچرل ادارے اور علامتیں (CulturalInstitutions and Symbols)

سائنس دانوں، فلسفیوں اور فنکاروں کے بدلتے ہوئے نظریہ فکر اور کامیابیاں کلچرل تاریخ کے اہم پہلو ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ کلچرل تبدیلی کے مطالعے میں مذاہب، عوامی روایات وعقائد، زبان، تعلیمی نظام اور ماس میڈیا جیسے کلچرل اداروں میں ہونے والی تبدیلیاں بہت اہم ہیں۔ ماہرین نشریات ان کلچرل خیالات ونظریات یا عدالتی نظاموں کا حوالہ دیتےہیں جو اقدار کے مربوط نمونوں اور عالمی نظریہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ کلچرل علامتیں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں کیونکہ یہ نہ صرف معلومات، تفریحات اور عقیدہ یا زندگی کی ''معنویت'' کے حوالے سے انسان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں بلکہ یہ عوامی اقدار، عقائد، جذبات اور مختلف سماجی گرہوں کے درمیان مشترکہ طور پر مشاہدے میں آنے والے رویوں کی شکل وصورت متعین کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اکثر سوسائٹیوں میں تعلیم اور ماس میڈیا جیسے کلچر اداروں کا کنٹرول اور ان کے قواعد وضوابط اس صاحب اقتدار اشرافیہ(Dominant Elitis) کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو جائیداد اور طاقت پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ آپ کی بنیاد پر تفریق ذات پات کے رواج اور ستی وغیرہ کے بارے میں ہندو عقائد پر برہمنوں کے اثرات سے واقف ہی ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے کو خاص طور پر قدیم ہندوستان میں شودروں کی

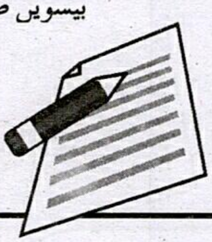

نوٹ

محنت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے فوائد پر اجارہ داری حاصل تھی۔ اسی طرح جدید زمانے میں بھی سرمایہ دار طبقے کا ماس میڈیا پر زبردست اثر ہے اور وہ عوامی عقائد اور رویوں کو اسی طرح متاثر کرتا ہے اور من چاہے طریقے سے موڑ لیتا ہے کہ استحصال شدہ عوام پر طاقت کے ذریعے یا طاقت کے استعمال کے بنا ہی ان پر غلبہ اور تفوق حاصل کر لیتا ہے۔

کلچرل اداروں کے چلن کے اس عالم نمونے کے تحت ان اداروں کی خصوصیات یا معنویت میں بہت سے فرق بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ گذشتہ صدی کا زمانہ تو درحقیقت وہ زمانہ تھا جب بدلاؤ کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس زمانے میں تعلیم، مذہب اور عوامی روایات وعقائد وغیرہ کے پیغام اور مواد میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے اہم کلچرل اداروں کے درمیان توازن میں بھی بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

زبانیں (Languages)

زبان کسی بھی کلچر کا اہم ترکیبی جز ہوتی ہے۔ بیسویں صدی میں دنیا کے لسانی نقشے پر زبردست بدلاؤ آیا۔ مقامی بولیوں کے علاوہ جنھیں عوام بولتے تھے سنسکرت اور لاطینی جیسی کلاسیکی زبانوں نے بھی جنھیں صدیوں سے اہل علم کے علمی اظہار کا ذریعہ ہونے کا فخر حاصل تھا ان منتخب قومی زبانوں کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دی جن کو ان خطوں نے اپنی ابھرتی ہوئی قومی شناخت کے اظہار کے لیے اپنالیا۔

اندازہ یہ لگایا گیا ہے کہ آج دنیا میں تقریباً 6500 زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے تقریباً آدھی زبانیں چھوٹے چھوٹے سماج بولتے ہیں اور یہ اسی لیے معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ دس بڑی زبانیں دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی کی مادری زبانیں ہیں۔ (ماخذ: فاؤنڈیشن اف ان ڈینجرڈ لنگویجز ویب سائٹ)

آج کے جدید دور میں دنیا کی زبانوں کے بدلتے ہوئے منظرنامہ کی ایک دوسری دلچسپ خصوصیت دولسانیت (Bilingualism) ہے یعنی یہ کہ تمام دنیا کے تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کا کم از کم دو زبانوں سے واقف ہونا۔ عالمگیریت (Globalization) اور انٹرنیٹ کے بڑھتے ہوئے استعمال کی وجہ سے انگریزی زبان خاص طور پر دوسری اختیاری زبان بن گئی ہے۔ حالانکہ آج بھی دنیا میں سب سے بڑا لسانی گروپ چینی ہے لیکن انگریزی جاننے والوں کی تعداد (عالمی آبادی کا تقریباً 10 فیصد) دوسرے نمبر پر ہے اور دوسری زبان کی حیثیت سے انگریزی جاننے والوں کی تعداد سب سے اونچی ہے۔

بیسویں صدی میں بڑھتی ہوئی تعلیم اور ماس میڈیا کے اثر کے تحت زبانوں کے درمیان سب سے بڑی تبدیلی ان کا بڑھتا ہوا اختلاط ہے۔ حالانکہ خود انگریزی زبان نے فرانسیسی اور ہندی سمیت دوسری زبانوں سے بہت سے نئے الفاظ لے لیے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سلسلے میں ہندی، اردو اور انگریزی زبانوں کی ایک مخلوط بولی ہنگلش (Hinglish) بھی پڑھے لکھے طبقے میں ارتقاپذیر ہوئی ہے۔

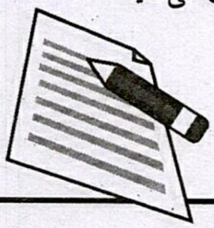

نوٹ

عوامی روایات(Folk Traditions)

بیسویں صدی کے اندر مختلف سماجوں کے کلچروں میں ایک اور بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ عوامی روایات، عقائد اور ذرائع تفریح وغیرہ کی صورت حال بدل گئی ہے۔ گذشتہ صدی میں اکثر ترقی پذیر ملکوں کے بہت سے روایات فنون و تفریح کی مختلف شکلیں مثلاً کٹھ پتلی کے تماشے، قصہ گوئی، اساطیری ڈرامے، لوک ڈانس وغیرہ بڑی خاموشی سے مفقود ہوگئی ہیں۔ قدیم گیت، قصے اور کہانیاں جنھیں مختلف فرقے اپنی اقدار اور نظریات کو دوسری نسل تک پہنچانے کے لیے استعمال کرتے تھے اب تیزی سے اپنا مقام کھوتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ یا تو وہ تفریحی پروگرام لے رہے ہیں جو پروفیشنل طور پر بنائے جاتے ہیں یا وہ خبروں کے پروگرام لے رہے ہیں جو جدید ماس میڈیا کے ذریعے نشر ہوتی ہے۔ اب البتہ ریاستیں اور دیگر شہری ایجنسیاں خاص طور پر ہندوستان میں ایسی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں کہ مالی امداد اور ادارہ جاتی تعاون سے ان لوک روایات کو محفوظ کیا جائے۔

مذہب(Religion)

ان عوامی روایات وعقائد(Folklore) کے علاوہ ایک اہم اور بڑا کلچرل ادارہ مذہب کا ہے۔ پچھلی صدی میں اس کے کردار کی حدبندی بیشتر سماجوں میں ہوگئی ہے۔ پچھلی صدی کے دوران ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دونوں ہی ملکوں میں زیادہ تر بشر دوستی، قومیت پرستی اور جمہوریت جیسے سیکولر نظریوں اور عقائد نے بڑی بڑی تحریکوں کو متاثر کیا ہے اور لوگوں نے ان ہی نظریات اور عقائد کے ساتھ اپنی وفاداریوں کو برقرار رکھا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ قومیت پرستی (کسی ملک، اسٹیٹ کے ساتھ وفاداری کا دعویٰ) یا بشر دوستی (آخرت کی زندگی سے زیادہ خود انسان کی قدر و قیمت زیادہ سمجھنا) مذہب کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ تقریباً تمام ہی ملکوں میں اکثر لوگ (خاص طور سے عورتیں) آج بھی خود کو مذہب کا ماننے والا بتاتے ہیں۔ مثال کے طور پر 1981 میں جو سروے امریکہ میں مذہبی عقائد کے بارے میں کیا گیا تھا اس کے مطابق تقریباً 10 فیصد لوگوں نے ہی خود کو منکر خدا(Atheist) بتایا تھا۔ اس کے علاوہ پچھلی صدی میں نہ صرف مذہبی سفروں اور یاتراؤں نیز مذہبی ادب اور مذہبی گانوں کی پیداوار میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں مذہب کا اثر کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خاص طور پر شہروں کے اندر ہمارے رسوم و رواج اور روزمرہ کے اعمال و افعال مثلاً ادب و آداب، کھان پان، تیوہار اور عوامی تقریبات میں مذہب کا اتنا اثر نظر نہیں آتا جتنا اب سے سو سال پہلے نظر آتا تھا دوسرے یہ کہ مذہبی اقدار اور مذہبی نظریات اب ہمارے بڑے بڑے سماجی اداروں جیسے ریاست اور فنون وغیرہ پر بھی اس طرح محیط نہیں ہیں جس طرح اس سے قبل ہوا کرتی تھیں بلکہ اس کے برعکس آج ہمارے اعمال و افعال عام مذہبی عقیدوں کے برخلاف انجام پاتے ہیں۔ اس طرح، صرف ایک صدی پہلے مغربی ممالک میں شادیوں کی رسوم چرچ میں انجام دی جاتی تھیں اور ہر نو مولود بچے کے لیے بپتسمہ(Baptism) ضروری ہوتا تھا۔ 1990 میں اس بات کا انکشاف فرانس میں ہوا کہ صرف 30 فیصد جوڑوں نے چرچ میں شادی کی۔ طلاق اور اسقاط جن کو چرچ

نوٹ

نے ممنوع قرار دیا تھا نہ صرف یہ کہ ان کو مغرب کے اکثر ملکوں میں قانونی درجہ حاصل ہوگیا ہے بلکہ اب ان کو بڑی حد تک قبول کر لیا گیا ہے اور ان پر اب کوئی انگشت نمائی بھی نہیں کرتا۔ افریقی اور ایشیائی ملکوں میں بھی ایسے ہی رجحانات نظر آرہے ہیں۔

تعلیم(Education)

آج بیشتر سماجی اداروں میں جاری و ساری اصول ونظریات کو مذہب طے نہیں کرتا اب سیکولر اور سائنٹفک معلومات پر مبنی جدید تعلیم کا دور دورہ ہے۔ ان جدید تعلیم یافتہ شہریوں کی ضروریات جو لکھنے، پڑھنے اور حسابدانی میں ماہر اور اپنی قومی تاریخ اور وراثت پر فخر محسوس کرنے والے ہیں یہ ہیں کہ وہ صنعتی سیکٹر، سروس سیکٹر اور سرکاری سیکٹروں میں نوکریوں کی خالی جگہوں کو پُر کریں اور قومی ریاست کے وفادار شہری ثابت ہوں۔

اکثر مغربی ملکوں نے انیسویں صدی میں ہی تعلیم کو لازمی اور کفایتی یا مفت کر دیا تھا۔ پچھلی صدی میں ایشیا اور افریقہ کی نوآزاد اقوام نے بھی اسی جہت میں کوششیں کیں حالانکہ وسائل کی کمی اور نوآبادیاتی اور اجنبی نظام تعلیم کی وجہ سے ان کو کم کامیابی ملی۔ ہمارے ملک میں آدھی سے زیادہ آبادی 1980 تک ناخواندہ رہی اور پچھلی دو دہائیوں میں ہی ایسا ہوا ہے کہ ناخواندگی کا تناسب تقریباً 25 فیصد نیچے آیا ہے۔

یونیورسٹی کی تعلیم میں بیسویں صدی کے وسط سے تیزی کے ساتھ توسیع ہوئی ہے۔ اس طرح 1939 میں برطانیہ اور فرانس جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں 0.1 فیصد سے بھی کم آبادی نے کالجوں میں داخلہ لیا۔ 1990 کی دہائی میں ان میں سے اکثر ملکوں میں تقریباً 2 فیصد آبادی کالج میں پہنچی (یعنی بیس گنا اضافہ ہوا) درحقیت 1960 اور 1980 کے درمیان ترقی پذیر ملکوں میں بھی اعلیٰ تعلیم میں زبردست اضافہ ہوا اور ان غریب تر ملکوں میں بھی اسی تناسب سے طلبا نے یونیورسٹیوں میں داخلہ لیا حالانکہ ان ملکوں میں پیشہ وارانہ(Vocational) تعلیم اور پرائمری تعلیم نے اب بھی ترقی نہ کی۔ معیشتوں کا سیکٹر بہت کم منظم ہونے کی وجہ سے ان ملکوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کی بے روزگاری کا مسئلہ بہت ہی سنگین رہا۔

یونیورسٹی طلبا سماجی اور کلچر احتجاج(Protest) میں بہت فعال رہے ہیں۔ طلبا کے بڑے احتجاج آج بھی اپنی شدت اور انتہا پسندی کی وجہ سے یاد رکھے جاتے ہیں۔ یہ احتجاج 1968 میں نیویارک اور سان فرانسسکو سے پیرس اور پراگ(Prague) تک جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئے تھے۔ دراصل اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نہ صرف اپنے ملکوں میں ریاستی پالیسیوں کو اور تعلیم کے میدان میں اشرافیہ پرستی کو کچلنا چاہتے تھے بلکہ انھوں نے ویتنام میں امریکی مداخلت کو چیلنج کرکے مضبوط آفاقیت کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی اور جنگ مخالف اور سامراج مخالف جذبات کو برانگیختہ کرنے کی زبردست جدوجہد کی۔ البتہ حالیہ دہائیوں میں خاص طور پر سوویت یونین کی شکست وریخت اور تفریحی چینلوں کی بھرمار کے بعد لگتا ہے تمام دنیا میں طلبا کے احتجاج میں کمی آگئی ہے۔

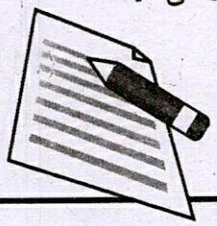

نوٹ

متن پر مبنی سوالات 28.3

1۔ متن میں مذکور اصطلاح کلچرل اداروں سے کیا مطلب ہے؟

2۔ بیسویں صدی میں دنیا کا لسانی منظر نامہ کیسے بدلا؟

3۔ ماس کمیونیکیشن کے ان مختلف نئے چینلوں کے نام بتائیے جنھوں نے خبروں، معلومات، تفریحات اور مذاکرات وغیرہ کے حصول کے موجودہ طور طریقوں کو ہی بدل کر رکھ دیا۔

28.4 عالمگیریت (Globalization)

نئی تعلیم، ماس میڈیا اور سیکولر سیاسی نظریات کے عروج نے بیسوی صدی کے ایک اور اہم واقعہ یعنی عالمگیریت (Globalization) کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور اسے ہی سیاسی عالمگیریت کو یکجہتی کی طرف گامزن دنیا کا ظہور کہہ سکتے ہیں جس میں ملٹی نیشنل تجارت، مینوفیکچرنگ، فائننس، اقوام متحدہ جیسی سیاسی اور فلاحی تنظیمیں اور عالمی سوشل فورم جیسے پروفیشنل اداروں کے بڑھتے ہوئے نیٹ ورک موجود ہیں جو لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو باہمی انحصار کے بندھنوں میں باندھے رکھتے ہیں بھلے ہی اس کی بنیاد مساوی شرائط پر ہو اور اس سے امیروں کی حمایت بھی ہوتی ہو۔

ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کی ترقی، شہری مالوں (Malls) اور انٹرنیٹ پر دنیا بھر کی سروسوں اور سامانوں کی فراہمی، خیالات، نظریات اخبار اور معلومات کی سستی اور فوری عالمی پیمانے پر ترسیل، فیشن، غذا اور تفریحی سامان و ذرائع کے عالمی رجحانات اور عالمی منڈیاں وغیرہ آج کی اصلی عالمگیریت کی نشانیاں ہیں۔

یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ بیسویں صدی میں عالمگیریت کا ظہور اچانک نہیں ہوگیا۔ عالمی تجرباتی نیٹ ورک اور طبی وفنی معلومات کے فروغ کا پتہ ہمیں پچھلے ادوار میں بھی ملتا ہے۔ سولہویں صدی سے یوروپی طاقتوں نے غیر یوروپی ملکوں کو اپنی نوآبادی بنانا شروع کیا۔ اس عمل سے دنیا کے اندر بڑے پیمانے پر عدم مساوات بڑھنے لگی۔ لیکن طاقتور اور دور رس غیر ملکی کارپوریشنوں اور انجمنوں کی نشوونما اور عالمی میڈیا کا پھیلاؤ صرف پچھلی صدی کی ہی خصوصیات ہیں۔

ان چینلوں سے سامان، سروسوں اور معلومات کا بہاؤ عالمی پیمانے پر ہونے لگا ہے اور ہوسکتا ہے کہ کچھ خطوں کو اپنی پسند اور ناپسندگی اور زیادہ سہولتیں دستیاب ہوں اور ان کو زیادہ خوشحالی مل جائے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان چیزوں

نوٹ

نے نہ صرف پرانے کلچرل طور طریقوں اور سماجی رسم و رواج کو بدل کر رکھ دیا ہے بلکہ تمام دنیا کو عام طور پر مغربی عادات و اقدار کی طرف مائل کر دیا ہے۔ ساری دنیا میں امیر و غریب کے درمیان کی کھائی بڑھا دی ہے۔

بدقسمتی سے تمام دنیا میں مغربی خیالات اور عادات کا پھر سے فروغ تو ہوا لیکن آزادی، مساوات اور جمہوریت کے اہم نظریات کی غیر مغربی دنیا میں درآمد ذرا مشکل ہی ہے البتہ مغربی خود پسندی نے مادیت پرستی، مشترکہ خاندانوں اور سماجی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ تنہائی اور عصبیت وغیرہ جیسی برائیوں کا پھیلاؤ آسان بنا دیا ہے۔ اکثر ترقی پذیر ملکوں میں بے انتہا غریبی، بدعنوانی، جرائم پسندی، لاقانونیت یا ڈکٹیٹرشپ آج بھی سرفہرست ہیں اور ان بیماریوں نے بڑے پیمانے پر صورت حال کو خراب کر دیا ہے۔

اس پس منظر میں یہ ذمہ داری نوجوانوں کے کندھوں پر ہے کہ وہ صحیح راستے کا انتخاب کریں اور اپنے اپنے ملکوں کو ان کلچرل اور سوشل تبدیلیوں کے بھنور سے باہر نکال لائیں جو اس نئی صدی میں بڑھ سکتی ہیں۔

آپ نے کیا سیکھا

جس طرح رہنما، جنگیں اور انقلابات دنیا میں اپنے غیر معمولی اثرات چھوڑتے ہیں وہیں موت و حیات کی شرح میں تبدیلیاں، سماجی طبقات، عقائد، اقدار اور رویے بھی اس دنیا میں متواتر بدلاؤ لاتے رہتے ہیں۔

بیسویں صدی کا زمانہ بھی ایک انوکھا زمانہ تھا جس میں دوسری قسم کی کئی بڑی بڑی تبدیلیاں وجود میں آئیں۔ اس دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی بڑی تیز رفتاری سے ہوئی۔ جب کہ مختلف فنون، فلسفہ اور ادبیات، جدیدیت، سماجی حقیقت پسندی اور مابعد جدیدیت جیسی عالمی تحریکوں سے روشناس ہوئے۔ اس کے علاوہ زبان، مذہب، تعلیم اور ماس میڈیا جیسے عالمی ثقافتی اداروں (Universal Cultural Instituations) کے دائرۂ کار میں زبردست کیفی اور کمیتی (Qualitative and Quantitatiue) تبدیلیاں آئیں۔

چنانچہ اس چوطرفہ اور تیز رفتار بدلاؤ کے نتیجے میں اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ عالمگیریت آتی جا رہی ہے۔ عالمگیریت کا مطلب یہ ہے کہ اشیا اور خدمات کی پیداوار اور اصراف (Consumption) کے معاملہ بلکہ خبروں، معلومات، خیالات و نظریات اور ذرائع تفریح (Entertainments) کے معاملے میں دنیا کے اکثر ملکوں کی یکجہتی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک طرف ان بڑھتی ہوئی ثقافتی تبدیلیوں سے آج کے نوجوانوں کو تعلیم اور حرکت پذیری کے مواقع حاصل ہو رہے ہیں تو دوسری طرف ان سے بڑھتی ہوئی عالمی مسابقت، خود پسندی، صارفیت اور لذت پسندی کو بڑھاوا مل رہا ہے اور ان سب چیزوں کے نتیجے میں خاندان اور ملک سے ہی نہیں بلکہ ایک انصاف پسند، خوشحال اور آزاد معاشرے کی تشکیل کے لیے اجتماعی کوششوں سے بھی اجنبیت اور بیگانگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

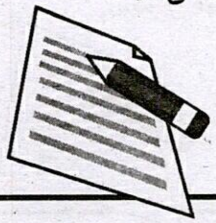

نوٹ

اختتامی سوالات

1۔ بیسویں صدی میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے مثال ترقی ایک مخلوط نعمت تھی۔ اظہار خیال کیجیے۔

2۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دنیا کے اکثر لوگ خود کو مذہبی کہتے ہیں، عوامی زندگی میں مذہب کا عمل دخل حالیہ دور میں کم ہوا ہے۔ وضاحت کیجیے۔

3۔ بیسویں صدی کے دوران ثقافتی بدلاؤ میں تعلیم اور طلبا کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

4۔ عالمگیریت اور مغربیت کے درمیان رشتے کی وضاحت کیجیے۔ ہندوستان جیسے ملکوں کی ثقافتوں کو ان سے کون سے خطرات درپیش ہیں اور ان سے کیا فوائد حاصل ہوئے ہیں؟

متن پر مبنی سوالوں کے جوابات

28.1

1۔ 1917 میں سوویت یونین کا جنم اور ایشیا اور افریقہ کی نوآبادیاتی قوموں کو آزادی (جس کی ابتدا 1947 میں ہندوستان نے کی) بیسویں صدی کی انقلابی تبدیلیوں کی مثالیں ہیں۔ اسی طرح تعلیمی اداروں اور ماس میڈیا کی توسیع کے ذریعے خواندگی اور نظریات کا پھیلاؤ اور ایسے ہی ذرائع تفریح، خبروں اور معلومات کی بڑھتی عالمگیریت سست رفتار مگر اہم ثقافتی تبدیلیوں کی مثال ہیں۔

2۔ عمرانی علوم کے ماہرین(Social Scientists) نے لفظ ثقافت(Culture) کو دو مختلف معنی میں استعمال کیا ہے: ایک تو مختلف فنون، ادبیات اور فلسفہ وغیرہ کے تخلیقی کاموں کے لیے اور دوسرے کسی کمیونٹی کی ان مشترکہ اقدار، عقائد اور رویوں کے لیے جو اس کمیونٹی کی تاریخ، مادی ماحول، زبان اور زندگی کے عوامی اظہارات پر مبنی ہوں۔ ثقافت کا اول الذکر مفہوم اکثر بہت زیادہ باصلاحیت افراد تک محدود رہتا ہے جبکہ دوسرے مفہوم میں بحیثیت مجموعی سبھی سماجی گروپ شامل ہیں۔ بہرحال یہ دونوں ہی خاص طور پر باہمی مظہر(Mutual Phenomenon) ہیں۔

3۔ عمرانی علوم(Social Sciences) میں لفظ کلچر مشکل بھی ہے اور اہم بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا استعمال مفکرین کے یہاں مختلف معنی میں ہوا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے مظاہر(Phenomena) نہ ٹھوس مادی ہیں اور نہ قابل پیائش۔

نوٹ

28.2

1۔ انیسویں صدی کے ممتاز سائنس داں یہ ہیں : میری کیوری (جنھوں نے عمل اشعاع (Process of radiation) پر کام کرتے ہوئے اپنی جان قربان کردی)، البرٹ آئن اسٹاین (نظریۂ اضافیت کی ترقی کا سہرا ان کے سر ہے)، فن مین(Fyneman) (جنھوں نے ذیلی ایٹمی ذرات کے نظریۂ موج کو ترقی دی)، اور چارلس بے بیج(Charles Babage) (جنھوں نے کمپیوٹر کی تخلیق میں نمایاں خدمات انجام دیں)۔

2۔ جدیدیت، سماجی حقیقت پسندی اور مابعد جدیدیت

3۔ برٹرینڈ رسل، ٹوم چومسکی، ای پی تھامپسن، امرتیہ سین

28.3

1۔ یہاں کلچرل اداروں سے مطلب ان علامتی نظاموں(Symbolsystems) سے ہے جو کسی کمیونٹی کے رویوں، عقائد اور اقدار کو شکل وصورت دینے کے لیے بنے ہیں۔ تمام سوسائٹیوں میں پائے جانے والے کچھ اہم ثقافتی ادارے ہیں: مذہب، زبان، تعلیم، فوک لور (یعنی عوامی روایات واقدار)، رسوم و رواج اور عوامی ترسیل کے ذرائع(Means of Mass Communication)۔

2۔ بیسویں صدی کے دوران ایشیائی اور کچھ افریقی ملکوں میں مقامی بولیوں اور کلاسیکل زبانوں پر قومی زبانوں یا بڑی بڑی علاقائی زبانوں کا غلبہ ہوگیا۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی زبان عالمگیر نوعیت اختیار کرکے دنیا میں ایک واسطے کی زبان بن کے ابھری۔

3۔ ٹیلیفون، ریڈیو، سنیما، ٹیلیوژن، ٹیپ ریکارڈر، سی ڈی(Compact Discs)، کمپیوٹر، مواصلاتی سیارچے (Communication Satellites) اور موبائل فون۔

اختتامی سوالوں کے لیے اشارے

1۔ دیکھیے 28.2

2۔ دیکھیے 28.3

3۔ دیکھیے 28.3.6

4۔ دیکھیے 28.4

نوٹ

پروجیکٹ ورک

کلچرل تبدیلی اکثر سست رفتار اور غیر محسوس طور پر ہوتی ہے لیکن بیسویں صدی میں یہ کلچرل تبدیلی نسبتاً تیز رفتار ہوئی۔ کلچرل بدلاؤ کی وضاحت کے لیے کچھ مثالیں اور اس سلسلے میں اپنے بڑوں سے پوچھیے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کیا کیا تبدیلیاں دیکھی ہیں۔

موجودہ زمانے کی اقدار، فنون، اداروں اور رسوم و رواج کے حوالے ہندوستانی کلچر کی کثرت(Diversity) میں موجود وحدت کے کچھ عناصر کا پتہ لگائیے۔

فرہنگ

ثقافت(Culture) : ایک طرف کسی کمیونٹی کے رسوم و رواج، اعتقاد اور مشترکہ قدریں اور دوسری طرف فنون، ادب، فلسفہ اور سائنس میں تخلیقی کام۔

عالمگیریت (Globalization) : ترسیل اور مواصلات، ذرائع تفریح، تجارت اور سیاست کے بین الاقوامی طور پر پھیلے ہوئے جالوں کے ذریعے دنیا کی بڑھتی ہوئی یکجہتی۔

بے ضرورت لفاظی(Jargon) : اپنی علمیت جتانے کے لیے روزمرہ کے الفاظ کے بجائے نامانوس اور فنی الفاظ و اصطلاحات کا بڑھتا ہوا استعمال۔

ذولسانیت(Bilingualism) : دو زبانوں کو مساوی استعداد کے ساتھ سمجھنے اور بولنے کی صلاحیت۔

جدیدیت(Modernism) : بیسویں صدی کا ایک بڑا جمالیاتی رجحان۔ اس کے تحت جدید سماج کے مسائل اور باطنی دکھ درد کا اظہار کیا جاتا ہے۔

سیکولر بنانا (Secularisation) : الحاد یا انکار خدا کا بے ضرورت سہارا لیے بغیر عوامی زندگی میں مذہب کا روبہ زوال کردار۔

سینئر سیکنڈری کورس

تاریخ

3

(اختیاری ماڈیولز)

کو آر ڈی نیٹر

وویک سنگھ

مترجم

سید ظفر الاسلام

کوآرڈی نیٹر (اردو میڈیم پروگرام)

ڈاکٹر شعیب رضا خان

विद्याधनम् सर्वधनं प्रधानम्

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوپن اسکولنگ

اے-24-25، انسٹی ٹیوشنل ایریا، سیکٹر-62، نوئیڈا، یوپی-201309

نوٹس

29

ریاست کی تشکیل کی جانب

ریاست کی اصطلاح کو ہم اکثر لفظی معنی کے اعتبار سے درست تسلیم کرلیتے ہیں۔ اس اصطلاح سے درحقیقت ہماری کیا مراد ہے؟ ہم ریاست کو عام طور سے حکومت کی مخصوص شکلوں کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ یہ بادشاہتیں یا جمہوریتیں ہوسکتی ہیں اور بعض صورتوں میں چندسری حکومتیں یا عدیدیہ حکومتیں، یعنی چندلوگوں کی حکومتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ یہ امتیازات اقتدار کے طریقے یعنی عوام کی زندگیوں پر اثر انداز ہونے اور انھیں کنٹرول کرنے کی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔ یہ طاقت چندلوگوں کے ہاتھوں میں بھی ہوسکتی ہے اور یہ بہت سے لوگوں میں بٹی ہوئی بھی ہوسکتی ہے۔

وہ افراد جو ریاستوں کو کنٹرول کرتے ہیں اور جنھیں ہم حکمراں کے طور پر شناخت کرتے ہیں، سیاسی تعلقات کو استوار کرتے ہیں اور کئی قسم کے اداروں کے ذریعہ عمل کرتے ہیں۔ ان میں انتظامی خدمات بھی شامل ہیں جنھیں کئی کاموں مثلاً ٹیکسوں کی وصلی، فوج، عدلیہ وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حکمراں عوام کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ حکومت کی ان کی شکل مثالی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ ریاست کے وجود کو جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ریاستوں کا فروغ ایک طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے اور اس نے مختلف انداز اختیار کیے ہیں۔ اس سبق میں ہم برصغیر میں کچھ قدیم رجحانات کے بارے میں چھان بین کریں گے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعہ کے بعد درج ذیل باتوں کو سمجھ سکیں گے

- قبائلی سرداروں اور بادشاہوں کے درمیان فرق کرسکیں گے
- اوائلی بادشاہتوں کی خصوصیات کی وضاحت کرسکیں گے اور
- یہ سمجھ سکیں گے کہ اوائلی بادشاہتوں میں سے کچھ طاقتور ریاستوں میں کس طرح تبدیل ہوئیں

نوٹس

29.1 پس منظر

شروع کے اسباق میں آپ نے ہڑپا تہذیب کے بارے میں پڑھا ہوگا۔ یہ ایک ترقی یافتہ تہذیب تھی، جس میں بڑے بڑے شہر تھے، جہاں لوگ مختلف اقسام کی اشیاء بنایا کرتے تھے۔ بعض اسکالروں کا خیال ہے کہ ہڑپا تہذیب میں ایک ریاستی تنظیم یقیناً موجود تھی۔ گو کہ اس بات کے قوی امکانات ہیں لیکن ہمارے پاس اس بات کو جانچنے کے لیے شواہد موجود نہیں ہیں کہ وہ کس طرح کی ریاست تھی اور نہ ہی ہمارے پاس انتظامی اداروں سے متعلق تفصیلات موجود ہیں۔

(i) قدیم ویدک ادب میں قبائلی سردار

آپ نے شروع کے اسباق (سبق-4) میں رگ وید کے بارے میں پڑھا ہے۔ رگ وید کو غالباً 1800-1000 قبل مسیح کے درمیان تیار کیا گیا تھا۔ یہ منتروں کا ایک مجموعہ ہے جس میں مختلف دیوتاؤں اور خاص طور سے اگنی، اندر اور سوم کو مخاطب کیا گیا ہے۔ عام طور پر پجاریوں کے خاندانوں کے افراد منتروں کو ترتیب دیتے تھے۔ ان منتروں کو عام طور پر قربانیوں کے موقعوں پر اور رسوم و رواج میں دیوتاؤں کی شرکت کے لیے گایا جاتا تھا، زیادہ تر منتر شمالی، مغربی ہندوستان میں جہاں دریائے سندھ اور اس کی شاخیں بہتی تھیں، ترتیب دیا گیا۔

ان منتروں میں دوسری معلومات بھی شامل ہوتی تھیں۔ ان چیزوں کی تفصیلات بھی ان میں شامل ہوتی تھیں، جن کے لیے لوگ دعا مانگتے تھے اور ان میں کبھی کبھار سرداروں اور اس دور کے اہم آدمیوں کے ناموں کا ذکر بھی کیا جاتا تھا۔

کیا ان منتروں سے ہمیں اس دور کے سیاسی طریقۂ کار کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے؟ اس سوال کا جواب ہے مشروط طور پر ہاں ہے۔ یہ منتر ہمیں سیاسی واقعات کے بارے میں راست طور پر معلومات فراہم نہیں کرتے (بجز غیر معمولی واقعات کے) لیکن دوسری طرف یہ سمجھنے کے لیے کہ سیاسی تعلقات کس طرح منظم ہوئے ان منتروں کے متنوں کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

(ii) مختلف قسم کے راجہ

عام طور پر جب ہم راجہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں ایک ایسے فرد کا تصور ہوتا ہے جو محل میں رہتا ہے۔ نوکروں اور غلاموں کی ایک بڑی تعداد اُس کے حکم کو مانتی ہے، وہ ایک دولت مند آدمی ہے، ایک بڑی فوج کا سردار ہے اور اس کا ایک دربار ہے۔ اور ہمارا عام طور پر یہ خیال

نوٹس

ہے کہ راجہ اپنی حکومت کو اپنے بیٹوں کو اور خاص طور سے اپنے بڑے بیٹے کو سونپ دیتا ہے۔ لیکن راجہ کی اصطلاح کا ہمیشہ یہی مطلب نہیں ہوتا۔

29.1.4 لڑائیاں

آپ کو شاید یاد ہوگا کہ رِگ وید میں کہا گیا ہے کہ اس دور میں لوگ بنیادی طور پر کسان تھے چنانچہ ہم سمجھ سکتے ہیں، کچھ لڑائیاں چراگاہوں کو حاصل کرنے کے لیے لڑی گئی ہوں گی۔ چراگاہیں عام طور پر دریاؤں کے کناروں پر ہوتی تھیں۔ لڑائیاں انسانوں اور جانوروں کے لیے پانی حاصل کرنے کے مسئلہ پر بھی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ مویشیوں اور زمین اور خاص طور سے چراگاہ کے قابل زمینوں اور جلد کٹائی کی قابل فصلوں، جو کی فصل وغیرہ پر قبضہ کرنے کے بھی لڑائیاں ہوتی تھیں اور لڑائیوں کی اور وجہ عورتوں پر قبضہ کرنا بھی تھا۔

ان جنگوں میں زیادہ تر مرد حصہ لیا کرتے تھے۔ اس دور میں کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی، لیکن اس طرح کی بیٹھکیں ہوا کرتی تھیں، جہاں لوگ جنگ اور امن کے بارے میں بات چیت کرتے تھے۔ وہ ان میں سرداروں اور بہادر اور زیرک لڑاکوں کا انتخاب بھی کرتے تھے۔ بعض دفعہ وہ خصوصی قربانیاں دیا کرتے تھے اور جنگ میں فتح کے لیے دیوتاؤں سے منتیں کیا کرتے تھے۔

اگر راجہ اپنے لوگوں کو فتح سے ہمکنار کرتا تھا تو اُس کے بعد کیا ہوتا تھا؟ لڑائیوں میں جن زمینوں اور آبی وسائل پر قبضہ کیا جاتا تھا انھیں غالباً مشترکہ طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور دوسری چیزوں مثلاً مویشیوں اور عورتوں کو راجہ کے حمایتوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ان سے کچھ پجاریوں کو بھی دیا جاتا تھا جو راجہ کی جیت اور دیوتاؤں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے پوجا پاٹ اور قربانیاں کیا کرتے تھے جنھوں نے ان کے راجہ کو فتح دلائی تھی۔

ان کی لڑائی کس کے ساتھ تھی؟ رِگ وید میں کئی قبائل مثلاً پورس، یادوس، بھارت، انوس اور درہوس کا ذکر کیا گیا ہے۔ بسا اوقات یہ قبائل ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو جاتے تھے لیکن یہ آپس میں بھی لڑتے رہتے تھے، بعض وقت یہ لوگ جو اپنے آپ کو آریہ کہتے تھے دوسری قوموں سے بھی جنگ کرتے تھے جنھیں یہ 'داس' یا 'دسیو' کہا کرتے تھے۔

عام آدمی کے لیے دو اصطلاحیں استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ ایک لفظ ''جن'' استعمال کیا گیا ہے جسے ہندی اور دوسری زبانوں میں آج بھی اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری اصطلاح ''وِس'' کی ہے۔ راجہ کو عام طور پر ''جن'' یا ''وِس'' کا راجہ کہا جاتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں راجہ کسی سلطنت کا راجہ یا مخصوص علاقہ کا راجہ نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ وہ لوگوں کے ایک گروپ کا راجہ ہوتا تھا۔

نوٹس

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ یہ راجہ، اس راجہ کے جیسا نہیں ہوتا تھا جس سے ہم واقف ہیں۔ انھیں اکثرت بادشاہ کے بجائے سردار سمجھا جاتا تھا اور جن پر اس کا کنٹرول ہوتا تھا تو وہ مملکت کے بجائے قبیلہ ہوتا تھا۔

- سرداروں کا انتخاب لوگ عام طور پر راست یا بالواسطہ طور پر کیا کرتے تھے جبکہ بادشاہ موروثی ہوا کرتے تھے۔
- سرداروں کے پاس اپنے کاموں کی معاونت کے لیے کوئی انتظامی میکانزم نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے ہم قبیلہ افراد اور اپنے دوسرے حامیوں کی مدد پر انحصار کرتے تھے۔ جبکہ بادشاہ بھی اپنے رشتہ داروں پر اعتماد کرسکتے تھے اس کے باوجود ان کا انحصار انتظامی نظام پر ہوتا ہے۔
- قبائلی سردار باقاعدہ ٹیکس وصول نہیں کیا کرتے تھے اس کے بجائے ان کا انحصار ان تحائف پر تھا جو ان کے حامی ان کو اکثر دیا کرتے تھے۔ بادشاہ بھی تحائف قبول کرتے تھے لیکن ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ عام طور سے ٹیکسوں کی وصولی تھا۔
- قبائلی سرداروں کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کا انحصار لڑاکوں کی ٹولی پر ہوا کرتا تھا یعنی ایسے افراد کی ٹولی جنھیں ضرورت پڑنے پر لڑائی کرنے کے لیے اکٹھا کیا جاتا تھا اور جن کو کوئی باقاعدہ تنخواہیں نہیں دی جاتی تھیں جبکہ بادشاہ اپنی فوج میں مسلسل بھرتی کرسکتے تھے اور ان کی ایک باقاعدہ فوج ہوتی تھیں۔
- قبائلی سردار اپنے لوگوں کے ساتھ بیٹھکوں میں صلاح مشورے کرتا تھا، جہاں لوگ اہم معاملات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ بادشاہ بھی درباروں میں لوگوں سے ملا کرتے تھے لیکن یہ رسمی مواقع پر منعقد ہوتے تھے۔

متن پر مبنی سوالات 29.1

1۔ رگ وید کو غالباً............................، .... قبل مسیح کے درمیان ترتیب دیا گیا۔

2۔ منتروں سے ہمیں .... واقعات کے بارے میں راست معلومات حاصل نہیں ہوتی۔

3۔ بہترین چراگاہیں عام طور پر .... کے ساتھ ہوتی تھیں۔

4۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو آریہ کہتے تھے دوسروں سے جنھیں وہ .... یا .... کہتے تھے لڑتے تھے۔

نوٹس

29.2 قدیم بادشاہتیں: جن پد

تقریباً 1000 قبل مسیح اور 500 قبل مسیح کے درمیان شمالی ہند میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے۔ اس دور میں ہم بستیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں جو اکثر رنگے ہوئے، خاکستری رنگ کے برتنوں کی ثقافت کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں جن کے بارے میں آپ سبق-5 میں پڑھ چکے ہیں۔ دوسری چیزوں میں ایک جگہ رہ کر کھیتی کرنا زیادہ اہمیت اختیار کرگیا۔ آبادی میں بھی اضافہ ہوا اور اوزاروں اور ہتھیاروں کی تیاری کے لیے لوہے کا زیادہ استعمال کیا جانے لگا۔

اس دور میں ہمیں متنوں کے اور زیادہ مفصل مجموعہ کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے جس کا حوالہ ہم نے ویدک ادب کے طور پر دیا ہے۔ ان متنوں کا تعلق رسوم و رواج، ان کی وضاحت ان کے تجزیے سے ہے اور ان میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان رسموں کو کن موقعوں پر اور کس طرح انجام دیا جانا چاہیے۔ ان سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ سیاسی تنظیم کی ایک شکل، جسے ''جن پد'' کہا گیا ہے، اہمیت اختیار کرتی جارہی تھی۔

جیسا کہ ظاہر ہے کہ ''جن پد'' کی اصطلاح لفظ ''جن'' سے اخذ کی گئی ہے جس سے مراد لوگوں (قبیلہ) سے ہے۔ درحقیقت ''جن پد'' کے معنی ہیں جہاں ''جن'' (افراد قبیلہ) اپنے قدم (پد) روک لے اور اسی جگہ پر بس جائے۔ اس جگہ کا نام اس قبیلہ کے نام پر رکھا جاتا تھا۔ مثلاً جہاں ''کورو'' آباد ہوئے اس جگہ کا نام ''کورو جن پد'' کو دیا گیا۔

ان جن پدوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ان علاقوں میں مقیم آبادی کی زمرہ بندی ''ورن'' چار پرتی سماجی زمرہ بندی کے مطابق کی جاتی تھی جس کے بارے میں آپ سبق-4 میں پڑھ چکے ہیں۔

29.3 راجہ بننے کے نئے طریقے

جن پد کے لیڈر یا سردار کو اب بھی راجہ کہا جاتا تھا، لیکن ایسی کئی اہم مثالیں ہیں جن میں یہ راجہ، جن کے راجہ سے مختلف ہوتا تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کچھ معاملات میں ایسے اشارے ملتے ہیں کہ اب راجہ کا مقام موروثی ہوگیا تھا، دوسرے لفظوں میں راجہ کے بیٹے اس کے وارث ہوتے تھے اور وہ اپنے باپ کی حکومت پر جائز طور پر دعویٰ کرسکتے تھے۔

دوسرے یہ کہ اب ہمیں خاص رسم و رواج کے بارے میں حوالے مل چکے ہیں جن میں سے ''راجسیو'' اشومیدھ بہت مشہور ہیں۔ یہ دونوں لنگ ہیں جو بعض دفعہ ایک سال سے زیادہ عرصہ تک چلتے ہیں اور خاص طور سے تربیت پائے ہوئے پجاری ہی ان کی ادائیگی کرسکتے ہیں۔ ویدک ادب کو ترتیب دینے اور اس کی دھن بنانے والے پجاری کو راجہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔

نوٹس

اس طرح کی قربانیوں میں زیادہ سے زیادہ لوگ حصہ لیتے تھے۔ ان میں راجہ بھی شامل ہوتا تھا۔ یہ اپنے اقتدار کا اعلان کرنے کا ایک اہم موقع ہوتا تھا۔ اس کی بیویوں اور بیٹیوں کو اس طرح کی قربانیوں میں اس کی مدد کرنا ہوتی تھی۔ اس کے دوسرے حمایتی، جن میں اس کے رتھ کا سارتھی (کوچ بان) خاندان بچاری (پروہت) فوج کا سپہ سالار اور پیغام رساں (ایلچی) بھی اس میں شامل ہوتے تھے۔ عام یعنی 'وِش' یا 'ویشہ' راجہ کے لیے تحفے تحائف لاتے تھے جس سے قربانی کی ادائیگی کے لیے سرمائے کے ایک بڑے حصہ کا بندوبست ہو جاتا تھا۔ پڑوسی راجاؤں کو اس طرح کے شاندار موقعوں کو دیکھنے کی دعوت دی جاتی تھی اور یہ کہ رسم کی پوری کارروائی بچاری ہی انجام دیتے تھے۔

کیا شودر اس طرح کی رسموں میں حصہ لے سکتے تھے؟ بعض دفعہ ان کو اس طرح کی رسموں میں چھوٹا موٹا کام دیا جاتا تھا لیکن کو ان رسموں سے زیادہ تر دور ہی رکھا جاتا تھا۔ وہ لوگ بھی جو ان رسموں میں شرکت کرتے تھے صرف اپنے حصہ کا کام کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ویش، بچاری کا کام نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی راجہ کی بیوی اس کی جگہ بیٹھ سکتی تھی۔

ان رسوم کا مطلب کیا تھا۔ اشومیدھ کی رسم میں قربانی کے گھوڑے کو ایک سال کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ مسلح آدمیوں کی ایک ٹولی ہوتی تھی۔ وہ تمام لوگ جو گھوڑے کو اپنے علاقوں سے گذرنے کی اجازت دیتے تھے، گھوڑے کے مالک کے حکم کو تسلیم کرتے تھے۔

جب گھوڑے کو واپس لایا جاتا تھا تو ایک طویل رسم کے بعد اس کی قربانی کی جاتی تھی۔ لوگوں کی بڑی تعداد کو جن میں پڑوسی راجہ اور عام آدمی دونوں شامل ہوتے تھے، اس رسم کو دیکھنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ اس میں پکوان کھلائے جاتے تھے اور داستان گوئی ہوتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک زبردست اور مہنگی رسم ہوتی تھی۔

اقتدار کا خواہش مند کوئی بھی راجہ جو اس طرح کی رسم ادا کرنا چاہتا تھا طاقتور بھی ہوتا تھا اور دولت مند بھی۔ پجاریوں کو قربانی کا بھاری معاوضہ یا دکشنا دی جاتی تھی۔ اس میں گھوڑے، مویشی، سونے اور چاندی کے زیورات، رتھ، کپڑے، غلام مرد اور عورتیں اور دوسری اشیاء شامل ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس طرح کی رسم کی کامیاب ادائیگی سے راجہ عوام میں اپنے مقام کو منواتا تھا اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا تھا۔

اس طرح کی بہت سی رسموں میں ایک رسم "ابھشیک" بھی تھی، اس کا مطلب تھا مقدس پانی سے راجہ کا اشنان، یہ مقدس پانی عام طور سے پہلے پجاری راجہ پر چھڑکتا تھا۔ گو کہ اس میں دوسرے لوگ مثلاً ویش اور راجہ کے رشتہ دار بھی حصہ لے سکتے تھے۔

جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت عوامی جتھے کے ذریعہ راجہ کے انتخاب کا کوئی سوال نہیں تھا۔ کوئی بھی فرد جو حکمراں کے خاندان میں پیدا ہوا ہو راجہ بن سکتا تھا یا اگر اس کے پاس مناسب فوجی اور

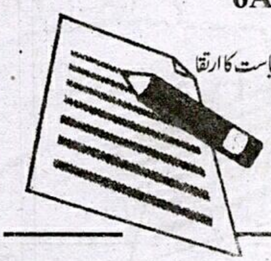

نوٹس

ماڈی وسائل ہوتے تھے تو وہ راجہ بننے کی کوشش کرسکتا تھا۔

29.4 انتظامی نظام کا آغاز

ایک اور رسم جس کا بعد کے ویدک ادب میں بار بار ذکر کیا گیا ہے ''راجسیو'' تھی۔ اگر آپ مہابھارت کی کہانی سے واقف ہیں تو شاید آپ کو یاد ہوگا کہ ''راجسیو'' وہ ایک اہم قربانی تھی جو یدھشٹر نے تحت پر دعویٰ کرنے کے لیے ادا کی تھی۔

''راجسیو'' کے ایک حصہ کے طور پر ایک اور رسم ''رتنانم ہویمسی'' کا ذکر بھی ملتا ہے۔ یہ ایک ایسی رسم تھی جس کے تحت راجہ سے اہم لوگوں کے گھروں پر پوجا کرنے کی توقع کی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو ''رتنانم'' کہا جاتا تھا (لفظی معنی میں وہ لوگ جو ہیرے جواہرات کے مالک ہوتے تھے) ان اہم لوگوں میں راجہ کی بیویاں، فوج کا سپہ سالار، مکھیہ بجاری، سارتھی اور کچھ دوسرے لوگ شامل ہوتے تھے جن میں ایلچی (قاصد) بھی شامل تھے اور اس کے علاوہ اس میں ان لوگوں کا بھی شمار ہوتا تھا جو راجہ کی جانب سے تحفہ تحائف وصول کیا کرتے تھے۔

ان ''عہدیداروں'' کو باقاعدہ تنخواہیں دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں ان میں سے کچھ ''عہدیداران'' وہ محور تھے جس سے بعد کا انتظامی نظام وجود میں آیا۔

29.5 راجہ کے وسائل

جن پد پر راج کرنے والا راجہ گوکہ اس راجہ سے مختلف تھا جس کا ذکر رگ وید میں کیا گیا ہے۔ اس کی بعض مخصوص خصوصیات تھیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مدت کے دوران بھی وسائل کے حصول کے راجہ کے مختلف طریقے۔ لڑائیاں اور تحفے تحائف تھے۔

ان تحائف کو ''بلی'' کہا جاتا تھا، جن کا، تقاضہ رسموں کے موقع پر کیا جاسکتا تھا۔ مثال کے طور پر اگر راجہ ''اشومیدھ'' کی ادائیگی کرتا تھا وہ اپنے لوگوں سے وسائل کا مطالبہ کرسکتا تھا۔ ''تحفے تحائف'' کے معنی یوں تو رضا کارانہ پیش کش کے ہیں، مگر انھیں دینے کی ترغیب بھی دی جاتی تھی اور ان کو زبردستی وصول بھی کیا جاسکتا تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ویدک ادب میں راجہ اور پرجا کے درمیان تعلقات کے لیے بعض نئی تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے۔ راجہ کا ذکر ''دانی'' یا ''ہرن'' کے طور پر کیا گیا ہے اور پرجا کو ''خوراک'' یا ''چارہ'' کہا گیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گوکہ اس وقت باقاعدہ ٹیکس نہیں تھے لیکن وقتاً فوقتاً رعایا کا استحصال کیا جاتا تھا۔

دوسری طرف یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لوگ راجہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کو تحفے تحائف دیا کرتے ہوں اور اس کا ایک دوسرا مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ راجہ دوسرے راجاؤں سے رعایا کی حفاظت کرنے کا اہل رہے اور اس پر آمادہ رہے۔

رِگ وید کے راجہ اور بعد کی ویدک روایت کے راجہ کے درمیان ایک اور مماثلت مسلح حمایت کے لیے جنگجوؤں پر انحصار تھا۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ راجہ اپنی مستقل فوج کیوں نہیں بنا پاتا تھا؟

29.6 مہاجن پد

500 قبل مسیح تک 'دوسری جن پدوں کے مقابلے میں بعض جن پدیں اور زیادہ طاقتور ہوگئیں اور وہ مہاجن پدوں کے نام سے جانی جانے لگیں۔ بودھ اور جینی ادب میں ہمیں 16 ایسی مہاجن پدوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سے بہت زیادہ اہم اور ان کی راجدھانیاں نقشہ میں دکھلائی گئی ہیں۔ (دیکھیے کتاب-1 صفحہ نمبر 67 پر ٹیبل 5.1 اور صفحہ نمبر 68 پر نقشہ)۔

ان جن پدوں میں سے چار بہت زیادہ اہم تھیں کوسالہ، آونتی، وجّی اور مگدھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے مگدھ بالآخر ایک بہت زیادہ طاقتور جن پد بن گئی، موریہ حکومت کا، جو برصغیر کی تاریخ میں پہلی جانی مانی سلطنت تھی، مرکز مگدھ میں تھا۔

مہاجن پدئیں، جن پدوں سے کئی لحاظ سے مختلف تھیں، آیئے ان کے درمیان فرق کو دیکھیں۔

29.7 قلعہ بند شہر

تقریباً سبھی مہاجن پدوں کا ایک راجدھانی شہر ہوتا تھا۔ جن پد کی بستیوں کے برعکس ان میں سے کئی قلعہ بند شہر تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شہروں کے چاروں اطراف میں لکڑی، اینٹوں یا پتھروں کی بلند دیواریں تعمیر کی گئی تھیں۔

ان شہروں میں بسنے والی رعایا کے بارے میں ہمیں تھوڑا بہت اندازہ ہے۔ ان میں راجہ اور ان کی پرجا، جن میں دستکار، تاجر، بیوپاری اور چھوٹے دوکاندار شامل تھے، رہتے تھے۔ اس طرح کے شہروں میں بسنے والے کچھ دولت مند مرد اور عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ ان میں سے کئی شہر جن سے آج ہم واقف ہیں اسی مدت کے دوران وجود میں آئے۔ ان میں متھرا وارانسی، ویشالی اور پاٹلی پتر قابلِ ذکر ہیں۔ ان شہروں کا دار و مدار زراعت کی ترقی پر تھا، جہاں لوہے کے زرعی اوزاروں کی مدد سے اور زیادہ خوراک پیدا کرنا ممکن ہوگیا تھا۔

قلعہ بندی شاید اس لیے کی گئی تھی کہ ان شہروں کے باسیوں کو حملوں کا خطرہ تھا اور انھیں تحفظ کی

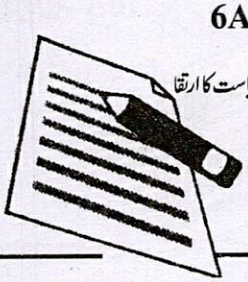

نوٹس

ضرورت تھی اس بات کا بھی امکان ہے کہ کچھ راجاؤں کا مقصد اپنے شہروں کو اونچی، چوڑی اور مضبوط دیواروں سے گھیر کر اپنی دولت و امارت اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا۔

اس طرح کی مضبوط دیواروں کی تعمیر کے لیے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے، لاکھوں اینٹیں اور پتھر تیار کرنے پڑتے ہیں۔ اور اس کا مطلب ہے بڑے پیمانے پر محنت مزدوری کرنے والوں کا انتظام کرنا جس کے لیے ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کو کام لگایا گیا ہوگا اور آخر میں یہ کہ ان دیواروں کی تعمیر کے لیے سرمائے کی فراہمی بھی کی گئی ہوگی۔

29.8 نئی افواج

ہمارے پاس اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ 330 قبل مسیح تک ان جن پدوں میں سے کچھ میں فوجوں کو مختلف طریقہ سے منظم کیا گیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب یونان کے شمال میسیڈونیہ کے راجہ سکندر دنیا فتح کرنے کی غرض سے نکلا، جیسا کہ ظاہر ہے کہ وہ دنیا فتح نہیں کرسکا۔ تاہم اس نے مصر اور مغربی ایشیا کے کچھ حصے فتح کیے اور برصغیر ہند میں دریاے بیاس کے کناروں تک پہنچ گیا۔

جب اس نے مشرق کی سمت میں آگے بڑھنا شروع کیا تو اس کے فوجیوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا وہ اس لیے خوفزدہ تھے کہ انھوں نے سن رکھا تھا کہ ہندوستان کے راجاؤں کے پاس پیدل سپاہیوں، رتھ سواروں اور ہاتھیوں پر مشتمل بہت بڑی افواج موجود ہیں۔

یہ افواج ان لڑاکو ٹولیوں سے بہت مختلف تھیں جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ اس فوج کے فوجیوں کو باقاعدہ تنخواہیں دی جاتی تھیں اور راجہ سال بھران کی نگہداشت کرتا تھا۔ اس دور میں فوجی مقاصد کے لیے ہاتھیوں کا وسیع پیمانے پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہاتھیوں کو پکڑنا، ان کو پالنا اور ان کی تربیت کرنا ایک کٹھن کام ہے اور اسی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پہلے کے مقابلہ میں اب افواج اور زیادہ مفصل اور بہتر طور پر منظم تھیں اور اس طرح کی بڑی افواج کی دیکھ ریکھ کے لیے پہلے کی جن پدوں کی سادہ سی فوجوں کی دیکھ ریکھ کے مقابلے میں بہت زیادہ وسائل کی ضرورت تھی۔

بودھ کتابات سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مگدھ کے راجاؤں نے بہترین افواج تیار کی تھیں۔ انھوں نے ریاست کے جنگلوں میں پائے جانے والے ہاتھیوں کا استعمال کیا۔ انھوں نے اپنی سلطنت کی کھدانوں سے حاصل ہونے والے لوہے کا استعمال کیا اور اپنی فوجوں کے لیے مضبوط ہتھیار فراہم کیے۔

اچھے اور مضبوط ہتھیاروں اور دوسری طرح کی سہولیات سے لیس پر عزم راجاؤں کی قیادت میں یہ فوج جلد ہی دوسرے راجاؤں کو شکست دے سکتی تھی اور اپنی حکومت کو پڑوسی علاقوں تک بڑھا سکتی تھی۔ بعض معاملات میں راجاؤں نے خشکی اور دریاؤں کے ساتھ ساتھ کے آمد و رفت کے راستوں پر قبضہ

نوٹس

کرنے کی کوشش بھی کی۔ اور کچھ معاملوں میں انھوں نے زمینوں اور خاص طور سے زرخیز زرعی زمینوں پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی کی کیونکہ یہ وسائل کو حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ تھیں۔

متن پر مبنی سوالات 29.2

خالی جگہوں کو بھریے:

1۔ تقریباً سبھی مہاجن پدوں کا ایک..............شہر تھا۔

2۔ اس طرح کی مضبوط اور بڑی دیوار بنانے کے لیے بڑے پیمانے پر..............کی ضرورت تھی۔

3۔ ان شہروں کا دار و مدار..............کی ترقی پر تھا۔

4۔ سکندر نے مصر اور مغربی ایشیا کے کچھ علاقوں کو فتح کیا اور برصغیر میں .... کے کناروں تک پہنچ گیا۔

29.9 باقاعدہ ٹیکس

مہاجن پدوں کے راجہ چونکہ مضبوط اور وسیع وعریض قلعے تعمیر کررہے تھے اور بڑی افواج کی نگہداشت کررہے تھے اس لیے ان کے لیے سرمائے کی باقاعدہ فراہمی کی ضرورت تھی۔ اس لیے ٹیکسوں کی وصولی اہمیت اختیار کرگئی۔

- فصلوں پر لگان سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ اس لیے کہ زیادہ تر لوگ کسان تھے اور وہ اپنی زمینوں اور فصلوں کی حفاظت کے لیے راجہ پر منحصر تھے۔ عام طور پر کل پیداوار کا 1/6 حصہ ٹیکس کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔ اس طرح کے ٹیکس کو ''بھاگ'' کہا جاتا تھا۔
- دستکاری پر بھی ٹیکس عائد تھے۔ یہ عام طور پر محنت کی شکل میں ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک بُنکر یا لوہار کو پورے مہینہ میں ایک دن حکومت کے لیے کام کرنا ہوتا تھا۔ چراگاہوں سے بھی ٹیکس ادا کرنے کی توقع کی جاتی تھی۔
- ان تجارتی اشیاء پر بھی ٹیکس تھا جنھیں باہر سے لاکر فروخت کیا جاتا تھا۔

اور راجہ کو ٹیکسوں کی وصولی کے لیے بہت سے عہدیداران اور افسروں کی ضرورت تھی اور ان کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے بھی پیسہ درکار رہتا تھا۔

کچھ ٹیکس اشیاء کی شکل میں مثلاً اناج، مویشی یا دستکاری کی بنائی ہوئی چیزوں کی شکل میں وصول

نوٹس

کیے جاتے تھے اور بعض اوقات ٹیکس نقد رقم کی شکل میں وصول کیے جاتے تھے۔ درحقیقت بعض پرانے سکّوں کا تعلق اسی دور سے ہے۔

29.10 مگدھ اور اس کے راجہ

تقریباً دوسو برسوں میں مگدھ ایک انتہائی اہم مہاجن پد بن گئی۔ اس کی کسی حد تک وجہ مگدھی فوج تھی جس کے بارے میں اوپر بتایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ مگدھ دریاؤں سے گھرا ہوا تھا جن میں گنگا اور سون ندیاں بھی شامل تھیں یہ ذرائع نقل وحمل، پانی کی فراہمی اور زرخیز زمینوں کے لیے اہم تھا۔

مگدھ میں دو انتہائی طاقتور راجہ تھے۔ یہ راجہ بمبسار اور اس کا بیٹا اجات شترو تھے۔ جنھوں نے اپنے حریفوں پر قابو پانے اور دوسری جن پدوں پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے تمام تر وسائل کا استعمال کیا۔ بعض اوقات وہ پڑوسی راجاؤں پر قابو پانے کے لیے شادی کے بندھنوں کا استعمال بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ پڑوسی علاقوں پر فوج کشی کرتے تھے اور ان پر قبضہ کر لیتے تھے۔

مہا پدم نا د مگدھ کا ایک اور اہم راجہ تھا۔ اس نے اپنے اقتدار کو برصغیر کے شمالی مغربی حصہ تک پھیلا رکھا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ سکندر کے فوجیوں نے اسی بھاری فوج کے بارے میں سنا ہو۔

یہ بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ مگدھ کے راجہ بڑے پیمانے پر قربانیاں کرتے تھے یا نہیں۔ کیا آپ کوئی ایسی وجہ سوچ سکتے ہیں وہ ان رسموں کی انجام دہی کیوں نہیں کرتے تھے؟

29.11 گن سنگھ

مہاجن پدوں پر مختلف انفرادی راجہ حکومت کرتے تھے جبکہ کچھ مہاجن پدوں میں مختلف شکل کی حکومت تھی اور ان کو ''گن سنگھ'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ان میں صرف ایک نہیں بلکہ کئی راجہ ہوتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض معاملوں میں ہزاروں لوگ ایک ساتھ حکومت کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک راجہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔

یہ راجہ رسوم کی ادائیگی ایک ساتھ کیا کرتے تھے۔ یہ رسوم ویدک قربانیوں سے مختلف تھیں۔ یہ راجہ جتھوں میں ملتے تھے اور تبادلہ خیال اور بحث ومباحثہ کے ذریعہ یہ فیصلہ کرتے تھے کہ کیا اور کس طرح کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر انھیں دشمن کے حملہ کا سامنا کرنا ہوتا تھا تو وہ جتھہ میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کرتے تھے کہ اس خطرے سے نمٹنے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے۔ ان کی کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی بلکہ یہ تمام راجہ ایک ساتھ متحد ہو جاتے تھے اور اپنے حامیوں کے ساتھ ضرورت کے لحاظ سے فوج بناتے تھے۔

گن سنگھوں کی پوری زمین تمام راجاؤں کی متحدہ ملکیت ہوتی تھی۔ زمین کی کاشت کے لیے ان کے پاس ملازم اور مزدور ہوتے تھے جنھیں ''داس کرم کار'' کہا جاتا تھا۔ ان مرد اور عورتوں کو تھوڑا بہت کھانا، کپڑے اور پناہ گاہ فراہم کی جاتی تھی، لیکن جو کچھ یہ پیدا کرتے تھے وہ سب راجہ اور اس کے رشتہ دار لے جاتے تھے۔

سب سے زیادہ مشہور گن سنگھیں ملاون اور وجیوں کی تھیں۔ وجّی گن سنگھ کو مہاجن پد سمجھا جاتا تھا۔ بودھ اور مہاویر دونوں کا تعلق گن سنگھوں سے تھا۔ گن سنگھوں میں زندگی کا سب سے زیادہ واضح تذکرہ بودھ کتابوں میں پایا جاسکتا ہے۔

چنانچہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سبھی مہاجن پدوں میں یکساں شکل کی حکومت نہیں تھی۔

متن پر مبنی سوالات 29.3

1۔ سب سے زیادہ طاقتور جن پدیں کون سی تھیں؟

2۔ مگدھ کی افواج نے راستوں پر قبضہ کرنے کے لیے کون سے ذرائع نقل و حمل اور مواصلات کا استعمال کیا؟

3۔ زرعی پیداوار سے راجہ کتنا ٹیکس وصول کرتے تھے؟

4۔ مگدھ کے دو طاقتور راجاؤں کے نام بتایئے؟

آپ نے کیا سیکھا

ریاست کی تشکیل کے عمل کو قدیم ویدک دور سے جوڑا جاسکتا ہے جبکہ قبائلی سرداروں کی حکومت نے چراگاہوں کے لیے لڑائی کے نتیجہ میں بادشاہت کی تشکیل کی راہ آہستہ آہستہ ہموار ہوئی۔

یہ لڑائیاں قبیلوں کے درمیان یا قبائلی گروہوں کی دوسرے قبائلی گروہوں کے ساتھ لڑائیوں پر محیط تھیں۔ قدیم بادشاہت نے جسے جن پد کہا جاتا تھا مہاجن پدوں کی راہ ہموار کی جن کی خصوصیت قلعہ بند

شہر، بڑی تعداد میں نوکر چاکر اور بھاری فوج تھی۔ یہاں حکومت کی ایک مختلف شکل نظر آتی ہے جس میں راجہ یا سردار عام آدمیوں سے مختلف ہوتا تھا عام آدمی کو ''جن'' کہا جاتا تھا۔

راجہ کا مقام دھیرے دھیرے موروثی بن گیا۔ اس کے پاس بھاری افواج ہوتی تھیں جن کی نگہداشت اور دیکھ ریکھ کے لیے بھاری اخراجات کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان اخراجات کو فصلوں، دستکاری اور تجارتی مصنوعات پر ٹیکس وصول کر کے پورا کیا جاتا تھا۔

ایک دلچسپ تصور گن سنگھ کا تھا جس کا مطلب تھا کئی راجاؤں کی حکومت اور ان میں سے ہم ایک راجہ کہلاتا تھا۔ یہ راجہ اپنی رسوم ایک ساتھ ادا کرتے تھے۔ وہ جتھوں میں ملاقات کرتے تھے اور یہ فیصلہ کرتے تھے کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ گن سنگھوں کی زمین سبھی راجاؤں کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی۔

اختتامی سوالات

1۔ رِگ وید کیا ہے؟

2 لڑائیاں کیوں لڑی گئیں؟

3۔ قبائلی سرداروں اور بادشاہت کے درمیان فرق بتایئے؟

4۔ رِگ وید میں متذکرہ کن ہی چار قبائل کے نام بتایئے؟

5۔ راجہ بننے کے نئے طریقوں کی وضاحت کیجیے؟

6۔ وضاحت کیجیے کہ ٹیکسوں کی وصولی کیوں اہم تھی؟

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

29.1

1۔ 1800-1000 قبل مسیح

2۔ سیاسی

3۔ دریا

4۔ داس یا داسیو

29.2

1۔ راجدھانی

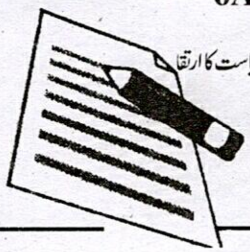

نوٹس

2۔ منصوبہ بندی

3۔ زراعت

4۔ بیاس

29.3

1۔ مگدھ

2۔ خشکی اور دریاؤں کے کناروں کے راستے

3۔ 1/6

4۔ بمبسار، اجات شترو اور اماپدم نندہ (کوئی سے دو)

اختتامی سوالات کے بارے میں اشارے

1۔ دیکھیے 29.1.2

2۔ دیکھیے 29.1.4

3۔ دیکھیے 29.1.4، باقی پانچ نکات

4۔ دیکھیے 29.1.4 پیرا 4

5۔ دیکھیے 29.3

6۔ دیکھیے 29.5

نوٹس

30

قدیم ریاستیں

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں ہمیں سماج کی کئی شکلیں نظر آتی ہیں جن کا سلسلہ وادیٔ سندھ کی شہری تہذیب سے گپتا راجاؤں کے کلاسیکی عہد تک پھیلا ہوا ہے۔ اس مدت کے دوران مرکزی اور منتشر حکومتوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے جن میں سے کچھ اپنے سیاسی ڈھانچوں اور حکومت کے لحاظ سے بہت زیادہ منظّم و مستحکم تھیں جب کہ دوسری اندرونی مسائل اور اقتدار کے بٹوارے کی وجہ سے کمزور ہو چکی تھیں۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ درج ذیل باتوں سے واقف ہو سکیں گے:

- یہ وضاحت کر سکیں گے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کے نظام کا فروغ کس طرح ہوا۔
- ریاست کی مختلف اقسام کے درمیان فرق کر سکیں گے۔
- یہ سمجھ سکیں گے کہ انتہائی طاقتور ریاستیں کس طرح وجود میں آئیں۔

30.1 پس منظر

دور قدیم میں انسانی سماج کا یہ ماننا تھا کہ سبھی انسان مساوی ہیں اور ان کو یکساں حقوق حاصل ہونے چاہئیں کیوں کہ یہ بنیادی طور پر ایک قبائلی سماج تھا۔ ریاست کے تصور کے ظہور پذیری وسائل پر قابو کے لیے ٹکراؤ اور تفریق پر مبنی معیشت کو بڑھاوا دینے کا نتیجہ تھی یا یہ کہ سماج کو الگ الگ سطحوں پر ترتیب دی جانے لگی تھی۔ طبقات پر مبنی سماج ریاست کے نظام میں تبدیلی کے لیے اہم بنیادی شرط تھا۔

30.2 بادشاہت کے تصور کا ارتقا

آثار قدیمہ کے شواہد سے ہڑپا دور میں ایک مستحکم مرکزی حکومت کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ ویدک

نوٹس

بادشاہتوں میں خاندان کا سربراہ، راجہ ہوا کرتا تھا اور اس کو آہستہ آہستہ اختیارات دے کر وہ حیثیت دی جاتی تھی کہ اس کو دیوتا سمجھا جانے لگتا تھا۔ بودھوں اور جینیوں نے ''خدائی'' کے اس تصور کو رد کر دیا اور اس کے بجائے اس تصور کو اپنایا کہ قدرت کی اس اصل کیفیت میں ہر ضرورت کوششوں کے بغیر پوری ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اس میں زوالی ہوتا ہے اور انسانی بدی کا راستہ اپناتا ہے، اس کی خواہشات اور ضرورتیں بڑھ جاتی ہیں جو نجی املاک اور خاندان کے تصورات کی جانب اور بالآخر برے اور غیر دیانتدار رویے کا سبب بنتی ہیں۔ انتشار کی اس صورت میں لوگ ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور اپنے آپ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا فیصلہ کرتے تھے جو قانون اور امن وامان کو بحال کرتا تھا۔ اس کو ''مہا سماتا'' یا اہم انتخاب کہا جاتا تھا۔ اس طرح دھیرے دھیرے ریاست کا نظام وجود میں آتا چلا گیا۔ بعد میں یہ نظریات حکمراں اور عوام کے درمیان رابطہ کا عنصر بن گئے۔ برہمن سماج کا یہ ماننا تھا کہ حکمراں دیوتاؤں کی جانب سے مقرر کیا جاتا ہے اور یہ کہ یہ حکمراں اور عوام کے درمیان ذمہ داریوں کی ادائیگی کا معاہدہ ہوتا ہے۔ اس دور میں ''مانس انیائے'' کا نظریہ بھی موجود تھا جو اس پر محمول تھا کہ بدامنی کے دور میں جب کہ کوئی حکمراں نہیں ہوا طاقتور، کمزور کو اسی طرح ہڑپ کر جاتا جیسے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے۔ چنانچہ حکمراں کی ضرورت کو قطعی سمجھا جاتا تھا۔ ریاست کا وجود ابتدائی طور پر دو عناصر ''دنڈ'' (اقتدار) اور ''دھرم'' (اس کے اپنے معنی میں سماجی نظام یعنی ذات پات کے ڈھانچہ کا تحفظ) پر مبنی تھا۔ مزید برآں ''ارتھ شاستر'' میں ریاست کے سات پہلو (سپت انگ) کا حوالہ دیا گیا ہے یہ سات پہلو راجہ، انتظامیہ (مملکت) راجدھانی کے زیر تحت علاقہ، خزانہ، طاقتور اقتدار اور حلیف پر مشتمل ہیں۔ تاہم ریاست کے سیاسی تصورت کی اہمیت آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ اس کا ایک سبب تو عوامی حکومت کی سیاسی روایات کا زوال تھا اور دوسرا سبب بادشاہی نظام کا بتدریج غلبہ تھا جس میں اطاعت اور وفاداری بادشاہ کے لیے ہوتی تھی۔ موریہ راجاؤں نے بادشاہت کے نظام کے سیاسی تصور کو اور زیادہ مستحکم بنایا۔ دوسرا عنصر ''دھرم'' کا تھا جس کا مطلب سماجی نظام سے تھا، جو ریاست کے موہوم پڑتے ہوئے تصور کے مقابلے میں زیادہ اطاعت گزاری کا تقاضہ کرتا تھا۔ ''دھرم'' کی حفاظت کرنا راجہ کا فرض ہوتا تھا اور اس وقت جب تک کہ سماجی نظام محفوظ رہتا تھا، بدنظمی اور بدامنی کے پھیلنے کا اندیشہ نہیں ہوتا تھا۔ سماجی نظام کے ساتھ وفاداری اور وابستگی، جو ہندوستانی تہذیب کا بنیادی پہلو تھی، گذشتہ صدیوں میں اہم سماجی دستوروں کے موثر تسلسل کی وجہ رہی ہے۔ تاہم اس نے اپنی وابستگی کو ریاست کے سیاسی تصور سے منتقل بھی کیا۔ جو شاید اور زیادہ متواتر حکومتوں اور وسیع تر سیاسی بیداری کو بڑھاوا دیتا۔ موریہ حکومتوں کے زوال کے بعد کسی دوسری منظّم حکومت کے وجود میں آنے میں کئی صدیاں لگیں۔

نوٹس

30.3 سندھ اور ویدک سیاسی/ یا حکومتی تنظیمیں: ما قبل ریاست سے ریاست کی جانب

وادیٔ سندھ کی شہری تہذیب ایک جامع منصوبہ بندی کے بارے میں بتاتی ہے جو پورے علاقہ میں نظر آتی تھی اور یہاں کے عوام اس وقت کے معیار کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ آثار قدیمہ کے ذریعہ دریافت کردہ شواہد کے باوجود وادی سندھ کی ''ریاست'' کے سماجی اور سیاسی ڈھانچوں کے بارے میں معلومات ابھی بھی قیاس پر ہی منحصر ہے۔ وادیٔ سندھ کی پوری سرزمین میں ناپ اور تول سے متعلق پیمانوں میں یکسانیت قابل ذکر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ پر تعمیراتی کام مثلاً بڑے بڑے گوداموں کی موجودگی ایک وسیع علاقہ پر بڑی حد تک سیاسی اور انتظامی کنٹرول کا مظہر ہے۔

آریائی 1500 قبل مسیح کے آس پاس درّہ خیبر سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور ہندوستان کی تاریخ میں ایک اور تہذیب کو جنم دیا جو ویدک دور کے نام سے جانی جاتی ہے۔ آریائی قبائل میں بٹے ہوئے تھے جو شمالی مغربی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ قبیلے کی سرداری دھیرے دھیرے موروثی بن گئی گو کہ سردار عام طور پر ایک کمیٹی یا پورے قبیلے کے مشورے اور ہدایت پر کام کرتا تھا۔ قبیلے کا سردار، جسے راجہ یا حاکم کہا جاتا تھا، ایک بہادر اور جنگجو فرد ہوتا تھا جس کا بنیادی فرض اپنے قبائل کی حفاظت کرنا ہوتا تھا۔ راجہ کی طاقت و اختیارات دھرم کے بڑے مہنتوں کے برابر ہوتی تھی۔ ویدک بادشاہت آریوں کے اردگرد کے حالات کا قدرتی نتیجہ تھی۔ راجہ حملہ یا دفاع کی صورت میں لوگوں کا سردار ہوتا تھا۔ اس کو عوام کا محافظ'' کہا جاتا تھا۔ ''رگ وید'' کے ایک مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ پرانے قبیلے کا صرف سردار ہی نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ اس کو قبیلہ کے باسیوں میں امتیازی مقام بھی حاصل ہوتا تھا۔ لوگوں کی حفاظت راجہ کا مقدس فرض ہوتا تھا۔ اس کے بدلے وہ لوگوں سے خراج کی صورت میں اطاعت وفرمانبرداری کی توقع کرتا تھا اور وہ اسے حاصل بھی ہوتی تھی۔

آریائی قبائل مضبوط سیاسی بنیاد کی عدم موجودگی اور ذات پات کے اپنے اندرونی نظام کی غیر پائیدار نوعیت کی وجہ سے غیر آریائی طبقوں کے خلاف متحد ہونے میں ناکام رہے۔ ذات پات کے سخت اور بے لوچ نظام پر مبنی کمزور حکومت، جو لوگوں کو گروہوں میں تقسیم کرتا تھا اور اُن کے اندر متزلزل احساسات پیدا کرتا تھا۔ یہی وہ وجوہات تھیں جن کی بنا پر ویدک حکومت، وادیٔ سندھ کی تہذیب کے مقابلہ میں کمزور اور غیر منظم تھی۔

ویدک عہد کے دوران سیاسی یونٹ مثلاً ''جن'' موجود تھے جو بعد میں ''جن پد'' اور مہا جن پد'' میں تبدیل ہو گئے ''جن'' وہ علاقہ کہلاتا تھا جہاں قبیلے کے لوگ رہتے تھے۔ ان قبائل کا نام ایک مخصوص سردار کے نام سے منسوب ہوتا تھا۔ بعد میں علاقہ کی توسیع کے ساتھ سیاسی تنظیم کی نوعیت میں تبدیلی آتی گئی۔

ویدک عہد کے حکومت کے نئے نظام کے طور پر حکومت کا آئین جہانبانی وجود میں آیا۔ قبائلی ریاست

نوٹس

کی یکجہتی اور بہترین جنگجو سرداروں کی سیاسی طاقت نے ایک نئی طرز کی حکومت کو جنم دیا۔ اس کا مقصد زیادہ پیشہ ور فوجوں کی تیاری اور راجہ پر انحصار کو بڑھاوا دینا تھا۔ آئین جہانبانی کا مقصد مال غنیمت اکٹھا کرنے یا قبائلی علاقوں کو بڑھانے کے بجائے قدرتی وسائل سے مالا مال علاقوں پر قبضہ کرنا اور کسانوں سے لگان وصول کرنا تھا۔

30.4 مہاجن پد

موریہ دور حکومت سے قبل کی صدیاں، یعنی وہ دور جس میں کوسالہ اور مگدھ حکومتوں کا فروغ ہوا، نسبتاً تیز رفتار سماجی اور معاشی تبدیلیوں کا دور تھا۔ اس دور میں قبائلی ریاست کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہونا، ذات پات کے نظام میں تبدیلی اور مشرقی گنگائی وادی کے چاول کے علاقوں کی جانب پیش قدمی نظر آتی ہے۔ پرانے سماجی سمجھوتوں کی شکستگی کے اس دور میں، سماجی اور معاشی تعلقات کے نئے طریقوں کے قیام کے دوران ہمیں بڑے پیمانے پر تبدیلی کا تصور نظر آتا ہے۔ بودھ مت اور جین مت کا وجود میں آنا اسی انقلابی تبدیلی کا نتیجہ تھی۔ آریائی پنجاب کے علاقوں کے اپنے اصل ٹھکانوں سے دھیرے دھیرے مشرق کی جانب پھیلنے لگے۔ انھوں نے 1500 اور 800 قبل مسیح کے دوران گنگا اور یمنا (جمنا) کے کناروں پر گھنے جنگلات صاف کر کے قبائلی بستیاں بسائیں۔ 500 قبل مسیح کے آس پاس شمالی ہندوستان کا زیادہ تر علاقہ آباد ہو چکا تھا اور اس پر کھیتی باڑی کی جانے لگی تھی اور اس کے ساتھ لوہے سے بنے زرعی اوزاروں کے بارے میں جانکاری بڑھنے لگی تھی جن میں بیلوں کے ذریعہ کھینچے جانے والے ہل بھی شامل تھے۔ اور اس علاقہ کی آبادی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا جس کی وجہ سے رضا کار اور جبری دونوں طرح کے مزدور فراہم تھے۔ دریائی اور خشکی کے راستوں سے تجارت کے پھلنے پھولنے کے ساتھ ہی دریائے گنگا کے کنارے کے زیادہ تر شہر تجارت، ثقافت اور شاہانہ زندگی کے مراکز میں تبدیلی ہوگئے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور وافر پیداوار نے آزاد ریاستوں کے وجود میں آنے کی بنیاد فراہم کی جن کی کوئی متعین سرحد نہیں ہوتی تھی اور جن کی وجہ سے ان میں متواتر تصادم اور جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔

کئی علاقائی ریاستوں یا موروثی بادشاہتوں قبائلی سرداروں کی سربراہی میں بنیادی انتظامیہ کی داغ بیل پڑی جو آمدنی کو اکٹھا کرنے اور آبادی اور کھیتی باڑی کی زمینوں کو اور زیادہ مشرق اور جنوب کی طرف دریائے نرمدا کے پار تک بڑھانے کے لیے مزدوروں کی جبری بھرتی کے طریقے بنایا کرتی تھی۔ ان ابھرتی ہوئی ریاستوں نے اپنے افسروں کے ذریعہ محصول وصول کیے فوج کو ترتیب دیا اور نئے شہروں اور شاہراہوں کی تعمیر کی۔ 600 قبل مسیح تک آج کے افغانستان سے بنگلہ دیش تک پھیلے ہوئے شمالی ہندوستان کے میدانوں میں اس طرح کی سولہ علاقائی طاقتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تخت و تاج کے لیے بادشاہ کے حق کو، اس سے قطع نظر

کہ اس کو کس طرح حاصل کیا گیا ہے، قربانی کی رسموں اور سلسلہ نسب یعنی ماضی سے حال تک خاندان کے ممبروں کی تاریخ کے بارے میں پجاریوں کی جھوٹی اور من گھڑت کہانیوں کے ذریعہ جائز بنایا جاتا تھا جو بادشاہ کو مقدس یا مافوق الفطرت نسل کا بتاتا تھا۔ کتابوں میں 16 ''مہا جن پدوں'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں سے مگدھ، کوسالہ، کاسی، آونتی، ویشالی، لچھوی اہم ''مہاجن پد'' تھے۔ ''مہاجن پدوں'' کی دو قسمیں تھیں جن کے بارے میں ذیل میں بتایا گیا ہے۔

(i) بادشاہی مہاجن پد

''مہاجن پد'' کی دو قسموں میں سے پہلی بادشاہی طرز کی تھی۔ جس میں بادشاہ یا قبائلی سردار علاقے کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں ویدک رسموں اور برہمنوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ ان علاقوں کے راجہ ویدک قربانیاں کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر کوسالہ ''مہاجن پد'' بادشاہی قسم کی تھی۔ کوسالہ کا راجہ پرسن جیت قربانیوں کے لیے مشہور تھا۔

(ii) جمہوری مہاجن پد

مہاجن پد کی دوسری قسم جمہوری یا عدیدیہ تھی جس میں چند لوگوں کے ذریعہ حکومت کی جاتی تھی یہ بادشاہی ریاستوں سے مختلف نوعیت کی حامل تھی۔ اس دوسرے زمرے میں راجہ کا انتخاب لوگوں کے ایک گروپ سے کیا جاتا تھا جنھیں ''راجہ'' کہا جاتا تھا اس طرح کی ریاست میں اسمبلیوں کا ذکر بھی ملتا ہے جنھیں ''سبھا'' کہا جاتا تھا جن میں ارکان کسی مخصوص معاملے کے بارے میں بات چیت کیا کرتے تھے اور اس کے بعد اس معاملہ کے بارے میں ووٹ بھی کیا جاتا تھا۔

اسی طرح کی ایک اسمبلی میں 7707 ''راجاؤں'' کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے جو ''راج نیاس'' طبقہ کی نمائندگی کرتے تھے اور ان زمینوں کے مالک تھے جن پر 'داس' اور کرم کاروں'' (مزدوروں) کے ذریعہ کھیتی باڑی کی جاتی تھی۔ ''راجہ'' لڑائی کرنے کی اپنی صلاحیت کے لیے جانے جاتے تھے۔ ویدک قربانیوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی اور برہمنوں کو چھتریوں کے بعد دوسرے نمبر کی سماجی حیثیت حاصل تھی۔ ان ''مہاجن پدوں'' کے مطالعہ کے لیے بودھ مت کی کتابیں خاص وسیلہ ہیں۔

(iii) بادشاہی مہاجن پد اور جمہوری جن پد کے درمیانی ٹکراؤ

ورِجّی کی نیم وفاقی ریاستیں (کئی ریاستوں کی یونین) جو کوہ ہمالیہ کے دامن میں واقع ایک طاقتور عدیدیہ حکومت تھی۔ اس نے کچھ بادشاہی ریاستوں کی برتری کو چنوتی دی۔ مگدھ اور لچھوی جیسی بادشاہی

نوٹس

ریاستوں کے لیے یہ ایک کٹھن معاملہ تھا اس لیے کہ وہ اپنے علاقوں میں توسیع کرنے کے اہل نہیں تھے۔ ''مہاجن پدوں کے درمیان اقتدار اور برتری کو لے کر ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ مگدھ کا ایک پر عزم راجہ اجات شترو تھا جس نے پڑوسی علاقوں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جنگی ہنر مندی اور شادی کے بندھنوں کے سبب وہ کوسالہ اور کاسی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

متن پر مبنی سوالات 30.1

درج ذیل جملوں کو درست کر کے دوبارہ لکھئے:

1۔ شروع میں انسانی سماج بنیادی طور پر ایک قبائلی سماج نہیں تھا؟

____

2۔ سمراٹ اشوک کے وجود نے بادشاہت کے سیاسی تصور کو مستحکم بنایا؟

____

3۔ آریائی قبائل مضبوط سیاسی بنیاد کی عدم موجودگی کی وجہ سے غیر آریائی لوگوں کے خلاف متحد ہوئے؟

____

4۔ ایک اسمبلی میں 7707 / 7077 ''راجہ'' شامل تھے جو راج نیاس طبقہ کی نمائندگی کرتے تھے؟

____

30.5 مگدھوں اور موریاؤں کا ابھار

بادشاہی ریاستوں میں مگدھ ایک اہم طاقت بن کر ابھرا۔ تاہم اسے لچھوی ریاست کے خلاف کئی برسوں تک لڑائی کرنی پڑی۔ اجات شترو نے اپنے وزیروں کے ذریعہ وریجی کی نیم وفاقی ریاستوں میں پھوٹ کے بیج بوئے۔ اس کوشش کے نتیجہ میں اجات شترو کو لچھوی حکومت کے خلاف فتح حاصل ہوئی اور وہ بالآخر مگدھ سلطنت کا حصہ بن گئی۔

یہ خطہ شمال کے تجارتی راستہ پر قابض تھا جسے ''اتر پتھ'' کہا جاتا تھا۔ جب کہ جنوبی راستہ کو ''دکشن پتھ'' کہا جاتا تھا۔ جس پر مگدھ ریاست کا قبضہ تھا۔ ان فتوحات کی وجہ سے مگدھ دریاؤں کی زرخیز وادیوں اور خام لوہے کی کانوں جیسے معاشی وسائل کو اپنی حکومت کے تحت لینے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے مختلف مصنوعات کی تیاری کے لیے مواددوں کی ضروری فراہمی کا بندوبست کرنا آسان ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ مگدھ ہی تھا جہاں سے ریاست کی تشکیل کی علامتوں کا آغاز ہوا۔

نوٹس

قدیم ریاستیں

موریائی سلطنت جس پر موریائی خاندان کا راج تھا ، جو قدیم ہندوستان کی ایک سب بڑی اور طاقتور سیاسی اور فوجی حکومت تھی۔ آج کے بہار اور بنگال کے سندھ، گنگائی میدانوں پر پھیلی مگدھ کی سلطنت تھی، جس کی راجدھانی پاٹلی پتر (پٹنہ کے نزدیک) تھا۔ اس سلطنت کی بنیاد چندر گپت موریہ تھے 322 قبل مسیح میں ڈالی جس نے نند خاندان کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا اور اپنے اقتدار کو پورے وسطی اور مغربی ہندوستان میں پھیلانا شروع کر دیا۔ راجہ بندوسار نے اس سلطنت کی سرحدیں وسطی اور جنوبی علاقوں تک پھیلا دیں لیکن اس نے کلنگ کے قریب چھوٹے سے قبائلی اور جنگلاتی علاقہ کو چھوڑ دیا۔

ایک بڑی جنگ میں کاسنگ کی فتح کے بعد سمراٹ اشوک نے اپنی حکومت کی فوجی توسیع کو ختم کر دیا۔ چنانچہ جنوبی ہندوستان میں پانڈیہ اور چیرا سلطنتوں کی آزادی برقرار رہی اور انھوں نے موریائی راجہ کی برتری کو تسلیم کر لیا۔ موریائی سلطنت انگریزوں کی آمد سے قبل بر"عظیم ہند کی شاید سب سے زیادہ طاقتور حکومت تھی۔ سمراٹ اشوک کی حکومت ختم ہونے کے پچاس برسوں بعد کے بعد اس کا زوال شروع ہوا اور 185 قبل مسیح میں مگدھ میں سُنگ سلسلۂ نسب کی حکومت کے قیام کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔

30.6 موریائی ریاست

چندر گپت موریہ کے وزیر کوٹلیا چانکیہ نے "ارتھ شاستر" لکھی جو معاشیات، سیاست، بیرونی تعلقات اور فن حرب انتظامیہ، جنگ اور دھرم کے بارے میں مشرق میں لکھے جانے والے سب سے عظیم مقالات ہیں۔ آثارِ قدیمہ کی دریافتوں کے مطابق جنوبی ایشیا میں موریائی حکومت شمال کے سیاہ پارش شدہ برتنوں کے عہد میں آتی ہے۔ "ارتھ شاستر" اور اشوک کے فرمان موریائی دور کے تحریری ریکارڈوں کا اصل ماخذ ہیں۔ سارناتھ میں اشوک کی شیر کے نشان والی لاٹ ہندوستان کا علامتی قومی نشان ہے۔

موریائی سلطنت سیاسی بناوٹوں اور ماحولیاتی علاقوں کی وسیع اقسام پر مشتمل تھی، اس میں جنگلوں میں بسنے والی قومیں، خانہ بدوش قبائل، سرداروں کے زیر اثر گروہ، اور "گن سنگھ" جیسے سرداروں کے گروپ پر مبنی عدیدیہ حکومتیں شامل تھیں۔ ان میں مختلف النوع انتظامی ڈھانچوں پر مبنی چھوٹی بادشاہتیں بھی شامل تھیں جن کا انتظامی ڈھانچہ مگدھ کے انتظامی ڈھانچہ سے مختلف بھی ہوتا۔ اس سلطنت کے مختلف حصوں مثلاً مرکز، بڑے شہر اور سرحدی علاقوں کا انتظام مختلف طریقوں سے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ پوری موریائی سلطنت میں انتظامیہ کا یکساں طریقہ موجود نہیں تھا۔ مرکز اور بڑے شہروں کے انتظامی امور راست طور پر ریاست کی ذمہ داری تھی جب کہ سرحدی علاقوں کو اور زیادہ خودمختاری دی گئی تھی اس لیے کہ ان علاقوں سے ٹیکسوں اور لگانوں کی وصولی کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ انتظامی نیٹ ورک اعلیٰ دفتری عہدیداروں پر مشتمل تھا جن کی تقرری اعلیٰ ذات کے طبقہ سے کی جاتی تھی اور ان کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ آسامیوں ح کی بھرتی کا کوئی مرکزی

نوٹس

نظام نہیں تھا اور مقامی لوگوں کا ریاست کے مرکزی شہر سے دور کے علاقوں میں تقرر کیا جاتا تھا۔

سمراٹ اشوک کے دورِ حکمرانی میں موریائی سلطنت باقاعدہ طور پر پانچ حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ مگدھ اور کچھ متصل مہاجن پد راست انتظامیہ کے تحت آتے تھے۔ یونانی سفیر میگاستھنیس کی رپورٹوں اور ارتھ شاستر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حکومت کا مرکزی حصہ کسی حد تک مرکزی انتظامیہ کے تحت تھا۔

30.7 موریائی دفتری نظام

یہ ریاست چار صوبوں میں بٹی ہوئی تھی جس کی راجدھانی پاٹلی پتر تھا۔ اشوک کے فرمانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان چاروں صوبوں کی راجدھانیاں مشرق میں توسالی مغرب میں اُجین، جنوب میں سورن گری اور شمال میں ٹکسلا تھیں۔ صوبائی حکومت کا سربراہ ''کمار'' (شہزادہ) کہلاتا تھا۔ جو راجہ کے نمائندے کی حیثیت سے صوبہ پر حکومت کرتا تھا۔ ''مہامتھ'' اور وزراء کی کونسل کمار کی مدد کرتی تھیں۔ یہ تنظیمی ڈھانچہ شاہی سطح پر راجہ اور اس کے ''منتری پریشد'' (وزراء کی کونسل) کو جواب دہ ہوتا تھا۔ دفتری نظام کا کام مفتوحہ علاقوں کی ازسرنو تشکیل کرنا یا ان کو انتظامیہ کے یکساں نمونہ کے مطابق چلانا ہی نہیں بلکہ آمدنیوں کے مسلسل حصول کو یقینی بنانا ہوتا تھا۔ اس حکومت کے عروج کے زمانے میں افسروں کے ایسے گروپ کا ذکر بھی ملتا ہے جو بنیادی طور پر مالیاتی انتظامیہ کے لیے مخصوص تھا اور جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان افسروں کا تقرر راست طور پر مرکز کی جانب سے کیا جاتا تھا۔ اپنے حلقہ کا دورہ کرنا اور محکومین کی فلاح و بہبود کی خبر گیری کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ آبپاشی کا نظام لامرکزی تھا اور یہ چھوٹے پیمانے کے کئی نظاموں پر مبنی تھا جو دریاؤں ''تالابوں'' کنوؤں، چشموں اور مصنوعی تالابوں سے آبپاشی کا پانی حاصل کرتے تھے۔ اور زیادہ آبی ذخائر دریاؤں کے کنارے مقامی وسائل کے ذریعہ تعمیر کیے جاتے تھے گو کہ حکومت نئے آباد ہوئے علاقوں میں آبپاشی کے کاموں میں مدد کرتی تھی۔ دریافتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آبپاشی کا کام مقامی طور پر کنٹرول کیا جاتا تھا۔

موریائی تجارت کے ذریعہ بھی آمدنیاں حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ تاہم تجارت کو باقاعدہ شکل دینے کے معاملہ میں بھی انھوں نے کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھائی۔ اس کا اندازہ اسی بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے امتیازی نوعیت کا کوئی دھاتی سکہ رائج نہیں کیا، جو معمولی سے ٹھپے دار سکے دریافت ہوئے ہیں ان کے بارے میں یہ امکانات ہیں کہ انھیں کسی طرح کی تجارتی انجمنوں یا مقامی اداروں نے بنایا تھا۔ ریاست نے انفرادی تاجر یا تاجروں کے گروپ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے وہ ان کی شناخت کا معائنہ کرتے تھے۔ ان کے سامان تجارت اور منافعوں کی جانچ کرتے تھے۔ مصنوعات کی تیاری کی جگہ پر ان کی فروخت پر پابندی تھی شاید اس لیے کہ منڈی میں ان کی فروخت آمدنی اکٹھا کرنے والے افسروں کی

نوٹس

دسترس میں تھی۔ مصنوعات کی تیاری میں، خام موادوں سے لے کر تیار شدہ مصنوعات تک کئی جگہ ٹیکسوں کی وصولی جاتی تھی۔ مصنوعات کے معیار کو یقینی بنانے اور دھوکہ دھڑی وجعل سازی کو روکنے کے ساتھ ساتھ ان اشیاء کی تجارت پر نگرانی کے لیے خصوصی افسران مقرر کیے گئے تھے جن کی تجارت پر ریاست کی اجارہ داری تھی۔ ان اشیاء میں ہتھیار، زرہ بکتر، دھاتیں اور قیمتی پتھر شامل تھے۔ چنانچہ تجارتی مصنوعات آزادانہ طور پر منڈی میں فروخت ہوتی تھیں اور اس طرح سے تجارت، ریاست کی آمدنی کا ایک بڑا اور اہم وسیلہ تھا۔

مورخین کا نظریہ ہے کہ حکومت کی تنظیم، وسیع تر دفتری نظام کے ساتھ تھی جس کے بارے میں کوٹلیا چانکیہ نے ارتھ شاستر میں لکھا ہے۔ ایک عمدہ شہری حکومت، شہر کے باسیوں کی صحت سے لے کر بین الاقوامی تجارت تک، ہر طرح کا انتظام سنبھال سکتی ہے۔ حکومت کا دفاع اس وقت کی شاید سب سے بڑی فوج کی وجہ سے ممکن ہوسکا۔ یونان سفیر میگا تھینس کے مطابق یہ فوج 600,000 پیدل سپاہیوں، 30,000 گھڑسواروں اور 9,000 جنگی ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ جاسوسی کا ایک وسیع نظام داخلی اور خارجی دونوں طرح کے تحفظ کے لیے خفیہ اطلاعات فراہم کرتا تھا۔ جارحانہ جنگی کارروائیوں اور توسیع پسندی سے کنارہ کشی کے باوجود سمراٹ اشوک سلطنت کے تحفظ اور مغربی اور جنوبی ایشیا میں پائداری امن کی برقراری کے لیے اس اتنی بڑی فوج کو مسلسل تیار رکھتا تھا۔

30.8 مابعد موریائی ریاستیں

مابعد موریائی بادشاہتیں وسطی ایشیائی حملہ آوروں یعنی ہند۔ یونانی، شاکیہ، پارتھین اور کُشانوں کی آمد کی نشاندہی کرتی ہیں۔ انھوں نے مقامی حکاموں کو شکست دی اور اس طرح سے آقا اور غلام کے تعلقات پر مبنی تنظیم کی پیش رفت کے لیے راہ ہموار کی۔ وسطی ایشیائی درانداز وں نے بادشاہ کے مقدس ہونے کے تصور کو مستحکم کیا۔ کشان راجہ اپنے آپ کو ''دیوتا کا بیٹا'' بتایا کرتا تھے۔ وسطی ایشیا سے آنے والوں نے ''سترپ'' نظام اور فوجی حکومت کو بھی رائج کیا۔

متن پر مبنی سوالات 30.2

درج ذیل سوالات کے جواب دیجیے:

1۔ ارتھ شاستر کس نے لکھی؟

2۔ 7ویں اور 8ویں صدی قبل مسیح میں کمار کس کو کہا جاتا تھا؟

نوٹس

3۔ میگاستھینز کون تھا؟

4۔ موریہ زمانے کی چار ریاستوں کی راجدھانیوں کے نام بتائیے؟

5۔ میگاستھینز کے مطابق موریہ حکومت کی کتنی فوجی طاقت تھی؟

30.9 گپتا ریاست کی توسیع

چوتھی صدی عیسوی کی سب سے بڑی اور طاقتور حکومت، گپتا حکومت تھی جو ہندوستانی تاریخ کے ایک سنہرے دور کا آغاز تھا یہ سلطنت کم از کم دو صدیوں تک برقرار رہی۔ اس کے تحت ہندوستانی برعظیم کا ایک بڑا حصہ آتا تھا۔ لیکن موریائی حکومت کے مقابلہ میں اس کا نظم ونسق بہت زیادہ منظم نہیں تھا۔ لیکن سُنگ راجاؤں کے مقابلہ میں زیادہ منظم تھا۔ راجاؤں کے مقدس ہونے کا نظریہ گپتا دور حکومت کے دوران اور زیادہ مستحکم ہوگیا۔ اپنے پڑوس کی چھوٹی حکومتوں کے ساتھ جنگ اور شادی بیاہ کے بندھنوں کے سبب اس سلطنت کی سرحدیں ہر گپتا راجہ کے ساتھ بڑھتی گھٹتی رہیں۔ گپتا راجاؤں کی سلطنت کا علاقہ گوکہ موریائی سلطنت کے مقابلہ میں کم وسیع تھا۔ لیکن یہ برعظیم کے نصف شمالی اور وسطی علاقوں تک پھیلا ہوا تھا۔ گپتا راجاؤں کے دور کو سامراجی عہد بھی کہا جاتا ہے لیکن مرکزی نظم ونسق جو سامراجی نظام کی ایک اہم خصوصیت ہے، موریا راجاؤں کے دور کے مقابلہ میں کم نظر آتی تھی۔ موریا راجاؤں کے برعکس، گپتا سلطنت میں دوسرے راجاؤں کو ایک غلامانہ انداز میں رہنا پڑتا تھا۔ انھوں نے ہر حکومت کو ایک واحد انتظامی یونٹ میں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی۔ بعد کے مغل بادشاہوں اور برطانوی راج کے لیے ایک نمونہ تھا۔ برطانوی راج کی تعمیر مغل نمونہ کے مطابق تھی۔

گپتا راجا، جن کا تعلق ایک غیر معروف خاندان سے تھا، مگدھ یا اترپردیش کے مشرقی حصہ سے تعلق رکھتے تھے۔ گپتا سلسلۂ نسب کے تیسرے راجہ چندر گپت اول نے ''مہاراج ادھیراج'' کا لقب اپنالیا۔ اس نے ایک لچھوی شہزادی سے شادی کر لی اور شادی کا جشن سونے کے سکوں کے ساتھ منایا گیا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگر گپتا سلطنت کی حکومت اگر پریاگ (مشرقی اترپردیش میں آج کا الہ آباد) پر ہوتی تو وہ شادی بیاہ کے بندھن کے ذریعہ مگدھ کو اپنے حلقۂ اقتدار میں شامل کر سکتے تھے۔ گپتا راجاؤں کے دور کا آغاز 320 قبل مسیح سے ہوتا ہے۔ چندر گپت نے اپنے بیٹے سمدر گپت 330 قبل مسیح کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس کا اندازہ الہ آباد

نوٹس

میں نصب ایک ستون سے بھی ہوتا ہے جس پر سمدر گپت کی شان میں ایک طویل قصیدہ کھڈا ہوا ہے۔ ایک غیر معروف شہزادے، کاچا کے نام کے سکوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تخت کے اور بھی امیدوار موجود تھے۔ سمدر گپت کی مہمیں اس کو کئی سمتوں میں لے گئیں اور اس نے بہت سی فتوحات بھی حاصل کیں۔ ان فتوحات کے دوران اس نے وہ سب کچھ کیا جو دوسروں نے اس سے چاہا۔ ان فتوحات سے حاصل ہونے والے علاقوں میں آریہ ورت کے حکمرانوں کے علاقے مختلف جنگلی قبائل کے سردار، شمالی عدیدیہ حکومتی اور نیپال سمیت مشرق کی سرحدی ریاستیں شامل تھیں۔ سمدر گپت کے دائرہ اقتدار میں شامل کیے گئے دور دراز کے علاقوں کو محکوم علاقے قرار دیا گیا۔ اس میں شمال مغرب کے ''راجاؤں کے راجہ'' شاکیہ، فرونداس اور سنہالا (سری لنکا) سمیت ''تمام جزائر'' کے باشندے شامل تھے۔ ان سبھی کا تذکرہ آلہ آباد میں نسب ستون پر کھدی ہوئی تحریر میں کہا گیا ہے۔ گنگا کی وادی اور وسطی ہندوستان راست انتظامی کنٹرول کے علاقے تھے۔ سمدر گپت کا بیٹا چندر گپت دوم 380 قبل مسیح میں تخت نشین ہوا۔ گو کہ اس طرح کے شواہد ملتے ہیں کہ غالبا رام گپتا کے نام سے ایک درمیانی حکمراں نے بھی عنان حکومت سنبھالی تھی۔ چندر گپت، دوم کی بڑی مہمیں اُجین کے شاکیہ حکمرانوں کے خلاف تھیں جس کی کامیابی کا جشن چاندی کے سلسلہ وار سکوں کو رائج کر کے منایا گیا۔ دکن سے متصل گپتا حکومت کے علاقہ کو وکاٹا سلسلہ نسب میں شادی کے بندھنوں کے ذریعہ حاصل کیا گیا۔ جو اس علاقہ میں ''ستواہن'' کے جانشین تھے۔ گو کہ چندر گپت'' دوم نے ''وکرماتیہ'' (عظیم سوریا) کا لقب اختیار کیا لیکن اس کا دور حکومت فوجی مہموں سے زیادہ ثقافتی اور دانشورانہ کامیابیوں سے منسوب ہے۔ اس کے دور میں چینی بودھ راہب فاھیان نے ہندوستان کی سیاحت کی اور اپنے تاثرات کو تحریری شکل دی۔

30.10 گپتا ریاست کی نوعیت

چندر گپت، اول کے دورِ حکومت کے بعد سے گپتا راجاؤں نے ''مہاراج ادھیراج'' کا لقب اپنایا اور جیسا کہ کھدی ہوئی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ''پرم راج ادھیراج''، ''راج ادھیراج شری'' اور ''راجہ راج ادھیراج شری'' جیسے القابات اپنائے۔ سمدر گپت کو زمین پر بسنے والا دیوتا کہا جاتا تھا۔ تاریخی کتابوں میں اس کو ''کُبیر''، ''اور'' اندار'' کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ موروثی جانشینی کا قیام اسی دور میں ہوا گو کہ راجہ جانشینی کے لیے اپنے واضح وارث کا ہی انتخاب کرتا تھا۔ گپتا راجاؤں کے ذریعہ مفتوحہ طاقتوں کو آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت تھی۔ وہ مفتوحہ علاقوں کو زیر کرتے تھے لیکن انھیں اپنی سلطنت میں شامل نہیں کرتے تھے۔ غلاموں جیسی یہ صوبیداریاں گپتا راجاؤں کو خراج ادا کرتی تھیں لیکن ان میں سے بعض اکثر و بیشتر گپتا راجاؤں کو اپنے سرکاری اندراجات میں اپنا حاکم درج نہیں کرتے تھے۔ ستواہنوں کے تحت شروع کیا گیا زمینوں اور دیہاتوں کے عطیات (دان) کا عمل گپتا راجاؤں کے دور میں بھی جاری رہا۔ ان عطیات

نوٹس

میں انتظامی حقوق بھی شامل تھے جس کی وجہ سے انتظامی اختیار مرکزی نوعیت حاصل نہیں کر سکے۔ زمینوں کے وصول کنندگان کو محکوم مالکانہ حقوق دیے گئے۔

وسطی اور مغربی ہندوستان میں دیہی افراد کو جبری مزدور بھی بھرتی کیا جاتا تھا جنھیں ''وِستی'' کہا جاتا تھا اس جبری مزدوری کا اطلاق سبھی طبقات پر ہوتا تھا۔

30.11 گپتا راجاؤں کی انتظامیہ

گپتا ریاست انتظامی طور پر صوبوں میں بٹی ہوئی تھی جنھیں ''دیس'' یا ''بھکتی'' کہا جاتا تھا۔ اور ان کو اور زیادہ چھوٹے یونٹوں ''پرادیس'' یا ''وسائے'' میں تقسیم کیا گیا تھا۔ صوبوں کے انتظامی امور اعلیٰ شاہی افسران ''کمار اماتیہ'' یا شاہی خاندان کے ممبران کے ذریعہ چلائے جاتے تھے۔ اختیارات کی ذمہ داری کی چھوٹے علاقوں میں منتقلی میونسپل بورڈ ''ادھیستان ادھیکاران'' کی تشکیل سے ظاہر ہوتی ہے جو پیشہ وروں کی کمیٹیوں کے صدر ''ناگریستن'' بڑے تاجروں'' سارتھواہا'' اور فنکاروں اور خطوط نویسوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس مدت کے دوران ثالثوں کے لیے سانگ کی اصطلاح کا استعمال کیا جانے لگا جس کے اصل معنی تھے ''پڑوسی'' اور جن کو زمینوں کے عطیات دیے جاتے تھے یا پھر اس اصطلاح کا استعمال مفتوحہ منصب دار حکمرانوں کے لیے ہوتا تھا۔ اعلیٰ انتظامی افسران میں بھی عہدوں کو موروثی بنانے کا رجحان نظر آتا تھا۔ مفتوحہ علاقوں پر کنٹرول کی کمی کی وجہ سے یہ علاقے گپتا راجاؤں کی گرفت سے آزاد ہونے لگے۔ بار بار فوجی حملوں کی وجہ سے سلطنت کے وسائل کم ہونے لگے۔ گپتا راجاؤں نے ایک بڑی فوج بنائی تھی۔ اس فوج میں شہسوار رسالوں اور گھڑ سوار تیر اندازوں کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ زمین کے ٹیکس اور آبکاری ٹیکس وصول کیے جاتے تھے۔ عدلیہ نظام وجود میں آچکا تھا اور قانون سے متعلق کئی کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ پہلی بار شہری اور مجرمانہ قوانین کو الگ الگ کیا گیا تھا۔

30.12 گپتا دور کے بعد کی ہندوستانی ریاست

ہرش وردھن اور اس کے بعد کے پال، پرتی ہار، راشٹرکوٹ اور چالوکیہ راجاؤں کا نظام حکومت راجہ کی شخصیت پر مرکوز ہوتا تھا جو وراثتی ہوتی تھی۔ منصب داری کا نظام غالب تھا اور راجاؤں اور منصب داروں کے درمیان متواتر جنگوں نے سیاسی حالات کو دگرگوں اور نازک بنا دیا تھا۔ ریاستیں ایسے علاقوں پر مشتمل تھی جہاں راست طور پر راجاؤں کی حکومت تھی اور ایسے بھی علاقے تھے جن پر منصب داروں کے سردار کا حکم چلتا تھا جو اپنے اندرونی معاملات میں خود مختارانہ طور پر فیصلے کرتے تھے۔ منصب داروں پر راجہ کے ساتھ وفاداری کی عام ذمہ داری تھی۔ وہ خراج ادا کرتے تھے اور راجہ کو فوجی دستے فراہم کرتے تھے۔ اس طرح سے یہ حکومت

منصب داریوں پر مبنی حکومت تھی۔

متن پر مبنی سوالات 30.3

خالی جگہوں کو بھریے:

1۔ چوتھی صدی کی سب بڑی سلطنت ________ تھی۔

2۔ تیسرے ________ راجہ نے ________ کا لقب اختیار کیا۔

3۔ سمدر گپت کا جانشین ________ تھا۔

4۔ فاہیان ہندوستان کا دورہ کرنے والا پہلا ________ راہب تھا۔

30.13 جنوبی ہندستان کی چولا ریاست

چولا اس دور میں بڑی حد تک برّعظیم کا سب سے اہم شاہی سلسلہ تھا گو کہ ان کی سرگرمیوں نے خاص طور سے ہندستانی جزیزہ نما اور جنوب مشرقی ایشیا پر اثر ڈالا۔ نویں صدی کے اواخر میں راجہ وجیالا کے دور حکومت کے دوران چولا اقتدار کا مرکز تھنجا دور تھا۔ جہاں سے چولا شاہی سلسلہ کا اقتدار شمال کی جانب پھیلا اور دسویں صدی تک اس نے پلو علاقے کے باقی حصوں کو بھی اپنے دائرہ اقتدار میں شامل کر لیا۔ جنوب کی جانب انھوں نے پانڈیوں کے خلاف جدوجہد کی۔ چولا حکومت کی تاریخ کو کافی تفصیل سے بتایا جاسکتا ہے اس لیے کہ اس کی تفصیلات بڑی تعداد میں طویل کندہ کتبات کی شکل میں موجود ہے جو نہ صرف شاہی خاندان کی طرف سے بلکہ مندر کے پجاریوں دیہی کونسلوں اور تاجروں کے گروپ کے ذریعہ تحریر کرائے گئے تھے۔ پرانٹکا، اول نے (907-953) اس سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ اس نے اپنی شمالی سرحد کو نیلور (آندھرا پردیش) تک بڑھایا جہاں اس کی پیش قدمی کو راشٹر کوٹ راجہ کرشنا سوم کے ہاتھوں شکست سے روکا گیا۔ پرانٹکا کو جنوب میں زیادہ کامیابیاں حاصل ہوئیں جہاں اس نے پانڈیوں اور کلنگ والوں کو شکست سے دوچار کیا۔ اس نے سری لنکا پر بھی ایک ناکام حملہ کیا۔ اس کی موت کے تیس برسوں بعد تک یکے بعد دیگرے کمزور حکومتوں کی وجہ سے سلطنت مستحکم نہیں ہو پائی۔ اس کے بعد دو ایسے غیر معمولی حکمرانوں نے اس سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی جنھوں نے نہ صرف چولا سلطنت کے اقتدار کو مضبوط کیا بلکہ اس سلطنت کی برتری کو بھی منوایا۔ یہ دونوں راجہ تھے راجا راج اول اور راجہ راجندر، راجہ راج (985-1014) نے پانڈیوں اور الا منڈلم (سری لنکا) پر حملوں کے ساتھ اپنے اقتدار کو قائم کرنا شروع کیا۔ شمالی سری لنکا چولا سلطنت کا ایک علاقہ بن گیا۔ کلنگ اور چا کولیہ راجاؤں کے خلاف مہم نے چولا اقتدار کی سرحد کو دریائے تنگ بھدر کے شمال تک

پھیلا دیا۔ مشرقی ساحل پر وینگی پر قبضہ کے لیے چولا سلطنت نے چالوکیا راجاؤں کے ساتھ جنگ کی۔ شادی کے بندھنوں نے چولا سلطنت کو برتری کی پوزیشن دی۔ لیکن وینگی جھگڑے کی وجہ بنا رہا۔ ایک بحری جنگی مہم کے ذریعہ مالدیپ جزائر، مالا بار کے ساحل اور شمالی سری لنکا پر قبضہ کر لیا گیا۔ یہ سبھی مقامات جنوب مشرقی ایشیا، اور مشرقی افریقہ کے ساتھ تجارت پر چولا سلطنت کے کنٹرول کے لیے ضروری تھے۔ یہ عرب تاجروں اور جنوب مشرقی ایشیا اور چین کے ساتھ تجارت کے عبوری علاقے اور بندرگاہیں تھیں۔ جہاں سے بیش قیمت مسالے ساحل پر اترتے تھے جنھیں یوروپ میں بہت زیادہ منافع کے ساتھ فروخت کیا جاتا تھا۔

راجہ راج کے بیٹے راجندر نے 1012 میں اپنے باپ کی حکومت میں ہاتھ بٹانا شروع کیا اور دو برسوں بعد اس نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس نے 1044 تک حکومت کی۔ اس نے شمال میں رائچور اور دو آب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور منی کھیتا کی طرف پیش قدمی کی جو چالوکیہ راجاؤں کے علاقے کا قلب تھا۔ سری لنکا کے راجہ مہندرا، پنجم کے خلاف بغاوت نے راجہ راجندر کو جنوبی لنکا پر چڑھائی کا بہانہ فراہم کر دیا۔ 22-1021 میں مشہور شمالی مہم جوئی کا آغاز ہوا۔ چولا سلطنت کی افواج نے مشرقی ساحل پر بنگال تک اور شمال میں گنگا کے میدانوں تک مہم جوئی کی۔ یہ سمدر گپت کی مہم کے بالکل برعکس تھی جس نے چوتھی صدی عیسوی میں کانچی پورم پر چڑھائی کی تھی۔ تاہم راجہ راجندر کی سب سے زیادہ شاندار مہم جوئی 1025 میں جنوب مشرقی ایشیا میں سری وجے سلطنت کے خلاف بحری فوج کشی تھی۔ سری وجے سلطنت اور اس کے پڑوسی علاقوں پر حملہ کی وجہ ہندوستانی بحریہ اور تجارتی مفادات میں مداخلت تھی جس کا مقصد جنوبی چین کے ساتھ راست تجارت کی کوشش تھی۔ چولا سلطنت کی فتح نے ان رابطوں کو بحال کر دیا اور پوری گیارہویں صدی میں چولا سلطنت کے تجارتی مشن چین کا تجارتی دورہ کرتے رہے۔

30.14 چولا انتظامیہ کا ارتقا

سامراجی دور (1200-850) کے دوران چولا ریاست انوکھے انداز اور اختراعات سے معمور رہی ہے۔ چولا شاہی سلسلہ کی سلطنت تھی جس نے پورے جنوبی ہندوستان کو ایک حکومت کے تحت لانے کی کوشش کی اور وہ اپنی ان کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اس سلطنت کی حکومت کی شکل اور پروٹوکول کا گو کہ عصری حکومت کی کسی شکل سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن چولا سلطنت ہماری تاریخ میں خوشحالی کے دور کا درجہ رکھتی ہے جب کہ سب کچھ دقیانوسی ہونے کے باوجود حکومت اور عام لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

راجہ کو سب سے اعلیٰ کمانداراور فیض رساں آمر کی حیثیت حاصل تھی۔ انتظامیہ میں اس کا حصہ ذمہ دار افسران کے لیے زبانی احکامات جاری کرنا تھا۔ یہ احکامات عام طور پر مندروں کی دیواروں پر انتہائی تفصیل

نوٹس

کے ساتھ کندہ کر کے درج کیے جاتے تھے۔ ایک خصوصی طرح کا افسر ''تڑمندیرا اولائی نیا یگم'' کہا جاتا تھا، راجہ کے فرمانوں کو فوری طور پر زیتون کے پتوں پر تحریر کرتا تھا اور وہ ان کی درستگی کا ذمہ دار بھی ہوتا تھا۔

وزراء کی کونسل یا مرکزی حکومت سے جڑے ہوئے افسران کے وجود کے بارے میں واضح شواہد دستیاب نہیں ہو پائے ہیں لیکن کتبات میں انفرادی وزیروں کے نام درج ہیں۔ دفتری امور کا ایک طاقتور عملہ انتظامیہ کے فرائض کی انجام دہی اور شاہی احکامات کی تعمیل میں راجہ کی مدد کرتا تھا۔ قانون یا جدید زبان میں قانونی نظام کی عدم موجودگی کی وجہ سے راجہ کے احکامات کی منصفانہ نوعیت افسر کی نیکی اور ''دھرم'' نیکی اور انصاف پسندی پر اس کے یقین پر منحصر ہوتی تھی۔ قدیم سماج حکومت سے تحفظ اور سلامتی کے علاوہ اور کسی چیز کے طلبگار نہیں تھے۔ جھگڑوں اور تنازعات بھی بہت مجبوری کی حالت میں دربار کے افسروں تک لے جائے جاتے تھے۔

چولا کا انتظامی عملہ اپنے ہمعصروں یعنی اس دور میں موجود دوسری سلطنتوں کے انتظامی عملہ سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھا۔ تاہم جو چیز ان کو دوسروں سے ممتاز بناتی وہ ان کی انتہائی منظم نوعیت تھی۔ مرکزی کنٹرول اور مقامی آزاد اداروں کے درمیان ایک محتاط توازن تھا۔ مقامی انتظامیہ میں عدم مداخلت انتہائی اہم پالیسی تھی۔ دفتری عملہ میں معینہ حسب مراتب موجود تھے اور افسران کی روزگار کی معیاد راجہ کی خوشنودی پر منحصر تھی۔ افسران کو مختلف خطابات مثلاً ''ماریان'' اور ''ادی گاریگل'' سے نوازا جاتا تھا۔ مساوی عملہ کے درمیان اعلیٰ تر مقام کو ''پیروندانم'' جیسے خطابات سے آنکا جاتا تھا۔ افسران کے عملہ میں اہم افسران ہوتے تھے جو کہ وصولیوں اور اخراجات کے ذمہ دار ہوتے تھے۔

ہر دیہات کا ایک خود انتظامی یونٹ ہوتا تھا۔ اس طرح کے دیہاتوں کی ایک مخصوص تعداد ملک کے مختلف حصوں میں ایک ''کورم'' یا ''ناڈو'' یا ''کوتم'' بناتی تھی۔ کئی ''کورم'' مل کر ایک ''ویلنڈو'' کہلاتے تھے اور کئی ویلنڈو ایک ''منڈلم'' کی تشکیل کرتے تھے جو ایک صوبہ کہلاتا تھا۔ چولا سلطنت کے عروج کے دنوں میں اس طرح کے آٹھ یا نو صوبے تھے جن میں سری لنکا بھی شامل تھا۔ چولا سلطنت کی مدت کے دوران ان صوبوں اور ان کے ناموں میں مستقل تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اترامیرور مندر میں آٹھویں صدی قبل مسیح کے ایک کتبہ میں مقامی کونسل کے قوانین، امیدواروں کی اہلیت اور نا اہلی، انتخاب کے طریقے، ان کے فرائض اور ان کے اختیارات کی حدود کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ دیہات ''اُر'' یا ''اور'' کی انتظامیہ، برہمنوں کو بطور تحفہ دیے گئے دیہات کے انتظامیہ سے مختلف نظر آتی ہے۔

دفتری عملہ کے افسران کی سرگرمیوں کا مستقل طور سے محاسبہ کیا جاتا تھا اور ان کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ اُتھاما چولا کے دور حکومت کے ایک کتبہ میں اسی طرح کی رپورٹیں اس کی ایک مثال ہے۔ جس میں کچھ افسران کی ایک مخصوص مختص رقم کے اندراج میں تاخیر میں لاپرواہی اور بے توجہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے

نوٹس

نتیجہ میں مخالف فریقوں کے درمیان یہ تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا کہ اس مختص کردہ رقم سے کس کو فائدہ پہنچنا چاہیے۔ اس واقعہ کے ذمہ دار افسران کو سزا دی گئی۔ شہری انتظامیہ کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے راجہ خود وقتاً فوقتاً ملک کا دورہ کیا کرتا تھا اور مقامی انتظامیہ سے پوچھ تاچھ کیا کرتا تھا۔ چولا راجہ کولوٹونگا نے 1089 کے آس پاس سلطنت کے علاقوں کا وسیع دورہ کیا اور زمینوں کی وسعت اور ان کے تجزیے، دیہاتوں کی سرحدوں، دیہاتوں کے اندر عام حقوق جس میں عام چراگاہوں سے متعلق حق بھی شامل تھا کا جائزہ لیا۔ مالیاتی افسران ٹیکس جمع کرنے کے ذمہ دار تھے۔ چولا حکومت ریاستی مشینری کو چلانے کے لیے ٹیکسوں کی منصفانہ اور درست وصولی پر پوری طرح سے توجہ دیتی تھی۔ آمدنی کے ریکارڈ جبری وصولی کے کھاتے نہیں تھے بلکہ زمینی حقوق کے انتہائی احتیاط اور چابک دستی سے بنائے اور برقرار رکھے گئے ریکارڈ تھے جو مکمل معلومات اور درستگی کے ساتھ کیے گئے سروے پر مبنی تھے اور ان کو باقاعدگی کے ساتھ سروے کر کے تازہ رکھا جاتا تھا۔

مالیاتی افسران کے فرائض میں ذمہ داریوں کے دوسرے میدان بھی شامل تھے۔ وہ مندروں کی وصولیوں اور اخراجات کا اندراج بھی رکھتے تھے۔ وہ دیہی اسمبلیوں کی جانب سے زمین بھی خریدتے تھے۔ وہ مقامی حکومتی اداروں مثلاً دیہی کونسل کی جانب سے جاری کردہ اہم دستاویزات کی تصدیق و توثیق بھی کرتے تھے۔ ان کو مجسٹریٹ کی حیثیت سے بھی کام کرتے ہوئے دکھلایا گیا ہے۔ مرکزی حکومت کے ذریعہ وصول کیے جانے والے ٹیکس کے علاوہ مقامی اداروں کو بھی چنگی اور دوسرے محصولات وصول کرنے کی مراعات حاصل تھیں۔

چولا سلطنت میں انصاف عام طور پر ایک مقامی معاملہ تھا۔ جہاں چھوٹے موٹے جھگڑے دیہی سطح پر طے کیے جاتے تھے۔ معمولی جرائم کے لیے سزا جرمانوں کی شکل میں ہوتی تھی یا قصوروار کو کسی خیراتی ادارے کو ایک مخصوص رقم بطور چندہ دینے کی ہدایت دی جاتی تھی۔ قتل عام یا انفرادی قتل کی سزا بھی جرمانہ کی شکل میں دی جاتی تھی۔ ریاست کے خلاف جرائم مثلاً غداری اور بغاوت کی شنوائی راجہ خود کرتا تھا اور اس کی سزا موت یا جائداد کی ضبطی ہوتی تھی۔ سزائے موت بہت زیادہ عام نہیں تھی یہاں تک کہ انتہائی بے رحمانہ قتل کے جرم میں سزائے موت نہیں دی جاتی تھی۔ اب تک کی دریافتوں کی بنیاد پر سزائے موت کی صرف ایک مثال کے بارے میں پتہ چلا ہے۔ دیہی اسمبلیوں مقامی تنازعات حل کرنے کے لیے وسیع اختیارات دیے گئے تھے۔ چھوٹی کمیٹیوں کو 'نیائے اتّر' کہا جاتا تھا۔ یہ ان معاملات کی شنوائی کرتی تھی جو رضا کارانہ طور پر بنائی گئی دیہی کمیٹی کے دائرہ اختیار میں نہیں آتے تھے۔ زیادہ تر مقدمات میں سزا مندروں اور دوسرے خیراتی اداروں کو چندوں کی شکل میں ہوتی تھی۔ سزا یافتہ فرد ایک جگہ پر جیسے ''دار ماسانہ'' کہا جاتا تھا اپنے جرمانوں کو جمع کراتے تھے۔ قانونی کاروائیوں اور عدالتی ریکارڈوں کے بارے میں بہت زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکی ہیں۔ مالیاتی اور فوجداری قانون شکنیوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ بعض اوقات شہری مقدمات کو اس وقت تک

نوٹس

طول دیا جاتا تھا جب تک کہ وقت خود ہی ان کو حل نہ کردے۔ چوری، بدکاری اور جعل سازی کو سنگین قانون شکنی مانا جاتا تھا۔ زیادہ تر مقدمات میں ملزم کو کسی مندر میں دیے کو مستقل طور پر جلائے رکھنے کی سزا دی جاتی تھی۔ قتل کی سزا بھی جرمانے کی شکل میں ہوتی تھی۔ ایک مثال یہ ہے کہ ایک فرد نے ایک فوجی کمانڈار کو چاقو مار دیا۔ راجہ راجندر چولا، دوم نے اسے پڑوس کے ایک مندر میں ایک دیے کی دیکھ ریکھ کے لیے 96 بھیڑیں وقف کرنے کی سزا دی۔

متن پر مبنی سوالات 30.4

صحیح جواب پر (✓) کا نشان لگایئے۔

1۔ وجے واڑہ کے دور حکومت میں چولا سلطنت کا مرکز تنجاور کس صدی میں تھا۔ (8ویں، 9ویں، 10ویں)

____

2۔ راجاراج، اول کے بیٹے راجہ راجندر نے کس سال میں اپنے باپ کی حکومت میں ہاتھ بٹانا شروع کیا (1012، 1102، 2101)

____

3۔ اترمیرور کے مندر میں موجود کتبہ کس صدی میں مقامی کونسل کے قوانین بارے میں بتاتا ہے۔ (چھٹی، ساتویں، آٹھویں)

____

آپ نے کیا سیکھا

شروع میں انسانی سماج کا یہ عقیدہ تھا کہ تمام نوع انسان مساوی ہیں اور ان کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ طبقات پر مبنی سماج کو فروغ ریاست کے نظام میں تبدیلی کے لیے پہلی شرط ہے۔

ویدک بادشاہتوں میں خاندان کا سربراہ راجہ بنتا تھا اور اُسے آہستہ آہستہ وہ حیثیت حاصل ہوتی تھی جو دیوتا کے مساوی تھی۔ ریاست کا وجود ابتدائی طور پر دو عناصر پر: 'دنڈ' (حکم) اور ''دھرم'' پر منحصر تھا۔ موریائی سلطنت کے وجود نے بادشاہت کے سیاسی تصور کو مستحکم کیا۔ تاہم موریائی سلطنت کے زوال کے بعد دوسری کسی سلطنت کے وجود میں آنے میں کئی صدیاں لگیں۔

آریائی قوم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ درۂ خیبر کے راستہ ہندوستان میں داخل ہوئی۔ آریائی تقریباً 1500 قبل مسیح ہندوستان میں آئے اور ہندوستانی تاریخ میں ایک اور تہذیب کو جنم دیا جس کو ویدک دور کہا جاتا ہے۔ آریائی قبائل کی شکل میں آئے تھے جو شمالی۔ مغربی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے۔ قبائلی سردار جن کو راجہ کہا جاتا تھا شروع شروع میں ایک جنگی سردار کی حیثیت رکھتا تھا جس کا بنیادی فرض اپنے قبائل کی حفاظت کرنا تھا۔ اس کے بدلے میں راجہ اپنے قبائلی افراد سے اطاعت وفرمانبرداری کی توقع کرتا تھا اور وہ راجہ کو خراج ادا کرتے تھے۔

ایک بڑی جنگ میں کلنگ کی فتح کے بعد سمراٹ اشوک نے اپنی سلطنت کی فوجی توسیع ختم کردی۔ موریائی سلطنت برعظیم ہند پر حکومت کرنے والی شاید سب سے بڑی حکومت تھی۔ چندر گپت موریہ کے وزیر کوٹلیہ چانکیہ نے ''ارتھ شاستر'' لکھی جو معاشیات، سیاسیات، خارجی امور، انتظامیہ، فنون حرب، جنگ اور مذہب کے موضوعات پر مشرق میں لکھے جانے والے عظیم ترین مقالات میں شامل ہیں۔

چوتھی صدی عیسوی کی سب سے بڑی سلطنت، گپتا سلطنت تھی جس کو ہندوستانی تاریخ کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اس سبق میں آپ نے موریائی سلطنت کے دفتری امور، گپتا راجاؤں کی انتظامیہ اور چولا راجاؤں کی انتظامیہ کے ارتقاء کے بارے میں بھی پڑھا۔ چولا سلطنت کے دفتری امور سے متعلق افسران کی کاروائیوں کا مستقل طور سے محاسبہ اور جانچ پڑتال کی جاتی تھی۔ مالیاتی افسران ٹیکسوں کی وصولیابی کے ذمہ دار تھے۔

اختتامی سوالات

1۔ بادشاہت سے کیا مراد ہے؟ بادشاہت کے تصور کو کس طرح فروغ ملا؟

2۔ مہاجن پدوں اور بادشاہی مہاجن پدوں کے درمیان فرق کیجیے؟

3۔ مگدھ اور موریا سلطنت کے ارتقا کے بارے میں بتایئے؟

4۔ گپتا ریاست کس طرح پھیلی؟

5۔ چولا انتظامیہ کے ارتقاء کا تجزیہ کیجیے؟

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

30.1

1۔ شروع میں انسانی سماج بنیادی طور پر ایک قبائلی سماج تھا۔

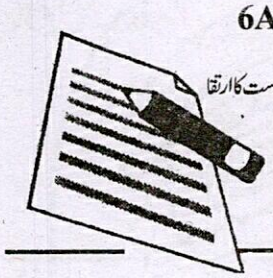

2۔ موریہ سلطنت کے وجود نے بادشاہت کے سیاسی تصور کو بڑھاوا دیا۔

3۔ آریائی قبائل مضبوط سیاسی بنیاد کی عدم موجودگی کی وجہ سے غیر آریائی قوموں کو متحد کرنے میں ناکام رہے۔

4۔ اسی طرح کی ایک اسمبلی میں 7707 راجہ شامل ہوئے جو راج نیاس کی نمائندگی کرتے تھے۔

30.2

1۔ کوٹلیہ

2۔ شاہی خاندان شہزادے

3۔ ایک یونان سفیر نے ہندوستان کا دورہ کیا۔

4۔ a) توئیسالی b) اُجین c) سورن گری اور d) تاملا

5۔ 6,00,000 پیدل فوج، 30,000 گھڑ سوار اور 9000 ہاتھی

30.3

1۔ گپت سلطنت

2۔ چندر گپت، اول، مہاراج ادھیراج

3۔ چندر گپت دوم

4۔ چینی، بودھ

اختتامی سوالات کے حل کے لیے اشارے

1۔ دیکھیے پیرا 30.2 اور 30.3

2۔ دیکھیے پیرا 30.4

3۔ دیکھیے پیرا 30.5

4۔ دیکھیے پیرا 30.9

5۔ دیکھیے پیرا 30.14

نوٹس

31

وسطی دور کی ریاستیں

اس مطالعاتی مواد میں ہم ریاستوں کے وجود میں آنے، ان کی نوعیت اور ان کی توسیع کے بارے میں تبادلۂ خیال کررہے ہیں جو وسطی دور کے ہندوستان میں وقوع پذیر ہوا۔ یہاں ہم دور وسطی کی دو بڑی ریاستوں: دہلی سلطنت اور مغل سلطنت کی ترتیب کے بارے میں بات چیت کریں گے۔ دور وسطیٰ کے حکمراں بنیادی طور پر بیرون ہند سے آئے تھے چنانچہ انھوں نے مقامی سیاسی ڈھانچوں پر نہ اپنا اثر ڈالا بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھا بھی۔ دور وسطیٰ کی ریاستوں کے نظام حکومت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کے سربراہ طاقتور حکمراں تھے، جن کو درجہ بند منظّم انتظامیہ مشینری کی مدد و معاونت حاصل تھی اور جنھیں اکابرین مذہب نے جائز قرار دیا تھا۔ فوج موروثی دفتری عملہ اور زمینوں کے لگان کی آمدنی ریاستوں کے بنیادی عوامل کی حیثیت سے برقرار رہے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعے کے بعد آپ درج ذیل باتوں سے واقف ہوسکیں گے:

- دور وسطیٰ میں ریاستوں کو ارتقاء کا تجزیہ کرسکیں گے۔
- دور وسطیٰ کی ریاستوں کی نوعیت سے واقف ہوسکیں گے اور
- دور وسطیٰ کی ریاستوں کے اداروں کے بارے میں وضاحت سے جان سکیں گے۔

31.1 پس منظر

گپتا سلطنت کے زوال کے بعد سے ہندوستانی نظام حکومت میں لامرکزیت نظر آتی ہے اور اس دور میں کئی علاقائی ریاستیں وجود میں آگئی تھیں۔ قدیم دور سے وسطیٰ دور کی طرف منتقلی کی مدت میں تین علاقائی طاقتوں بنگال کے پال راجاؤں، شمالی ہند کے پرتیہار شاہی سلسلہ اور جزیزہ نما ہند کے راشٹرکوٹ کے درمیان

سہ رخی جدوجہد جاری تھی۔ اس کے فوراً بعد شمالی ہند میں چھوٹے راجپوت راجاؤں کا وجود ہوا جو اپنے دائرہ اقتدار کو بڑھا کر ایک سلطنت میں ڈھالنے کے خواہش مند نظر آتے تھے۔ لیکن شمال مغرب سے ترکوں کی آمد نے دورِ وسطیٰ ریاست کی توسیع کے ایک نئے عمل کا آغاز کیا۔

31.2 دہلی سلطنت

البّاری ترک

13ویں صدی میں شمالی ہندوستان میں ایک نئی طرز کے شاہی سلسلہ کے اقتدار کا آغاز ہوا۔ دہلی سلطنت کا ماخذ محمد غوری کی فتوحات تھیں جس نے 1151ء میں غزنویوں پر حملہ کیا اور انھیں کھدیڑ کر پنجاب کی طرف بھگا دیا۔ محمد غوری نے 1157 سندھ کے بیسن کی طرف پیش قدمی کی 1186ء میں غزنویوں کی حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ اس فوج کشی میں اس کی فوجوں نے ملتان (1175) سندھ (1182) پیشاور اور لاہور (1186) پر قبضہ کرلیا۔ محمد غوری کی افواج نے 1190 میں بھٹنڈہ پر قبضہ کیا جس کی وجہ سے راجپوت راجہ پرتھوی راج چوہان کے ساتھ اس کی جھڑپیں شروع ہوگئیں جسے غوری نے 1192ء میں مکمل شکست دی۔ دریائے گنگا کے بیسن کی طرف جانے والے مغربی راستوں پر راجپوتوں کی گرفت کو ختم کر کے محمد غوری کی افواج نے مشرق کی جانب پیش قدمی کی اور بختیار خلجی نے 1200ء میں بنگال میں لکشمن سینا کو شکست سے دو چار کیا۔ 1206 میں محمد غوری کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کے بھروسہ مند مملوک (سابق غلام) جنرل قطب الدین ایبک نے جو دہلی کا حاکم تھا، اپنی آزاد حکومت کا اعلان کر دیا۔ البّاری ترکوں کا یہ شاہی سلسلہ مجموعی طور پر دہلی سلطنت کے بادشاہوں کے سلسلہ کا پہلا حکمراں تھا۔ بعد میں غوریوں اور غزنویوں کے ذریعہ دہلی کو واپس حاصل کرنے کی کوششوں کو دہلی کے سلطان التمش نے (1236-1211) بالآخر شکست سے دوچار کیا۔ التمس کو شمال ہند میں ترک فتوحات کا حقیقی نمائندہ سمجھا جانا چاہیے۔ اس نے نئی ریاستی راجدھانی، دہلی، حکومت کی بادشاہی شکل اور سرداروں اور حکومتی افسران کے طبقہ کی بنیاد ڈالی۔ اس نے علاقہ سے مشاہرہ کے بجائے اقطا عطیات کو رائج کیا۔ التمش نے مرکزی فوج کی تشکیل کی اور ''ٹنکا چاندی) اور ''جیتل (کانسہ) کے سکوں کو رائج کیا۔ مشہور عالم قطب مینار کی تعمیر اسی کے دور میں مکمل ہوئی۔ اس نے اپنی بیٹی رضیہ (رضیۃ الدین) کو اپنا جانشین نامزد کیا۔ التمش کے انتقال کے 10 برسوں تک بہت زیادہ اندرونی خلفشار کے سال تھے جو اندرونی تنازعات سے معمور تھے۔ اس مدت میں التمش کے چار بیٹے اور پوتے تخت نشین ہوئے اور پھر تخت سے محروم ہوگئے۔ التمش کی ذاتی لیاقت اور التمش کے خاندان کے ساتھ وفاداری پر مبنی چالیس امراء کا چہل گانی ٹولہ اس کے لیے ذمہ دار تھا۔ 1246ء تک سیاسی صورت حال تبدیل ہوگئی جب ''چالیس'' کے ایک جونیئر رکن غیاث

نوٹس

الدین بلبن نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ اس نے نئے سلطان ناصر الدین محمود (1266-1246) کی حکومت میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ بلبن نے پہلے سلطان کے نائب کی حیثیت سے کام کیا اور بعد میں وہ خود سلطان کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔ اس نے 1266 سے 1287ء کے دوران حکومت کی۔ وہ اپنے دور کی ایک انتہائی اہم سیاسی شخصیت تھا۔ بلبن نے سلطان کے خصوصی مقام کو زمین پر ''خدا کے سائے'' (ظل اللہ) کی حیثیت دی۔ بلبن نے درباری شان وشوکت، شاہی آداب اور شائستگی پر زور دیا۔ اس نے اعلیٰ منصب کے عہدیداروں اور شاہی خاندان کے افراد کو بھی ان کی غلطیوں کے لیے سزا دے کر ایک مثال قائم کی۔ تاہم بلبن کے قریبی جانشین انتظامیہ یا پرانے ترک سرداروں اور نئی طاقتوں یعنی خلجیوں کے درمیان گروہی چپقلش کو سلجھانے میں ناکام رہے۔ دونوں فرقوں کے درمیان کشمکش اور پھر ٹکراؤ کے بعد جلال الدین فیروز خلجی نے 1290 میں تخت پر قبضہ کر لیا۔

خلجی خاندان

خلجیوں کو ترکوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے شاہی خاندان کے پرانے افراد تسلیم نہیں کرتے تھے گو کہ خلجی بھی ترک تھے اور یہ کہ اقتدار میں ان کی آمد میں بعض منحرف بیرونی سرداروں نے معاونت کی تھی جن میں سے کچھ ہندوستان میں پیدا ہونے سردار تھے جو شاید یہ توقع کرتے تھے کہ بلبن کے حامیوں اور ''چالیس'' کے ٹولے کی گرفت کمزور ہونے کے بعد ان کی اپنی حیثیت بہتر اور مستحکم ہو جائے گی۔ اقتدار پر خلجیوں کا قبضہ اقتدار کے توازن میں تبدیلی کو تسلیم کرنے کی جانب ایک قدم تھا جو دہلی سلطنت کے علاقے کے باہر، وسطیٰ ایشیا اور ایران میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا۔ اس کا ایک دوسرا سبب شمال ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کا قیام بھی تھا۔ خلجیوں کی فتوحات سے متعلق خارجی پالیسی اور مکمل کنٹرول کے اندرونی طریقۂ کار کو فوجی مہموں اور قاعدے قوانین کی ترتیب کے ذریعہ عمل پیرا کیا گیا۔ خلجیوں نے غیر مطمئن شاہی سرداروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اپنے افغان سرداروں کا استعمال کیا۔ جلال الدین خلجی (1296-1290) نے بلبن کے دورِ حکومت کے کچھ سخت پہلوؤں کو ختم کر دیا۔ وہ اس نظریہ کو پیش کرنے والا پہلا حکمراں تھا کہ ریاست رعایا کی رضا اور رغبت پر مبنی ہونی چاہیے اور یہ کہ کیوں کہ ہندوستانیوں کی اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لیے ریاست حقیقی طور پر اسلامی نہیں ہو سکتی۔

جلال الدین خلجی کو 1296ء میں اس کے بھتیجے اور تخت کے جانشین علاء الدین خلجی نے قتل کر دیا۔ علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت میں یعنی 1296ء سے 1316ء کے دوران اس سلطنت نے مختصر وقفہ کے لیے ایک عظیم مملکت کا روپ لیا۔ مرکزیت اور حکمرانی کی توسیع کے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے علاء الدین خلجی کو سرمائے علاوہ وفادار اور قابل لحاظ تعداد میں شاہی حامیوں کی ضرورت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے

نوٹس

ذاتی کنٹرول میں ایک موثر اور کارکرد فوج بھی درکار تھی۔اس سے قبل 1292ء میں اس نے سرمایہ کے مسئلہ کو اس وقت کسی حد تک حل کیا تھا جب اس نے وسطی ہندوستان میں بھلسا پر نفع بخش حملہ کیا تھا۔اس کامیابی کو اپنی پوزیشن کو مستحکم بنانے کے استعمال کرتے ہوئے اور ایک تازہ دم فوج کے ساتھ اس نے بے انتہائی دولت مند شہر دیوگری (موجودہ دولت آباد) پر حملہ کیا۔دیوگری اس وقت یادوراجاؤں کی راجدھانی تھا اور یہ دکن میں واقع تھا۔علاء الدین خلجی نے دیوگری پر یہ حملہ 1296ء میں کیا تھا۔دیوگری کی دولت نے سرمایہ کے حصول کو نہ صرف پورا کیا بلکہ ریاست کی تعمیر کے اس کے منصوبوں کے لیے ایک اچھی اور مضبوط بنیاد بھی فراہم کر دی۔ مرکزیت اور بھاری زرعی لگان علاء الدین خلجی کی حکومت کی بنیادی خصوصیات تھیں۔زرعی ٹیکسوں کے بھاری حجم اور ان کی وصولی کے اس کے اپنے میکانزم نے سلطان علاء الدین خلجی کو اپنے دو مقاصد کی تکمیل میں مدد دی۔یہ دو مقاصد تھے (۱) اناج کے تاجروں کو کم قیمت پر اناجوں کی فراہمی کو یقینی بنانا اور (۲) ریاست کے اناج کے گوداموں کو بھرا رکھنا جو اس کے قیمتوں سے متعلق مشہور قوانین سے جڑا ہوا تھا اور یہ بڑی تیار فوج کے بندوبست کے لیے مالیات کے نازک اور کٹھن مسئلہ کا حل بنا۔علاء الدین خلجی کی موت (1316) کے صرف پانچ برسوں کے بعد ہی خلجی خاندان اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھا۔جانشینی کے تنازعہ کے نتیجہ میں محل کے محافظوں نے ملک کافور کو قتل کر دیا اور سلطان کے تیسرے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ نے علاء الدین کے چھ سالہ بیٹے کو اندھا بنا دیا۔قطب الدین مبارک شاہ (1316-1320) نے تخت پر قبضہ کر لیا۔لیکن اس کے پسندیدہ ہندو جنرل نے، جس نے دین اسلام کو قبول کر لیا تھا، اس کا قتل کر دیا۔اس جنرل کا نام خسرو خان تھا۔خسرو کی حکومت کی مخالفت فوراً ہی شروع ہوگئی جس کی قیادت غازی ملک نے کی جو دیپال پور میں مغربی محاذ پر نگراں تھا۔چار مہینوں کے بعد خسرو کو شکست ہوگئی اور اسے قتل کر دیا گیا۔

تغلق خاندان

غازی ملک، غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا۔اس کا دورِ حکومت 1320 سے 1325ء کے درمیان تھا۔تخت نشینی سے قبل اس نے منگولوں کے خلاف محاذ میں کامیاب دفاع کی وجہ سے امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا۔تغلق خاندان کی بھی یہ خواہش تھی کہ وہ پورے ہندوستان پر حکومت کریں۔غیاث الدین تغلق (1320 تا 1325) کے ذریعہ ورنگل، اڑیسہ اور بنگال پر مہم جوئی اسی مقصد کے تحت تھی۔اس نے دہلی کے نزدیک تغلق آباد شہر کی تعمیر کی۔بنگال کی فوجی مہم سے واپس آتے ہوئے دہلی کے نزدیک افغان پور میں ایک چوبی پناہ گاہ کے اس پر گر جانے سے اس کی موت ہوگئی۔محمد بن تغلق کا دورِ حکومت جو 1325ء سے 1351ء کے دوران تھا جو سلطنت کے عروج اور اس کے زوال دونوں کی نشاندہی کرتا ہے۔1296ء سے 1335ء تک کی مدت کو مستقل مرکزیت اور توسیع کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔دہلی میں 14ویں صدی میں فیروز شاہ تغلق

نوٹس

کے دورحکومت اس کے ایک ہمعصر مورخ ضیاء الدین برانی نے لکھا ہے کہ: تاریخ واقعات کی معلومات ہوتی ہے: پیغمبروں کے، خلفاء سلطانوں اور مذہب اور حکومت کی عظیم شخصیات کی سرگزشت اور ان کے رسوم و روایات سمیں بیان ہوتے ہیں۔

تغلق خاندان تیمور کے حملہ کے فوراً بعد ختم ہوگیا لیکن سلطنت برقرار رہی گو کہ یہ اپنی سابق شان وشوکت کا صرف شائبہ ہی رہ گئی تھی۔ تیمور کے جانشین نے دہلی پر قبضہ کرلیا اور سلطان ہونے کا دعویٰ کردیا۔ اور اس طرح سید شاہی خاندان جس کا دورِحکومت 1414ء سے 1451ء تک تھا، پندرہویں صدی کے نصف اوائل تک حکومت کرتا رہا۔ ان کا دورِحکومت مختصر تھا اور یہ دہلی کے اردگرد 200 میل کے دائرہ میں محدود تھا۔ اس خاندان نے اس وقت تک حکومت کی جب تک کہ حکومت کرنے کی اور زیادہ صلاحیت کے حامل لودھیوں نے ان پر قبضہ نہیں کرلیا۔ لودھیوں کا تعلق افغان نسل سے تھا اور اس طرح ان کی آمد نے ترک شہنشاہیت کا خاتمہ کردیا۔

متن پر مبنی سوالات 31.1

درج ذیل جملوں کو درست کیجیے اور ان کو دوبارہ لکھیے:

1۔ محمد غوری نے 1168ء میں غزنویوں کو شکست دینے کے لیے سندھ کے بیسن کی جانب پیش قدمی کی۔

____

2۔ غوری کی افواج نے 1157ء میں ملتان، 1128ء میں پارکاواس اور 1168ء میں لاہور پر قبضہ کیا۔

____

3۔ التمش کو جنوبی ہندوستان میں ترک فتوحات کا حقیقی استحکام کنندہ سمجھنا چاہیے۔

____

4۔ دو فرقوں کے درمیان جد وجہد کے بعد جلال الدین خلجی نے 1209ء میں سلطنت کا دعویدار ہونے کا اعلان کردیا۔

____

5۔ 1269ء میں جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے اور جانشین نے قتل کردیا۔

____

31.3 مغلیہ سلطنت

1526ء میں بابر نے وسطی ایشیا سے آکر ہندوستان میں مغل سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔ بابر کا تعلق تیمور اور چنگیز خاں دونوں کی نسل سے بتایا جاتا ہے۔ دہلی اور گنگا کے تاس کے علاقوں کی اس کی فتوحات جنوبی ایشیا میں فوجی طاقت میں خلفشار سے قبل عمل میں آئی تھی۔ جنوبی ایشیا میں طاقتور حکومتیں مغل سلطان کی تھیں جن کا تعلق تیمور اور بابر کے توسط سے ترک نسل سے تھا۔ ان مغل سلطانوں نے بعد میں فارس (ایران) کی خسروی ثقافت کو اپنا لیا اور پادشاہ لقب اختیار کیا تا کہ وہ اپنے آپ کو علامتی طور پر ترک، افغان اور دوسرے سلاطین سے افضل و برتر کہلوا سکیں۔ بابر ایک چغتائی ترک تھا جسے ازبک افواج کی دسترس سے بچنے کے لیے سمرقند کے نزدیک اپنے آباء واجداد کی زمینوں کو چھوڑ کر فرار ہونا پڑا تھا۔ اس نے گنگا کے طاس میں اپنی بقا کے مواقع کو دیکھا اور ازبک طرز کے تیز رفتار گھوڑوں پر سوار شہسوار فوج کے ساتھ جو بندوقوں اور توپوں سے لیس تھی۔ اپنے حریفوں کو کھدیڑ دیا 1526ء تک اس نے پنجاب اور بنگال کا زیادہ تر علاقہ فتح کر لیا۔ لیکن اس کے حریف اب بھی موجود تھے۔ 13 سال کے بعد ایک افغان سردار نے جو لودھیوں اور بابر کے شانہ بہ شانہ لڑا تھا اور جس نے اپنی فارسی تعلیم کا اظہار کرنے کے لیے شیر شاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا (جونپور میں) بنگال اور بہار میں ایک نئے شاہی خاندان کا اعلان کر دیا۔ شیر شاہ کی فوجوں نے بابر کے بیٹے ہمایوں کو افغانستان کی طرف واپس کھدیڑ دیا جہاں ہمایوں نے جلاوطنی میں اپنے بیٹے اکبر کی پرورش کی۔ شیر شاہ کی موت کے بعد سوری خاندان برقرار نہیں رہ سکا گو کہ اس کے پائدار کارناموں میں انتظامی اختراعات اور بنگال سے پنجاب تک ایک مرکزی شاہراہ کی تعمیر شامل ہے۔ شیر شاہ کی موت کے بعد ہمایوں نے 1555ء میں دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ جہاں ایک حادثہ میں اس کی موت ہوگئی۔ اس کے بعد اکبر اپنے سرپرست اور استاد بیرم خاں کی رہنمائی میں تخت پر بیٹھا۔ اکبر نے 1556ء میں عنانِ حکومت سنبھالی اور اس کے ساتھ ہی بیرم خاں نے لاہور، دہلی، آگرہ اور جونپور کے جنگی اہمیت کے لحاظ سے اہم قلعوں کو فتح کر لیا۔ بیرم خاں نے اس کو علاوہ مالوہ اور راجستھان کو بھی فتح کیا۔ اس کے بعد بادشاہ کے قائم مقام کی حیثیت سے برطرف کر کے قتل کر دیا گیا۔ اکبر نے 50 برس (1556-1605) تک حکومت کی۔ اس کی فتوحات کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اس کی فوجیں اپنے سائز، مالیات، قیادت، تکنیکی مہارت اور کامیابی کے لحاظ سے گذشتہ تمام فوجوں سے بڑی تھیں۔ اس کی موت کے وقت اس کی مملکت کابل، کشمیر اور پنجاب سے گجرات، بنگال اور آسام تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس کی پیش قدمی جنوب میں اور سبھی کوہستانی علاقوں میں جاری تھی۔ اس کے بعد اس کے تخت و تاج کو اس کے بیٹے جہانگیر (1605-1627) نے اور پھر اس کے پوتے شاہجہاں (1627-1658) اور پھر اس کے پڑپوتے اورنگزیب (1658-1707) نے سنبھالا۔ اورنگزیب کے موت کے بعد مغل سلطنت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ گو کہ مغل خاندان 1858 تک برقرار رہا

نوٹس

جب تک انگریزوں نے تختہ نہیں پلٹ دیا۔ مغل سلطنت اپنے عروج کے زمانے میں اس وسیع پیمانے پر وسائل اکٹھا کیے تھے جن کی کوئی دوسری مثال ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتی اور ان کا دائرہ اقتدار تقریباً پورے برعظیم پر پھیلا ہوا تھا6 1556 سے 1707ء تک دوران اپنے انتہائی عروج کے دنوں میں جب انھیں بے انتہا دولت اور شاہ جلال حاصل تھا، مغل سلطنت ایک انتہائی کارکرد اور مرکزی تنظیم کی حیثیت رکھتی تھی جس میں افسران، سرمایہ اور اطلاعات کا ایک منظم اور وسیع نیٹ ورک موجودہ تھا جو مغل بادشاہوں کا پوری طرح سے وفادار تھا۔

اس مدت کے دوران سلطنت مغلیہ کی توسیع بیرونی دنیا کے ساتھ ہندوستان کے بڑھتے ہوئے معاشی اور ثقافتی روابط کا موجب تھی۔ چھٹی اور ساتویں صدیوں نے یوروپی اور غیر یوروپی تجارتی تنظیموں کے ہندوستان میں قیام اور ان کی وسعت کو دیکھا جن کا بنیادی مقصد ان ہندوستانی مصنوعات کا حصول تھا جن کی بیرونی ممالک میں مانگ تھی۔ ہندوستانی علاقے خشکی اور آبی تجارتی راستوں کے ذریعہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ بیش قیمت دھاتوں کے اندرونی ذخیروں میں نمایاں اضافہ ہوا۔ بیرونی دنیا کے ساتھ وسیع تر تعلقات کی وجہ سے نئے تصورات وخیالات اور نئی تکنالوجیوں میں اضافہ ہوا۔ جس نے مغل سلطنت کے مزاج، صلاحیت اور ذہانت کو اور زیادہ ثروت مند بنایا۔ تاہم سلطنت مغلیہ اپنے آپ میں ایک بالکل خالص ہندوستانی تاریخی تجربہ تھا۔ مغل ثقافت فارس۔ اسلامی اور ہندوستانی علاقائی عناصر کا امتزاج تھا جو ایک امتیازی لیکن مجموعی طور پر گوناگوں خصوصیت کا حامل تھا۔ گوکہ 18ویں صدی کے آغاز سے ہی مغلیہ سلطنت کے علاقوں نے اپنی آزادانہ پوزیشنوں کے لیے تگ ودو شروع کردی تھی لیکن مغلوں کی حکومت کو مرکزی شاہی اقتدار کی حیثیت حاصل تھی۔ حکومت کا مرکز درحقیقت پہلے دوسو برسوں تک 1526-1748 مغل بادشاہوں کے احکامات کے ذریعہ ہی کنٹرول کیا جاتا رہا اور اسی طرح یہ ہندوستانی برعظیم میں جدید ریاست سے قبل کی ریاست کی شکل میں دلچسپ عکاسی کرتا ہے۔

31.4 دورِ وسطیٰ کی ریاست کی نوعیت

''سلطانی'' ہونے کا کیا مطلب ہے؟ قرآن میں اس عربی لفظ سے مراد اس فرد سے ہے جو روحانی صلاحیت کا حاصل ہو۔ محمود غزنوی پہلا بادشاہ تھا جس کو اس نے ہمعصروں نے ''سلطان'' کا لقب دیا جو معترفین کے اضافہ میں اس کی کامیابی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ یہ خطاب پہلے غالباً مغربی اور وسطی ایشیا ترک اور سلجوق خاندانوں میں مقبول ہوا جنھوں نے ''سلطان'' کے خطاب کو باقاعدہ طور سے استعمال کیا۔ بعد میں عثمانی ترکوں نے اس خطاب کو یوروپ میں مشہور کیا۔ جب خلیفہ نے خطاب تقسیم شروع کیے تو یہ مسلم حکمرانوں کے درمیان اور تیزی سے پھیلا اور اس کے مفہوم میں تبدیلی بھی آتی رہی۔ دہلی کے سلطانوں نے خلیفۂ بغداد کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کیا اور اپنی سلطنت کو ''دارالاسلام'' کا ایک حصہ سمجھنے لگے جس کا قانونی سربراہ

نوٹس

خلیفہ ہوا کرتا تھا۔ مغلوں کے دور میں ہندوستان کا نظم ونسق ''شرعیہ'' کے مطابق ہوتا تھا۔ اس وقت بھی نہ تو دہلی کے سلطانوں کے دور میں اور نہ ہی سلطنت مغلیہ کے دور میں ریاست کے قوانین مکمل طور سے اسلامی قوانین نہیں تھے چونکہ انھیں اپنے آپ کو یہاں کی حقیقتوں کے مطابق ڈھالنا تھا جو ہمیشہ ہی ان کے موافق نہیں ہوتی تھیں۔ ہندوستان کے ترک اور افغان حکمرانوں کو یہاں کے ہندوؤں کی مدد وحمایت حاصل کرنا تھی جو یہاں کی آبادی کی وسیع اکثریت پر مشتمل تھی۔ مذہب، املاک اور دوسرے کئی غیر مذہبی امور میں غیر مسلم آبادی کو پوری آزادی حاصل تھی۔ وہ اپنے مقدمات کو اپنی پنچایتوں میں طے کر سکتے تھے۔ دہلی کے سلطانوں کے تحت زمینی آمدنیوں کا نظام، اور رسم ورواج کی ادائیگی اور شاہی دربار کا طریقہ کار ہندوستانی روایت کا حقیقی ثبوت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وسطی دور کی ریاست ''ملاؤں کی حکومت'' تھی۔ غیر رسمی معنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت کے تحت وسطی دور کی ریاست یقینی طور پر ایک مذہبی حکومت تھی اور اس کے تمام بنیادی عوامل — خدا کی افضلیت و برتری اور مقدس قوانین کے مطابق دینی عالموں کے ذریعہ خدا کی ہدایات کے مطابق حکومت کرنا — موجود تھے اور ان پر عمل کیا جاتا تھا۔ دہلی کے سلطان اپنے آپ کو خلیفہ کا نائب یا معاون سمجھتے تھے جو خدا کا نمائندہ ہوتا تھا۔ شیر شاہ اور اسلام شاہ نے خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا۔ اکبر سے لے کر اورنگزیب تک مغل بادشاہوں نے ''خدا کے سائے''، یعنی ''ظل اللہ'' یا زمین پر خدا کے نمائندے'' کے خطابات اختیار کیے۔ خدا کی افضلیت و برتری پر یقین مستحکم تھا۔ شریعت کی برتری کو ہمیشہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ گو کہ اکبر نے شریعت میں ریاستی قوانین کو بھی شامل کیا تھا۔ تاہم ان حکمرانوں نے مسلم علماء کو ریاست کی پالیسیوں پر کبھی اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

دفاع، قانون، نظم ونسق اور آمدنی کی وصولی دہلی سلطنتوں کی بنیادی ترجیحات تھیں۔ دوسرے معاملات میں وہ عام طور پر عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرتے تھے۔ کیوں اپنی رعایا کی فلاح و بہبود ان کی بنیادی ترجیحات نہیں تھیں۔ دہلی کے سلطانوں کے تحت رواداری کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ اسلامی ریاست ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود یہ فوجی اور آمر حکومت تھی۔ اس کے برعکس سلطنت مغلیہ کی حکومت بالکل ہی دوسری نوعیت کی حامل تھی۔ رواداری اور رحمدلی اکبر کی حکومت کے رہنما اصول تھے۔ اکبر کی رعایا اس کے بچوں کی طرح تھی اس لیے وہ اپنے آپ کو ان کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ ریاست کا خاکہ جسے ابوالفضل نے تیار کیا تھا اور جسے اکبر نے قائم کیا کسی ایک مخصوص طبقہ تک محدود نہیں تھا اور یہ سب کے لیے امن'' (صلح کل) کے اصولوں پر مبنی تھا۔ لیکن اکبر کی روشن خیال پالیسی اور بعد میں جہانگیر اور شاہ جہاں کے ذریعہ اس کے تسلسل کے باوجود مغل حکومت اپنی کارکردگی کے لحاظ سے محدود نوعیت رکھتی تھی۔ رحم دل اور فیاض بادشاہوں کی موجودگی کے باوجود سلطنت مغلیہ کی ریاست، فلاح و بہبود کی ریاست نہیں تھی۔ زمین کی آمدنیوں کی وصولی اور دفاع اس کے اہم دائرۂ عمل تھے۔ حکومت کی شکل بادشاہت تھی جو موروثی ہونے کے

نوٹس

باوجود جانشینی کے لیے بالکل واضح قانون کو وضع نہیں کرسکی۔ نظریاتی طور پر بادشاہ حکومت کی سبھی شاخوں کا سربراہ اعلیٰ ہوا کرتا تھا لیکن بادشاہ کی کمزور شخصیت امراء اور علماء کو شاہی فیصلوں پر موثر روک لگانے کا موقع فراہم کرسکتی تھی۔

متن پر مبنی سوالات 31.2

خالی جگہوں کو بھریے

1۔ بابر کی نسل ________ اور ________ دونوں سے ملتی تھی۔

2۔ شیر شاہ کی موت کے بعد ہمایوں نے ________ میں دہلی پر قبضہ کرلیا۔

3۔ 1556ء سے ________ تک سلطنت مغلیہ اپنی بے پناہ دولت اور شان وشوکت کے ساتھ ایک ________ اور ________ تنظیم تھی۔

4۔ ہندوستان پر ________ کی سلطنت میں ________ قوانین کے تحت حکومت کی گئی۔

31.5 بادشاہت

اس کا لقب خواہ کچھ بھی ہو لیکن ایک بادشاہ اپنی ذاتی خوبیوں کا مالک ہوا کرتا تھا۔ اس کی یہ خوبیاں ایک فوجی کمانڈر کی ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ اس کے اندر ایک مذہبی اور اخلاقی انسان کے اوصاف بھی ہوتے تھے۔ وہ تہذیب کا نمائندہ ہوتا تھا۔ اس کی جنگیں اپنی تہذیب کے لیے ہوتی تھیں۔ گوکہ ان کا مقصد جداگانہ تھا اور موقع کے لحاظ سے تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ ایک سلطان کی عظمت اور اس کی شان وشوکت اس کے اردگرد موجود لوگوں کے کاموں سے ہی ظاہر ہوتی تھی۔ مسلم بادشاہوں کی شہرت کو بڑھاوا دینا شاعروں، دانشوروں (اماموں اور علماء) معماروں، تاریخ نویسوں، سوانح نگاروں، روحانی رہنماؤں (صوفیوں) اور جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانے والے امام کا کام ہوتا تھا۔ جامع مسجد ہر دور سلطنت میں ایک ایسی جگہ ہوتی تھی جہاں پانچ وقت کی نمازیں باجماعت پڑھی جاتی تھیں اور جمعہ کے دن خطبہ ہوتا تھا جس میں بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوتے تھے۔ پیشہ ورانہ خدمات فراہم کرنے والے اور ثقافتی کارکنان سلطان کی بزرگی وعظمت کو بڑھانے کے کام میں مدد کرتے تھے اور اس طرح سلطان کی شخصیت کو اردگرد ایک روشن ہالہ قائم کردیا جاتا تھا۔ اس کے آس پاس موجود ماہرین اور حلیف اس کے مشوروں، ، پالیسیوں اور ترجیحات پر غور وخوض کرکے ان کی تفصیلات بنایا کرتے تھے۔ وہ اپنی کامیابی کو محفوظ بنانے کے لیے رعایا کے ساتھ بہتر برتاؤ کرتا تھا اور ان کی حمایت حاصل کرتا تھا۔ اور یہ کہ اس کی طاقت رعایا کی قوت پر منحصر ہوتی تھی۔ چنانچہ بادشاہ کے اقتدار کا سماجی

نوٹس

نفاذ اس کے تخت سے بہت حد تک جڑا رہتا تھا۔ شروع کے سلطان مثلاً محمود غزنوی اپنے قریبی عزیزوں اور نسلی حلیفوں پر بھروسہ کرتا تھا۔ سیاسی پس منظر کے اور زیادہ پیچیدہ ہونے کے ساتھ بادشاہوں کی اور زیادہ الجھی ہوئی شخصیات سامنے آتی رہیں اور اس نے مغلوں کے دور میں ایک پرشکوہ تناسب اختیار کرلیا۔ سلطان کی ذات، اس کا انداز گفتگو، اس کی پارسائی اور خداترسی، ذاتی عادات واطوار، مشاغل، خاندان، کنیز وخدام، اباو اجداد، بیگمات، شہزادے اور اس کے سسرالی عزیز اس کی عوامی شناخت کے اندرونی دائرے تھے جن کے بارے میں لوگوں کی بات چیت، آرٹ، داستانوں اور گیتوں اور تاریخ نویسی میں تذکرہ کیا جاتا تھا۔

31.6 شاہی دربار

سلطان کی عوامی شخصیت کا مظاہرہ روزانہ اس کے دربار میں ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے دربارِ عام میں مہمانوں، سفیروں، فریادیوں، اور ٹیکسوں اور خراجوں کی ادائیگی کرنے والوں سے ملاقات کرتا تھا۔ درباروں کا ارتقا وقت کے ساتھ ساتھ ہوا۔ شروع کی صدیوں میں سلطان کا وسطی ایشیا کا مسکن میدان جنگ میں شاہی خیمہ ہوا کرتا تھا جس میں وہ اپنا دربار لگایا کرتے تھے۔ بعد کی صدیوں میں اس نے فتح پور سیکری، آگرہ اور دہلی میں پرشکوہ اور عالیشان قلعوں کی شکل اختیار کرلی۔ وسیع درباری ایوان بادشاہ کی طاقت اور اقتدار کے مظاہرہ کے اسٹیج تھے۔ 18 ویں صدی عیسوی کی تصاویر جس میں 17 ویں صدی عیسوی کا شاہجہاں کی تاریخ نویسی پرمبنی ''بادشاہ نامہ'' بھی شامل ہے، میں درباری مناظر کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ان تصاویر میں لٹکے ہوئے قالینوں کو دیکھا جاسکتا ہے جو دربار کے صحرانوردورثہ کی یاد دلاتے تھے اور ان تصاویر میں دکھائے گئے ہر فرد کا مخصوص رُتبہ اور سلطان سے اس کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ دربار سلطان کے ساتھ اپنے تعلق کو عوام میں ظاہر کرنے کی ایک جگہ تھی۔ ان تمام شخصیات کا جو اس کے دربار کی تشکیل کرتی تھیں، مظاہرہ کرنے کے لیے، سلطان جہاں بھی جاتا تھا اس کا دربار اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ دربار میں وقت کا ایک بڑا حصہ خاص طور سے لڑائی کی حکمت عملی اور فوجوں کی نقل وحمل پر غور کرنے کے لیے صرف کیا جاتا تھا۔ حکمراں کے سفری دربار ایک پائدار ثقافتی مظہر تھے اور بعد کی صدیوں میں سفری منتظمین، ٹیکس وصول کرنے والے افسران اور سیاستداں موثر طور پر دور جدید کے ''سلطان'' بن گئے۔

31.7 بادشاہ کا کردار

بادشاہ کا ذاتی عملہ یعنی اس کے خدام، کنیز، دربانی، چوبدار، وغیرہ اور اس کا خاندان اس کی عظمت کو دکھلاتا تھا۔ سلطان رعایا سے آداب محفل، محدود ملاقاتوں اور محل کے خدام، کنیزوں اور دوسرے ملازمین سے اپنی جگہ پر ٹھہرنے اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرنے پر زور دیتے تھے۔ سلطان اپنی بلند اقبالی اور فوقیت کو ظاہر

نوٹس

کرنے کے لیے سب سے بڑی بیش قیمت، مزین، متصرف ایشیاء کا استعمال کرتا تھا۔ وجے نگر کے راجاؤں نے اپنے آپ کو "مشرقی اور مغربی سمندروں کے نوابوں" کی طرز پر ڈھالا تھا اور سمندر پار کی تجارت سے حاصل کردہ بیش قیمت اشیاء کو اپنے بدن پر سجاتے تھے اور خاص طور عطریات کا استعمال کرتے تھے چینی مٹی کے بنے ہوئے برتنوں کا استعمال کرتے تھے۔ سلطان کا محل بھی اُس کی شخصیت کی عکاسی کرتا تھا اس سے ان کی قیادت، کنٹرول، دولت وامارت اور اس کے مزاج کی عکاسی ہوتی تھی۔ ان عظیم بادشاہوں کے اطراف کی فراخدلانہ عادتیں جنوبی ایشیا میں سیاسی زندگی کی ایک پائدار حقیقت بن گئی۔

رعایا کے درمیان خانگی معاملات اور خاص طور سے شادی کے موقعوں پر سلطان کی موجودگی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ شادیاں سیاسی زندگی ایک بڑا اور اہم واقعہ ہوا کرتی تھیں اس کے یہ سیاسی اتحاد کو حاصل کرنے کا سب سے محفوظ طریقہ تھیں۔ "پادشاہ نامے" میں مصورین نے جنگ اور شادی کے مناظر کی تصویر کشی انتہائی تفصیلی انداز میں کی ہے۔ مغلیہ سلطنت بھی خاندانی امور سے متاثر تھی۔ محل کے انتہائی اندرونی خفیہ جگہوں پر افراد خاندان اثر ورسوخ کے حصول کے لیے سر جوڑ کر بیٹھتے تھے اور خفیہ منصوبوں کی تیاری میں مصروف رہتے تھے جن کا اکثر و بیشتر نتیجہ جانشینی کے لیے لڑائی کے شکل میں سامنے آتا تھا جس میں رشتہ دار ایک دوسرے کو ہلاک کردیتے تھے جیسا کہ "مہابھارت" میں بھی ہوا تھا۔ محل کے اندر سلطان کی عزت وتکریم اس کی ماں بیگمات، شہزادیوں اور بہنوں کی بے داغ آبرو پر مبنی ہوتی تھی جو لوگوں کی نظروں سے دور پردے کے پیچھے رہتی تھیں۔ خواتین کی گوشہ نشینی (پردہ نشین) سلطان کے اپنے عزت وتوقیر کے لیے تھی۔ خواتین کی پردہ نشینی کا چلن سماج کی ہر سطح پر ہندو اور مسلمانوں دونوں میں موجود تھا جسے انھوں نے سلطانوں سے اختیار کیا تھا۔

اکبر کے دور حکومت کے پہلے تین برسوں میں اعلیٰ درجہ کے شاہی افسران کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا۔ چونکہ وسطی ایشیا کے شاہی اکابرین کی پرداخت بادشاہ کے ساتھ طاقت کو بانٹنے کی ترک۔ منگول روایت کے مطابق ہوئی تھی جو ایک ایسا عنصر تھا جو مغل مرکزیت کو اپنے ارد گرد باندھنے کے اکبر کے عزائم سے میل نہیں کھاتا تھا اس لیے اکبر کا بنیادی مقصد ان کی طاقت اور اثر کو کم کرنا تھا۔ اس نے اپنی خدمات میں نئے عناصر کی آمد کی حمایت کی اور اس طرح ایرانی امراء بھی مغل سلطنت کی انتظامیہ کا ایک اہم حصہ بن گئے۔ اکبر نے ہندوستانی پس منظر کے حامل نئے لوگوں کو اپنی حکومت میں شامل کیا۔ ہندوستانی افغان مغلوں کے بنیادی حریف تھے اس لیے ان کو فاصلہ پر رکھا گیا۔ لیکن براہا کے سیدوں، بخاری سیدوں اور کامبوس کو جو ہندوستانی مسلمان تھے خاص طور سے اعلیٰ فوجی اور شہری منصب عطا کیے گئے۔ اس سے بھی زیادہ نمایاں عنصر مغل سلطنت میں ہندو راجپوتوں کی شمولیت تھی۔ یہ ایک بڑا اور اہم قدم تھا گو کہ ہند۔ اسلامی تاریخ کے لیے یہ بالکل نیا عنصر نہیں تھا۔ اس قدم نے مغل فرمانرواؤں اور مقامی جنگجو حکمرانوں کے درمیان تعلقات کا ایک معیاری نمونہ قائم کردیا۔

نوٹس

31.9 دفاتر اور نظام مراتب کا ڈھانچہ

نہ تو دہلی کی سلطنت اور نہ ہی مغلوں کی حکومت غلامانہ رویوں پر یقین رکھتی تھیں۔ دونوں ہی حکومتیں باقاعدہ دفتری نظام سے لیس تھیں جس میں شعبوں اور افسروں کے مراتب تقسیم کیے گئے تھے۔ کوئی بھی افسر خواہ وہ شہری ہو یا فوجی موروثی نہیں ہوتا تھا چنانچہ بادشاہ اپنی مرضی کے مطابق افسران کا تقرر کرتا تھا، ان کی منتقلی کرتا تھا اور ان کو برطرف کرتا تھا۔ اور وہ صرف بادشاہ کو جوابدہ ہوتے تھے۔ دہلی سلطنتوں کے تحت بادشاہ کے فوراً بعد وزیر کا دفتر ہوتا تھا جو حکومت کے معاملات کی نگرانی کرتا تھا۔ مغل اپنے وزیر اعظم کو ''وکیل کہا کرتے تھے جو بعد میں وزیر یا دیوان کے مترادف تھا۔ سلطانوں نے ''دیوان عرض'' (فوجی شعبہ) قائم کیا جس کا سربراہ ''عریض ممالک'' کہلاتا تھا جب کہ مغلوں کے دور میں میر بخشی شاہی مملکت کی فوجوں اور عام انتظامیہ کا نگراں ہوا کرتا تھا۔ دہلی سلطنت میں مذہبی امور خیرات وغیرہ کی دیکھ بھال کے شعبہ کو ''دیوان رسالت'' کہا جاتا تھا اور اس کا نگراں ''صدر الصدور'' کہلاتا تھا۔ جہاں تک افسران کا تعلق تھا مغلوں نے بھی ان ہی القابات کو اپنائے رکھا۔ دونوں ہی حکومتوں کے دور میں قاضی اعلیٰ (منصف اعلیٰ) کا دفتر موجود تھا۔ اس کے علاوہ صدر کا منصب بھی دونوں ہی حکومتوں میں قائم تھا۔ دہلی کے سلطانوں کے دور میں ''مشرف ممالک'' (اکاؤنٹینٹ جنرل) اور ''مشافی ممالک'' (آڈمیٹر جنرل) اور ''دیوان انشا'' (ریاستی خط وکتابت کا شعبہ) جس کا سربراہ دبیر خاص کہلاتا تھا اور ''برید ممالک'' (سراغرسانی شعبہ کا سربراہ) کے کچھ اہم دفاتر اور شعبے تھے۔

31.10 صوبائی انتظامیہ

دہلی کے سلطانوں کے دور میں مقتی یا ولی صوبوں کے نگراں ہوتے تھے۔ صوبوں میں ''صاحب دیوان'' بھی ہوتا تھا جس کی معاونت متصرفوں اور کارکنوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ ان کا کام آمدنی اور اخراجات کی نگرانی کرنا تھا۔ 13 ویں صدی کے اختتام تک ''شِق'' ایک انتظامی شعبہ کے طور پر ابھری جس کو بعد میں ''سرکار'' کے طور پر بھی جانا گیا۔ انصاف کے لیے صوبوں میں قاضی کی عدالتیں اور صدر کام کرتے تھے۔ مغل مملکت کو 13 صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور یہ صوبے تھے، الہ آباد، آگرہ، اودھ، اجمیر، احمد آباد، بہار، بنگال، دہلی، کابل، لاہور، ملتان، ملکّا، خاندیش، برار اور احمد نگر۔ کشمیر اور قندھار صوبہ کابل کے ضلع تھے۔ سندھ جو اس وقت تھٹ کے نام سے جانا تھا۔ صوبہ ملتان کا ایک ضلع تھا۔ اڑیسہ بنگال کا حصہ تھا۔ صوبے یکساں علاقے یا آمدنی پر منحصر نہیں تھے۔ ہر صوبہ میں ایک گورنر، ایک دیوان (آمدنی اور مالیاتی افسر) ایک بخشی (فوجی کماندار) ایک صدر (مذہبی منتظم) اور قاضی (منصف) ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ گماشتہ (ایجنٹ) بھی ہوا کرتے تھے جو

نوٹس

مرکزی حکومت کو اطلاعات فراہم کرتے تھے۔ مختلف حکام کے درمیان اور خاص طور سے گورنر اور دیوان کے درمیان اختیارات کی علیحدگی شاہی انتظامیہ میں کارکردگی کا نمایاں اصول تھا۔ مغل سلطنت کے صوبے ضلعوں (سرکاروں) میں بھی تقسیم کیے گئے تھے۔ ہر ضلع میں ایک فوجدار (فوجی افسر) ہوتا تھا جس کے فرائض آج کے کلکٹر سے ملتے جلتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک خزانے دار (خزانچی) بھی تعینات کیا جاتا تھا۔ انصاف عدالتوں کے ایک نظام کے ذریعہ کیا جاتا تھا جو پنچایت سے پرگنہ، سرکار (ضلع) اور صوبائی عدالتوں تک پھیلا ہوا تھا۔ انصاف کرنے کے لیے ترتیب وار منصب کے حامل قاضی، امیر داد اور میر عدل موجود تھے اور ان سب کے اوپر نگراں صدر/ قاضی ہوتا تھا اور بالآخر انصاف بادشاہ خود کرتا تھا۔ دہلی سلطنت اور مغل بادشاہوں دونوں ہی کے دور میں مقامی سطح پر قانون کے نفاذ کی ذمہ داری کوتوال کی ہوتی تھی۔

31.11 اِقطاع، جاگیر اور منصب

سلطانوں کے تحت اِقطاع اور مغلوں کے تحت جاگیر کے قیام کا مقصد افسروں کے ذریعہ لگانوں اور ٹیکسوں کی وصولی کرنا تھی اور جو اقطاعدار اور جاگیردار اپنی تنخواہوں کے حصول کے لیے وصول کروایا کرتے تھے۔ لیکن ان کی قانونی حیثیت بادشاہ کی خوشنودی پر منحصر ہوتی تھی۔ اقطاع کے ذمہ داروں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنی اقطاع نظم وضبط برقرار رکھنے اور ٹیکسوں کی وصولی کرنے کے علاوہ ضرورت کے وقت سلطان کو فوجی تعاون بھی فراہم کریں گے۔ آمدنی کی یہ تفویفات عام طور پر غیر موروثی اور قابل منتقلی نوعیت کی ہوتی تھیں۔ اسی طرح سے منصب کا نظام مغل حکومت کے دوران عوامی خدمات کی تنظیم پر مبنی تھا۔ یہ نہ تو موروثی ہوتا تھا اور نہ ہی اس میں مراتب کا نظام ہوتا تھا۔ منصب کے لفظی معنی ہیں عہدہ یا مقام جو افسر کی لیاقت اور اس کی حیثیت (ذات) اور فوجی دستہ (سوار دستہ) کی تعداد کے لحاظ سے مقرر کیا جاتا تھا۔ منصب دار کو عام طور پر ایک علاقہ سونپا جاتا تھا جسے جاگیر کہا جاتا تھا۔ جس کی تخمیناً آمدنی اس کے ذات اور سوار منصب دونوں کی واجب الادا تنخواہ کے مساوی ہوتی تھی۔ گوکہ کچھ منصب داروں کو شاہی خزانے سے بھی ادائیگی کی جاتی تھی۔

31.12 ٹیکسوں کا نظام

دہلی سلطنت کے دور حکومت میں ٹیکس کاری مثلاً خراج کل مجموعی پیداوار کے چھٹے سے تیسرے حصہ کے برابر ہوتی تھی۔ تمام بالغ غیر مسلم مردوں کو فوجی خدمات کے عوض رکھ رکھاؤ کے آزادانہ ذرائع کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ امیر مسلمانوں سے زکوٰۃ بھی وصول کی جاتی تھی۔ جنگوں سے حاصل ہونے والے 'خمس'، یا مال غنیمت کے ساتھ ساتھ چنگی اور قدرتی وسائل آمدنی کے اہم ذرائع تھے۔ چودھری، مقدم اور کھوٹ دیہی آبادی سے ٹیکس وصول کرنے کے ذمہ دار تھے۔ وہ، شقداروں اور صوبائی مقتیوں کے تحت کام

نوٹس

کرتے تھے۔خالصہ زمینوں کی آمدنی سلطان کے خزانے کے لیے وقف تھی۔مغلوں نے اس نظام کو اور خاص طور سے زمینوں سے حاصل ہونے والی آمدنیوں کے نظام کو بہتر بنایا۔اکبر نے شیر شاہ سوری کے ناپ تول کے ''ضبط'' نظام کو اپنایا اور اس کو مزید بہتر بنایا۔اور بالآخر ''آئین دہ سالہ'' کا نظام وجود میں آیا جو کسی ایک مخصوص کھیت کی گذشتہ دس برسوں کی اوسط سالانہ پیداوار پر مبنی تھا۔زمینوں کی ناپ کے ایک نئے نظام ''گز الٰہی'' زمین کے ناپ کے معاملہ میں یکسانیت پیدا کردی۔زمین کی پیداواری صلاحیت، فصل کی نوعیت، قیمتیں اور آبپاشی کی سہولیات، حکومت کی آمدنی کے مطالبہ کی نقد قدرو قیمت کے دوسرے بڑے فیصلہ کن عوامل تھے۔زمین کے لگان کی ادائیگی کے لیے کئی متبادل نظام بھی موجود تھے زمین کی ملکیت ہمیشہ کاشتکار کی ہی ہوتی تھی۔

31.13 فوج

سلطنت دہلی اور مملکت مغلیہ دونوں ہی اپنی افواج پر انحصار کرتی تھیں جن کی مرکزی طاقت گھڑسوار رسالہ ہوا کرتا تھا۔سلطنت دہلی کے تحت ''عریض ممالک'' اور مغل شہنشاہوں کے تحت امیر بخشی فوج کا نگرانِ اعلیٰ ہوا کرتا تھا لیکن حکمراں بذات خود پوری فوج کی سربراہی کرتا تھا۔غیاث الدین بلبن پہلا بادشاہ تھا جس نے باقاعدہ تیار فوج کی بھرتی کی۔علاء الدین خلجی نے بعد میں اس نظام کو اور زیادہ مستحکم بنایا۔اس نے گھوڑوں کو داغنے کے طریقہ کو رائج کیا۔دہلی سلطنت کے دور میں فوج کے شاہی شہسوار دستہ کو ''ہاشم قلب'' یا ''افواج قلب'' کہا جاتا تھا۔صوبائی سطح پر تعینات گھڑسوار فوج کو ''ہاشم اعتراض'' کہا جاتا تھا۔اس فوج کو اعشاری نظام پر منظم کیا جاتا تھا۔مغل افواج کو منصب نظام کی بنیاد پر منظم کیا جاتا تھا جس کے بارے میں اوپر بتایا جا چکا ہے۔احدی بادشاہ کی راست کمان میں وفادار اور جان نثار دستہ ہوتا تھا بابر کی مہم جوئی کے بعد توپ خانہ کا ہندوستان میں تیزی کے ساتھ فروغ ہوا۔محاصرہ، یعنی قلعہ کو گھیرنے اور پھر اس پر حملہ کرنے کی حربی حکمت عملی موجود تھی۔قلعہ کی دیواروں پر بھاری توپیں نصب کی جاتی تھیں۔پیدل افواج کی تعداد گو کہ لامحدود تھی لیکن یہ جنگجو اور غیر جنگجو دونوں زمروں پر مشتمل تھی۔جنگجو فوجی عام طور پر بندوق بردار فوجی ہوا کرتے تھے جنھیں ''بندوقچی'' کہا جاتا تھا۔اکبر کے دور تک پیدل فوج میں بندوق بردار دستہ بنا دیا گیا تھا۔دہلی سلطنت اور مغل حکومت دونوں ہی لڑائی کے میدانوں میں ہاتھیوں کا استعمال کرتی تھی۔بحری فوج ہمیشہ سے ہی ہندوستانی حکمرانوں کا کمزور پہلو رہی ہے۔

31.14 سکّوں کا نظام

التمش کے بعد سے دہلی سلطنت میں معیاری سکہ چاندی کا ٹنکا تھا جس کا وزن 175 رتی تھا۔تاہم سکّے

نوٹس

عموماً ملواں دھات کے ہوتے تھے۔ کانسہ میں اسی وزن کے سکّے موجود تھے جن کی بنیادی اکائی ''جیتل تھا۔ چودھویں صدی میں ایک ٹنکا 48 سے 50 جیتل کا ہوا کرتا تھا۔ دہلی کے سلطانوں نے سونے اور چاندی کے سکے بھی رائج کیے۔ لودھیوں نے جنھوں نے کبھی بھی چاندی کے سکے نہیں ڈھالے'' سونے کا ایک بھاری سکہ رائج کیا تھا جس کا وزن 145 رتی تھا اور جسے ''بہولی'' کہا جاتا تھا۔ شیر شاہ سوری نے دو دھاتوں کے سکے رائج کیے۔ اس نے چاندی کا ایک سکہ رائج کیا اس کے علاوہ ٹنکا کو خالص تانبے میں ڈھالا گیا۔ اکبر کے بعد سے مغلوں نے اسی نظام کو رائج کیا۔ ان کا روپیہ 178 رتی کا تھا (اورنگزیب کے تحت یہ روپیہ 180 رتی کا تھا) اور ان میں ملواں دھاتیں کبھی بھی 4 فی صد سے زیادہ نہیں رہیں۔ انھوں نے تانبے کے کئی سکہ ڈھالے جن میں سے ہر ایک کا وزن 323 رتی تھا۔ یہ شیر شاہ کے ٹنکا کے نصف کے برابر تھے۔ اکبر کے دور حکومت کے آخری دنوں میں ایک روپیہ 40 دام کا ہوا کرتا تھا اور یہی بعد میں کاغذی روپیہ کی قدر و قیمت بنی۔ درحقیقت سترہویں صدی کی پوری مدت روپیہ کے تانبے کی قدر و قیمت زوال پذیر رہی۔ مغلوں نے سونے کے سکوں کو بھی رائج کیا جنھیں ''مُہر'' یا ''اشرفی'' کہا جاتا تھا۔ لیکن ان کو عام طور پر منڈی میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ مغلوں کے ذریعہ رائج کردہ سکوں میں دھاتوں کا خالص پن اور یکسانیت موجود تھی۔ سکوں کی ڈھلائی کے معاملہ میں اتنی آزادی'' موجود تھی کہ کوئی بھی سونے کو ٹکسال میں لے جاسکتا تھا اور اس کو قدر و قیمت کے رائج الوقت سکوں میں ڈھلوا سکتا تھا۔

متن پر مبنی سوالات 31.3

بریکٹ سے مناسب الفاظ کو خالی جگہوں میں بھریے:

1۔ بادشاہ نے نئے عناصر کو اپنی فوج میں بھرتی کی پیشکش کی اور ________ مغل افواج کا ایک اہم حصہ بن گئے۔ (افغان، ایرانی، ترک)

2۔ سلطنت کے دور میں سلطان کے فوراً بعد ________ کا دفتر حکومت کے کاموں کی نگرانی کرتا تھا۔ (صدر اعلیٰ، منصف اعلیٰ، وزیر)

3۔ ________ کو مغلوں کے تحت آمدنیوں کی وصولی کے لیے بنایا گیا جو ریاست کے ایما پر ٹیکس وصول کرتا تھا۔ (منصب، صدر، جاگیر)

4۔ التمش کے بعد کے سلطانوں کے تحت رائج چاندی کے ٹنکا کا وزن ________ رتی تھا۔ (225,200,175)

چنانچہ وسطی دور کی ریاستوں کی افزائش فتوحات اور مفتوحہ علاقوں کے استحکام کے ساتھ ایک روز افزوں افزائشی عمل تھا۔ فن حکمرانی کے لیے وسطیٰ ایشیاء کے بعض نظاموں کو اپنا گیا لیکن دوسرے گذشتہ طریقوں کو بالکل ہی فراموش نہیں کیا گیا۔ جہاں تک انتظامیہ کی تنظیم اور حکمراں طبقہ کا تعلق تھا یہ کسی ایک شخص پر مبنی ڈھانچہ نہیں تھا۔ طاقت کا واحد وسیلہ ہونے کے باوجود بھی ہر حکمراں نے اپنی حکومت کی پائداری اور مضبوطی کو برقرار رکھنے کے لیے رعایا اور سماج کے مختلف حصوں اور مختلف مفادات کے عامل گروپوں کے درمیان توازن کو قائم رکھا۔ اس کے باوجود بھی مختلف عقائد پر مشتمل ثقافت پر ہمیشہ پوری طرح توجہ دی جاتی رہی۔

آپ نے کیا سیکھا

گپتا ریاست کے زوال کے بعد ہندوستانی ریاست لامرکزیت اور مختلف علاقائی ریاستوں کے ابھار میں آنے کے دور سے گذری۔ 13 ویں صدی میں شمالی ہند میں ایک نئی قسم کی ریاست وجود میں آئی۔ دہلی سلطنت کا ماخذ محمد غوری کی فتوحات تھیں جس نے 1151ء میں محمود غزنوی کو حکومت سے ہٹا دیا تھا۔ غزنی کی فوجوں نے ملتان، سندھ، پیشاور اور لاہور کو فتح کیا۔ بعد میں شمس الدین التمش نے شمالی ہند میں ترکی فتوحات کو مستحکم بنایا۔

1246ء تک سیاسی صورت حال میں اس وقت تبدیلی آئی جب غیاث الدین بلبن نے بہت زیادہ طاقت حاصل کرلی۔ اس نے پہلے سلطان کے نائب کی حیثیت سے کام کیا اور بعد میں خود سلطان بن گیا۔ اس کا دور حکومت 1266 سے 1287ء تک رہا۔ وہ اپنے دور کی ایک انتہائی اہم شخصیت تھا۔ اُس کے جانشینوں کی نااہلی کے سبب 1290 میں غیاث الدین تغلق نے دہلی سلطنت پر قبضہ کرلیا، مگر 1296ء میں اس کے بھتیجے اور تخت کے جانشین علاء الدین خلجی نے اس کو قتل کردیا۔ علاء الدین خلجی کے دور حکومت (1296-1316) کے دوران سلطنت نے مختصر طور پر عظیم مملکت کی حیثیت اختیار کرلی۔ تاہم علاء الدین کی موت کے بعد کے صرف پانچ برسوں میں ہی خلجی خاندان کی حکومت ختم ہوگئی۔

غیاث الدین تغلق 25-1320 اور محمد بن تغلق سلطنت کے عہد کی نمایاں مثالیں ہیں اور انھوں نے پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کی خواہش کی۔ یہ دور مسلسل مرکزیت اور توسیع سے وابستہ ہے۔ 1526ء میں بابر نے وسطیٰ ایشیا سے آکر مغل شاہی خاندان کی ہندوستان میں داغ بیل ڈالی، دہلی، گنگا کے طاس اور بعد میں بنگال اور پنجاب پر قبضہ نے اسے پادشاہ کا لقب اختیار کرنے کا حقدار بنایا۔ اس کے بیٹے ہمایوں نے شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھائی اور افغانستان واپس چلا گیا۔ شیر شاہ کے انتقال کے بعد ہمایوں نے 1555ء میں دہلی کو دوبارہ فتح کرلیا۔ لیکن ایک حادثہ میں اس کی موت ہوگئی۔ اس کے بعد اس کا تیرہ سالہ

نوٹس

بیٹا اکبر تخت نشین ہوا اور اس نے اپنے سرپرست اور استاد بیرم خاں کی رہنمائی میں لاہور، آگرہ اور جونپور کے جنگی اہمیت کے حامل قلعوں کو فتح کرلیا۔ اکبر نے 1556ء سے 1605ء تک حکومت کی۔ اس کی مملکت کابل، کشمیر اور پنجاب سے بنگال اور آسام تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بیٹے جہانگیر نے 1605ء سے 1627ء تک اور اس کے پوتے شاہجہاں نے 1627ء سے 1658ء تک حکومت کی اور اس کے بعد پڑپوتے اورنگزیب نے 1658ء سے 1707ء تک حکومت کی۔ مغل سلطنت اپنے عروج تک پہنچی اور اس نے ان وسائل پر حکومت کی جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

16 ویں اور 17 ویں صدیاں برصغیر میں یوروپی اور غیر یوروپی تنظیم کے قیام اور توسیع خاص طور پر بیرون ممالک میں ہندوستانی اشیا کی مانگ میں اضافے کے لیے معروف ہیں۔

اس سبق میں آپ نے عہد وسطیٰ کی ریاست، بادشاہت، شاہی دربار اور طبقہ امراء کے بارے میں پڑھا اس کے علاوہ آپ نے صوبائی انتظامیہ، ٹیکس کے نظام، عہد وسطیٰ کی فوج اور کرنسی نظام کے بارے میں معلومات حاصل کی۔

اختتامی سوالات

1۔ محمد غوری کے رول کا مختصر طور پر بیان کیجیے۔
2۔ بلبن اور خلجی کے دور حکومت کی بنیادی خصوصیات بتائیے۔
3۔ ''محمد بن تغلق کی حکومت دہلی سلطنت کے عروج اور زوال دونوں کی نشاندہی کرتی ہے''، تبصرہ کیجیے۔
4۔ سولہویں اور سترھویں صدیوں کے دوران مغلوں کی حکومت کا تجزیہ کیجیے۔
5۔ دورِ وسطیٰ کی ریاست کی نوعیت کی وضاحت کیجیے۔
6۔ بادشاہ کی شخصیت سے کیا مراد ہے؟
7۔ صوبائی انتظامیہ کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

31.1 1۔ 1186ء

2۔ 1175ء 1182ء اور 1186ء

3۔ شمالی ہند

نوٹس

4- 1290ء

5- 1296ء

31.2 خالی جگہوں کو بھریے:

1- تیمور، چنگیز خاں

2- 1555ء

3- 1707ء موثر، مرکزی

4- مغل، شریعہ

31.3 بریکٹ سے چن کر مناسب الفاظ کو خالی جگہوں میں بھریئے۔

1- ایرانی

2- وزیر

3- جاگیر

4- 175

اختتامی سوالات کے حل کے لیے اشارے

1- دیکھیے پیرا 31.2

2- دیکھیے پیرا 31.2

3- دیکھیے پیرا 31.2

4- دیکھیے پیرا 31.3

5- دیکھیے پیرا 31.4

6- دیکھیے پیرا 31.5

7- دیکھیے پیرا 31.10

نوٹس

32

نوآبادیاتی ریاست

جب برطانیہ نے ہندوستان کے اقتدارِ اعلیٰ پر قبضہ کرلیا یعنی وہ اس ملک کی سب سے بڑی طاقت بن گیا تو اس نے پورے ہندوستان پر سامراجی نوآبادیاتی حکومت کا قیام کیا یا انھوں نے مقامی ہندوستانی حکومتوں کے جائز اقتدار پر قابو پانے کے لیے انھیں نا اہل اور پسماندہ قرار دے کر برطانوی اقتدار کو درست قرار دینے کی وضاحت کی۔ نوآبادیاتی ریاست کے سیاسی اقتدار نے اپنی طاقت کو تھوپنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے کئی حربوں اور حکمتِ عملیوں کا استعمال کیا جو نوآبادیاتی پالیسی کی تشکیل کی ایک اولین شرط تھی۔ اس بات سے واقف ہونا اہم ضروری ہے کہ عوام پر حکومت کو کس طرح جائز قرار دیا گیا اور نوآبادیاتی ریاست کو بیرونی حکومت کے غلام عام آدمیوں پر کس طرح سے ظاہر کیا گیا۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ درج ذیل باتوں سے واقف ہوسکیں گے:

- نوآبادیاتی ریاست کے مفہوم اور اس کی نوعیت کو سمجھ سکیں گے؛
- ہندوستان میں نوآبادیاتی مقاصد سے واقف ہوسکیں گے؛
- نوآبادیاتی کنٹرول کی حکمتِ عملیوں کی شناخت کرسکیں گے؛ اور
- نوآبادیاتی حکومت کی علامات اور اس کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔

32.1 پس منظر

مغلیہ سلطنت کا زوال اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہوگیا تھا۔ اس سیاسی خلا کو علاقائی ریاستوں مثلاً بنگال، حیدرآباد، اودھ، پنجاب اور مراٹھا حکومتوں نے بھرا، لیکن یہ علاقائی طاقتیں سیاسی پائداری فراہم نہ کرسکیں جس کے نتیجہ میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان میں ملکی حکومت قائم کرنے کا شرمناک موقع مل گیا۔ اب نوآبادیاتی مشینری کے ذریعہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے حکمتِ عملیوں

نوٹس

اور قواعد کو بنانے کی ضرورت تھی۔

(i) نوآبادیاتی ریاست کا مفہوم

ہندوستان پر برطانوی قبضہ سے قبل . قائی عوام اور مطلق العنانی طاقتوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت کبھی بھی مذہبی نہیں رہی۔ معاشی اور سماجی تعلقات کا ایک جال سامراجی استحکام، بحران اور زوال کے ادوار سے محفوظ رہا اور اس نے برعظیم کو ایک دوسرے پر انحصار کے فریم ورک کے کمزور بندھنوں میں باندھے رکھا۔ بڑی طاقتوں کے ہم آہنگی کے کثیر معیاروں کی ایک طویل تاریخ ہونے کے باوجود بھی آزاد ہندوستان میں طاقت واقتدار کے بٹوارے کی اصطلاح نے ملکی اقتدار اعلیٰ سخت گیر اور وسیع تر تصور کا سامنا کیا جو واحد اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ملک کے تصور پر مبنی تھا۔ نوآبادیاتی ریاست کے معنی ہیں ایک بیرونی سیاسی اکائی کے ذریعہ کسی ملک کے اقتدار پر قبضہ (جس میں اسے حکومت کرنے اور کنٹرول کرنے کی قانونی آزادی حاصل ہو) نوآبادیاتی ریاست سامراجی، نوآبادیاتی تعلقات کے خصوصی سیاق وسباق میں اقتدار اعلیٰ کا نظریہ بناتی ہے۔ اس کو دو طریقوں سے انجام دیا جاتا ہے۔ (1) نوآبادیاتی ریاست کو جائز اور قانونی حیثیت دینے کا طریقہ یعنی بیرونی اکائی کی قانونی موجودگی کو درست قرار دینا جو خود کار طور پر دوسرے طریقے کی جانب سے کی جاتی ہے۔ (2) ماقبل نوآبادیت کی مقامی سیاسی حکومت کو غیر قانونی قرار دینے کی تخریبی کارروائی۔

(ii) نوآبادیاتی ریاست کی نوعیت

انگریزوں نے اپنے اس تصور کے مطابق کہ ایک نوآبادیاتی ریاست کس طرح کی ہو سکتی ہے ہندوستان میں اپنی نوآبادیاتی حکومت کو مستحکم کیا اور اس طرح سے جدید خصوصیات کے ساتھ ایک جدید طرز کی ریاست وجود میں آئی۔ جیسا کہ جدید طرز کی اس ریاست میں طاقت کی اجارہ داری نوآبادیاتی حکومت کی تھی، ٹیکسوں کی وصولی کے لیے ایک مرکزی انتظامیہ موجود تھی، ایک مرکزی قانونی نظام موجود تھا۔ منتظمین اور دفتری افسران کا پیشہ ورانہ عملہ موجود تھا اور ملک کی سرحدوں کا واضح طور پر تعین کیا گیا تھا۔ برطانوی نوآبادیاتی حکومت کا قانون پر مبنی حکومت اور قوانین کے مطابق نظم ونسق چلانا تھا۔ تاہم سب سے نچلی سطح پر جب پالیسی پر عمل درآمد کیا جاتا ہے، ذات، برادری اور حکمراں کے روابط اور حاکم محکوم کے تعلقات کا اس بات میں اہم رول ہوتا ہے کہ نوآبادیاتی ریاست مقامی سماج پر کیا اثر ڈالے گی۔ 1947ء میں آزادی کے بعد ایک نئے ملک نے اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کی شکل نوآبادیت سے اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں وکمزوریوں کے ساتھ ورثہ میں ملی تھی۔

(iii) ہندوستان میں نوآبادیاتی مقاصد

19 ویں صدی کے دوران سامراجی تصورات کا حامل برطانوی راج وجود میں آیا۔ دنیا میں سب سے زیادہ دولتمند اور انتہائی ترقی پسند قوم کی حیثیت سے برطانیہ کا یہ فرض تھا کہ وہ دنیا کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے میں مدد کرتا۔ قانون کی حکومت مہذب اندازِ زندگی اور دولت کے حصول کے حالات پیدا کرتی۔

ہندوستان پر حکومت کرنے کا برطانوی نظریہ یہ تھا کہ:

1۔ ہندوستانی خود کی اپنا نظم ونسق چلانے کے اہل نہیں ہیں

2۔ اچھی حکومت فراہم کرنا برطانیہ کا فرض ہے جو قانون کی حکومت پر مبنی ہوگی اور یہ ہندوستان کی معیشت اور سماج کے انتظام میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔

لیکن سامراجی حکومت کی اہم ذمہ داریاں اس شکل میں سامنے آئیں۔

(a) زمینوں کی آمدنی کی وصولی

(b) قانونی انتظامیہ پر عملدرآمد

ایسٹ انڈیا کمپنی نے آمدنیوں کے تصفیہ کے جو طریقے بنائے تھے وہ ہندوستان میں دولت اکٹھا کرنے، کمپنی کی تحفظاتی ضروریات اور اس تجربے کے مطابق تبدیل ہوتے رہے تھے جو کمپنی نے نئے علاقوں پر اپنے کنٹرول کی بنا پر حاصل کیا تھا۔

نوآبادیاتی ریاست دو مقاصد کے تحت مصروفِ عمل تھی: (1) برطانوی حکومت کی ضروریات کے لیے ہندوستانی نوآبادی کی مکمل محکومی اور (2) ہندوستانی نوآبادی کا معاشی استحصال یا برطانوی راج کے ذریعہ نوآبادیوں کے معاشی وسائل پر قبضہ، لیکن ہندوستان میں سامراجی مفادات پورے وقت یکساں نہیں رہے بلکہ یہ برطانیہ کی ضروریات اور برطانیہ میں مختلف سماجی گروپوں کی ضروریات کے مطابق تبدیل ہوتے رہے۔

1813ء تک ہندوستان پر برطانوی راج کے پہلے مرحلے کے دوران برطانوی مفادات کا خاص مقصد تھا: (i) ہندوستان کے ساتھ تجارت پر برطانیہ کی اجارہ داری اور دوسرے یوروپی حریفوں کا خاتمہ اور (ii) ٹیکسوں کے ذریعہ ہندوستان کے مالی وسائل پر کنٹرول۔

ان دونوں ہی مقاصد کی تکمیل اس وقت موجود حکومتوں اور انتظامی ڈھانچوں کو درہم برہم کیے بغیر بھی ہوسکتی تھی۔ اس مرحلہ پر برطانوی حکمراں اس ملک کے روایتی حکمرانوں سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھے جن کی خاص دلچسپی زرعی پیداوار کے زائد حصہ کو وصول کرنا تھا۔ چنانچہ اس مرحلہ پر ایک یکساں انتظامیہ کو بنانے یا پرانی انتظامیہ کو بھی نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ قانونی نظام یا انتظامیہ میں کسی بھی طرح کی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی۔ جو کچھ تھوڑی بہت تبدیلیاں کی گئیں وہ آمدنی کی وصولی سے متعلق انتظامیہ کی اعلیٰ

نوٹس

سطح پر کی گئیں اوران کا مقصد آمدنیوں کی آسان وصولی تھا۔ اس مرحلہ پر ہندوستان کے لیے ایک جدید قانونی نظام یا یکساں انتظامی ڈھانچہ کی تشکیل کو ضروری نہیں سمجھا گیا چونکہ ہندوستان پر برطانوی راج کے پہلے مرحلہ کے دوران برطانوی مقاصد کی تکمیل کے تعلق سے اس پر غور نہیں کیا گیا۔

1813ء کے بعد اس پس منظر میں قابلِ لحاظ تبدیلی آئی۔ برطانوی معیشت اور سماج صنعتی انقلاب کے سبب ایک بڑی ماہیتی تبدیلی سے گذر رہی تھی جو برطانوی سماج میں ایک غالب طاقت بن چکی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانی تجارت پر اپنی اجارہ داری سے آہستہ آہستہ محروم ہوتی جارہی تھی۔ ہندوستان میں برطانوی مفادات اب کمپنی کے مفادات کی نہیں بلکہ صنعتی سرمایہ دار طبقہ کے مفادات کی نمائندگی کرنے لگے تھے۔ ہندوستان میں برطانوی صنعت کاروں کے مفادات تھے۔ (الف) ان کی تیار صنعتی مصنوعات کے لیے ایک منڈی اور (ب) ان کی صنعتوں کے لیے خام موادوں مثلاً پٹ سن اور کپاس وغیرہ کی دستیابی اور ان کی برآمد کے لیے اناجوں اور افیم وغیرہ کی فراہمی کا وسیلہ۔

ان سب مقاصد کی تکمیل کے لیے ہندوستانی معیشت اور سماج میں گہری دراندازی اور نہ صرف برطانیہ کے ساتھ بلکہ دوسرے ممالک کے ساتھ اس کی تجارت پر کنٹرول کی ضرورت تھی۔ اب ہندوستان سے ایک نیا کردار نبھانے کی توقع کی جانے لگی تھی۔ روایتی انتظامی ڈھانچوں کے ساتھ اس کردار کو نبھانا شاید ممکن نہیں تھا۔ برطانوی مفادات کے نئے تقاضوں کے ان کو مطابق بنانے کے لیے ان کو تبدیل کرنا بلکہ نئے سرے سے ان کی تشکیل کرنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ ہندوستانی انتظامیہ میں ماہیتی تبدیلی کا آغاز ہوا۔ جدید کاروبار، منڈی معیشت کو قائم کرنے، آزادانہ کاروباری تعلقات اور جدید قوانین کی مدد سے مختلف معاشی کارروائیوں کو باضابطہ بنانے کے لیے پورے قانونی ڈھانچہ میں تبدیلی کرنا ضروری ہوگیا تھا۔

برطانوی مفادات کئی قسم کے تھے۔ ان کا سب سے پہلا اور اہم مقصد تو اجارہ دارانہ تجارتی مقام حاصل کرنا تھا۔ بعد میں یہ محسوس کیا گیا کہ آزاد تجارت کا ایک نظام ہندوستان کو برطانوی مصنوعات کی ایک بڑی منڈی اور خام موادوں کے حصول کا ایک وسیلہ بنا دے گا، لیکن ہندوستان میں سرمایہ کاری کرنے والے برطانوی سرمایہ دار یا جو برطانیہ میں بنک کاری اور جہاز رانی کی خدمات فروخت کرتے تھے ان فائدوں کو موثر طور پر کنٹرول کرتے رہے اور ان پر قابض رہے۔ ہندوستان، برطانیہ کے بالائی درمیانی طبقہ کے لیے دلچسپ اور منافع بخش روزگاروں کا قابلِ لحاظ بڑا حصہ بھی فراہم کرتا رہا اور وہ جو رقم گھر بھیجتے تھے وہ برطانیہ کی ادائیگی اور بچت کی اس کی صلاحیت کے توازن میں نمایاں حصہ ادا کرتی تھی۔ آخر میں یہ کہ ہندوستان پر قبضہ جغرافیائی، فوجی نقل وحمل اور فوجی افرادی قوت کے نقطۂ نظر سے عالمی طاقت کے ڈھانچہ میں ایک کلیدی عنصر تھا۔ برطانوی اس وجہ سے کہ ہندوستان ان کی منڈی کو بڑھاوا دے رہا تھا وہ اس کی معاشی ترقی سے بیگانہ نہیں تھے لیکن وہ ان علاقوں میں مدد کرنے سے انکار کرتے تھے، جہاں وہ اپنے خود کے معاشی مفادات یا سیاسی

تحفظ سے ٹکراؤ محسوس کرتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ہندوستان کی کپڑا صنعت کو تحفظ دینے سے اس وقت تک انکار کیا جب تک کہ عالمی پیمانے پر اس صنعت کا بڑا حریف مانچسٹر کے بجائے جاپان نہ بن گیا۔ انھوں نے تکنیکی تعلیم کے فروغ کے لیے عملی طور پر کچھ نہیں کیا۔ انھوں نے املاک سے متعلق کچھ برطانوی تصورات کو رائج کیا لیکن جب اس میں دلچسپی نہیں دکھائی گئی تو انھوں نے ان پر بہت زیادہ زور نہیں دیا۔

متن پر مبنی سوالات 32.1

خالی جگہوں کو بھریے:

1۔ مغلیہ سلطنت کا زوال ______ میں ہوا۔

2۔ ہندوستان پر برطانوی راج کے پہلے مرحلہ ______ تک برطانیہ کا مفاد ہندوستان کے ساتھ تجارت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری تک محدود تھا۔

3۔ برطانوی معیشت اور سماج ______ انقلاب کے سبب ایک بڑی ماہیئتی تبدیلی سے گذر رہے تھے۔

4۔ برطانوی صنعت کاروں کے مفادات ہندوستان کو اپنی ______ مصنوعات کی منڈی بنانے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔

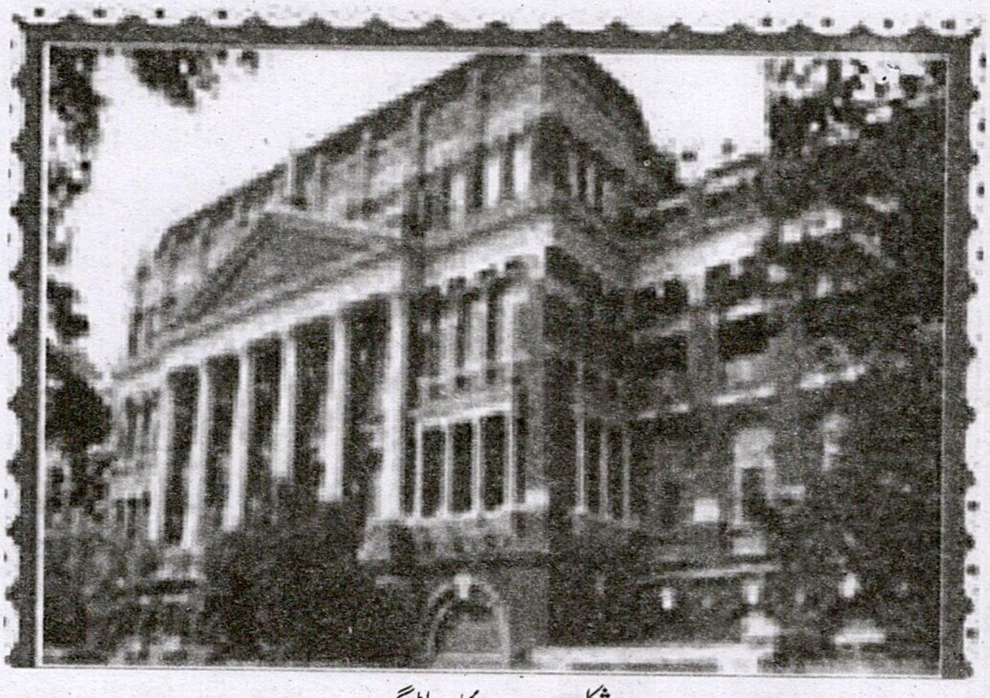

شکل: 32.1: رائٹرز بلڈنگ

نوٹس

32.2 قانونی استحقاق کی شکلیں

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ برطانوی راج سے فوری قبل ہندوستان پر مغلیہ سلطنت کی حکومت تھی۔ 19ویں صدی کے اوائل تک انگریزوں نے مغل سلطنت کی بادشاہی علامتوں کے ساتھ کسی بھی طرح کی مداخلت نہیں کی۔ 1835ء تک فارسی سرکاری زبان تھی اور مغل بادشاہ کے نام سکّوں پر کندہ کیے جاتے تھے۔ 1837ء تک سب سے زیادہ توپوں کی سلامی مغل بادشاہ کے لیے مخصوص تھی۔ اقتدارِ اعلیٰ کی ان علامتوں کا خاتمہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے ایک علامتی قدم تھا جو اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ اس نے ہندوستان کے اقتدارِ اعلیٰ پر قبضہ کرلیا ہے۔ پریسیڈنسی علاقوں پر اقتدار اور اس کے بعد ملک کے کچھ اندرونی حصوں میں انگریزوں کی موجودگی کا مطلب تھا کہ ان انتظامی مراکز کو بھی جو مغلیہ سلطنت کی خستہ حالی کی علامتیں تھیں، اسی نظام کے تحت تعمیر کیا جانا ہے۔ چنانچہ بمبئی کے قریب کے کچھ جزائر اور دریائے ہگلی کے دہانے کے کچھ دیہات کمپنی کی بمبئی پریذیڈنسی کی بڑی ملکیتیں بن گئیں۔ مغلیہ سلطنت کے اعلیٰ وارفع اور شاندار حکومتی مراکز انگریزوں کے علاقائی مراکز میں تبدیل ہوگئے۔ مرکز اور اس کے دائرہ اختیار کے نئے نقوش نئے فن تعمیر کے اوزاروں سے بنائے گئے۔ نئے ادارے نئی طاقت کے وجود میں آنے کی نشاندہی کرنے لگے۔ نئے اداروں کی عمارتیں انتہائی دلکش اور متاثر کن تھیں۔ 19ویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں بمبئی جیسے راجدھانی شہر میں جو کچھ بھی نظر آتا تھا صوبائی شہر میں اس کا شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی (جو بذاتِ خود تاج برطانیہ کی غلام تھی اور اپنے معاملات سامراجی احکامات کے مطابق انجام دیتی تھی)، ہندوستانی حکمرانوں کو اپنا تابعدار بنانا چاہتی تھی۔ تابعداری یا محکومی کی اصطلاح میں ''افضلیت و برتری''، ''تحفظ''، ''ماتحتی اتحاد''، ''بالواسطہ حکمرانی'' اور ''تابعدارانہ اشتراک'' شامل تھا، جسے خاص طور سے ہندوستان میں برطانوی تجربہ سے حاصل کیا گیا تھا۔ 19ویں صدی کے آغاز تک کمپنی اور مختلف شاہی ریاستوں کے درمیان معاہدوں کے ایک سلسلہ کے ذریعہ ''تحفظ کی فراہمی'' کے بندوبست وجود میں لائے گئے۔ گورنر جنرل لارڈ ویلزلی نے ایک نظام تیار کیا، جو ''ماتحتی اتحاد نظام'' کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس نظام کے تحت حیدرآباد (1798) مراٹھا پیشوا (1802) ناگپور کی بھونسلے ریاست اور گوالیار کی سندھیا ریاست (1803)، جے پور (1803) بڑودہ کی گائیکوارڈ ریاست (1805) ٹراونکور (1805) کوچین (1807) کوٹہ (1807)، جودھپور (1818) اور بیکانیر (1828) ریاستوں کو اپنی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس نظام کا لب لباب تھا مقامی ریاست کو برطانوی تحفظ کی یقین دہانی جس کی ادائیگی درج ذیل ذرائع سے کرنی ہوتی تھی۔ (الف) کمپنی کے فوجی دستہ کی دیکھ ریکھ کے اخراجات نقد رقم کی صورت میں (ب) ریاست کے علاقہ کے ایک حصہ کی کمپنی کو سپردگی (ت) جزوی یا کلی غیر فوجی نوعیت یعنی ریاست کی اپنی فوج سے دستبرداری (ج)

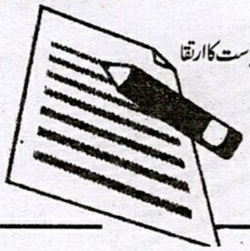

دوسری سیاسی طاقتوں سے تعلقات پر تحدید اور کمپنی کی منظوری کے بغیر جنگ نہ کرنے کا وعدہ (ح) مشورے اور ہدایات دینے کے لیے دربار میں کمپنی کے حکام کی موجودگی کی منظوری۔

دباؤ اور جابرانہ رویے کے ذریعہ محکومی حاصل ہوجانے کے بعد ریاست کے طریقوں سے تمام محکومین کو روشناس کرایا جاتا تھا۔ نوآبادیاتی ریاست کے وجود کو دکھلانے کے طریقے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر پر اپنے ہی محل میں چلائے جانے والے مقدمے (1858) یا 1877ء میں دہلی دربار کے واقعات سے دیکھے جاسکتے ہیں جب برطانوی اقتدار اعلیٰ کے سامنے ہندوستان کی محکومی کو عوامی طور پر ظاہر کیا گیا۔ عوام کے سامنے نوآبادیاتی ریاست کی علامتی ثقافتی بناوٹ ریاست کی نام نہاد ایجنسیوں اور روزمرہ کی آزمائشوں۔ داروغہ اور سپاہیوں، پٹیل، امین، پٹواری اور قانون گو کے ذریعہ کی گئی۔ اس کے علاوہ اس کے لیے کلکٹروں کی کچہری۔ قانون کی نئی عدالت کا بھی استعمال کیا گیا جہاں سیاہ چوغوں میں ملبوس، اجنبی زبان (انگریزی) میں بات کرتے ہوئے طاقتور اور بااثر لوگوں کے حق میں فیصلے کرتے تھے۔ شہروں میں بھاری اور بڑی نوآبادیاتی عمارتیں نوآبادیاتی طاقت کو ظاہر کرتی تھیں۔ چھاؤنیوں سے فوجیوں کے گشتی دستوں کی وقتاً فوقتاً پریڈ اور مقامی سماجی سربرآوردہ افراد کا گوری نسل کے افراد کے سامنے جھکنا اور تسلیم خم کرنا وہ مظاہر تھے جس نے ہندوستانی عوام کے دل ودماغ میں نوآبادیاتی حکومت کے عکس کو بٹھادیا۔

32.3 نوآبادیاتی کنٹرول کا آغاز

نوآبادیاتی قبضہ کے ابتدائی مرحلہ میں مقامی شہری انتظامیہ نے اپنا کام جاری رکھا۔ یہ انتظام بنگال کی فتح سے پہلے قابل لحاظ حد تک اچھی طرح سے کام کرتا رہا لیکن ایک بڑی ملکی حکومت کے افسران کا معاوضہ ادا کرنے کے لحاظ سے یہ غیر مؤثر تھا اس لیے کہ (الف) منافعوں کا بڑا حصہ کمپنی کے کھاتوں میں جانے کے بجائے نجی ہاتھوں میں پہنچ جاتا تھا اور (ب) بہت زیادہ لالچ پر مبنی مختصر مدتی پالیسی معیشت کی پیداواری صلاحیت کو تباہ و برباد کررہی تھی اور اس کی وجہ سے مقامی آبادی میں بغاوت کے آثار پیدا ہونے لگے تھے اور یہ دونوں ہی عنصر کمپنی کے طویل مدتی مفادات کے خلاف تھے۔ کلائیو نے ایک ''دوہرے'' نظام کا آغاز کیا یعنی کمپنی کی طاقت کے زیر سایہ کٹھ پتلی نواب کو بنائے رکھنے کی پالیسی وارن ہیسٹنگز نے نوابوں کو برطرف کردیا اور راست انتظامیہ کو رائج کیا، لیکن اس نے ہندوستانی عہدیداران کو برقرار رکھا۔

32.4 نوآبادیت کا نظریہ اور فلسفہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ پر بینتھم کا کٹر پرستانہ نظریہ غالب اثر نظر آتا ہے، جان مل، جس نے ہندوستان کی دروغ گوئی پر مبنی تاریخ لکھی تھی۔ 1819ء میں کمپنی کا ایک سینئر عہدیدار بن گیا، جس میں

نوٹس

ہندوستانی طورطریقوں کے بارے میں انتہائی نفرت کا اظہار کیا گیا تھا۔ وہ 1831ء سے 1836ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا چیف ایگزیکیٹو آفیسر رہ اور اس کا بیٹا جان اسٹیوارٹ مل 1823ء سے 1858ء تک کمپنی کے لیے کام کرتا رہا۔ ہیل بری میں مالتھوس اقتصادیات کا پروفیسر تھا اور یہاں کمپنی کے مستقبل کے افسران کی تربیت کرتا تھا۔ وہ افادیت پسندی کے نظریے سے متاثر تھا۔ بینتھم خود بھی ہندوستانی طور طریقوں کی بہتری اور سدھار کے بارے میں مشورے دیا کرتا تھا۔ افادیت پسند اپنے تجربات اور تصورات کو (مثلاً شہری خدمات میں تقرریوں کے لیے تقابلی داخلہ) کو دانستہ طور پر ہندوستان میں آزمایا کرتے تھے تاکہ وہ انھیں انگلینڈ میں استعمال کرسکیں۔ افادیت پسند فرانسیسی تصور''معاشی ترقی میں عدم مداخلت'' کے پکے حامی تھے اور وہ معاشی ترقی میں عدم مداخلت'' کے پکے حامی تھے اور وہ معاشی ترقی کی پیش رفت میں کسی بھی طرح کی ریاستی مداخلت سے نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ قحط سالی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے منڈی کی طاقتوں پر بھروسہ کرتے تھے۔ انھوں نے زراعت میں اضافہ کرنے یا صنعت کو تحفظ دینے کے لیے عملاً کچھ بھی نہیں کیا۔ معاشی ترقی میں عدم مداخلت کی روایت انگلینڈ سے زیادہ ہندوستان میں شہری خدمات میں گہرائی تک اپنی جڑیں پھیلا چکی تھی اور یہ 1920ء کے آخر تک پوری مضبوطی کے ساتھ موجود رہی۔ انتظامیہ کارکرد اور ایماندار تھی۔ ریاستی نظام ایک چوکس نگہبان کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ ترقی کے لیے اخراجات کچھ ہی میدانوں، مثلاً فوج، انصاف، پولیس اور جیل تک محدود تھے۔ زراعت کے فروغ کے لیے صرف 3% فی صد اخراجات وقف تھے۔ برطانیہ نے ہندوستان کو مغربی انداز میں ڈھالنے کے لیے ایک نمایاں کام یہ کیا کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کے ترمیم شدہ پہلو کو متعارف کرایا۔ میکالے کی تعلیم سے متعلق 1835ء کی تجاویز نے برطانوی تعلیمی پالیسی پر فیصلہ کن اثر ڈالا اور یہ ہندوستانی تہذیب کے تئیں مغربی قریب توجیہہ کی ایک کلاسیکی مثال ہے۔ ہندوستان پر برطانوی قبضہ سے پہلے مغلوں کی درباری زبان فارسی تھی اور مسلم آبادی اردو زبان کا استعمال کرتی تھی جو عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کا مرکب تھی۔ اعلیٰ تعلیم زیادہ تر مذہبی ہوتی تھی۔ عربی اور سنسکرت کی جانکاری پر زور دیا جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ کے ایک مدرسہ کو کچھ مالی امداد دی تھی (1718) اس کے علاوہ اس نے بنارس میں ایک سنسکرت کالج کی بھی مالی مدد کی تھی (1792)۔ 1782ء سے 1795ء تک وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل تھا اور اس نے خود بھی سنسکرت اور فارسی زبانیں سیکھیں۔ کمپنی کے کئی دوسرے عہدیداران بھی مشرقی اسکالر تھے۔ ان میں سے ایک سر ولیم جونز نے سنسکرت ادب کے ایک بڑے حصہ کا ترجمہ کیا اور 1785ء میں بنگال کی ایشیائی سوسائٹی قائم کی۔

لیکن میکالے اس مشرقیت کا سخت مخالف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''موجودہ نظام کا میلان سچائی کی پیش رفت کو تیز تر کرنے کی جانب نہیں بلکہ دم توڑتی ہوئی غلطیوں کی قدرتی موت کی جانب ہے۔ ہم عوامی سرمائے کو ضائع کرنے کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ ہم ان کتابوں کو چھاپنے کے ذمہ دار ہیں جن کی قدر و قیمت اس سادہ

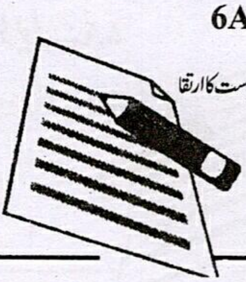

نوٹس

کاغذ سے بھی کم ہے جن کو ان کی چھپائی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہم نے یہ کتابیں لغو تاریخ، بے سرو پا مابعد الطبیعات اور بے سروپا اور فضول دینی علوم کو مصنوعی بڑھاوا دینے کے لیے چھاپی ہیں۔ مجھے سنسکرت یا عربی کی کوئی شُد بُد نہیں ہے۔ لیکن میں ان کی درست قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے جو کچھ کر سکتا تھا وہ کیا۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک اچھی یوروپی لائبریری کی ایک واحد الماری ہندوستان اور عربی کے پورے مقامی ادب پر بھاری ہے۔ سنسکرت زبان میں لکھی گئیں تمام کتابوں کی تاریخی معلومات کی وقعت و اہمیت اس معمولی مطبوعات کی کتابوں سے بھی کم ہے جسے انگلستان میں ابتدائی اسکولوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔''

ان ہی وجوہات کی بنا پر میکالے نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے انگریزی تعلیم کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن یہ تعلیم بھی عام ہندوستانیوں کے لیے نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمارے محدود وسائل کے ساتھ عام ہندوستانیوں کو تعلیم دینا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ اس وقت ہمیں ایک ایسا طبقہ تیار کرنا ہوگا جو ہمارے اور ان لاکھوں لوگوں کے درمیان ترجمان کے فرائض انجام دے سکتے جن پر ہم حکومت کرتے ہیں۔ یہ لوگوں کا ایک ایسا طبقہ ہوگا جو خون اور رنگ کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہوگا لیکن اپنے مزاج، اپنی سوچ، اپنے اخلاق اور اپنے ذہن کے لحاظ سے انگریز ہوگا۔ یہ ذمہ داری ہم اس طبقہ کو سونپتے ہیں کہ وہ ملک کی مقامی بولیوں میں سدھار لائے۔ ان بولیوں کو مغربی ناموں سے مستعار لیے ہوئے علم سے مالا مال کرے اور ان کو سند دے، یہ طبقہ آبادی کے بڑے حصہ کو معلومات اور علم فراہم کرنے کے لیے موزوں ہوگا۔''

متن پر مبنی سوالات 32.2

صحیح جواب پر (✓) کا نشان لگائیے:

1- ____________ تک فارسی زبان سلطنت مغلیہ کی سرکاری علامت تھی۔ (1831,1833,1835)

2- ____________ صدی کے دوسرے حصّہ میں راجدھانی شہر بمبئی میں کیا چیز نظر آتی تھی جو صوبائی شہروں میں دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔ (17ویں، 18ویں، 19ویں)

3- جیمس مِل ____________ میں کمپنی کا ایک سینئر عہدیدار بن گیا اور اس نے ہندوستان کی مسخ شدہ تاریخ لکھی۔ (1719, 1819, 1919)

4- سر ولیم جونز نے سنسکرت زبان کے ایک بڑے حصہ کا ترجمہ کیا اور اس نے ____________ ایشیائی سوسائٹی قائم کی۔ (1785, 1835, 1885)

32.5 نوآبادیاتی ڈھانچہ

1785ء میں کارنوالس نے کمپنی ملازمین کے پیشہ ورانہ عملہ کی شروعات کی جن کو اچھی تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ ہندوستان کا کوئی نجی تجارتی یا پیداواری مفاد نہیں تھا، ان کو باقاعدہ ترقی کے مواقع حاصل تھے اور وہ پنشن کے حقدار تھے۔ سبھی اعلیٰ عہدے انگریزوں کے لیے وقف تھے اور ہندوستانیوں کو ان سے علاحدہ کر دیا گیا تھا۔ کارنوالس نے برطانوی ججوں کا تقرر کیا اور بنگال کے ہر ضلع میں انگریز عہدیداروں کو آمدنی کلکٹروں اور مجسٹریٹوں کے عہدے پر فائز کیا۔ 1806ء سے کمپنی نے لندن کے نزدیک، ملیبری کالج میں نوجوان ریکروٹوں کی تربیت شروع کی، نگہبانی نظام کے تحت تقرریاں اب بھی منظّم طریقے سے ہوتی تھیں، لیکن 1833ء کے بعد کمپنی نے نامزد امیدواروں میں سے تقابلی امتحان کے ذریعہ ملازمین کا انتخاب کیا۔ 1853ء کے بعد ملازمت کے لیے انتخاب صلاحیت کی بنیاد پر کیا جانے لگا اور اس کے لیے ہونے والے امتحان میں سبھی انگریزوں کو حصہ لینے کا حق تھا۔ ملازمتوں کے لیے امتحان کا انگریزی نظام، چینی ماڈل سے متاثر تھا جس نے 2000 برسوں تک بخوبی کام کیا اور اس میں کلاسیکی تعلیم اور ادبی لیاقت پر اسی طرح سے زور دیا جاتا تھا۔ ہندوستانی سیول سروس کے دو پہلو تھے۔ (i) ان کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی تھیں اور (2) ان کو وہ سیاسی اثر حاصل تھا جو انگلینڈ میں کسی بھی افسر کو حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

1829ء میں پورے برطانوی ہندوستان میں ضلع بنائے گئے جو اپنے علاقہ کے لحاظ سے اتنے چھوٹے تھے کہ ان کو ایک انفرادی انگریز عہدیدار موثر طور پر کنٹرول کر سکتا تھا چنانچہ وہ اپنی طاقت کا استعمال ایک مطلق العنان حکمراں کے طور پر کرتا تھا۔ وہ خود ہی آمدنی کا وصول کنندہ ہوتا تھا، اور جج اور پولیس سربراہ بھی خود ہی ہوتا تھا (مغل انتظامیہ کے تحت یہ تمام کام علاحدہ علاحدہ افراد کو تفویض کیے جاتے تھے۔) یہ طریقہ بعد میں پوری برطانوی حکومت کی سامراجی انتظامیہ کا بنیادی عنصر بن گیا۔ چونکہ سول سروس بالآخر برطانوی پارلیمنٹ کو جواب دہ تھی اور ہندوستان میں برطانوی برادری پر گہری نظر رکھی جاتی تھی اس لیے انتظامیہ عملی طور پر بدعنوانیوں سے پاک تھی۔

شکل 32.2: بھاپ کا انجن

نوٹس

کمپنی کی فوج 20000-30000 افسران اور فوجیوں پر مشتمل مقامی بھاڑے کے سپاہیوں کی فوج تھی یہ اس وقت کی ایشیا کی سب سے جدید اور موثر فوج تھی۔ 1857ء کے غدر کے بعد برطانوی دستہ کل فوج کے تیسرے حصہ کے برابر تھا اور 1920ء کی دہائی تک سبھی افسران انگریز تھے اس وقت بہت تھوڑی تعداد میں ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی کیا جاتا تھا۔فوج کی کل نفری عام طور پر 200,000 کے قریب ہوتی تھی۔ یہ فوج مغلیہ فوج سے کہیں زیادہ چھوٹی تھی،لیکن بہتر تربیت اور ساز وسامان سے لیس تھی اور ریلوے کے نیٹ ورک کی وجہ سے (جس کا کچھ حصہ فوجی وجوہات کی بنا پر تعمیر کیا گیا تھا) اس کی نقل وحمل تیز رفتار تھی اور اس کی وجہ سے رسد اور دوسرے ساز وسامان کی فراہمی آسان ہوگئی تھی۔

1920ء کی دہائی تک انتظامیہ کے تقریباً اعلیٰ عہدیداران بھی انگریز ہوتے تھے جب سول سروسز کے امتحانات انگلینڈ کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی ہونے لگے۔اس کے علاوہ افسران اور عہدیداران کا ایک علاحدہ نظام مراتب موجود تھا جن میں اعلیٰ عہدیداران انگریز تھے یعنی آمدنی وصولی، انصاف، پولیس، تعلیم، طبی خدمات، عوامی خدمات، انجینئرنگ، ڈاک اور ریلوے سروسز کے سربراہ انگریز تھے۔صوبائی سول سروسز کے سربراہ بھی انگریز تھے۔ چنانچہ ہندوستان برطانیہ کے ایک خاصے بڑے درمیانی اور اعلیٰ طبقات کے لیے بڑی بڑی تنخواہوں پر مبنی ذریعہ معاش فراہم کرنے لگا۔(اس میں اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے لوگ بھی شامل تھے)۔

1820ء سے 1850ء کی دہائیوں تک انگریز ہندوستانی سماجی طور طریقوں میں تبدیلی لانے کے لیے زبردست طریقے سے کوشاں رہے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ان کو مغربی انداز میں ڈھالا جائے۔انھوں نے معصوم بچوں کی قربانی اور ستی کی رسموں کو ختم کردیا۔اس کے علاوہ انھوں نے غلامی اور شاہراہوں پر لوگوں کو لوٹنے والے ڈاکوؤں کا بھی سدِ باب کردیا۔انھوں نے بیواؤں کی دوبارہ شادی کو قانونی قرار دیا اور ہندوؤں کو عیسائی مذہب قبول کرنے کی اجازت دی تاکہ وہ مشترکہ خاندان کی املاک میں اپنے حصہ کا دعویٰ کرسکیں۔ انھوں نے برطانوی قانون پر مبنی تعزیری قانون کو لاگو کرنے کے اقدامات کیے جس میں برابری کا تصور پیدا کرنے کا مقصد تھا۔اس نئے قانون کے تحت برہمن اور شودر کو ایک جیسے جرم کے لیے ایک جیسی سزا دی جاتی تھی۔(اس قانون کا نفاذ درحقیقت 1861ء میں کیا جاچکا تھا) چنانچہ قانون کی حکومت اور قانون کے سامنے برابری نئی شکلیں تھیں۔

1857ء تک یہ دیکھنا ممکن ہوگیا تھا کہ برطانیہ روایتی ہندوستانی سماج کو تباہ و برباد کردینے اور ملک کو مغربی رنگ میں رنگ دینے کے درپے ہے،لیکن مغربی رنگ میں رنگنے اور مقامی ریاستی حکمرانوں پر قبضہ کرکے برطانوی حکومت کی توسیع کی ان کی کوششوں نے ہندو اور مسلمانوں کو 1857ء تک غدر میں ایک ساتھ لاکھڑا کیا۔ گوکہ غدر کو وفادار شاہی فوجوں، جن میں حال ہی میں مفتوحہ سکھ برادری بھی شامل تھی، کی مدد سے

کچل دیا گیا، لیکن اس کے بعد ہندوستانی طور طریقوں اور سماج کے تئیں برطانوی پالیسی اور بھی زیادہ اعتدال پسند ہوگئی۔ تاجِ برطانیہ نے راست ذمہ داری سنبھال لی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتشر کر دیا گیا۔ ہندوستانی سول سروس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور میں اختراعی تصور کے حامل چند ہی لوگ تھے اور ان کو اب لندن سے اور زیادہ گہرائی کے ساتھ کنٹرول کیا جاتا تھا۔

برطانیہ نے باقی ماندہ مقامی ریاستوں کے ساتھ نام نہاد اتحاد کیے اور نئے علاقوں پر قبضہ کرنا بند کر دیا۔ ان کی حکومت کے اختتام تک ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ نیم خود مختار ریاستوں میں آباد تھا۔ ان ریاستوں میں سرکاری برطانوی ریزیڈینٹ موجود تھے لیکن یہ داخلی پالیسی کے معاملے میں آزادنہ فیصلے کر سکتے تھے اور اس طرح مغربی رنگ میں ڈھالنے کی کوششیں رک گئیں۔

جس نظام تعلیم کو ہندوستان میں تیار کیا گیا وہ برطانوی نظام تعلیم کا صرف مدھم سا عکس ہی تھا۔ 1857ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا، لیکن یہ صرف امتحانی ادارے تھے اور ان میں تدریس نہیں ہوتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم الحاقی کالجوں کے ذریعہ دی جاتی تھی جہاں بی۔اے کا نصاب دو سال کا تھا اور اس میں حافظہ کے ذریعہ تعلیم اور امتحان پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا۔ پڑھائی چھوڑ دینے والے طلباء کا تناسب بہت زیادہ ہوتا تھا۔ انگریزوں نے اپنے نظام تعلیم میں تجزیاتی صلاحیت یا آزادانہ اندازِ فکر کو بڑھاوا دینے کے لیے کوئی خاص کام نہیں کیا اور انگریزی زبان کی آدھی ادھوری جانکاری کے ساتھ گریجویٹوں کے گروپ تیار کر دیے، لیکن انھیں مغربی رنگ ڈھنگ میں اتنا زیادہ ڈھال دیا گیا کہ وہ اپنی خود کی تہذیب سے بیگانہ نظر آنے لگے۔ 1920ء کی دہائی تک ہندوستانی یونیورسٹیوں نے تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، لیکن یہ بھی صرف ایم۔اے کے طلباء کے لیے تھا۔ مزید یہ کہ ہندوستانی تعلیم کی سمت پوری طرح سے ادب کی تدریس کی جانب تھی اور یہ کہ تکنیکی تربیت یوروپی ملکوں کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ 19ویں صدی کے پورے دور میں لڑکیوں کی تعلیم کو پوری طرح سے نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اس لیے کہ اعلیٰ تعلیم انگریزی زبان میں تھی۔ مغربی ادب کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کرنے کی کوئی بھی سرکاری کوشش نہیں کی گئی اور نہ ہی ہندوستانی مضامین کو معیاری بنانے کی سمت میں کسی طرح کی کوششیں کی گئیں جس کی مختلف النوع شکلیں کثیر لسانی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے درمیان ایک بڑی رکاوٹ تھی۔

ابتدائی تعلیم کو حکومت کے ایک فریضہ کے طور پر کبھی بھی سنجیدگی کے ساتھ نہیں نبھایا گیا اور اس کے لیے مالی امداد عام طور پر مقامی حکام کے ذریعہ فراہم کی جاتی تھی۔ اس کے نتیجہ میں عوام کے ایک بڑے حصہ کی رسائی تعلیم تک نہیں ہو پاتی تھی۔ اس کی وجہ سے آزادی کے وقت (1947) 88% عوام ناخواندہ تھے۔ 1930ء کے بعد اس سمت میں پیش رفت تیز تر ہوئی، لیکن آزادی کے وقت صرف بیس (20) فی صد بچے ہی کسی

بھی طرح کی ابتدائی تعلیم حاصل کر پاتے تھے۔ تعلیم سماجی حرکت پذیری کو بڑھاوا دینے، مذہبی توہمات کو ختم کرنے، پیداواریت کو بڑھانے اور عورتوں کے مقام کو بلند کرنے میں بنیادی رول ادا کر سکتی تھی، لیکن تعلیم کو اس کے بجائے سربر آوردہ لوگوں کی ایک چھوٹی سی تعداد کو ''انگریز'' بنانے اور کچھ بڑے گروپ کو ''سرکاری بابو'' بنانے کے لیے استعمال کیا گیا۔

32.6 نو آبادیاتی ریاست کے تحت تبدیلیاں

انگریزوں نے ہندوستانی سماج میں جو بڑی تبدیلیاں کیں وہ اعلیٰ سطح پر تھیں۔ انھوں نے ناکارہ جنگجو بادشاہتوں کو دفتری، فوجی اداروں میں تبدیل کر دیا، جنھیں فنِ حکومت کے عملی ماہرین نے انتہائی احتیاط کے ساتھ تیار کیا تھا، جو قانون اور نظم وضبط کو برقرار رکھنے میں بیحد مؤثر اور کارکرد تھے۔ حکومت کی بہتر کارکردگی نے مالی بوجھ کو بڑی حد تک کم کرنا ممکن بنا دیا اور قومی پیداوار کا سب سے بڑا حصہ زمینداروں، سرمایہ داروں اور نئے پیشہ ور طبقات کے لیے فراہم تھا۔ اونچے طبقہ کی اس آمدنی کا کچھ حصہ انگلینڈ بھیج دیا جاتا تھا لیکن اس کے بڑے حصہ کو ہندوستان میں صرف کیا جاتا تھا۔ تاہم کھپت کا نمونہ اس لحاظ سے تبدیل ہوا کہ نیا اونچا طبقہ اب حرموں اور محلات کا مالک نہیں تھا اور نہ ہی وہ ململ پہنتا تھا اور نہ مرصع تلوار لٹکاتا تھا۔ اس کی وجہ سے روایتی دستکاری کے میدان میں بعض تکلیف دہ حالات دیکھنے میں آئے۔ حکومت نے خود ریلوے اور آبپاشی میں پیداواری سرمایہ کاری کی اس کے نتیجہ میں زرعی اور صنعتی پیداواروں میں اضافہ ہوا۔ نئے معززین نے مغربی طرز زندگی کو اپنا لیا، وہ انگریزی زبان اور انگریزی اسکولوں کا استعمال کرنے لگے۔ نئے شہر اور شہری سہولیات تعمیر کی گئیں جن میں ان کے الگ خصوصی علاقے اور مکانات تھے۔ وکیلوں، ڈاکٹروں، استادوں، صحافیوں اور کاروباری افراد پر مشتمل اس نئے پیشہ ور طبقہ نے انگریزوں کے عادات واطوار کی نقل کی۔ اس گروپ کے اندر ذات کے پرانے بندھن ڈھیلے ہوئے اور سماجی نقل وحرکت میں اضافہ ہوا، جہاں تک آبادی کے بڑے حصہ کا تعلق تھا نو آبادیاتی حکومت نے اس میں صرف چند نمایاں تبدیلیاں کیں۔ انگریزوں کی تعلیم کی سمت میں کوششیں بہت محدود تھیں۔ دیہی سماج، ذات پات کے نظام، اچھوتوں کے مقام، ملے جلے خاندان کے نظام یا زراعت میں پیداواری تکنیک کے معاملہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ چنانچہ معاشی اور سماجی فروغ پر برطانوی اثر بہت محدود تھا۔ کل پیداوار اور آبادی میں قابلِ لحاظ اضافہ ہوا، لیکن فی کس آمدنی یا تو بہت کم تھی یا نہ ہونے کے برابر تھی۔

نوٹس

متن پر مبنی سوالات 32.3

خالی جگہوں کو بھریے:

1۔ اعلیٰ سطح کے تمام عہدے انگریزوں کے لیے وقف تھے اور ہندوستانیوں کو ــــــــــ رکھا جاتا تھا۔

2۔ کیونکہ سول سروس بالآخر برطانوی ــــــــــ کے ذریعہ کنٹرول کی جاتی تھی اس لیے انتظامیہ ــــــــــ تھی۔

3۔ برطانوی فوج، مغل فوج کے مقابل ــــــــــ لیکن ان کو بہتر تربیت اور ــــــــــ حاصل تھا۔

4۔ ــــــــــ نے براہ راست ذمہ داری لے لی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو ــــــــــ کر دیا گیا۔

ہندوستان میں برطانوی ریاست نے خود اپنے تصورات وخیالات کو پروان چڑھایا۔ (انگریز نچلے طبقات (مقامی طبقات) کے ساتھ نہ تو ملتے جلتے تھے اور نہ ہی ان کے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ انھوں نے اپنی ریاست کو صرف فتوحات اور گٹھ جوڑ کے ذریعہ ہی نہیں بنائے رکھا بلکہ اس کے لیے انھوں نے نئے طور طریقوں اور حکمت عملیوں کا استعمال کیا جس نے علامتی طور پر ''صاحب'' اور ''دیسی'' کے درمیان فرق بنا دیا۔ ملی جلی نسلی کا چھوٹا سا طبقہ یعنی اینگلو انڈین بالکل الگ تھلگ طبقہ تھا اور یہ ہندوستانی یا برطانوی مقامی سماج سے بیگانہ تھا۔ انگریز اپنے کلب اور بنگلے الگ تھلگ خصوصی علاقوں میں بناتے تھے، جنھیں کنٹونمنٹ یا سول لائنز کہا جاتا تھا۔ انھوں نے مغلوں کی روایتی حکومتی شان وشوکت کو برقرار رکھا۔ ان کی رہائش گاہیں بڑی اور پر تکلف ہوتی تھیں اور ان میں بڑی تعداد میں نوکر چاکر بھی ہوتے تھے۔ معزز ہندوستانی اپنی کلاسیکی تعلیم سے لیس قانون اور نظم ونسق کو قائم رکھنے میں مگن تھے اور اس طرح سے وہ برطانوی راج کو ''وحشی اور سفاک'' ہندوستانیوں کو دور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو عوامی نہیں لیکن اچھی حکومت کا فراہم کردہ سمجھتے ہوئے اپنا خود ایک خوش فہمانہ تکبر قائم کر لیا تھا۔ ان کے لیے لفظ ''برطانوی'' اپنی جغرافیائی حدود کھو بیٹھا تھا اور ایک ایسی عرفیت بن کر رہ گیا تھا جو ہندوستان کی نو آبادی پر حکومت کرنے کی ''اخلاقی معقولیت'' کی نشاندہی کرتا تھا۔

نوٹس

آپ نے کیا سیکھا

مغلیہ سلطنت اٹھارویں صدی کے نصف اول میں زوال پذیر ہوگئی۔ برطانیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ ہندوستان میں پورے ملک میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوششیں کرنے لگا۔نوآبادیاتی ریاست کا مطلب تھا ہندوستان کے اقتدارِاعلیٰ پر قبضہ اوراس پر نوآبادیاتی تصورات کے ساتھ حکومت کرنا، ایک جدید ریاست میں نوآبادیاتی حکومت کی طاقت کی اجارہ داری'' ایک مرکزی انتظامیہ اور واضح طور پر متعینہ علاقائی سرحدیں تھیں۔

19ویں صدی کے دوران برطانوی راج یا سامراجی تصور ابھرا اور برطانیہ اس وقت دنیا کا سب سے زیادہ امیر اور ترقی پسند ملک تھا اور یہ اس کا پوری دنیا کے تئیں فرض تھا کہ وہ ان کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے میں مدد کرتا، لیکن سامراجی حکومت کی اصل ذمہ داریاں آمدنیوں کی وصولی اور قانونی حکومت کو چلانے تک ہی محدود رہیں۔

جبر واستبداد کے ذریعہ محکومی حاصل کرنے کے بعد ریاست کے طریقے اور قوانین تمام محکوموں پر اجاگر کیے گئے۔نوآبادیاتی کنٹرول کے ابتدائی مرحلہ میں مقامی شہری انتظامیہ کو برقرار رکھا گیا۔

1785ء میں کارنوالس نے کمپنی کے ملازمین کے لیے پیشہ ورانہ ضابطوں کو رائج کیا۔تمام اعلیٰ عہدے انگریزوں کے لیے وقف کردیے گئے اور ہندوستانیوں کو ان عہدوں سے الگ رکھا۔ کمپنی کی فوج مقامی کرائے کے سپاہیوں پر مشتمل تھی جس کی نفری طاقت 30,000—20,000 تک تھی اور اس کے افسران انگریز تھے۔

1920ء کی دہائی تک انتظامیہ کے سبھی اعلیٰ عہدیدار انگریز تھے، جبکہ ہندوستانی سول سروس ہندوستان کے سماجی طور طریقوں کو تبدیل کرنے کی زبردست خواہش رکھتا تھا اور انھیں مغربی رنگ میں رنگنا چاہتا تھا۔ انھوں نے معصوم بچوں کی قربانی اور ستی کی رسموں کو ختم کردیا اور بیواؤں کی شادی کی قانونی اجازت دی اور ہندوؤں کو عیسائی مذہب قبول کرنے کی آزادی دی۔ اس کے علاوہ 1857ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں تین یونیورسیٹیاں قائم کی گئیں۔

برطانوی اپنے کلب اور رہائش گاہیں الگ تھلگ علاقوں میں بناتے تھے جنھیں کینٹونمنٹ یا سول لائنز کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ تاہم انھوں نے دیہی سماج میں کوئی بڑی تبدیلیاں نہیں کیں۔ اس کے علاوہ ذات پات کے نظام اچھوتوں کے مقام، ملے جلے خاندان کے نظام یا زراعت کی پیداواری تکنیکوں میں انھوں نے کوئی خاص سُدھار نہیں کیا۔

نوٹس

اختتامی سوالات

1۔ نوآبادیاتی ریاست کا مفہوم اور اس کی نوعیت بیان کیجیے؟

2۔ نوآبادیت کا تصور اور فلسفہ کیا ہے؟

3۔ نوآبادیت کے ڈھانچے کے بارے میں بتایئے؟

4۔ نوآبادیاتی ریاست کے تحت ہوئی تبدیلیوں کا حوالہ دیجیے؟

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

32.1

1۔ 18ویں صدی

2۔ 1813

3۔ صنعتی

4۔ تیار مصنوعات

32.2

1۔ 1835ء

2۔ 19ویں صدی

3۔ 1819ء

4۔ 1785ء

32.3

1۔ الگ کر دیا

2۔ پارلیمنٹ، ایماندار

3۔ چھوٹی تھی، ساز و سامان

4۔ کرا دن، ختم

نوٹس

اختتامی سوالات سے متعلق اشارے

1۔ دیکھیے پیراگراف 32.1

2۔ دیکھیے پیراگراف 32.4

3۔ دیکھیے پیراگراف 32.5

4۔ دیکھیے پیراگراف 32.6

ماڈیول 6B

ہندوستان میں ثقافت

سبق 29 — عصری ثقافتی حالات

سبق 30 — ثقافتی مصنوعات

سبق 31 — ثقافتی ترسیل (کمیونیکشن)

نوٹس

29

عصری ثقافتی حالات

فرض کیجیے کہ ایک صبح آپ سو کر اٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک اجنبی سرزمین میں پاتے ہیں، جہاں لوگ ایک ایسی زبان بولتے ہیں کہ جو آپ کے لیے ناقابل فہم ہے۔ ان کے پہناوے، ان کی غذا آپ کے لیے بالکل ناآشنا ہے۔ آپ کے لیے ایسی جگہ زندگی گذارنا غالباً اس وقت ناممکن ہوگا جب تک کہ آپ ان کے رہن سہن، ان کے طرز زندگی کو سمجھ نہ لیں۔ زندگی کی گذر بسر کے یہی طریقے دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ مل کر ہماری ثقافت کی تشکیل کرتے ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم سب ہی کا تعلق کسی نہ کسی تہذیب سے ہے جو ہمارے خطہ، مذہب اور ذات وطبقہ کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہے۔ ہم جیسے جیسے بڑے ہوتے ہیں، بہت سے دوسرے ثقافتی طورطریقوں کو تقریباً فطری طور پر اپناتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بہت طور طریقے نسل درنسل چلے آرہے ہیں۔ ان میں کچھ روایات، رسم و رواج صدیوں پرانے ہیں اور کچھ تو لاکھوں برسوں سے انسانی زندگی کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ ثقافتی اور تہذیبی اقدار اور رسم و رواج میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس سبق میں ہم تہذیب وثقافت کے ساتھ اپنے تعلق کا مطالعہ کریں گے۔

مقاصد

اس سبق کے مطالعہ کے بعد آپ درج ذیل باتوں سے واقف ہوسکیں گے:

- ثقافت کی وضاحت کرسکیں گے۔
- ثقافت کی تشکیل کے طریقوں کی وضاحت کرسکیں گے۔
- ثقافتی عمل باہم کو واضح کرسکیں گے اور
- عالمگیریت کے مظاہر کا تنقیدی جائزہ لے سکیں گے۔

نوٹس

29.1 ثقافت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

ثقافتی اظہار کی شکلیں

جب ہم ریڈیو، ٹیلی ویژن یا اسٹیج پر کسی کلچرل پروگرام کو دیکھتے یا سنتے ہیں یہ عام طور پر گیتوں، موسیقی اور رقص پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ثقافتی تاثر، اظہار کی ایک شکل ہے۔ ان میں سے ہر شکل کسی نہ کسی پیغام کی ترسیل کرتی ہے۔ مثال کے طور پر دھیان (مراقبہ) کی شکل میں گوتم بدھ کے مجسمہ کا مقصد امن وسکون کے احساسات کو بڑھاوا دینا ہے (شکل 29.1) ایک لوک گیت/کہانی سبق آموز بھی ہوسکتی ہے اور تفریح کا سامان بھی فراہم کرسکتی ہے جب کہ ایک پرشکوہ تاریخی عمارت، مثال کے طور پر قطب مینار (شکل 29.2) ہمیں مرعوب کرسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ثقافت کو انواع اقسام کے تصورات کی ترسیل کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس کتاب کے سبق نمبر 31 میں اس طرح کی اور مثالیں دیں گے۔

شکل 29.1: (گوتم بدھ)

شکل 29.2: (قطب مینار)

ہندوستان میں ثقافتی اشکال کا ایک وسیع وسیلہ موجود ہے۔ اس میں مجسمہ سازی، فن معماری، ادب، پنٹینگ اور موسیقی کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت ساری چیزیں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر شکل اپنے اندر زبردست تنوع رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم گیتوں کے بارے میں بات کریں تو اس کی بہت ساری اقسام فوراً ہی ہمارے ذہن میں ابھرتی ہیں۔ لوک گیت، فلمی گانے، بھجن، قوالی وغیرہ۔ ان میں سے ہر قسم عام طور پر کسی مخصوص موقع پر گائی جاتی ہے اور اس کا ایک مخصوص مقصد ہوتا ہے۔ دوسری طرف شاید آپ نے غور کیا ہو کہ فلمی گانے، درحقیقت بھجنوں اور لوک گیتوں کی دھنوں پر ترتیب دیے جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں ایک فلمی بھجن، مندر میں پجاریوں کے ذریعہ گائے جانے والے بھجنوں سے کس طرح مختلف ہوتا ہے۔

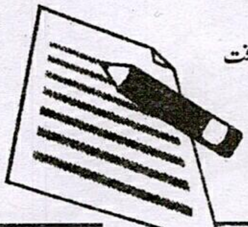

نوٹس

29.2 عوامی یا لوک ثقافت

عام آدمی رنگا رنگ ثقافتی روایات کو فروغ دیتا ہے، جنھیں اکثر عوامی، درحقیقت عوام سے وابستہ کہاجاتا ہے۔ عوام گیت، رقص اور داستان کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے اور ثقافتی اقدار کو دوسرں تک پہنچاتے ہیں۔

اپنے محدود وسائل کی وجہ سے عام آدمی یادگاریں تو تعمیر نہیں کرسکتا لیکن وہ لا تعداد چھوٹی اشیا کی تخلیق کرتا ہے اور انھیں استعمال کرتا ہے جو انتہائی خوبصورت ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ اشیاء روزمرہ کی سرگرمیوں میں استعمال کی جاتی ہیں کہ جب کہ دوسری اشیاء مخصوص موقعوں کے لیے محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ بدقسمتی سے ان اشیاء میں استعمال کیا جانے والا زیادہ تر مواد مثلاً چھڑیاں، کپڑا، لکڑی، پتیاں اور مٹی کے برتن جلد خراب ہوجانے والے یا ٹوٹ جانے والے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ اشیاء دیرپا نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم قدیم دور کے عام آدمی کی ثقافتوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں کرپاتے (شکل 29.3)

شکل 29.3: کیلاش ناتھ مندر

29.3 کلاسیکی ثقافت

رقص کی بہت سی شکلوں مثال کے طور پر بھارت ناٹیم کو اکثر کلاسیکی زمرے میں شامل کیاجاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ فنکارانہ اظہار کی بہترین شکلوں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح سے کالیداس کو کلاسیکی سنسکرت شاعر کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اسی طرح چولا شاہی خاندان کے ذریعہ تعمیر کیے گئے

نوٹس

مندروں کو کلاسیکی مندر فن تعمیر کی مثال مانا جاتا ہے۔ اور تاج محل مغل فن تعمیر کا نمونہ ہے (شکل 29.4)

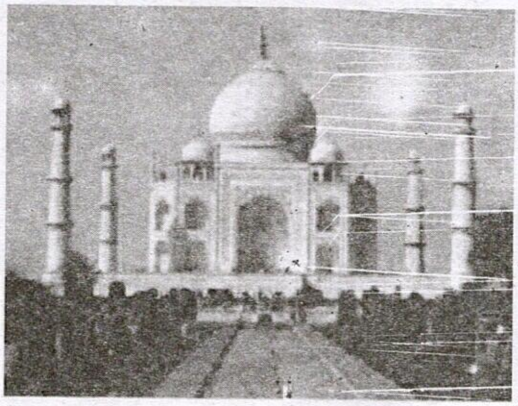

شکل 29.4: تاج محل

ہم ان شاندار کارناموں پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں تاہم ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت جب کہ کالیداس نے اپنی نظمیں لکھی تھیں (چوتھی صدی عیسوی) شمالی اور وسطی ہندوستان میں زیادہ تر لوگ ''پراکرت'' (جس سے کئی جدید ہندوستانی زبانیں وجود میں آئیں) کی مختلف شکلیں بولتے تھے۔ انھوں نے کالیداس کے ڈرامون کے پراکرت حصوں کو تو سمجھ لیا لیکن وہ اس کی سنسکرت نظموں کو سمجھ نہیں پائے۔ اسی طرح عام آدمی اوپر متذکرہ شاندار مندروں میں داخل نہیں ہو پاتے۔ ان میں داخلہ ذات یا مذہب کی بنیاد پر محدود کر دیا گیا ہے۔

اسی طرح سے کلاسیکی ثقافت کا بھی فروغ ہوتا رہا لیکن محدود طریقے سے ایسا غالباً صرف گزشتہ دو صدیوں میں ہی ہو پایا ہے کہ سنسکرت کی کئی تخلیقات کا ترجمہ علاقائی، زبانوں میں ہوا ہے اور مندروں اور دوسری تاریخی یادگاروں کو سبھی عوام کے لیے کھولا گیا ہے۔

لوک اور کلاسلیکی ثقافتیں ایک ساتھ نشوونما پاتی ہیں اور ان کا عمل باہم صدیوں تک جاری رہتا ہے۔ یہ تصورات کو ایک دوسرے سے مستعار لیتی اور انھیں اپناتی ہیں۔

ماہرین بشریات ثقافت کی وضاحت کس طرح کرتے ہیں؟

علم بشریات کے عملی معنی ہیں نوع انسان ثقافت کا مطالعہ اور سماجی علم بشریات کے تحت موجودہ دور کے سماجوں کا، جن میں رسم و رواج، ایقانات، سماجی روایات اور تخلیقات کے نمونے وغیرہ شامل ہیں، مطالعہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب ماہرین بشریات ثقافت کے بارے میں لکھتے ہیں تو اس میں ان تمام پہلوؤں یا ان میں سے کچھ پہلوؤں کو شامل کرتے ہیں۔

نوٹس

آثار قدیمہ کے ماہرین اور ثقافت

جو لوگ ہماری جیسی خوراک استعمال کرتے ہیں اور ہمارے جیسے لباس پہنتے ہیں، اور ہم میں کچھ چیزیں مشترک ہیں تو ہم ان کے ساتھ یگانگت محسوس کرتے ہیں، جبکہ اُن لوگوں کے ساتھ ہمارا رویہ مختلف اور بیگانہ ہوتا ہے جن کی غذا اور لباس ہم سے الگ تھلگ ہوتے ہیں اور ان کا تعلق دوسری ثقافت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ثقافت کی یہ وضاحت بالکل ویسی ہے جیسی کہ آثار قدیمہ کے ماہرین نے کی ہے۔ ماہرین اثریات گھروں، اوزاروں، برتنوں، مجسموں وغیرہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ماضی کا انسان کس طرح کی اشیاء کا استعمال کرتے تھے اور اُن میں جو مستقل طور پر استعمال ہوتی تھیں انھیں ان کی ماڈی ثقافت کا حصّہ مان لیا جاتا ہے۔ آپ اگلے سبق (سبق 30) میں ہماری مادی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اور زیادہ وضاحت سے جان سکیں گے۔

> کپڑا اور غذائیں بھی ہماری مادی ثقافت کا حصہ ہیں لیکن یہ جلد خراب ہوجانے والے ہوتے ہیں۔ ماہرین اثریات نے اکثر غذاؤں اور کپڑوں کے نقوش دریافت کیے ہیں لیکن یہ دوسری چیزوں مثلاً برتنوں، اوزاروں اور ہتھیاروں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔
>
> یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ثقافت کی وضاحت کئی طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔
>
> a۔ ثقافتی تاثرات کی شکلوں مثلاً رقص، گیت، موسیقی، پینٹنگ، مجسمہ سازی، فن معماری وغیرہ کے طور پر۔
>
> b۔ سماجی گروپوں کے تناظر میں جو کسی ایک ثقافتی رنگ روپ کی تخلیق کرتے اور انھیں رواج دیتے ہیں یعنی عوامی/لوک، کلاسیکی۔
>
> c۔ سماجی، مذہبی اور مادی زندگی کے پہلوؤں کے تناظر میں وسیع تر وضاحتیں۔

کیا آپ نے دھیان دیا کہ یہ وضاحتیں ایک دوسرے سے کتنی مربوط ہیں؟ اس گھر کی تصویر کو غور سے دیکھئے (شکل 29.5) اگر ہم اس کو اس کی بناوٹ کے لحاظ سے دیکھتے ہیں تو ہم اس کو فن تعمیر کی ایک مثال کے زمرے میں رکھیں گے (جو کہ مجسمہ سازی یا موسیقی سے بالکلا مختلف ہے) لیکن دوسری طرف یہ لوک یا عوامی ثقافت کی بھی ایک مثال ہے اس لیے کہ یہ ان لوگوں کی مادی ثقافت کا ایک حصہ ہے جنھوں نے اس کو تعمیر کیا ہے اور اس میں رہتے ہیں۔

شکل:29.5: ایک گھر

اس کی ایک دوسری مثال ہے: اجنتا کی پینٹنگز جن کو کلاسیکی مذہبی پینٹنگ کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے اگلے سبق میں آپ سیکھیں گے کہ ثقافت کی مختلف شکلیں کس طرح وجود میں آتی ہیں۔

نوٹس

متن پر مبنی سوالات 29.1

I۔ درج ذیل کا موازنہ کیجیے:

a۔	رقص	سنسکرت شاعری
b۔	تاج محل	ثقافتی اظہار کی شکل
c۔	کالی داس	مغل فن معماری
d۔	ماہرین بشریات	مادی ثقافت
e۔	ماہرین اثریات	سماجی روایات

II۔ بتائیے کہ صحیح (✓) ہے یا غلط (✗)

1۔ فلمی گانوں میں کبھی بھی لوک گیتوں کی دھنوں کو نہیں اپنایا جاتا۔

2۔ داستان گوئی، لوک دھنوں کا ایک حصہ ہے۔

3۔ رسم ورواج ہماری ثقافت کا حصہ نہیں ہیں۔

4۔ گھر، کپڑے اور غذائیں ہماری مادی ثقافت کا حصہ ہیں۔

5۔ لوک اور کلاسیکی ثقافتیں ایک دوسرے پر اثر نہیں ڈالتیں۔

29.4 ثقافت کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے

ہماری ثقافت کی بعض انتہائی شاندار اشکال مذہب کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ سانچی مندر (مدھیہ پردیش)

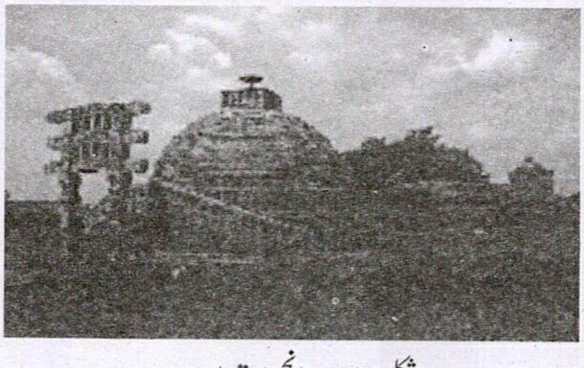

شکل 29.6: سانچی استوپا

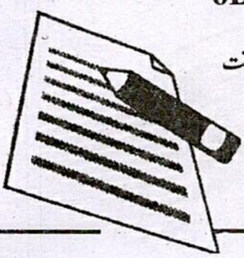

نوٹس

جنوبی ہند کے متذکرہ مندر، دلوارہ مندر (راجستھان) کے ساتھ ساتھ جامع مسجد (دہلی) مذہبی مقاصد کی غرض سے تعمیر کردہ بعض شاندار اور غیر معمولی مثالیں ہیں۔

گذشتہ صدیوں کے دوران مذہب نے ہماری بہترین، شاعری اور موسیقی کو بھی تحریک دی ہے۔ ان میں ویدک بھجن، بودھ راہبوں اور دھویوں کے ذریعہ ترتیب کردہ دھنیں اور شاید سب سے زیادہ مقبول ومشہور بھگتی گیت اور صوفیانہ کلام شامل ہیں۔

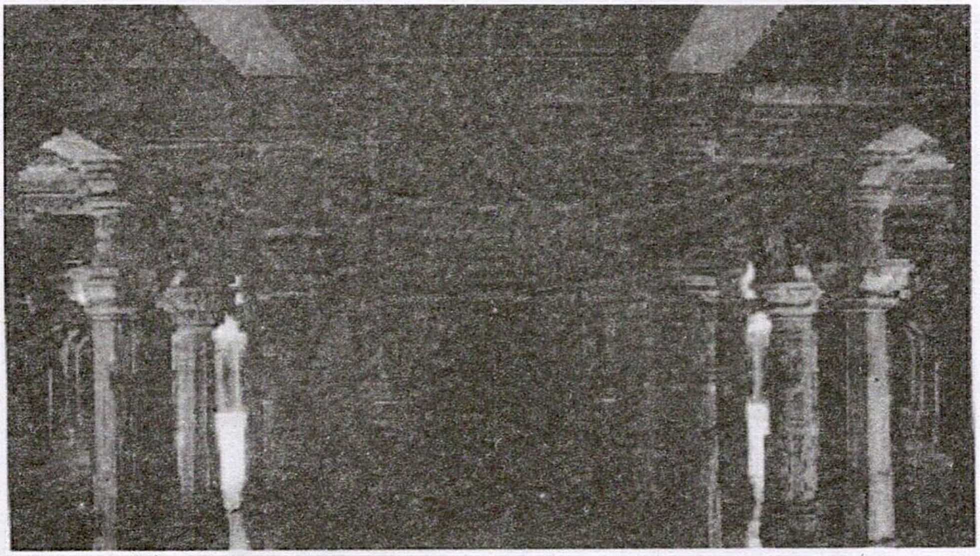

شکل 29.7: دلوارہ مندر (راجستھان)

تامل ناڈو میں ویشنو اور شیو بھگتی ادب کی ثروت مند اور مسلسل روایت رہی ہے جس میں اندال جیسی خاتون کی ترتیب کردہ شاعری شامل ہیں۔ ایک اور اوائلی اور مشہور کشمیری شاعرہ للہ دید، چوتھی صدی عیسوی کی ایک خاتون صوفی تھیں۔

قرون وسطیٰ کے صوفی سنت شاعروں میں میرا دیوی، گرونانک اور کبیر آج نہ صرف اپنے علاقوں میں بلکہ پورے ہندوستان میں مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ زیادہ تر صوفی سنتوں کا تعلق نچلے طبقوں سے تھا اور انھوں نے اپنی شاعری میں عام آدمیوں کی زبان کا استعمال کیا۔ ان کی شاعری، جو ہماری عوامی ثقافت کا حصہ ہے، صدیوں تک زبانی طور پر ایک سے دوسرے تک پہنچتی رہی ہے۔

ہمارے مذہبی اعتقادات ہماری روزمرہ کی زندگی کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ شادی کی رسومات، ہماری غذائیں اور کپڑے سبھی مذہبی اصولوں کا خیال رکھا جاتا ہے، لیکن اکثر وبیشتر ہمارے کھانوں، ملبوسات اور شادی کی رسومات پر مذہب سے زیادہ ان خطوں یا علاقوں کا اثر ہوتا ہے جہاں ہماری سکونت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پنجاب میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی عورتیں عام طور پر شلوار قمیص پہنتی ہیں جب کہ تامل ناڈو میں ہندو، مسلم اور عیسائی عورتیں عام طور پر ساڑی پہنتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے مذہبی

نوٹس

ایقانات، ہمارے ثقافتی کاموں پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی درست ہے کہ ہماری ثقافت کی تشکیل میں یہی ایک واحد عنصر نہیں ہوتا۔

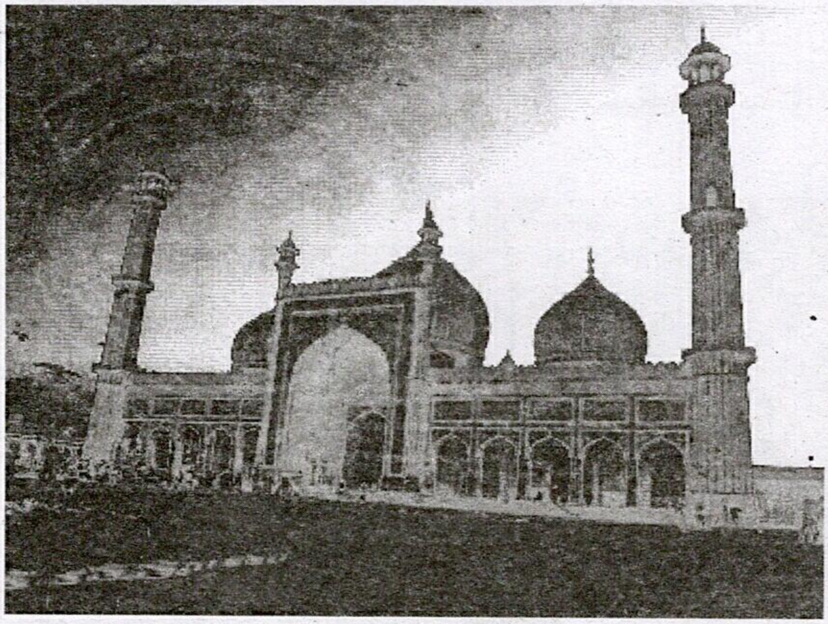

شکل:29.8: جامع مسجد

29.5 ہماری سماجی اور معاشی صورت حال

ہماری زیادہ تر ثقافتی سرگرمیاں ہمارے سماجی اور معاشی حالات سے متاثر رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہماری سماجی حالت اس بات سے متاثر ہوسکتی ہے کہ ہم کیا پہنتے ہیں۔ آپ نے غالباً اس پر دھیان دیا ہوگا کہ بہت سی عورتوں کے پہناوے کا دار و مدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہیں یا بیوہ ہیں۔

بعض اوقات ہماری ثقافتی سرگرمیاں ہمارے سماجی اور معاشی دونوں حالات سے متاثر ہوسکتی ہیں۔ اس میں ہماری پسند و ناپسند اور موسیقی میں ہماری ترجیحات جیسی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ یعنی کیا ہم لوک گیت، فلمی گانے، کلاسیکی موسیقی کو پسند کرتے ہیں یا ہمیں مغربی پوپ موسیقی پسند ہے۔ ہم ریڈیو ہندی فلم گیتوں کو آسانی سے سیکھ سکتے ہیں جب کہ کلاسیکی موسیقی کو سیکھنا زیادہ دشوار ہوتا ہے اور یہ مہنگا بھی ہوتا ہے۔ یہ زیادہ وقت طلب بھی ہوتا ہے اور ہم میں سے زیادہ تر کے لیے کلاسیکی موسیقی کو سیکھنے کے لیے وقت نکالنا بھی مشکل ہوسکتا ہے۔

ہم جن ثقافتی مصنوعات کو بناتے اور استعمال کرتے ہیں وہ ہمارے معاشی حالات کی وجہ سے اکثر محدود ہوتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں بھی تو تاج محل نہیں بناسکتے۔ یہ صرف شاہجہاں کے لیے ہی ممکن تھا۔ جو ایک بڑی اور خوشحال سلطنت کا حکمراں تھا۔

نوٹس

شاہجہاں نے اپنی بیگم ممتاز محل کی یاد میں تاج محل کی تعمیر 1632ء میں شروع کی اس یادگار کی تعمیر کی تکمیل میں 22 برس لگے اور اس کی تعمیر کے آغازی دور میں تقریباً 20 ہزار مزدوروں نے روزانہ کام کیا۔ اس کی تعمیر میں اس دور میں 4 کروڑ روپے خرچ ہوئے جو اس دور کے لحاظ سے ایک خطیر رقم تھی۔

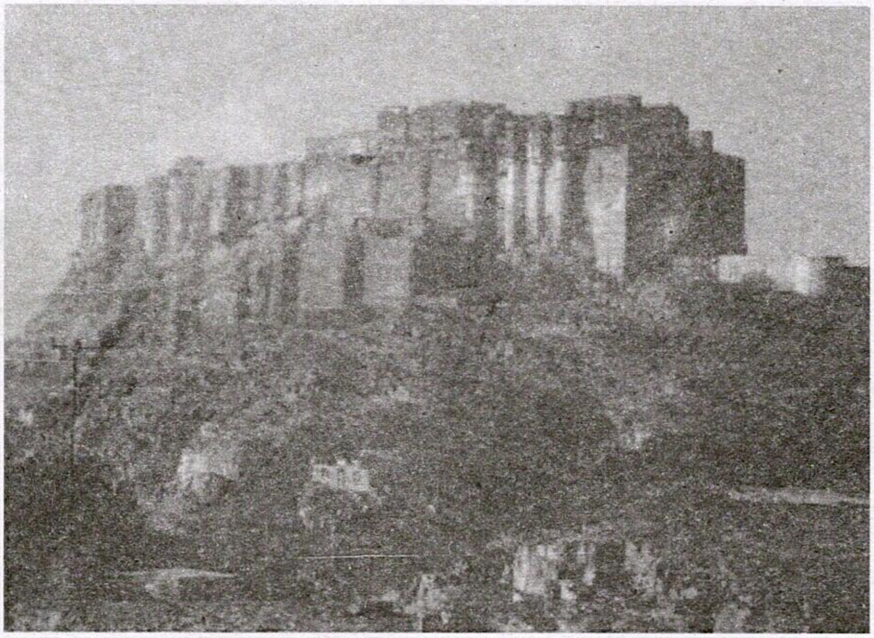

شکل 29.9: جودھپور کا قلعہ

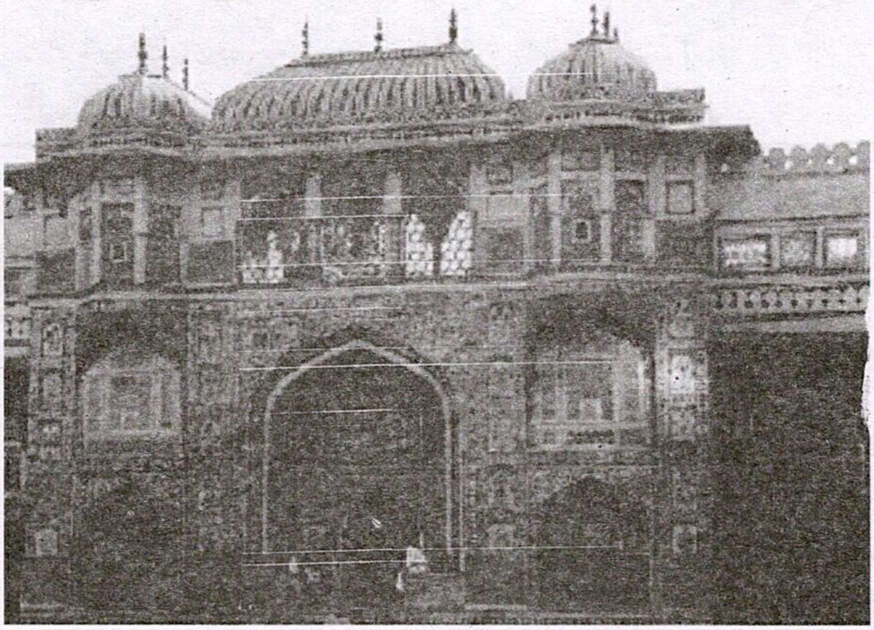

شکل 29.10: جے پور کا قلعہ

درحقیقت زیادہ تر عالیشان قلعے، محلات اور مذہبی یادگاریں (تصاویر: جودھپور، جے پور) حکمرانوں کے ذریعہ تعمیر کیے گئے۔ شاہی رہائش گاہوں یا عبادت کی جگہ کے علاوہ ان کا مقصد اقتدار کے دعوے کو جتانا اور اپنی شان وشوکت کو ظاہر کرنا تھا جنھوں نے ان کو تعمیر کیا۔ تاہم مادی وسائل گو کہ اہم ہوتے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ہی فیصلہ کن نہیں ہوتے۔ میرا بائی نے بے خانماں زندگی کو اپنانے اور اپنے روحانی مقاصد کی تکمیل کی آزادی کے حصول کے لیے چتوڑ کے محلوں کی دولت اور پر تعیش زندگی کو ٹھکرا دیا۔ آج ہم اس کے شوہر کو نہیں بلکہ اس کے گیتوں اور بھجنوں کو یاد رکھتے ہیں۔

متن پر مبنی سوالات 29.2

I- خالی جگہوں کو بھریئے:

1- سانچی ——— مذہبی فن تعمیر کی ایک مثال ہے

2- ویدک منتر ——— موسیقی کی ایک شکل ہے۔

3- ——— تامل ناڈو کی ایک مشہور خاتون سنت تھیں۔

4- ——— ایک مشہور کشمیر شاعرہ تھیں۔

5- بھکتی اور صوفی سنت اپنی نظمیں ——— زبان میں کہتے تھے۔

6- یہ نظمیں ——— کے ذریعہ صدیوں تک ایک سے دوسرے تک منتقل ہوتی رہیں۔

7- ہم جو لباس پہنتے ہیں وہ ——— کے لحاظ سے تبدیل ہوتے ہیں۔

8- قلعے اور محلات ——— کے ذریعہ تعمیر کیے گئے۔

29.6 ثقافتی عمل باہم

ہماری ثقافت اکثر باہمی عمل کے ذریعہ پیش رفت کرتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب مختلف ثقافتی روایات سے تعلق رکھنے والے افراد ایک دوسرے کے رابطہ میں آتے ہیں۔ یہ تعلق نمائشوں کے ذریعہ یا تاجروں اور بیوپاریوں کے سفر کے ذریعہ واقع ہوتا ہے یا پھر یہ تعلق اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب کوئی حملہ آور کسی ملک پر حملہ کرتا ہے۔ اس تعلق کے واقع ہونے کا ایک دوسرا سبب سیاحوں اور زائرین کے ذریعہ دور دراز کے ملکوں کا سفر یا دست کاروں اور مزدور عورتوں اور مردوں کا روزگار کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا ہوتا ہے۔

اس طرح کے عمل باہم میں شامل لوگ دوسری قوموں کی عادتوں اور طور طریقوں کو سیکھتے ہیں اور اپنے خود کے تصورات اور رسم ورواج کو دوسری سرزمینوں تک لے جاتے ہیں۔ اس عمل میں ان لوگوں کی ثقافتی عادتوں اور طور طریقے میں تبدیلیاں آنا ناگزیر ہوتا ہے جو اس طرح کے عمل باہم کا حصہ ہوتے ہیں۔

آیئے ہم غذاؤں کی مثال لیتے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ آلو اور ٹماٹر جیسی سبزیاں ہندوستان میں تقریباً پانچ سو برس قبل پرتگالی سیاحوں اور فوجیوں کے ذریعہ متعارف کرائی گئی تھیں جو ان سبزیوں کو وسطیٰ امریکہ سے لے کر آئے تھے یا یہ کہ ہندوستان میں چائے، چین سے آئی تھی؟ اور دوسرے غذائی اجناس مثلاً چاول اور دال، رائی اور تل جیسے تلہنوں کی کھیتی ہندوستان میں پانچ ہزار سے زیادہ برسوں سے کی جاتی ہے۔

اگر ہم غور کریں کہ آج ہم کیا کھاتے ہیں تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ روایتی طور پر فراہم کھانوں کے ساتھ ساتھ جدید کھانوں کا مرکب ہے۔ دوسری طرف دنیا کے مختلف حصوں مثلاً امریکہ اور برطانیہ میں لوگ ہندوستانی پکوانوں، مثال کے طور پر مسالے دار کھانوں اور کبابوں کا ذائقہ پسند کرنے لگے ہیں۔ اگلے سبق میں ہم ثقافتی عمل باہم کی اور زیادہ مثالوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کریں گے۔

متن پر مبنی سوالات 29.3

بتایئے کہ غلط (×) ہے یا صحیح (✓)

1۔ ثقافتی عمل باہم اس وقت واقع ہوتا ہے جب سیاح نئے ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔
2۔ حملے ثقافتی عمل باہم میں کوئی حصہ ادا نہیں کرتے۔
3۔ چائے کی کاشت وسطیٰ امریکہ میں ہوتی تھی۔
4۔ رائی اور تل ہندوستان میں پرتگالیوں کے ذریعہ لائے گئے۔
5۔ مسالے دار کھانے برطانیہ میں پسند کیے جاتے ہیں۔

29.7 عالمگیریت

اس عمل کو جس کے تحت پوری دنیا ایک معاشی اور ثقافتی نیٹ ورک کے تحت آتی جا رہی ہے، اکثر عالمگیریت (Globalisation) کے طور پر جانا جاتا ہے۔ یہ گلوب (Globe) سے اخذ کیا گیا ہے۔

نوٹس

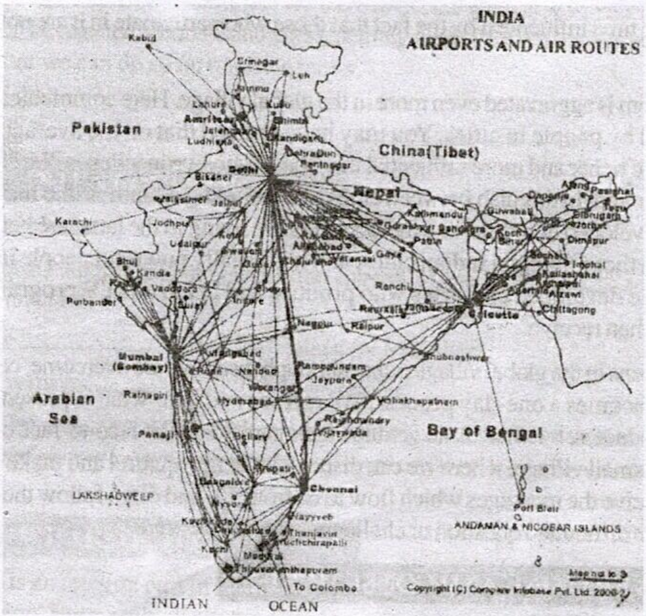

شکل 29.11: ایرلائن نیٹ ورک

29.8 عالمگیر دیہات (Global village) کیا ہے؟

آپ نے عالمگیر دیہات کی اصطلاح کے بارے میں سنا ہوگا۔ پہلی نظر میں یہ اصطلاح متضاد نظر آتی ہے۔ ایک ایسی چیز جو عالمگیر یا عالمی ہو ایک ہی وقت ایک دیہات کیسے ہو سکتی ہے۔؟

عالمگیر دیہات کی اصطلاح سب سے پہلے میک۔ لوہان نامی اسکالر نے استعمال کی تھی۔ اس نے یہ محسوس کیا کہ ٹیلی ویژن کے بڑھتے ہوئے استعمال کی وجہ سے کمیونیکشن (مواصلات) خودکار طور پر تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنے پیغامات کو فوری طور پر ہزاروں میل دور بھیج سکیں گے۔ اس کے نتیجہ میں طبعی فاصلے کمیونیکشن (مواصلات) کو روکنے یا انھیں سست بنانے میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوں گے۔

گذشتہ کچھ دہائیوں میں، اور خاص طور سے پچھلے دس برسوں میں سیٹلائٹوں اور دوسرے تکنیکی آلات کے ذریعہ وسیع ٹیلی ویژن نیٹ ورک ہمیں یہ ماننے پر مجبور کر سکتی ہے کہ میک۔ لوہان کی پیشین گوئی درست تھی۔ ہندوستان میں بیٹھے بیٹھے ہم جنوبی افریقہ میں نیلسن منڈیلا کو یا شارجہ میں کرکٹ میچ کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن پھر ہمارے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا قوموں کے درمیان فرق کی واحد وجہ طبعی دوری تھی؟

ایک دیہات میں رہنے والے زیادہ تر افراد کسان ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان واضح فرق مالدار زمیندار، چھوٹے کسان دستکار، بٹائی کاشت کار اور زمین سے محروم زرعی مزدور کا ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ

نوٹس

میں لوگ طبعی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہوسکتے ہیں لیکن ان میں سماجی اور معاشی لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ زمیندار چونکہ زیادہ مالدار ہوتے ہیں اس لیے وہ دیہات کے سماجی، معاشی اور ثقافتی عمل باہم پر حاوی ہوتے ہیں۔ چنانچہ کمیونیکشن (رابطہ) گوکہ راست اور آمنے سامنے کا ہوسکتا ہے لیکن دوسری طرف وہ اس حقیقت سے متاثر بھی ہوتا ہے کہ اس میں شرکت کرنے والے اپنی حیثیت کے مطابق مساوی نہیں ہوتے۔

عالمگیر دیہات میں یہ دشواری اور زیادہ شدت اختیار کرلیتی ہے۔ یہاں کمیونیکشن یا رابطہ پر شہر میں رہنے والے افراد کی مسابقت ہوتی ہے۔ آپ نے شاید اس بات پر غور کیا ہوگا کہ شہر میں بسنے والے افراد گاؤں میں بسنے والے افراد سے زیادہ مالدار اور با اثر ہوتے ہیں۔ ہم ایک قدم اور آگے جاکر ترقی پذیر مما لک مثلاً ہندوستان اور ترقی یافتہ مما لک مثلاً امریکہ کے شہروں کے درمیان فرق کی بات کرتے ہیں۔ امریکی شہروں میں بسنے والے افراد، ہندوستان شہروں کے ساکنان سے زیادہ مالدار ہوتے ہیں اور یہی وہ بااختیار لوگ ہیں جو عام طور پر ان ٹیلی ویژن پروگراموں کو بناتے اور نشر کرتے ہیں جنھیں ہم اور آپ دیکھتے ہیں۔

عالمگیر دیہات میں گوکہ فاصلوں پر قابو پالیا گیا ہے۔ رابطہ یومیہ عمل بن چکا ہے۔ ہم اس چیز کو دیکھ اور سن سکتے ہیں جو ٹیلی ویژن پروڈیوسروں کے ذریعہ پیش کی جاتی ہے لیکن حقیقی بات چیت، رابطہ کا وجود اب بھی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں آمنے سامنے کے رابطہ کے برعکس جہاں ہم بات چیت کرسکتے ہیں، ایک دوسرے کو ٹوک سکتے ہیں، ایک دوسرے سے لڑائی اور اختلاف رائے کرسکتے ہیں اور پھر ایک دوسرے سے سمجھوتہ کرسکتے ہیں، ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہمیں صرف پیغامات اور رائیں ملتی ہیں اور ہم اکثر ان کو اپناتے بھی ہیں۔ ہم کو جو کچھ بتایا جاتا ہے اس پر سوال اٹھانا اور اس کو چنوتی دینا از خود دشوار اور مشکل ہے۔

29.9 اشتہارات اور اصراف

ذرا ان پروگراموں پر غور کیجیے جو ہم ریڈیو پر سنتے یا ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہیں، جو ہمیں فلموں یا بات چیت کے پروگراموں میں نظر آتے ہیں۔ سائنس، موسیقی، تاریخ، کھیل کود کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ موجود ہے۔ ان پروگراموں کے دوران ہمیں سینکڑوں اشتہارات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ہم جن پروگراموں کو دیکھتے ہیں ان کی تیاری پر یہ مشتہرین (ایڈورٹائز) اور ان کو پیش کرنے والے (اسپونسر) اپنا سرمایہ لگاتے ہیں۔ وہ احتیاط کے ساتھ ان پروگراموں کا انتخاب کرتے ہیں جو زیادہ مقبول ہوں تاکہ وہ ناظرین کی وسیع تعداد تک اپنی مصنوعات کے بارے میں جانکاریوں کو پہنچاسکیں۔

نوٹس

اس طرح وہ اپنی مصنوعات کو لاکھوں لوگوں میں مشتہر کر سکتے ہیں۔

مشتہرین (ایڈورٹائز) یہ امید کرتے ہیں ہم ٹیلی ویژن پر اپنے پسندیدہ پروگراموں کو دیکھتے ہوئے ان کی مصنوعات پر توجہ دیں گے اور ان کو استعمال کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں انھیں ایک موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی مصنوعات خواہ صابن ہو، کریم، کار یا گھریلو استعمال کی مصنوعات ہوں، خریدنے پر ہمیں راغب کر سکیں۔ اپنی فوری اور بنیادی ضروریات سے ہٹ کر یا اپنے وسائل سے پرے کبھی کبھار چیزوں کو خریدنے کا یہ رجحان اصراف کہلاتا ہے۔

چنانچہ فاصلے گوکہ ڈرامائی طور پر سمٹ گئے ہیں لیکن نئی تکنالوجی کو کثیر قومی کمپنیوں سمیت بڑے صنعت کاروں کے فائدے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ صارفین کی بڑی آبادی تخلیق کرتے ہیں جن کو شاندار اور مہنگی اشیاء کی خریداری کی اپنی طمع کو پورا کرنے کے لیے اپنی جمع پونجی کو خرچ کرنے اور کبھی کبھار اس کے لیے ادھار لینے پر بھی مائل کیے جاتے ہیں۔

ابھی تک تو عالمگیریت کی عمل پیرائی دولت مند صنعت کاروں کے مفادات کی تکمیل تک ہی محدود رہی ہے۔ عالمگیریت کو حقیقی طور پر فائدہ مند بنانے کے لیے اس کو ثقافتی تنوع کے احترام پر مبنی عمل باہم اور عالمی وسائل کے صرف چند ہاتھوں میں جماؤ کے بجائے ان کی مساوی تقسیم کے خطوط پر فروغ دینا ہوگا۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ عالمگیریت کے امکانی فوائد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہمیں ٹیلی ویژن پروگراموں کے ذریعہ غیر ملکی اشیاء کی خریداری کی جانب راغب کیا جاتا ہے تو ہمیں دوسری ثقافتوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہونی چاہیے۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس چیز کو کب اپنانا ہے اور کس چیز کو رد کیا جاسکتا ہے۔ عالمگیریت ایک ایسا عنصر ہے جو ہماری زندگی کا حصہ بنتا جارہا ہے ہمارے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہم اس کو اپنی شرائط پر اپنا سکیں۔

متن پر مبنی سوالات 29.4

خالی جگہوں کو بھریے:

1۔ عالمگیریت ———— اور ثقافتی ترسیل کے میدانوں میں تشکیل پا رہی ہے۔

2۔ ———— کی اصطلاح میک لوہن نے فراہم کی تھی۔

3۔ مشتہرین ———— اور ٹیلی ویژن پروگراموں کو تیار کرتے ہیں۔

4۔ عالمگیر ترسیل (کمیونیکشن) پر ———— ممالک غالب ہیں۔

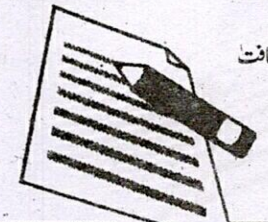

نوٹس

آپ نے کیا سیکھا

ثقافت انسان کی زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ ثقافتی اظہارات کی کئی طرح کی شکلیں ہیں۔ عام آدمیوں کے ذریعہ یا اُن کے لیے تشکیل دی جانے والی شکلیں عوامی کہلاتی ہیں۔ جب کہ اور زیادہ خصوصی شکلیں جنھیں کلاسیکی ثقافت کہا جاتا ہے، اِن میں سماجی رسوم و رواج کے ساتھ ساتھ ملبوسات اور غذائیں بھی شامل ہیں جو ہماری روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہیں۔ ہماری ثقافتی سرگرمیوں پر اکثر و بیشتر ہمارے مذہبی ایقانات اور ہمارے سماجی اور معاشی حالات کا اثر پڑتا ہے۔ یہ لوگوں کے درمیان عمل باہم کے ذریعہ بھی وجود میں آتی ہیں۔ آج کے دور میں عالمگیریت عمل باہم کی ایک مخصوص شکل کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ ایک طرح کا ''گٹھ جوڑ'' ہے جس کے نتیجہ میں اصراف کو بڑھاوا ملتا ہے۔ اس کو صنعت کاروں کے ذریعہ بڑھاوا دیا جاتا ہے جو اپنی مصنوعات کو مشتہر کرتے ہیں۔ دوسری جانب عالمگیریت ایک فائدہ مند محرک ہے چونکہ اس کی وجہ سے ہمیں دور دراز کے فاصلوں تک ترسیل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اور یہ ہر طرح کے تصورات اور اطلاعات کے تبادلے کو آسان بناتا ہے۔

اختتامی سوالات

1۔ ثقافتی اظہارات کی ان سبھی شکلوں کی ایک فہرست بنایئے جن کا ذکر اس سبق میں کیا گیا ہے۔ اور ان میں سے ان پر نشان لگایئے جنھیں آپ نے خود دیکھا یا سنا ہے اور یہ بتایئے کہ آپ نے اپنی پسندیدہ شکل یعنی پسندیدہ پینٹنگ، گانے وغیرہ کہاں دیکھے یا سنیں ہیں۔

2۔ ان بعض سماجی اور معاشی حالات کا ذکر کیجیے جن کا اثر ہماری ثقافتی سرگرمیوں پر پڑتا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ سبھی اہم ہیں۔ اپنے جواب کو دلیلیں دے کر سمجھایئے۔

3۔ کسی ایسی جگہ کے بارے میں سوچئے جہاں آپ گئے ہوں۔ کیا یہ آپ کے (الف) ضلع (ب) ریاست (ت) ملک میں ہے؟ بتایئے کہ اس جگہ کے لوگوں کی ثقافت آپ جیسی ہی ہے یا آپ سے مختلف ہے۔

4۔ عالمگیر دیہات میں کمیونیکشن (ترسیل) کی نوعیت کے بارے میں بتایئے۔ یہ ایک عام دیہات میں موجود ترسیل کی شکل جیسی ہے یا اس سے مختلف ہے؟

5- روزانہ اخبار یا میگزین سے پانچ اشتہاروں کو کاٹ کر چسپاں کیجیے۔ ان مصنوعات کے بارے میں بتایئے جن کی تشہیر کی جارہی ہے۔ یہ بتایئے کہ یہ مصنوعات کہاں تیار کی جاتی ہیں، یہ کہاں فراہم ہیں اور ان کی کیا قیمت ہے؟ تفصیل سے بتایئے کہ مشتہرین آپ کو اپنی مصنوعات خریدنے کی جانب کس طرح راغب کرتے ہیں۔

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

29.1

I

(a) ثقافتی اظہارات کی اشکال

(b) مغل فن تعمیر

(c) سنسکرت شاعری

(d) سماجی رسوم و رواج

(e) مادی ثقافت

II

1- غلط

2- صحیح

3- غلط

4- صحیح

5- غلط

29.2

1- صحیح

2- غلط

3- غلط

4- غلط

5- صحیح

نوٹس

29.3

1۔ معاشیات

2۔ عالمگیر دیہات

3۔ سرمایہ کار (اسپونسر)

4۔ ترقی یافتہ

فرہنگ

علم بشریات: اس کے عملی معنی ہیں انسان سے متعلق علم۔ اس کے تحت طبعی اور سماجی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے کلیت کے ساتھ نوع انسان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

ماہرین آثاریات: (آثار قدیمہ) یا وہ ماہر جو گذشتہ سماجوں کے مادی باقیات کا تجزیہ کر کے ہمیں ان سماجوں کو سمجھنے میں مدد دے۔

کلاسیکی: ہر وہ چیز جو مکمل تناسب میں ہو۔ اس کو عام طور سے بہترین سمجھی جانے والی اشیاء کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اصراف: حقیقی ضرورت سے زیادہ اشیاء اور خدمات کے حصول کی خواہش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ان کا بھی متحمل نہیں ہوا جا سکتا۔

مادی ثقافت: اس میں ہماری روزمرہ کے استعمال کی اشیاء شامل ہیں۔ یہ تصورات کے برعکس جو ناقابل لمس ہیں، یہ اشیاء قابل لمس ہیں یعنی جنھیں ہم دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔

عوامی: اس کا مفہوم ہے افراد سے متعلق چیزیں جو ان کے ذریعہ ایک سے دوسرے کو منتقل ہوتی ہیں۔ اس کا بعض دفعہ مفہوم ہوتا ہے وہ چیز جو لوگوں کے وسائل کی رسائی میں ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اشیاء یا تصورات جو ج لوگوں میں مقبول ہوں یا پسند کیے جاتے ہوں۔

ویدک منتر: ویدوں کی تعداد چار ہے، رگ وید، یجروید، ساماوید اور اتھروو ید۔ یہ منتروں پر مشتمل ہیں۔ جن میں سے کئی کو قربانی یا دوسری رسموں کی انجام دہی کے موقعہ پر الاپا یا گایا جاتا ہے۔

نوٹس

30

ثقافتی مصنوعات

برتن اور پراتیں، پینٹنگز، ادب اور غذائیں ہماری ثقافت میں شامل اشیاء ہیں۔ اس سبق میں ہم یہ پڑھیں گے کہ ان میں سے کچھ چیزیں کیسے تیار کی جاتی ہیں، ان کو کون تیار کرتا ہے اور ان کو کون استعمال کرتا ہے۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ درج ذیل باتوں کے بارے میں معلومات حاصل کرسکیں گے:

- پینٹنگوں کی تیاری میں کون سی تکنیکوں کا استعمال کیا جاتا ہے اور یہ پینٹگیں کن کے لیے تیار کی جاتی تھیں۔
- ہندوستان میں مختلف طرح کے کپڑے اور ملبوسات تیار کیے جاتے تھے۔
- ہندوستان کا ثروت منداور رنگارنگ ادب جو رزمیہ نظموں سے گیتوں تک پھیلا ہوا ہے اور
- غذاؤں (کھانوں) کی تیاری کی نوعیت اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں غذاؤں کی وسیع اقسام

30.1 پینٹنگ، مصور اور سرپرست

سبق کے اس حصہ میں، ہم اپنے مصورین اور ان کی پینٹنگ کے بارے میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ وہ کون سی تصاویر بناتے تھے اور اس کے لیے کون سے مواد استعمال کرتے تھے اور وہ یہ تصاویر کن کے لیے بناتے تھے۔

ماضی میں مصوری اور حرفے کا فن روزمرہ کی زندگی کا حصہ ہوتا تھا اور اس سے جو کچھ تیار ہوتا تھا وہ نہ صرف کارآمد ہوتا تھا بلکہ خوبصورت بھی ہوتا تھا۔ ہمارے اجداد جو ظروف اور برتن استعمال کرتے تھے، وہ جو کپڑے پہنتے تھے اور جن گھروں میں وہ رہتے تھے، وہ مختلف طرح کے ڈیزائنوں سے مزین ہوتے تھے۔

نوٹس

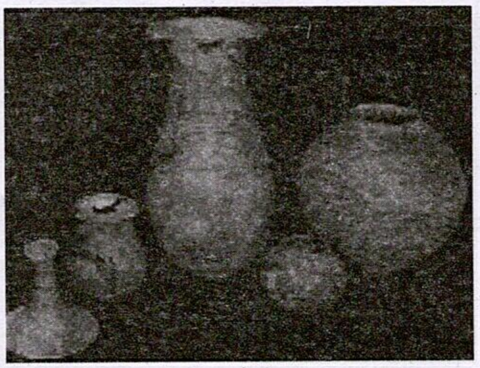

شکل 30.1: ہڑپا دور کے مزین ظروف

سب سے زیادہ خوشنما ڈیزائن عورتیں اپنے گھروں کی دہلیز پر تیار کرتی تھیں۔ انھیں بنانے کے لیے چاول، آٹے، ہلدی اور کم کم کے پاؤڈروں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ مدھوبنی پنٹینگز کا ماخذ بہار کی اسی طرح کی ایک دیہی روایت تھا جس میں بھگوان کرشن کی زندگی کے مناظر کو دیواروں کا غذ یا کسی دوسری چیز پر جنم اشٹمی کے ساتھ دوسرے تہواروں کے موقع پر درشایا جاتا تھا۔ اس شبہاتی مصوری کا مقصد رسوم کے موقع پر سجاوٹ کرنا بھی تھا اور اسے متبرک بھی سمجھا جاتا تھا۔

ہم تک پہنچنے والی سب سے پہلی پنٹنگز، غاروں میں کی گئی پنٹینگز تھیں جنھیں شکاری اور خانہ بدوش قبائل نے بنایا تھا۔ ان میں سے بعض بہترین تصاویر اتر پردیش میں مرزا پور اور باندہ کے غاروں اور سائبانی چٹانوں میں، مدھیہ پردیش میں بھوپال کے نزدیک بھیم بیکٹا اور رائے گڑھ کے نزدیک سنگین پور، وندھیاچل پہاڑی سلسلہ میں مہادیو پہاڑیوں اور کرناٹک میں بیلاری میں پائی جاتی ہیں۔ یہ تصاویر زیادہ تر شکاری مناظر پر مشتمل ہیں جن سے ہمیں ان علاقوں کی نباتاتی اور حیواناتی زندگی کے بارے میں پتہ چلتا ہے اور ماضی کے مرد اور عورت کے ذریعہ استعمال کیے جانے والے اوزاروں اور ہتھیاروں کی نوعیت سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ سادے ہتھیار مثلاً تیر کمان اور کلہاڑی ہوتے تھے ہم درست طور پر تو نہیں جان پائے کہ اِن تصاویر کو کیوں بنایا گیا ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ ان کی کوئی جادوئی اہمیت ہو اور ان کا مقصد شکار کی کامیابی کو یقینی بنانا ہو ماضی کے مردوں اور عورتوں نے یہ تصاویر اپنی ضروریات کے لیے بنائی تھیں جب کہ بعد کے زمانے میں تصاویر شاہی سرپرستی کے زیر تحت بنائی جاتی تھیں اس کا مطلب یہ ہے کہ راجہ اس کا معاوضہ دیتا تھا اور بعض اوقات ان تصاویر کو بنانے کی غرض سے مصور کی پرورش بھی کرتا تھا۔

ان تصاویر میں سے سب سے اوائلی تصاویر باگ (مدھیہ پردیش) اور ایلورا اور اجنتا (مہاراشٹر) کے مشہور غاروں میں پائی گئیں۔ اجنتا کے غاروں کی پنٹنگز کا موضوعات گوتم بدھ کی زندگی سے متعلق ہیں اور ان میں خاص طور سے جاتک کی کہانیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے جن میں گوتم بدھ کی پچھلی کئی زندگیوں کے بارے

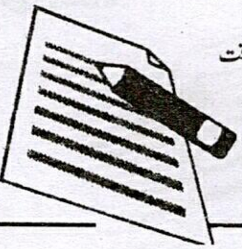

نوٹس

میں بتایا گیا ہے۔ آپ گوتم بدھ کی زندگی کے بارے میں سبق 31 میں اور زیادہ تفصیل سے جان سکیں گے۔ ان تصاویر میں روزمرہ کی زندگی سے متعلق کچھ مناظر شامل ہیں۔ مثال کے طور پر اجنتا کی مشہور تصویر جس میں شہزادیوں کے سنگھار کرنے کی منظرکشی کی گئی ہے۔ اجنتا کی مصوری کی سرپرستی گپت اور وکاٹا حکمرانوں کے ذریعہ کی گئی تھی اور ان تصاویر کا تعلق تقریباً چوتھی اور چھٹی صدی عیسوی سے ہے۔ یہ تصاویر اپنے پھیکے نہ پڑنے والے رنگوں کی وجہ سے غیر معمولی حیثیت کی حامل ہیں۔ یہ مانا جاتا ہے کہ پلوا راجاؤں کے دور کا مہابلی پورم گھپائی آرٹ، جن کا دورِ حکومت چھٹی سے دسویں صدی عیسوی کے درمیان تھا، اجنتا اور ایلورا کی پینٹنگز میں استعمال کی گئیں مصورانہ تکنیکوں سے حاصل کردہ تحریک پر مبنی تھا۔

> مہابلی پورم کے چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے مندر (جو چینائی کے نزدیکی بیرونی علاقہ میں واقع ہیں) مالن نرسمہا پلّوں کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جس کا دورِ حکومت ساتویں صدی عیسوی میں تھا۔ یہاں خوبصورت پینٹنگوں اور مجسموں میں مہابھارت کے مناظر کی تصویر کشی کی گئی ہے جو غاروں کے اندرونی حصوں اور چٹانوں کی سطح پر دریافت کی گئیں۔

فن کے طور پر پینٹنگوں کا کی شروعات ایک ایسی تبدیلی تھی جس نے شاہی درباروں اور شہروں اور قصبوں میں جنم لیا۔ اس طرح کی روایات میں ہم مغل دور کی بہت چھوٹی تصاویر اور مغل پینٹنگز کو شمار کر سکتے ہیں جن میں 16ویں اور 18ویں صدی کے درمیان بنایا گیا۔ یہ آرٹ اکثر وبیشتر صفاوبی (ایرانی) اور ہندوستانی روایات کا خوشگوار امتزاج ہوا کرتا تھا۔ مغل اور راجپوت مصورین اپنے جداگانہ انداز کے باوجود ایک دوسرے سے تحریک حاصل کرتے تھے۔ جلد سازی اور مسوداتی مصوری ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دو ایسے فنون تھے جو ایک ہی وقت میں ظہور پذیر ہوئے کثیر تصویری ''پادشاہ نامہ'' فارسی حرفہ سازوں کی مہارت کی ایک اچھی مثال ہے جنہیں مسوداتی مصوری میں ملکہ حاصل تھا۔ دوسرے تصویری مسودات میں ''اکبرنامہ'' شامل ہے یہ دونوں ہی بادشاہوں کی سوانح حیات سے متعلق ہیں جن میں وہ اپنی کامیابیوں کا جشن منا رہے ہیں۔

ایک دوسری مثال تصویری جین مسودات ہیں۔ یہ مسودات چھٹی صدی عیسوی کے بعد سے تیار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جین میت کے ماننے والوں نے اپنی قدیم معلومات کو تحریری شکل میں محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بعض معاملات میں تاجروں نے مسودے کی تیاری کے لیے مصوروں کو معاوضہ بھی ادا کیا۔ ان مسودات کو تصاویر کے ذریعہ خوبصورتی کے ساتھ مزین کیا گیا۔ یہ مانا جاتا ہے کہ پہلے تیرتھانکر رشبھ دیو خود بھی ایک ماہر مصور تھے۔ اور اٹلی جین تصویری مسودات میں ''اشٹھا سہر سریکا پراجنا ناپرامیتا'' خاص طور سے قابل ذکر ہے جین مذہب اور فلسفہ سے متعلق سب سے مشہور چھوٹی پینٹنگ ''ترلوکیا دیپکا'' ہے۔

نوٹس

متن پر مبنی سوالات 30.1

1۔ بتائیے کہ صحیح ہے یا غلط

(a) مدھوبنی پنٹینگ رسوماتی اور مذہبی روایات پر مبنی ہیں۔

(b) غاروں میں بنائی گئی تصاویر کو شاہی سرپرستی حاصل تھی۔

(c) مغل منقش چھوٹی تصاویر دیہی روایات پر مبنی ہیں۔

(d) ''اکبرنامہ'' اور ''پادشاہ نامہ'' بادشاہوں کی سوانح حیات ہیں۔

2۔ ان جگہوں کے نام بتائیے جہاں غاروں میں کی گئی پینٹنگیں دریافت کی گئی ہیں۔

30.2 ہندوستانی کپڑے اور ملبوسات

جغرافیائی اور موسمی حالات ہندوستانیوں کے پہناؤں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں لوگ اونی اور سوتی دونوں طرح کے کپڑے استعمال کرتے ہیں جب کہ جنوبی ہندوستان میں جہاں کی آب وہوا گرم ہے لوگ صرف سوتی کپڑے پہنتے ہیں۔ گرم خطوں کے باسیوں کا لباس ایک اوپری کپڑے اور نچلے کپڑے پر مشتمل ہوتا ہے جو عام طور پر ڈیڑھ گز کا ہوتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں لوگ سلا ہوا اوپری کپڑا، جسے کرتا کہا جاتا ہے اور سلا ہوا نچلا کپڑا بھی پہنتے ہیں جسے پاجامہ کہا جاتا ہے، بھی استعمال کرتے ہیں۔ عورتیں چھ گز کا بغیر سلا کپڑا پہنتی ہیں جسے ساڑی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مردوں کی طرح سلا ہوا لباس بھی استعمال کرتی ہیں جسے کرتا شلوار کہا جاتا ہے۔ ساڑی کا پہناوا مختلف خطوں کی ثقافت اور روایات پر منحصر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مراٹھی اور تامل عورتیں نو گز کی ساڑی پہنتی ہیں جو ٹانگوں کے درمیان سے باندھی جاتی ہے جب کہ کیرالہ عورتیں چار یا پانچ گز کی ساڑھی پہنتی ہیں جو ان کے ٹخنوں تک ہوتی ہے۔

> یہ مانا جاتا ہے کہ اوائلی ہندوستان میں لوگوں کا لباس بغیر سلے کپڑوں پر مشتمل ہوتا تھا یہ بتانا مشکل ہے کہ ہندوستانیوں نے سلا ہوا لباس کب پہننا شروع کیا لیکن اوائلی مسیحی دور کی تصاویر اور مجسموں میں کشان محافظوں اور سپاہیوں کو پتلون اور جیکٹ میں دکھایا گیا ہے۔ یہ یونانی اثر کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔ قدیم مجسموں مثلاً امراوتی (آندھراپردیش) اور برھادسورم (تامل ناڈو) میں موجود مجسموں میں سلے ہوئے کپڑوں میں لوگوں کو دکھلایا گیا ہے لیکن یہ بادشاہ یا دیوتا نہیں ہیں بلکہ خدمتگار طبقہ اور رقاصائیں ہیں۔ (نیشنل میوزیم متھرا میوزیم میں موجود کنشک کا بغیر سر کا مجسمہ ایک کوٹ میں ملبوس ہے۔

نوٹس

ہندوستان میں کپاس کی پیداوار ماقبل تاریخ کے عہد سے ہوتی آئی ہے۔اس بات کا پختہ ثبوت موجود ہے کہ ہڑپا تہذیب کے سب سے بڑے شہر موئنجوداڑو میں کپاس کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ماہرین آثار قدیمہ نے کھدائیوں کے دوران تکلیاں دریافت کی ہیں۔کرگھے کا پہلا کتابی حوالہ ''اتھرووید'' سے ملتا ہے۔ بنائی کا کام خاص طور سے بیوائیں اور غیر شادی شدہ لڑکیاں انجام دیا کرتی تھیں۔

ہندوستانی کپڑوں سے ثقافت کی عکاسی ہوتی ہے۔اس میں رنگوں کا انتخاب ڈیزائن اوران کو پہننے کا موقع، ہر چیز اہمیت رکھتی ہے۔سرخ رنگ زرخیزی اور بارآوری کی نمائندگی کرتا ہے اوراسے دلہنیں عام طور پر شادی کے موقع پر پہنتی ہیں۔بادامی (ہلکا پیلا) اورسفید رنگ پاکیزگی اور قربانی کی علامت ہیں انھیں عام طور پر عبادت گذار افراد اور بیوائیں پہنتی ہیں۔سیاہ رنگ کو منحوس تصور کیا جاتا ہے گوکہ جنوبی ہندوستان میں حاملہ عورتیں سیاہ رنگ کے کپڑے پہنتی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ بری نظر سے بچنا ہے۔رنگوں کو بنانے کے لیے سبزیوں کے سفوف اور پودوں کا استعمال کیا جاتا تھا اب گوکہ زیادہ تر رنگ سستی کیمیائی ڈایوں سے تیار کیے جاتے ہیں۔

شروع شروع میں کپڑوں پر جیومیترائی ڈیزائن، تیار کیے جاتے تھے۔ کپڑوں پر پیڑ پودوں اور جانوروں کی اشکال کی تصویر کشی سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ کن کن چیزوں سے واقف تھے اور انھیں متبرک سمجھتے تھے۔کنول یا کالکا (آم) کے ڈیزائن ہندوستان کے زیادہ تر حصوں میں مقبول تھے۔ ہندوستان میں کپڑوں کی طرح طرح کی اقسام تیار کی جاتی ہیں۔ان میں وارانسی (بنارس) کا زربفتی سلک (ریشم) جسے جام دانی یا جام ور کہا جاتا ہے۔کانچی پورم کا سنہرے بارڈر (کناروں کا سلک اور آسام کاٹسر، بریگل اور کرناٹک کی سلک کی مشہور اقسام شامل ہیں۔سوتی کپڑوں کو افقی کرگھوں پر آسانی سے بنا جاسکتا ہے جب کہ بھاری زربفتی ریشمی کپڑوں کو بننے کے لیے پیچیدہ کرگھوں کی ضرورت پڑتی ہے جن میں کئی پیڈل لگے ہوتے ہیں۔ریشمی کپڑے، سوتی کپڑوں کے مقابلے میں زیادہ مہنگے ہوتے ہیں اور کم ہی لوگ ان کے متحمل ہوسکتے ہیں۔

مختلف طرح کے کپڑوں کی تیاری کے لیے مختلف تکنیکوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کپڑے جو ''باندھو اور رنگو'' کے زمرے میں آتے ہیں مختلف ثقافتی روایات میں مختلف ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر راجستھان اور گجرات میں انھیں ''بندھنی'' اڑیسہ میں ''ایکاٹ'' اور تامل ناڈو میں ''چنگدی کہا جاتا ہے۔اس طریقہ میں کپڑوں اور کبھی کبھی سوت کو باندھا اور پھر رنگا جاتا ہے۔

قلم کاری طریقے سے بنائے گئے کپڑے آندھرا پردیش کی زندہ روایت ہیں۔قلم کاری کے لفظی معنی ہیں قلم سے الفاظ لکھنا۔دکنی سلطنتوں نے قلم کار مصورین کی سرپرستی کی۔اس طرح کے کپڑوں پر پیش کیے گئے ڈیزائن اسلامی اور ہندو سجاوٹی ڈیزائنوں کا امتزاج ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آج قلم کاری کپڑوں کو

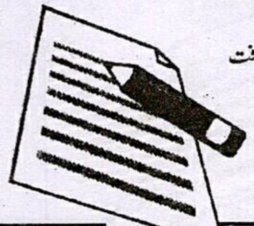

نوٹس

فروخت کی غرض سے مشینوں کے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔

متن پر مبنی سوالات 30.2

1۔ بندھنی تکنیک سے آپ کیا سمجھتے ہیں اور اس تکنیک سے کپڑے کہاں بنائے جاتے ہیں؟

____

2۔ قلم کاری اصطلاح کی وضاحت کیجیے۔

____

3۔ بتائیے کہ صحیح ہے یا غلط

(a) سوتی کپڑوں کو گرم موسم میں پہنا جاتا ہے۔

(b) ریشمی کپڑے سوتی کپڑوں سے سستے ہوتے ہیں۔

(c) جن کپڑوں کو باندھا اور رنگا جاتا ہے انھیں جامدانی کہا جاتا ہے۔

(d) انڈیگو (نیل) اور میڈر (سرخ) سبزیوں سے بنائے جانے والے رنگ ہیں۔

30.3 ادب

آیئے اب ہم اپنے ثروت منداور متنوع ادب پر نظر ڈالتے ہیں۔ جو رزمیہ نظموں سے لوک گیتوں تک اور کلاسیکی سے عوامی ادب تک پھیلا ہوا ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں ہندوستان میں کم سے کم 325 زبانیں اور بولیاں ہیں۔ اتر پردیش کی بنیادی زبان گو کہ ہندی ہے لیکن اس ریاست کے لوگ تقریباً 85 بولیاں بولتے ہیں جو ہندی زبان کی خطہ جاتی اقسام ہیں۔

ہمارا ادب متن کے لحاظ سے مذہبی بھی ہے اور غیر مذہبی بھی ہے۔ اس میں لوگوں کی زندگی سے موضوعات کو چنا گیا ہے۔ سنسکرت زبان میں لکھے گئے وید ہمارے مذہبی ادب کا ایک حصہ ہے جب کہ ''مرچا کا تیکا''، جس کے معنی ہیں ''کھلونوں کی کہانی'' (شدراکا) دنیاوی موضوعات پر لکھی گئی کتاب ہے۔

ہمارے ادب میں خطہ جاتی تنوع کا ایک ثروت مند سلسلہ موجود ہے۔ اور یہ خاص طور سے ''رامائن'' اور ''مہابھارت''، جیسی اہم رزمیہ نظموں کو سنانے میں نظر آتا ہے۔ اس بات سے سبھی واقف ہیں کہ والمیکی نے سنسکرت زبان میں جو ''رامائن لکھی تھی اس کو ''ادی کاویہ'' کے نام جانا جاتا ہے۔ تلسی داس نے ہندی زبان میں رامائن کا جو ترجمہ لکھا اسے ''رام چرتر مانس'' کہا جاتا ہے۔ چولا عہد حکومت میں درباری شاعر کمبن نے

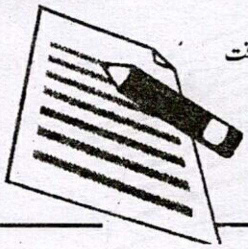

نوٹس

رامائن کوتامل زبان میں لکھا جب کہ رامائن کا عوامی لوک ترجمہ، جس کوایک کاشتکار خاتون نے، جس کا نام مولد تھا، تیلگو زبان میں کیا۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ کتابوں کا اندازِ تحریر بھی مصنف کے سماجی حالات سے متاثر رہتا ہے۔ کمبن نے رامائن لکھنے کے لیے جس زبان اور تصورات کا استعمال کیا وہ حکمراں طبقہ کی تھی جب کہ مولّد نے ایک کاشتکار خاتون کے انداز میں لکھا ہے سورج ڈوبنے کے منظر کے بارے میں وہ لکھتی ہے کہ ''سورج آسمان میں اسی طرح سے جھک گیا جیسے دن بھر کی کڑی محنت کے بعد تھکا ہارا مزدور اپنے گھر واپس آتا ہے''

اب ہم مختصر طور سے ''مہابھارت'' کی خطہ جاتی اور لوک شکلوں کا جائزہ لیں گے جس کے بارے میں یہ مانا جاتا ہے کہ اسے ویدویاس نے سنسکرت میں لکھا تھا۔ مہابھارت کی تیلگو زبان میں ایک شکل میں بتایا گیا ہے کہ جب یدھشٹر کی قیادت میں پانڈوؤں نے کوڑیوں کے کھیل میں اپنی حکومت اور اپنی آزادی کو دریودھن کے ہاتھوں ہار دیا تو دروپدی نے کوڑیوں کی کھیل میں شرکت کے اپنے حق کا استعمال کیا۔ اپنے حریفوں کے تئیں اپنے غصہ کے اظہار کے لیے اس نے کوڑیوں کو اپنے پیروں کے ذریعہ پھینکا اور ان سبھی چیزوں کو جیتنا شروع کر دیا جو اس کے شوہر نے ہار دی تھیں۔ دروپدی کو جنوبی ہندوستان کے کئی حصوں میں ایک دیوی کے طور پر پوجا جاتا ہے۔

مہابھارت کی ایک تامل شکل میں ایک پانڈو رانی کا ذکر کیا جاتا ہے جس کا نام عالی رانی تھا۔ اس کو مردوں سے نفرت تھی اور وہ صرف عورتوں کی مدد سے حکومت کرتی تھی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے جنگ میں ارجن کو شکست دی تھی اور بعد میں اس سے شادی کر لی تھی۔ ہمالیائی خطہ کی مہابھارت کہانیوں میں بھیم کو مرکزی کردار کی حیثیت دی جاتی ہے۔ بھیم اور اس کی قبائلی بیوی ہدیمبا کو ہماچل پردیش کے منڈی علاقہ میں مرکزی دیوی مانا جاتا ہے۔ مہابھارت کی اس روایت کے مطابق دروپدی پانچ پانڈو بھائیوں سے بیاہی تھی، کثیر شوہری شادی کی یہ روایت یہاں کی مہابھارت کہانیوں میں موجود ہے۔ مہابھارت کی چھتیس گڑھ شکل کو ''پانڈو رانی'' کہا جاتا ہے۔ ان کہانیوں میں بھی بھیم مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کے شمال مشرقی خطوں کی کئی قبائلی برادریاں راست طور پر بھیم اور ہدیمبا کی نسل ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر دیماپور کا درانگ کچھاری قبیلہ خود کو ''بھیم۔نی۔فا'' (بھیم کی اولاد) بتاتا ہے۔

شمالی ہند میں گو کہ بہت سے واقعات اور کردار جانے پہچانے ہیں لیکن مہابھارت ایک ایسی رنگا رنگ روایت ہے جو ہندوستان کے کونے کونے میں چھائی ہوئی ہے۔ مختلف برادریاں اس میں مقامی کہانیوں کو سمو کر اپنے طور پر سمجھتی رہیں اور ایک سے دوسرے تک پہنچاتی رہی ہیں۔ اس طرح مہابھارت مختلف قوموں کی مختلف ثقافتوں کی نمائندگی کرتا ہے جو کلاسیکی داستان سے لوک بیلے تک پھیلا ہوا ہے۔

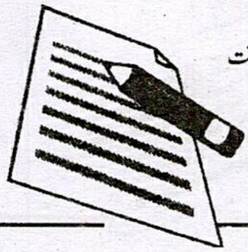

نوٹس

متن پر مبنی سوالات 30.3

1۔ ویدوں میں کس طرح کا ادب پیش کیا گیا ہے؟

2۔ ہندوستان کے کن خطوں میں بھیم اور ہدیمبا کی پوجا کی جاتی ہے؟

3۔ رامائن کی ہندی شکل کا مصنف کون ہے اور اس کو کس نام سے یاد کیا جاتا ہے؟

30.4 کھانے پینے کے طور طریقے

آیئے اب ہم کھانے کی اپنی عادتوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ہمیں اس بات پر دھیان دینا ہوگا کہ علاقوں کے لحاظ سے کھانے کی یہ عادتیں کتنی زیادہ مختلف اور متنوع ہیں اور گذرے ہوئے وقت کے ساتھ عمل باہم کی وجہ سے ان میں کتنی وسیع تبدیلی ہوئی ہے۔

ہم ہندوستانیوں کی کھانے کی عادتوں کا انحصار مختلف علاقوں میں اگائی جانے والی فصلوں کی نوعیت، مختلف برادریوں/فرقوں کے ثقافتی عادات واطوار اور صارفین طبقہ/ برادری یا افراد کی معاشی اور سماجی حیثیت پر ہوتا ہے۔ ہند گنگائی پٹی کی لوگوں کی اصل خوراک گیہوں ہے جب کہ جنوبی ہندوستان کے لوگوں کی خوراک کا بنیادی جز چاول ہے کیوں کہ وندھیا چل پہاڑوں کے جنوب کے خطوں میں گیہوں کی پیداوار بہت کم مقدار میں ہوتی ہے۔

ماہرین آثار قدیمہ کے غذائی اناجوں سے متعلق فراہم کردہ شواہد کے ذریعہ ہم ان غذاؤں کے بارے میں تھوڑا بہت جان سکے ہیں جنھیں ہمارے اجداد کیا استعمال کیا کرتے تھے۔ رہائشی علاقے، جہاں درحقیقت لوگ آباد ہوا کرتے تھے۔ گیہوں کی موجودگی کے بارے میں بتاتے ہیں (مثال کے طور پر بلوچستان میں پتھر کے نئے عہد مہر گڑھ کی کھدائی کی جگہ) یا جنوبی ہندوستان میں کرناٹک میں برہم گری اور ہلور میں دریافتی کھدائی کی جگہیں آندھرا پردیش میں پکلی ہال اور تامل ناڈو میں پائماپلیٔ میں کی گئی کھدائیوں سے کی گئی دریافتوں سے اس دور میں گیہوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ پکلی ہال سے ملے شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے لوگ چرواہے تھے اور گھریلو مویشی مثلاً بھیڑ بکریاں پالتے تھے۔

پانی اور اناج کا ذخیرہ کرنے اور کھانا پکانے کے لیے برتنوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی ماہرین

نوٹس

آثار قدیمہ نے ان برتنوں کی بنیاد پر قدیم ثقافتوں کو مختلف زمروں میں بانٹا ہے جنھیں وہ بناتے تھے۔ مثال کے طور پر ان میں رنگدار خاکستری برتن اور سیاہ پالش شدہ برتن شامل ہیں۔ تامل ناڈو میں ادی چنلور میں کانسہ کے عہد کی دریافت کے لیے کی گئی ماہرین آثار قدیمہ کی کھدائیوں میں کانسہ اور سونے کے پائے گئے ہیں۔ یہ برتن واضح طور پر امیروں کے ذریعہ استعمال کیے جاتے تھے۔

زیادہ تر علاقوں کی اپنی مخصوص اور منفرد غذائیں ہیں۔ آندھرا پردیش، کرناٹک، کیرالہ اور تامل ناڈو کی چاول پر مبنی ثقافت ہے۔ جنوبی ہندوستان کے لوگوں کے تیار کردہ کھانے مثلاً اِڈلی، ڈوسہ اور اُپما شمالی ہندوستان میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اور شمالی ریاستوں میں کھانے کی ان اقسام کی آسانی سے فراہمی مختلف برادریوں کے درمیان عمل باہم کا ثبوت ہے۔ مغربی بنگال کی طرح کیرالہ بھی جو کہ ایک ساحلی ریاست ہے مچھلی سے بنے کھانوں کے لیے مشہور ہے۔

مغلوں کی آمد سے ساتھ 'مغلئی' کھانے مثلاً مرغ تندوری اور سیخ کباب کے ساتھ ساتھ تربوز جیسے پھل بھی ہندوستانی ذائقوں کا ایک حصہ بن گئے۔ آج اودھی (اودھ مشرقی اتر پردیش کے علاقہ کو کہا جاتا ہے) پکوان مغل نوابی ثقافت کے عکاس ہیں۔ یورپیوں اور خاص طور سے پرتگالیوں نے 16 ویں صدی عیسوی میں ہندوستانی کھانوں کو آلو، ٹماٹر اور ہری مرچوں سے روشناس کرایا جو اس وقت کھانے پکانے کے ہمارے طریقے کا ایک اٹوٹ حصہ ہیں۔ اسی مدت کے دوران فرانسیسی پھلیاں ہمارے پکوانوں کا ایک حصہ بن گئیں۔ چنانچہ ثقافتی عمل باہم کھانے کی ہماری عادتوں میں تبدیلی کا سبب بنتا ہے۔

ایک خاندان کا عام طور سے کھانا چاول یا روٹی اور دال اور سبزی پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ کھانا عورتیں عام طور پر اپنے باورچی خانوں میں تیار کرتی ہیں لیکن بڑے پیمانے پر کھانے عام طور پر مرد تیار کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے غریب ایسے بھی ہیں جو روکھا سوکھا کھا کر گذارہ کرتے ہیں۔ دولتمند کئی اقسام کے کھانے کھا سکتے ہیں جن میں سبزیوں اور گوشت پر مبنی کھانے بھی شامل ہیں۔ گوشت، سبزیوں کے مقابلہ زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر سبھی برادریاں کئی طرح کے پکوان تیار کر کے دعوت کرتے ہیں جن میں ان کے اپنے علاقوں کا مخصوص ذائقہ ہوتا ہے۔

متن پر مبنی سوالات 30.4

1۔ ہندوستان کی خاص فصلیں کون سی ہیں اور ان کا غذائی عادتوں پر کیا اثر پڑتا ہے؟

____

2۔ جنوبی ہندوستان کے بعض مقبول پکوانوں کے نام بتایئے؟

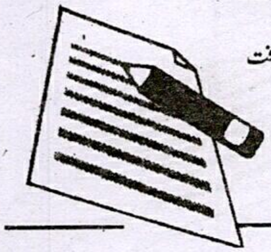

نوٹس

3۔ درج ذیل کے جوڑے بنایئے۔

روٹی	کیرالہ
اُپما	پرتگالی
سیخ کباب	تامل ناڈو
مرچیں	شمالی ہندوستان
مچھلی	مغلئی پکوان

آپ نے کیا سیکھا

ہم نے ثقافتی مصنوعات اوران کی خطہ جاتی شکلوں کے ساتھ ساتھ ملبوسات اور غذائی عادات واطوار کے سلسلہ میں ثقافتی عمل باہم پر تبادلۂ خیال کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے قدیم اجداد ایسے برتن بناتے تھے جو کارآمد ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتے تھے۔ تاہم بعد کے ادوار میں فن پارے مثلاً پنٹینگز وغیرہ شاہی سرپرستی کے تحت بنائی جانے لگیں۔

ہم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ لوگ موسم کے لحاظ سے کپڑے پہنتے ہیں اور یہ کہ خطوں کے لحاظ سے ان کی اقسام تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ ہم نے کپڑوں کی اقسام، ان کے ڈیزائن اور بعض مخصوص کپڑوں مثلاً قلم کاری اور چُنگدی کے بارے میں بھی پڑھا۔ ہم نے یہ دیکھا کہ ہندوستانی زبانوں کے تنوع کی وسعت نے ہمارے ادب کو مالا مال کرنے میں کتنا بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے ''مہابھارت'' کی بعض خطہ جاتی اور لوک شکلوں کا حوالہ بھی دیا۔ اور آخر میں ہم نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کی کھانے کی عادتوں کا ذکر کیا اور مسلسل ثقافتی عمل باہم کی وجہ سے ان میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں بھی بتایا۔

اختتامی سوالات

1۔ اجنتا اور ایلورا کی تصاویر کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ آج کل کی فلموں کے اشتہارات تصویری مصوروں کی پینٹنگز سے کس طرح مختلف ہیں؟

3۔ روایتی ہندوستانی کپڑوں میں رنگوں کی اہمیت کو واضح کیجیے۔

4۔ ''مہابھارت''، رزمیہ کی بعض علاقائی شکلوں کے بارے میں بتایئے۔

نوٹس

5۔ ہندوستان میں علاقائی کھانوں کی اقسام اور نوعیت کے بارے میں بتایئے۔

متن پر مبنی سوالات کے جوابات

:30.1

1۔ a= صحیح، b= غلط، c= غلط، d= صحیح

2۔ غاروں میں بنی ہوئی قدیم تصاویر اتر پردیش میں مرزا پور اور باندہ، مدھیہ پردیش میں بھیم بٹیگا اور سنگن پور وندھیا چل پہاڑی سلسلہ میں مہادیو پہاڑیوں اور کرناٹک مین بیلاری میں پائی گئیں۔

:30.2

1۔ کپڑوں کو رنگنے کے ''بندھنی'' طریقے میں سوت کو اور بعض اوقات کپڑوں کو باندھا اور رنگا جاتا ہے۔ اس طریقے سے رنگے ہوئے کپڑوں کو راجستھان اور گجرات میں بندھنی اڑیسہ میں ایکاٹ اور مدورائی میں چنگدی کہا جاتا ہے۔

2۔ ''قلم کاری'' اصطلاح کے لفظی معنی ہیں قلم سے کام کرنا۔

3۔ a= صحیح، b= غلط، c= غلط، d= صحیح

:30.3

1۔ سنسکرت زبان میں لکھے ہوئے وید ہمارے مذہبی ادب کا حصہ ہیں۔

2۔ ہماچل پردیش کے منڈی اور کنور علاقوں میں بھیم اور ہدیمبا کو دیوی دیوتا کے طور پر پوجا جاتا ہے۔

3۔ رامائن کا ہندی ترجمہ تلسی داس نے لکھا اور اس کو ''رام چرتر مانس'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

:30.4

1۔ ہندوستان کی اصل فصلیں گیہوں اور چاول ہیں۔ چاول جنوبی ہندوستان کی خاصل فصل ہے اور اسی لیے جنوبی ہندوستان کے لوگ چاول پر مبنی غذاؤں کا استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ شمالی ہندوستان میں گیہوں کی کاشت وسیع پیمانے پر کی جاتی ہے اس لیے یہاں کے لوگوں کی اصل غذا گیہوں ہے۔

2۔ اڈلی، ڈوسہ اور اُپما جنوبی ہندوستان کے کچھ مشہور کھانے ہیں۔

3۔ درج ذیل الفاظ کے موازنہ کا جواب۔

روٹی	شمالی ہندوستان
اُپما	تامل ناڈو
سیخ کباب	مغلئی

نوٹس

مرچیں	پرتگالی
مچھلی	کیرالہ

اختتامی سوالات کے بارے میں حوالے:

1۔ حوالہ پیراگراف 30.1

2۔ حوالہ پیراگراف 30.1

3۔ حوالہ پیراگراف 30.2

4۔ حوالہ پیراگراف 30.3

5۔ حوالہ پیراگراف 30.4

فرہنگ:

زربفت :(Brocade)	:	ریشمی کپڑے پر عام طور سے سنہرے تاروں سے بنائی
پکوان(Cuisine)	:	کھانا پکانے کے طریقے
ممتاز افراد (Elite)	:	ممتاز افراد کا گروپ
پکی مٹی (Fired Clay)	:	وہ مٹی جسے برتن بنانے یا تعمیراتی مواد کے طور پر استعمال کرنے کے لیے بھٹی میں پکایا یا تپایا جاتا ہے۔
انڈیگو(Indigo)	:	نیلا رنگ جسے انڈیگو(نیل) کے پودے سے حاصل کیا جاتا ہے۔
میڈر(Madder)	:	لال رنگ جو میڈر نامی پودے کی جڑوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔
چھوٹی تصاویر(Miniatures)	:	بہت چھوٹی پینٹنگز
کثیر شوہری (Polyandry)	:	شادی کا ایک نظام جس میں ایک عورت کے ایک زیادہ شوہر ہوتے ہیں۔
صفوی(Safawid)	:	فارس (ایران) کا ایک سلسلہ نسب، اس اصطلاح کو عام طور پر ہندوستانی آرٹ اور ثقافت پر فارسی اثر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

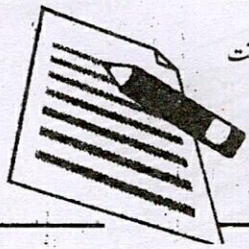

نوٹس

31

ثقافتی ترسیل (کمیونیکشن)

جب آپ چھوٹے ہوں گے تو آپ کے دادا دادی نے آپ کو راجہ رانی، جادوئی کرشموں، جانوروں اور چڑیوں کی کہانیاں ضرور سنائی ہوں گی۔ اُن میں سے بہت سی کہانیاں رزمیہ نظموں اور مذہبی کتابوں مثلاً رامائن یا بائبل یا پھر کہانیوں کے مجموعوں مثلاً پنچ تنتر یا داستان الف لیلیٰ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم سبھی نے اپنے ثقافتی ورثہ کے بہت سے پہلو ایسی ہی کہانیوں سے اخذ کیے ہیں۔ ثقافت کی ترسیل کئی ذریعوں مثلاً زبانی، تحریری اور موسیقی سے ہوتی ہے اور موجودہ دور میں اس کی ترسیل کا ذریعہ فلمیں اور ٹیلی ویژن ہیں۔

مقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد آپ درج ذیل باتوں کو سیکھ سکیں گے:

- یہ واضح کر سکیں گے کہ تحریر اور طباعت ثقافتی ترسیل میں کس طرح مدد کرتے ہیں۔
- ثقافتی ترسیل کے بعض طریقوں کے بارے میں بتا سکیں گے۔
- یہ بتا سکیں گے کہ موسیقی مختلف تصورات کی ترسیل کس طرح کرتی ہے۔
- یہ واضح کر سکیں گے کہ مختلف ثقافتی شکلوں نے بودھ مت کو پھیلانے میں کیا کردار ادا کیا۔

31.1 ثقافت کی ترسیل کس طرح ہوتی ہے

کیا آپ زبان کے بغیر کسی دنیا کا تصور کر سکتے ہیں؟ زبان انسانی سماج کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ یہ نہ صرف لوگوں کے لیے ایک دوسرے کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہے بلکہ ثقافتی تصورات کی منتقلی کا ایک وسیلہ بھی ہے۔ زبان لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی بھی ہے اور ان کے درمیان فرق کو واضح بھی کرتی ہے۔ پنجاب کے رہنے والے اپنی مشترکہ زبان پنجابی کی وجہ سے ایک دوسرے نہ صرف جڑے ہوئے ہیں بلکہ اُن کی شناخت ان لوگوں سے الگ بنی رہتی ہے جن کی مادری زبان پنجابی نہیں ہے۔ کیا آپ اس بات سے

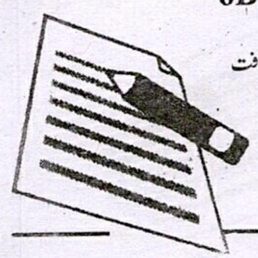

نوٹس

واقف ہیں کہ پاکستان میں وسیع پیمانے پر بولی جانے والی دوزبانوں میں سے ایک پنجابی ہے؟

برعظیم کے مختلف ممالک میں بولی جانے والی ایک دوسری زبان بنگالی ہے

زبانوں اور ثقافت کے پھیلاؤ پر جغرافیائی عناصر کا اثر پڑتا ہے۔قریب قریب کے علاقوں میں رہنے والے افراد عام طور پر یکساں یا ملتی جلتی زبان بولتے ہیں۔اور وہ لوگ جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل کی دوری پر رہتے ہیں ایک دوسرے سے مختلف زبان بولتے ہیں۔اس لیے کہ ذرائع آمدورفت کے فروغ پانے سے قبل دور دراز کے علاقوں کے درمیان ترسیل مشکل سے ہو پاتی تھی۔دنیا کے نسبتاً الگ تھلگ علاقوں میں پنپی ثقافتیں بالکل ہی الگ نوعیت کی ہوتی ہیں۔

گھنے جنگلات اور پہاڑی علاقوں میں مواصلات آج بھی دشوار ہے۔یہ ممکن ہے کہ پہاڑوں یا وادیوں کے ایک طرف بسنے والا قبیلہ پہاڑوں کی دوسرے طرف صرف چند کلومیٹر کی دوری پر بسے قبیلے کے بارے میں نہ جانتا ہو۔اس صورت میں ان کے ذریعہ بولی جانے والی زبانیں مختلف ہوسکتی ہیں۔

تاہم اتر پردیش اور بہار جیسی ریاستوں میں جہاں وسیع میدانی علاقوں میں جو دریاؤں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔لوگ قدیم ادوار میں بھی آسانی سے سفر کر سکتے تھے۔چنانچہ باقاعدہ عمل باہم کی وجہ سے ایک جیسی زبانوں اور رسوم ورواج کو فروغ ملا۔

ایک وسیع علاقہ میں جہاں زبان، مثلاً ہندی یا تامل بولی جاتی ہے، ضلع وار تنوع موجود ہے۔اور زبان کی کوئی بھی شکل اس حد تک مختلف نہیں ہوتی کہ اسے زبان تسلیم کیا جائے۔چنانچہ ایسی شکلوں کو زبان پر مبنی ''بولی'' کہا جاتا ہے۔

بات چیت کی زبان ترسیل کا ایک سب سے اہم ذریعہ تھی اور آج بھی ہے۔تاہم تحریر کی ایجاد نے ترسیل کے امکانات کو اور زیادہ وسیع کر دیا۔

ہندوستان میں تحریر کا استعمال تقریباً 4000 قبل مسیح شروع ہوا۔یہ ہڑپا دور کی تحریر تھی جس کی عبارت کو ابھی تک نہیں پڑھا جا سکا ہے۔1800 صدی قبل مسیح کے آس پاس ہڑپا تمدن کے زوال کے بعد تحریر بھی تقریباً غائب ہوگئی۔تحریر تیسری صدی قبل مسیح کے آس پاس دوبارہ ظہور میں آئی۔اس تحریر کو ''برہمی'' کہا جاتا ہے اور یہ سبھی جدید ہندوستانی تحریروں کی ماں کہلاتی ہے۔

ابتدائی طور پر حکمرانوں اور دولتمند افراد نے اہم دستاویزات کو چٹانوں پتھر کی سلوں، کانسہ کی پلیٹوں، چمڑے، کپڑے اور پیڑوں کی چھالوں پر، جنھیں بھوج پتر کہا جاتا تھا، اور زیتون کے پتوں پر، جنھیں ''تال پتر'' کہا جاتا تھا تحریر کروایا۔

آپ کے خیال میں قدیم دور میں کتابوں کی شکل کیا رہی ہوگی۔اس وقت مذہبی کتابیں تھیں جنھیں پجاری استعمال کیا کرتے تھے۔قانون کی کتابیں بھی تھیں، جنھیں ''شاستر'' کہا جاتا تھا، اور جنھیں راجہ اور ان

نوٹس

کے وزیر استعمال کیا کرتے تھے۔ امراء کی تعفن طبع کے لیے ڈرامے اور شاعری بھی لکھی جاتی تھی۔ یہ بات واضح رہے کہ زیادہ تر کتابیں بااثر افراد اور امراء کی چھوٹی سی تعداد کے استعمال کے لیے ہی مخصوص تھیں۔

تاہم مہابھارت (جس کے بارے میں آپ نے سبق 30 میں پڑھا ہے) جیسی رزمیہ نظمیں، جاتک کتھائیں کہانیوں اور ہتوپدیش سے جمع کی گئی عوامی کہانیاں اور کئی اساطیر داستانیں بھی پوران کی کہانیوں میں موجود تھیں اور یہ پیشہ ور داستانی گوئیوں اور بھاٹوں کے ذریعہ زبانی طور پر منتقل ہوتی رہتی تھیں۔ اس طرح کی کہانیاں مقامی مندر کے پجاریوں کے ذریعہ بھی سنائی جاتی تھیں۔ گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ داستان گوئی کے دوران ان کہانیوں میں تبدیلیاں آتی رہتی تھیں۔ چنانچہ آج ہم عوامی داستانوں کی کئی شکلوں کو دیکھتے ہیں۔ دور قدیم میں گوکہ بہت کم کتابیں پڑھی اور لکھی جاسکیں لیکن انھوں نے بہت سے لوگوں کی زندگی کو متاثر کیا۔

چھپائی (پرنٹنگ) 16 ویں صدی عیسوی میں روشناس ہوئی۔ اب کتابوں کو کم وقت اور کم لاگت کے ساتھ زیادہ تعداد میں تیار کیا جاسکتا تھا۔ تاہم چونکہ بہت کم لوگ پڑھے لکھے تھے اس لیے اس کا فوری اثر بہت محدود تھا۔ 19 ویں صدی عیسوی میں اس وقت اس میں اچانک اور تیز رفتار تبدیلی آئی جب کہ قوم پرستوں اور سماجی اصلاح کاروں کے ذریعہ پریس اور پرنٹنگ تکنالوجی کا بھرپور طور پر استعمال کیا۔

ہندوستان میں پہلا اخبار 1760ء میں انگریزی زبان میں شائع کیا گیا۔ جسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک افسر نے چھاپا تھا۔ اس کے بعد بہت سے اخبارات شائع کیے گئے ہیں۔ ان اخبارات کا مقصد ہندوستان میں موجود انگریزوں کو یوروپ کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنا تھا۔

19 ویں صدی کے اوائل سے مقامی زبانوں میں بھی بہت سے اخبارات شائع ہونا شروع ہوگئے۔ ان اخبارات کو ان محبان وطن نے شائع کیا جن کے ذہن میں ہندوستانی قوم کے مفادات موجود تھے۔ ان اخبارات کے ذریعہ خبریں اور نظریات نہ صرف تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچے بلکہ ان کے ذریعہ یہ دوسرے لوگوں تک بھی پہنچے۔ کئی مفکرین نے اس بات پر توجہ مرکوز کی کہ اگر ہندوستان کی روایتی کمزوریوں اور خامیوں کو ختم کردیا جائے تو برطانوی اقتدار سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان اصلاح کاروں نے آزادی کی مہم میں نہ صرف راست طور پر حصہ لیا بلکہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے پریس کا استعمال بھی کیا۔ اس طرح کے ایک اصلاح کار بنگال کے راجہ رام موہن رائے تھے۔

راجہ رام موہن رائے نے 1821ء میں بنگالی زبان کا اخبار "سماچار کومودی" شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد 1822ء میں فارسی زبان کا اخبار "مراۃ الاخبار" اور انگریزی زبان میں "برہمنیکل میگزین" شائع ہوا۔ ان اخبارات کے ذریعہ انھوں نے عورتوں کی تعلیم اور بیواؤں کی دوبارہ شادی کی حمایت کی اور "ستی" اور ذات پات کے نظام کی خامیوں اور برائیوں کی بیخ کنی کی۔ انھوں نے لاتعداد پمفلٹ بھی شائع کیے جن میں انھوں نے دنیا کے اہم مذاہب کی تعلیمات پر مبنی ایک مثالی سماج کے تصور پر زور دیا۔ انھوں نے "برہموسماج"

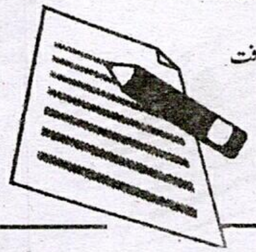

نوٹس

کے نام سے ایک برادری کی داغ بیل رکھی جس میں بنگال کے بے شمار تعلیم یافتہ اور ترقی پسند افراد نے شمولیت اختیار کی۔ یہ پرنٹنگ پریس کی وجہ سے ہی ممکن ہوسکا کہ راجہ رام موہن رائے کہ تصورات وخیالات ناظرین کی وسیع تعداد تک پہونچ سکے۔ آپ پریس کے اثر کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ سماجی اصلاح کے راجہ رام موہن رائے کے تصورات کی مخالفت کے لیے حریف اخبار ''چندریکا'' 1822ء میں ہی چھپنا شروع ہوگیا۔

چنانچہ ہم نے یہ دیکھا کہ اخبارات ورسائل صرف اطلاعات ہی فراہم نہیں کرتے وہ ہمارے انداز فکر کو بھی ڈھالتے ہیں۔ تصورات ونظریات کا تبادلہ ہمیشہ سے ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ تاہم ترسیل (کمیونیکشن) کی جدید شکلوں میں کوتصورات کی منتقلی یک طرفہ عمل بن کررہ گئی ہے۔ اخبارات کے مالکان قاری کے نظریات پر اثرانداز ہوسکتے ہیں جبکہ قاری اسی طرح کا اثر نہیں ڈال سکتا۔ کیا اس کی یکسانیت آپ عالمگیریت کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں جس کے بارے میں آپ سبق 29 میں پڑھ چکے ہیں۔

متن پرمبنی سوالات 31.1

1۔ ہندوستان کی زیادہ تر عبارتیں، کس رسم الخط سے اخذ کی گئی ہیں؟

2۔ زمانہ قدیم میں لکھی گئی دواقسام کی کتابوں کے نام بتایئے۔

3۔ مسودوں کی تیاری مہنگی کیوں تھی؟

4۔ بتایئے کہ صحیح ہے یا غلط

(i) زبان ترسیل کا ذریعہ نہیں ہے۔

(ii) ''ہت اپدیش'' کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے

(iii) راجہ رام موہن رائے 19ویں صدی میں پریس کا استعمال کرنے والے پہلے اصلاح کار تھے۔

(iv) تحریر سے طویل فاصلے کی ترسیل ممکن ہوتی ہے۔

31.2 موسیقی ثقافت کا ذریعہ اظہار

موسیقی اور رقص، ثقافت کے قدیم ترین ذریعہ اظہار ہیں۔ زمانہ قدیم کا انسان گیتوں اور رقص کے دوران تال میل پیدا کرنے کے لیے ہاتھوں سے تالیاں بجا کر یا زمین پر لکڑی مار کر آوازیں پیدا کرتا تھا۔

نوٹس

آہستہ آہستہ کئی اقسام کے ڈھول اور دوسرے آلات موسیقی استعمال کیے جانے لگے۔ گجرات میں ''گربا'' کیرالہ میں ''کتھاکلی'' اور پنجاب میں ''گدا'' اور ''بھنگڑہ'' لوک رقصوں کی کچھ مثالیں ہیں۔ ان سبھی لوک ناچوں کو تہواروں کو منانے، اہم تقاریب کے موقعوں، مختلف جذبات کا اظہار کرنے اور کبھی کبھار اپنے احتجاج میں زور پیدا کرنے کے ذریعہ کے طور پر انجام دیا جاتا ہے۔

لوک گیت بہاروں کے موسم، بارشوں کی آمد یا فصلوں کے پکنے پر گائے جاتے ہیں۔ اس میں زراعت کو مرکزی مقام حاصل ہے۔ ان گیتوں میں مزدوروں اور کمہاروں کے گیت بھی موجود ہیں۔ آپ نے شاید تعمیراتی مزدوروں کو اس وقت گاتے ہوئے سنا ہوگا جب وہ کسی بہت بھاری بوجھ کو اٹھاتے ہیں۔ ان کے الفاظ کو غور سے سنئے وہ ان کے کام سے متعلق ہوتے ہیں۔

عورتوں کے ذریعہ یا ان کے بارے میں گائے گئے بے شمار گیت موجود ہیں جن میں اس غم کا اظہار کیا جاتا ہے جو پریتم سے بچھڑنے پر ان کو محسوس ہوتا ہے۔ یا بابل کے گھر سے لڑکی کے وِداع ہونے کے موقع پر دکھ بھرے گیت گائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ساس اور بہو کے درمیان ناچاقی سے متعلق گیت بھی موجود ہیں۔

لوک موسیقی اپنی نوعیت کے لحاظ سے خوشی یا غم بانٹ لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ لوگوں کو تجربہ پر مبنی ہے۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے لوک آرٹ انہی لوگوں کے ذریعہ ''ناپید'' ہوجاتا ہے جو اس کی تخلیق کرتے ہیں۔

لوک موسیقی اسٹیج کے لیے نہیں ہوتی۔ تاہم دور جدید اس ثقافت کا اصل مقصد تبدیل ہو چکا ہے۔ چنانچہ آج کل لوک رقص اسٹیج پر بھی پیش کیے جاتے ہیں اور لوگ بطور ناظرین ان کو دیکھتے ہیں۔

آپ نے سبق 29 میں کلاسیکی ثقافت کے بارے میں پڑھا ہے۔ کلاسیکی موسیقی، موسیقی کی ایک انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے اس لیے کہ یہ واضح اور متعینہ اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کو موسیقی کے قواعد (گرامر) کہا جاسکتا ہے۔ گانے یا کسی آلہ موسیقی کو بجانے کے لیے ایک لمبی مدت تک کٹھن محنت اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم کوئی بھی اسے سن کر اس سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ درحقیقت بے شمار فلمی گانے، لوک گیت کلاسیکی راگوں یا کلاسیکی راگوں کو آسان شکلوں پر مبنی ہیں۔ کلاسیکی اور لوک دونوں طرح کی موسیقی صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں اور ایک دوسرے میں اس طرح سموتے رہے ہیں کہ بعض اوقات ان کی باریکی سے تشخیص کرنا بھی دشوار ہوتا ہے۔

> پرانے دور میں کلاسیکی موسیقی کی سرپرستی بادشاہوں کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ تان سین مغل شہنشاہ اکبر کے دربار کے نورتنوں میں سے ایک تھا۔
>
> آج بڑے کاروباری ادارے اور قومی اور بین الاقوامی ثقافتی تنظیمیں کلاسیکی موسیقی کی سرپرستی کرتے ہیں۔

موسیقی کی ان دونوں ہی اقسام کو مذہبی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ درحقیقت بہت سے

نوٹس

لوک اور کلاسیکی گیتوں کے موضوعات مذہبی اور روحانی ہوا کرتے تھے۔

ہندوستان میں روحانی موسیقی کی قدیم ترین مثال ''سام وید'' سے ملتی ہے۔ 3000 سال پرانی یہ کتاب ویدک منتروں پر مشتمل ہے جنھیں قربانی کی رسم کی انجام دہی کے دوران گیتوں کی شکل میں گایا جاتا تھا۔

قرون وسطیٰ سے بھکتی اور صوفی سنتوں کے گیت ان کے ماننے والوں اور دوسرے لوگوں کے ذریعہ گائے جاتے تھے۔ آج ہم ان گیتوں سے بھجنوں اور قوالیوں کی صورت میں واقف ہیں۔ بعض اوقات ان گیتوں میں اپنے کسی خاص دیوتا کے تئیں عشق اور جانثاری کے جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے اور اس سے دنیاوی مصائب اور آفات کو ٹالنے کے لیے مدد کی گذارش کی جاتی ہے۔ قوالی اور بھجن کی بنیاد اکثر کلاسیکی موسیقی ہوتی ہے اور عوامی یا لوک شکل میں ہوتے ہیں۔

> بھجن بعض اوقات عام لوگوں کی زندگی کے تجربات سے جڑے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کبیر کے دوہوں میں اس کے موروثی پیشہ بنائی، کتائی، کا بار بار حوالہ دیا گیا ہے۔
>
> قوالی خاص طور سے درگاہوں، یعنی صوفی پیروں کے مزاروں کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ گردواروں میں سکھوں کی مقدس کتاب ''گروگرنتھ صاحب'' کا موسیقی کے انداز میں پاٹھ کیا جاتا ہے۔ گروگرنتھ صاحب 10 سکھ گروؤں اور صوفی، سنتوں کے اقوال کا مجموعہ ہے۔
>
> گروگرنتھ صاحب کی گربانی پڑھنے والے سکھ کو نہ صرف مذہبی تربیت لینی پڑتی ہے بلکہ اس کو کلاسیکی موسیقی کی تربیت بھی لینی ہوتی ہے اور اسی لیے اُنھیں کو 'راگی' کہا جاتا ہے۔

موسیقی کی ایک نسبتاً نئی شکل فلمی موسیقی ہے۔ ابتدائی طور پر فلمی موسیقی پر کلاسیکی اور لوک موسیقی کا اثر غالب تھا۔ پرانے مشہور فلمی گانوں میں سے زیادہ تر ہندوستانی اور مغربی دونوں طرح کی کلاسیکی موسیقی کی دھنوں پر مبنی تھا۔ لیکن فلمی موسیقی کی اپنی کچھ مخصوص خصوصیات بھی ہیں۔ اس نے ہندوستانی آلات موسیقی کے ساتھ ساتھ آرکسٹرا کا استعمال بھی کیا جس کا تعلق اصل میں مغربی کلاسیکی موسیقی سے ہے۔ آج کل ہر روز اس طرح کی دھنیں روزانہ بن رہی ہیں جن میں کئی آلات موسیقی کو یکجا کر دیا جاتا ہے۔

> مشہور فلمی گیت ''اتنا نہ مجھ سے پیار بڑھا'' (فلم چھایا) 18 ویں صدی کے آسٹریا کے موسیقار موزارٹ کی ترتیب دی ہوئی سنگیت پر مبنی تھا۔
>
> ''مغل اعظم'' کے تقریباً سبھی گانے کلاسیکی ہندوستانی موسیقی پر مبنی ہیں اور اس فلم کا گانا ''محبت کی جھوٹی کہانی پر روئے'' راگ درباری کنٹر پر سیٹ گیا ہے۔

فلمی گیت ''فلم کے موضوع پر ہی نہیں بلکہ تکنیکی ملحوظات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس صدی کے آغاز کے وقت پرانا ریکارڈنگ میکانزم ایک وقت میں صرف $3\frac{1}{2}$ منٹ کے درمیان ہوتا تھا۔ اب تکنیکی پیش رفت کے ساتھ ریکارڈنگ مسلسل گھنٹوں تک کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ لیکن فلمی گیتوں کی ایک مقررہ شکل بن چکی ہے۔ اگلی

نوٹس

بار جب آپ ریڈیو پر کوئی گانا سنیں تو اس کے وقت پر غور کیجیے۔

ثقافت کے تمام ذرائع اظہار کی طرح موسیقی میں بھی تصورات مضمر ہوتے ہیں۔ بنگال کے ''باؤل'' اپنے گیتوں کے ذریعہ روایتی طور پر عالمی بھائی چارے اور خلوص کا پیغام دیتے تھے۔

روحانی گیت نہ صرف عبادت گذاروں کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں بلکہ ان کے ذریعہ دوسروں کو بھی اپنی جانب راغب کیا جاتا ہے۔ آج موسیقی عالمی دیہات میں ایک اہم پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کے بارے میں آپ سبق 29 میں پڑھ چکے ہیں۔ موسیقی کی نئی شکلوں کو ترتیب دیتے ہوئے ہمیں اپنے ثروت مند ورثہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

متن پر مبنی سوالات 31.2

1۔ لوک گیتوں اور رقصوں کے ذریعہ کن موقعوں کو منایا جاتا تھا؟

____

2۔ خالی جگہوں کو بھریئے:

(i) ____________ کے لیے کٹھن ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔

(ii) بھکتی اور صوفی سنتوں کے گیتوں کو ____________ کہا جاتا ہے۔

(iii) بنگال کے ''باؤل'' ____________ اور ____________ کے بارے میں گیت گاتے تھے۔

3۔ بتائیے کہ صحیح ہے یا غلط

1۔ لوک رقصوں کو صرف اسٹیج پر ہی پیش کیا جاتا ہے۔

2۔ کلاسیکی اور لوک موسیقی نے ایک دوسرے کے ساتھ کبھی بھی عمل باہم نہیں کیا۔

3۔ فلمی گیت کلاسیکی دھنوں سے مستعار لیے گئے ہیں۔

ہندوستان اور بیرونی دنیا کے درمیان رابطہ دوسری صدی قبل مسیح اور دوسری صدی عیسوی کے درمیان خوب پھلا پھولا۔ سیاسی اور کاروباری عمل باہم کے نتیجہ میں تصورات و خیالات کا تبادلہ ہوا اور وسیع پیمانے پر سماجی اور ثقافتی فروغ ہوا۔ بودھ مت نے نئے حالات کو اپنایا اور ہند یونانی اور وسطیٰ ایشیا کے علاقوں میں اس کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ خانقاہوں کے راہبوں نے تاجروں کے ساتھ سفر کیا اور وسطیٰ ایشیا کے دور دراز کے علاقوں میں خانقاہیں قائم کیں جہاں سے بودھ مت چین تک پھیل گیا۔

نوٹس

یونانیوں کے ساتھ عمل باہم سے مجسمہ سازی کو بڑھاوا ملا۔ شروع میں گوتم بدھ کو استوپ پر پہیہ، کنول پیپل کے درخت وغیرہ کی کندہ کاری کر کے علامتی انداز میں دکھایا جاتا تھا۔ لیکن اب یونانی دیوتاؤں مثلاً اپولو کے مجسموں کو دیکھ کر گوتم بدھ کے مجسمے بھی تیار کیے گئے۔ اسی کے متوازی پیچیدہ عقائد کا بھی فروغ ہوتا رہا۔ دوبارہ جنم اور دوبارہ تجسیم نے اس عقیدہ کی جانب رہنمائی کی کہ گوتم بدھ کے پہلے بھی کئی جنم ہوئے تھے۔ اوائلی طور پر گوتم بدھ کے جنم کو ''بودھی ستو'' کہا جاتا تھا۔ بودھی ستو کو ایک رحمدل انسان سمجھا جاتا تھا جو اپنے ماننے والوں کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ عبادت گذار اپنے آفات و مصائب کو ٹالنے کے لیے ان کی پوجا کرتے تھے اور اس کے لیے ان سے مدد کے طلبگار ہوتے تھے۔

31.3 ثقافت کی اشکال اور بودھ مت کا پھیلاؤ

آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ مذہب ہمارے ثقافتی ورثہ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مذہبی تصورات ثقافت کے ذریعہ ایک سے دوسرے کو منتقل ہو سکتے ہیں۔ آیئے یہاں ہم بودھ مت کی مثال کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

گوتم بدھ کا دور چھٹی صدی قبل مسیح کا تھا۔ انھوں نے اس بات کی تبلیغ کی کہ دنیا کی نوعیت دکھوں بھری ہے اور اس سے خود کو نجات دلانے کے لیے اپنی خواہشات پر قابو پانا چاہیے۔ انھوں نے اپنے بھکتوں کو سادہ اور نیک زندگی بسر کرنے کی تلقین کی اور بہت زیادہ سادگی اور حد سے زیادہ عیش پرستی کے درمیانی راستہ پر چلنے کی ہدایت کی۔

بودھ کے پیغامات کو عام لوگوں نے اپنایا کیوں کہ وہ عام زبان ''پراکرت'' میں بات کرتے تھے جب کہ برہمن، سنسکرت کا استعمال کرتے تھے جو اس وقت ایک ایسی زبان تھی جسے لوگ سمجھ نہیں پاتے تھے۔

بودھ مت کے ماننے والوں نے بہت سے مذہبی اور ثقافتی طور طریقوں کو اپنایا اور اپنے آپ کو ان میں ڈھالا۔ مثال کے طور پر درختوں کی پوجا ایک عام عمل تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ درخت کی پوجا، بودھ گیا درخت کی پوجا سے مماثلت رکھتی ہے۔ بودھ مت کی روایات کے مطابق گوتم بدھ درخت کے نیچے بیٹھ کر دھیان کرتے تھے اور یہیں انھیں ''گیان'' کی روشنی ملی۔

مردہ لوگوں کی یادگار قائم کرنے کا ایک رواج بھی عام لوگوں میں رائج تھا۔ اس مردہ جسم کے اوپر گولائی میں ڈھیر بنا دیا جاتا تھا۔ مرے ہوئے فرد کے رشتہ دار اور دوست احباب اسی ڈھیر پر عبادت کرتے تھے۔ بودھ مت کے ماننے والوں نے اس طریقہ کو اپنایا اور استوپ تعمیر کیے یا گول ڈھیر بنائے اس میں اکثر بدھ کے دانتوں یا ایسی پاک چیزوں کو رکھ دیا جاتا تھا، جن کے بارے میں لوگوں کو گمان تھا کہ گوتم بدھ کے استعمال میں رہی تھیں۔

شکل 31.1: گوتم بدھ

بودھ مت جیسے جیسے پھیلتا گیا بودھ، ہندوستانیوں اور یونانیوں کے رابطہ میں آئے جو برعظیم کے شمال مغربی علاقے میں آباد تھے یونانیوں کی ایک پرانی روایت تھی کہ وہ اپنے دیوتاؤں کو انسانی شکل میں پیش کرتے تھے۔ بودھوں نے بھی اس روایت کو اپنایا اور گوتم بدھ کو بھی ویسی ہی شکل میں پیش کیا۔ (شکل 31.1)

> یہاں ایک مختصر سی جاتک کہانی پیش کی جارہی ہے جیسے ''بدالا کوکوٹا جاتک'' کے نام سے جانا جاتا ہے (بلی اور مرغ کی جاتک) یہ کہانی اس طرح ہے:
>
> بلی نے مرغ سے کہا کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ مرغ کو درخت سے اتارے اور کھالے لیکن مرغا عقل مند تھا اور اس نے اس ''شادی'' سے انکار کردیا۔ بودھ مت کے پرچارک اس عقل مند مرغے کو پچھلے جنم کے بودھ سے مماثلت دیتے ہیں۔ بھرہٹ (مرکزی ہندوستان) میں اس کہانی کو سنگ تراش کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔

بودھ مت کے ماننے والوں نے سینکڑوں کی تعداد میں عوامی لوک کہانیوں کو بھی اپنایا۔ بودھ مت کی روایت کے مطابق ان کہانیوں کو ''جاتک'' یا بودھ کا گذشتہ جنم اور زندگی کہا جاتا ہے۔ ان میں سے بہت سی کہانیوں کو سنگ تراشی کے ذریعہ پیش بھی کیا گیا ہے۔

جاتک کہانیوں کی اجنتا میں غاروں کی دیواروں اور مدھیہ پردیش میں سانچی استوپ کے چاروں طرف لگی ریلنگوں پر بھی عکاسی کی گئی ہے۔ ان جگہوں پر جانے والے لوگوں کو وہ کہانیاں یاد آجاتی ہیں جو انھوں نے سنی ہیں۔ دوسری طرف ان تصویروں سے بودھ مت کے بارے میں سیکھنے کو بھی ملتا ہے۔

یہ صرف بودھ پرچارک ہی نہیں تھے جنھوں نے اپنے پیغامات کو پھیلانے کے لیے ثقافتی ذرائع کا استعمال کیا۔ اگر ہم اپنے اہم مذہب کی روایات پر نظر ڈالیں جن میں عیسائیت، ہندوازم، اسلام اور جین مت شامل ہیں تو ہم پائیں گے کہ ان کی کامیابی ان طریقوں میں مضمر تھی جن کے ذریعہ ان کے پیغامات دوسروں تک پہنچے۔ ان طریقوں میں موسیقی، مصوری، داستان گوئی اور عبادت گاہوں کی تعمیر کے مختلف انداز کا شمار ہوتا ہے۔

نوٹس

کثیر العیالی کے قدیم اور عوامی مسلک کو، جس کا مرکز دیوی ماؤں کی پوجا ہوا کرتا تھا بودھ مت کی بڑھتی ہوئی روحانیت میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ بودھی استو کے ساتھ ایک مقدس دیوی بھی ہوتی تھی جس کا نام تارا تھا۔ بودھی استو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ان ہی دیویوں کے ذریعہ اپنے کام انجام دیتا تھا۔ مرد اور عورت کی طاقت کثیر العیالی کے لاتعداد مسلکوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ عوامی عقائد اور طور طریقوں کے اس طرح کے ثقافتی تصورات کو اپنے اندر سمو لینے کی خصوصیت نے بودھ مت کی قبولیت کو اور زیادہ آسان بنا دیا۔

ان واقعات نے بودھ مت کی مقبولیت کو بڑھاوا دیا جب کہ بودھ کی اصل سادہ تدریس کو تقریباً فراموش کر دیا گیا۔ بودھ نے کسی بھی معجزہ کو انجام دینے سے سختی سے منع کیا تھا اور اپنی پوجا کیے جانے کی مخالفت بھی کی تھی لیکن اسے آج ایک دیوتا سمجھا جاتا ہے اور بودھی استو کے ذریعہ انجام کردہ کرشموں کی کہانیوں کو بودھ عقیدہ کی بنیاد بنا لیا گیا۔

بودھ مت اسی زمین پر مٹ گیا جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ اس نے اپنی اصل تعلیمات کو کھو دیا بلکہ اس کے ذریعہ سکھائے گئے سادہ زندگی کے اصولوں کو فراموش کر دیا گیا۔ حکمرانوں اور تاجروں کے ذریعہ خانقاہوں کو فراہم کی گئی دولت کے حاصل ہونے کے ساتھ راہبوں نے عام آدمیوں سے تعلق و رابطہ کو ختم کر دیا۔ بودھ مت سے متعلق نئی کتابیں سنسکرت زبان میں لکھی گئیں جسے عام لوگ سمجھ نہیں پاتے تھے۔

متن پر مبنی سوالات 31.3

1۔ بودھ کس زبان میں پرچار کرتے تھے؟

2۔ بودھ کی انسانی شکل میں تجسیم کس تعلق کی وجہ سے ہوئی؟

3۔ جاتک کہانیاں کیا ہوتی ہیں؟

خالی جگہوں کو بھریئے:

1۔ استوپ کندہ کاریوں میں بودھ کو علامتی طور پر ______ اور ______ وغیرہ کی حیثیت سے دکھلایا گیا ہے۔

2۔ تارا ایک دیوی تھی جس کا تعلق ______ سے تھا۔

3۔ ______ گول ڈھیر ہوتے تھے جن میں بودھ اور دوسرے اہم راہبوں کے باقیات اور نشانیاں رکھی جاتی تھیں۔

نوٹس

آپ نے کیا سیکھا

زبان ثقافتی تصورات کی منتقلی کا ایک ذریعہ ہے۔ ثقافت کے پھیلاؤ پر جغرافیائی، بولی اور لکھی جانے والی زبانوں، پرنٹنگ، اخبارات اور رسائل جیسے عوامل کا اثر پڑتا ہے۔

زبان کے علاوہ موسیقی اور رقص بھی ثقافت کے ذرائع اظہار ہیں۔ موسیقی عالمگیر کشش رکھتی ہے۔ اس کی لوک اور عوامی شکلوں نے ثقافت کو ثروت مند بنایا ہے۔ اس کے ذریعہ تصورات کی منتقلی بھی ہوتی ہے۔

اختتامی سوالات

1۔ ثقافت کی ترسیل کے مختلف ذرائع کیا ہیں؟

2۔ ثقافت کی ترسیل میں تحریر اور پرنٹنگ کی اہمیت کا تجزیہ کیجیے۔

3۔ مختلف تصورات کی ترسیل کرنے والے موسیقاروں کی کیا اہمیت ہے؟

4۔ ثقافت کی مختلف شکلوں نے بودھ مت کو پھیلنے میں کس طرح مدد دی؟

متن پرمبنی سوالات کے جوابات

31.1

1۔ برہمی

2۔ مذہبی کتابیں اور شاستر

3۔ وہ دستی تحریر میں تھیں

4۔ (i) غلط (ii) صحیح (iii) غلط (iv) صحیح

31.2

1۔ قدرتی تبدیلی کے واقعات اور زندگی کے غم و خوشی

2۔ (i) کلاسیکی موسیقی

(ii) بھجن، قوالیاں

(iii) عالمگیر بھائی چارہ اور خلوص

نوٹس

3- (i)غلط (ii)غلط (iii) صحیح

31.3

1- پراکرت

2- یونانی

3- بودھ کے جنم کی کہانیاں

4- (i) انسانی شکل میں دیوتا، بودھ کا جنم اوراس کی زندگیاں

(ii) کثیرالعیالی کے طور پر بودھی استو

(iii) استوپ

تاریخ

(315)

سوالنامے کا ڈیزائن

مضمون: تاریخ
نصاب: سینیئر سیکنڈری

نمبر: 100
مدت: تین گھنٹے

1۔ مقصد کے مطابق موازنہ

مقصد	نمبر	کل نمبروں کا فی صد
معلومات	26	26%
ادراک	52	52%
استعمال/ ہنر	22	22%

2۔ سوالات کی اقسام کے مطابق موازنہ

قسم	سوالات تعداد کی	نمبر	میزان	امیدوار کی جانب سے متوقع اندازاً وقت
طویل جوابی سوالات	5	10	50	100 منٹ
مختصر جوابی سوالات	8	4	32	48 منٹ
بہت مختصر جوابی سوالات	4	2	8	12 منٹ
ہنر (نقشہ)	1	10	10	10 منٹ
				10 منٹ اعادہ کے لیے
				180

3۔ فہرست کے مطابق موازنہ

یونٹ/ ذیلی یونٹ	نمبر
1۔ قدیم دور کا ہندوستان	20
2۔ وسطی دور کا ہندوستان	20
3۔ جدید دور کا ہندوستان	15
4۔ ہندوستانی قومی تحریک اور عصری ہندوستانی	15
5۔ عصری دنیا	15
6A۔ ریاست کا ارتقا	15
یا	
6B۔ ہندوستان میں ثقافت	

4۔ سوالنامے کی شکل سطح:

سطح	نمبر	نمبروں کا فی صد
مشکل (بہت اچھے طلبا کے ذریعہ حل کیے جاسکتے ہیں	10	10%
اوسط (ان طلباء کے ذریعہ حل کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے مواد کو باقاعدگی سے پڑھا ہے، لیکن شاید وہ تحریر کے لیے وافر وقت نہیں دے سکے	60	60%
آسان ان طلباء کے ذریعہ حل کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے مواد کو پڑھا ہے	30	30%

تاریخ

315

نمونۂ پرچۂ سوالات

وقت: تین گھنٹے **زیادہ سے زیادہ نمبر: 100**

نوٹ: (i) سبھی سوالات لازمی ہیں۔ ہر سوال کے سامنے اس کے نمبر درج ہیں۔

(ii) سوال نمبر 1 سے 4 تک جواب 20 الفاظ سے زیادہ میں نہ ہو۔ سوال نمبر 5 سے 12 تک ہر سوال کا جواب 80 الفاظ میں اور سوال نمبر 13 سے 17 تک کے جواب 200 الفاظ سے زیادہ میں نہ ہو۔

1۔ سنگم ادب سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ 2

2۔ تامل ناڈو اور کیرالہ کی ساحلی ریاستوں میں تالابوں سے آبپاشی کیوں مقبول ہے؟ 2

3۔ علاء الدین خلجی کے ایسے کن ہی دو مقاصد کا تجزیہ کیجیے جن کے ذریعہ وہ منڈی قوانین کی تکمیل کرنا چاہتا تھا۔ 2

4۔ سرمایہ داری کی اصطلاح کی وضاحت کیجیے 2

5۔ ہڑپا تہذیب کے زوال کی وضاحت کے لیے پیش کیے گئے مختلف نظریات پر تبادلۂ خیال کیجیے 4

یا

وہ کون سے خاص اسباب تھے جو اوائلی ویدک دور کو مابعد ویدک دور سے الگ کرتے ہیں؟

6۔ ہمایوں کو درپیش کن ہی چار مسائل کی وضاحت کیجیے 4

یا

وجے نگر سلطنت کی فوجی اور عسکری تنظیم کے بارے میں تبادلۂ خیال کیجیے

7۔ بنگال کے نواب سراج الدولہ اور برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ٹکراؤ کے بنیادی اسباب کیا تھے؟

یا

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ اختیار کردہ زمینی محصول کے مختلف نظام کیا تھے؟ کن ہی چار کا حوالہ دیجیے

8۔ برطانوی راج نے ہندوستان کا معاشی استحصال کس طرح کیا؟ قومی رہنماؤں نے کن بنیادوں پر معاشی قومیت پسندی کی تشکیل کی 4

یا

ثقافت کے میدان میں قوم پرستی کے تصورات کو کس طرح سے ظاہر کیا گیا۔ مثالیں دے کر سمجھائیے

9۔ سامراجیت کے پھیلاؤ نے پہلی عالمی جنگ کو کس طرح ہوا دی۔

یا

دوسری عالمی جنگ کے کچھ بیج ورسیلز میں بوئے گئے تھے، کس طرح 4

10۔ اس عظیم بحران کے دو بنیادی اسباب کی وضاحت کیجیے جس نے امریکہ کو اکتوبر 1929 میں متاثر کیا تھا۔ اس نے یوروپی قوموں پر کیا اثر ڈالا۔

یا

ٹرومین کے اصول کی وضاحت کرتے ہوئے بتائیے کہ اس نے امریکی خارجہ پالیسی پر کیا اثر ڈالا؟ یہ اس ضمن میں امریکہ کے مارشل پلان کی وضاحت بھی کیجیے 4

11۔ چین 1945 سے غالباً تاریخ کے عظیم ترین انقلاب سے گذرا۔ کسان اکثریتی سماج سے جس پر دیسی زعما، کا غلبہ تھا، ایک سوشلسٹ ریاست میں تبدیل ہوا جسے عوامی جمہوریہ چین کہا جاتا تھا۔ اس بیان کا تجزیہ کیجیے۔

یا

سرمایہ دارانہ صنعت کاری کے ساتھ ابھرنے والے دو نئے طبقات کی تشکیل کی وضاحت کیجیے 4

جن پدوں سے مہاجن پدوں تک ریاست کی تشکیل کس طرح ہوئی؟

یا

12۔ سماجی اور معاشی حالات ہمارے ثقافتی طریقوں کو کس طرح متاثر کرتے ہیں؟ اپنے نقطۂ نظر کو مثالوں کے ساتھ پیش کیجیے۔ 4

13۔ گپتا دور کے انتظامی نظام کی مفصل وضاحت کیجیے۔

یا

ان سماجی اور معاشی تبدیلیوں کی وضاحت کیجیے جو اوائلی وسطی دور کی خصوصیت تھی 10

14۔ دہلی سلطنت کا مرکزی انتظامی نظام کیا تھا؟ اس کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کیجیے۔

یا

مغلوں کے دور میں انتظامی ڈھانچہ کیا تھا؟ اس کی نمایاں خصوصیات بتائیے 10

15۔ ہندوستان میں مغربی تعلیم کے ابھار کے بارے میں بتائیے ہنٹر کمیشن کی سفارشات کیا تھیں؟

یا

1857ء کی بغاوت کے اسباب بتائیے۔ اس کے نتائج کیا تھے؟ 10

16۔ سول نافرمانی تحریک کی تفصیلات کا ذکر کیجیے اس کی واپسی اور تسلسل کی وضاحت کیجیے

یا

ہندوستان کس طرح آزاد ہوا؟ گو کہ آزادی کی حصولیابی انتہائی خوشی و مسرت کی بات ہے لیکن یہ مکمل فتح نہیں ہے۔ 10

17۔ دورِ جدید میں ہندوستان میں قومی ریاست کے فروغ کے مراحل پر تبادلۂ خیال کیجیے۔

یا

خورد و نوش کے کلچر پر مختصر مضمون لکھیے

18۔ (i) ہندوستان کے نقشہ کے خاکہ پر ایک جگہ پتھر کے عہد کی اور ایک جگہ ہڑپا تہذیب کی نشاندہی کیجیے۔ 2

(ii) ہندوستان کے نقشہ کے خاکہ پر مراٹھوں کے درج ذیل علاقوں کی نشاندہی کیجیے سندھ، ہولکر، بھونسلا، گائکواڈ 4

یا

دکن میں ملک کافور کی پیش قدمی کے اہم مراکز کی نشاندہی کیجیے۔

(iii) ہندوستان کے نقشہ کے خاکے پر کسی بھی فرانسیسی یا پرتگالی نوآبادی کو دکھلایئے 1

(iv) ہندوستان کے نقشہ کے خاکہ پر سابرمتی آشرم یا ڈانڈی کی نشاندہی کیجیے 1

(v) یوروپ کے نقشہ کے خاکے پر پہلی عالمی جنگ کے بعد ایک نئے آزاد ملک کی نشاندہی کیجیے 1

نمبروں کی اسکیم

تاریخ کا نمونہ پرچہ

جواب نمبر۔1

1۔ جنوبی ہندوستان کے سماج، معیشت اور حکومت 3000BC-300AD کے دوران مطالعہ کا اہم ماخذ

2۔ تامل زبان میں لکھا ہوا اور نوعیت کے لحاظ سے سیکولر

3۔ ان شاعروں کے ذریعہ پیش کردہ جنھوں نے ایک ساتھ اسمبلیوں (سنگم) میں شمولیت اختیار کی جس کی سرپرستی پہلی چار صدیوں کے دوران سرداروں اور راجاؤں نے کی۔

(کوئی سے دو نکات)

باب 1، صفحہ 3

1x2=2

جواب نمبر:2

1۔ دریا موسمی ہوتے تھے

2۔ لوگوں کو تالابی سینچائی پر منحصر ہونا پڑتا تھا۔

1x2=2

جواب نمبر:3

1۔ روزمرہ استعمال کی اشیاء کو فوج کے ہاتھوں مناسب داموں پر فروخت کرنا۔

2۔ گھوڑوں کے تاجروں اور دلالوں کے ذریعہ گھوڑوں کی خرید کو روکنا تاکہ گھوڑوں کو مرکزی طور پر خریدا جا سکے اور انھیں پھر فوج کو فراہم کیا جا سکے۔

1x2=2

جواب نمبر:4

سرمایہ داری: یہ لفظ ''سرمائے'' سے بنا ہے جس کا مطلب ہے پیسہ اور املاک کو جمع کرنا۔

صفحہ: 141

باب: 22

جواب نمبر:5

1۔ قدرتی آفات مثلاً زلزلے اور سیلاب۔

2۔ بڑھا ہوا اوسر پن اور دریائے گھاگھرا، حرکا کا خشک ہونا۔

3۔ آریائی حملوں کا نظریہ۔

4۔ تہذیب کا زوال اچانک ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ دھیرے دھیرے ختم ہوتی ہے۔

4x4

یا

1۔ لوہے کے استعمال کا آغاز

2۔ زراعت پر مبنی معیشت کی توسیع کی وجہ سے آبادی میں مسلسل اضافہ۔

3۔ خاندان کی ترتیب میں تبدیلی
4۔ نظام کی شکل میں سماجی تفریق میں ابھار اور بڑھاوا۔
5۔ آشرم کی شروعات ہو چکی تھی۔

(کوئی چار)

جواب:6

1۔ نئے مفتوحہ علاقہ اور انتظامیہ مستحکم نہیں تھی۔
2۔ بابر کے برعکس ہمایوں کو مغل شہنشاہیت کی عزت وتکریم حاصل نہیں تھی۔
3۔ چغتائی سرداروں کا جھکاؤ ہمایوں کی طرف نہیں تھا۔
4۔ افغانوں کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑا۔
5۔ ہمایوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ اقتدار کو تقسیم کرنا پڑا

1x4=4

صفحہ: 3-4

یا

وجے نگر

1۔ توپ خانہ اور گھوڑے
2۔ پہیئے دار توپ
3۔ امیر، نائک نظام
4۔ جاگیردار نائک

1x4=4

صفحہ: 183-184

جواب:7

1۔ شاہی فرمان کا کمپنی کے ذریعہ بیجا استعمال۔
2۔ کمپنی کے ملازمین نے ان مراعات کا اپنی ساحلی تجارت، بین ایشیائی تجارت کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔
3۔ کلکتہ کے ارد گرد فصیل بندی۔
4۔ کمپنی کے افسران کو شبہ تھا کہ نواب، بنگال میں فرانسیسیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے جا رہا ہے۔

4x4=8

صفحہ 4–3

یا

1۔ نوآبادیت سے زیادہ سے زیادہ محصول وصول کرنا برطانوی راج کا بنیادی مقصد بن گیا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے زمینی محصولات کے کئی تجربے کیے۔
2۔ استمراری بندوبست۔
3۔ رعیت داری نظام
4۔ محال ولدی نظام

1x4=4

صفحہ: 18-19

جواب:8

استحصال

1۔ کسانوں پر بھاری ٹیکس

2۔ ہندوستان کے ساتھ غیر مساوی تجارت

معاشی قوم پرستی

1۔ نوآبادیاتی حکمرانی لوگوں کے مفادات میں نہیں تھی۔

2۔ طاقت ور قومی احتجاج استحصال کے خلاف شروع ہوگیا۔ 2x2=4

صفحہ: 56-57

یا

1۔ ہندوستانی ثقافت کو ذات پات کے نظام، مذہبی اوہام پرستی، عورتوں کا استحصال جیسی ناپسندیدہ خواہشات سے نجات دلانا۔

2۔ ہندوستانی ثقافت میں برطانوی دراندازی کی مخالفت کرنا۔

مثالیں

ستی کی رسم

بیواؤں کی دوسری شادی (کوئی سے دو)

انگریزی لباس سے پرہیز (مثال کے ساتھ)

2+2

صفحہ 54

جواب:9

- 19 ویں صدی کے دوسرے نصف حصہ میں سامراجیت کا پھیلاؤ
- 1876ء سے 1900ء تک نوآبادیت کا پھیلاؤ
- سہ رخی اتحاد اور کی تشکیل
- اس سے دشمنیوں اور تنازعات میں اضافہ ہوا۔ 1x4=4

باب 23۔ صفحہ 96-97

یا

- معاہدہ ورسیلز میں امن اور آزادی کے اصولوں کو نظر انداز کیا گیا۔
- جرمنی کو اسی معاہدہ پر دستخط کرنے کے لیے نہیں بلایا گیا اور معاوضوں اور کوئلہ کی پیداوار کے علاقوں کی تقسیم میں غیر منصفانہ رویہ
- پولینڈ کا مسئلہ
- جرمنی کو افریقی نوآبادیوں کے حق سے محروم ہونا پڑا

جواب:10

عظیم بحران

اسباب: ضرورت سے زیادہ پیداوار اور ناقص تقسیم

اثرات: بیروزگاری، غربت اور یورپی قوموں میں بھکمری 2x2=4

باب 24، صفحہ: 114

یا

1۔ ٹرومین کا اصول۔ کمیونیزم کو ان ہی علاقوں تک محدود رکھنا جہاں اس نے قدم جما لیے ہیں اور اس کو مزید آگے نہ بڑھنے دینا۔

2۔ خارجہ پالیسی میں علاحدگی سے مداخلت پسندی کی جانب تبدیلی

3۔ مارشل پلان: یوروپ کو 10 ملین ڈالر کی منتقلی

1+1=2

باب 25، صفحہ: 132

جواب: 11

1۔ ماؤ کی پالیسی

2۔ 1949ء تک جاپانیوں، فرانسیسیوں اور برطانویوں کا اخراج

3۔ 1980ء کی دہائی کے بعد سب صنعت کاری اور تجارتی سرگرمیوں میں فری انٹر پرائز کا فروغ

4۔ بیرونی سرمایہ کاری

1x4

باب: 26، صفحہ 148

یا

1۔ بورژوازی اور مزدور طبقہ کا ظہور

2۔ بورژوازی—اوسط درجہ اور ذیلی اوسط درجہ

3۔ مزدور طبقہ— محنت کے معاوضہ پر منحصر، سرمائے کی صفت کی افزائش سے راست طور پر جڑا ہوا

2+1+1

باب 27، صفحہ 156

جواب: 12

جن کا مطلب، علاقہ، جہاں لوگ رہتے تھے، قبائل

علاقہ کی توسیع، پیشہ ورانہ فوج کی تیاری، سماجی اور معاشی تبدیلیاں، قومی وسائل، اس صورت میں مہاجن پدوں کا ظہور

یا

1۔ مرد اور عورتیں مختلف طرح کے لباس پہنتے ہیں، معیشت کی وجہ سے ملبوسات کی مختلف قیمتیں

2۔ موسیقی کا لطف ہماری معاشی صورت حال کی وجہ سے محدود۔

3۔ تاج محل کی تعمیر میں کثیر وسائل کا استعمال

کوئی سے 2x2=4

جواب: 13

گپت حکومت:

- عدم مرکزی
- موروثی بادشاہت
- بڑھے ہوئے محصولات
- عدلیہ کا بہتر نظام
- جاگیردارانہ نظام کو بڑھاوا

(5x2)

صفحہ: 108

یا

سماجی اور معاشی تبدیلیاں

- ذاتوں کی تعداد میں اضافہ

- زمین کی گرانٹوں میں اضافہ
- شکار کے بجائے بنیادی پیشہ زراعت
- راجپوتو کا ابھار
- راجپوت طبقہ اور زرعی سرگرمیوں کی توسیع کے درمیان تعلق

(5x2)

صفحہ 125-126

سوال:14

دہلی سلطنت

1۔ وزارت

3۔ دیوانِ انشا

4۔ دیوانِ رسالت

5۔ دوسرے شبہ جات، مثلاً وکیل دیر،

امیر حجاب، سراجاندار

امیر آخور، امیر مجلس

یا

مغل

1۔ بادشاہ

2۔ وکیل اور وزیر

3۔ دیوانِ کل

4۔ میر بخشی

5۔ صدرالصدور

6۔ میر سامان

کن ہی پانچ کی وضاحت

2x5=10

سوال:15

1۔ انگریزی تعلیم ہندوستان میں سب سے پہلے 18ویں صدی میں روشناس ہوئی۔

2۔ 1813ء میں ایک چارٹر ایکٹ کے ذریعہ اس کا بالآخر آغاز ہوا۔

3۔ اس ایکٹ نے انگریزی زبان کے ذریعہ مغربی ادب اور عیسائیت کی تدریس کے لیے مشنریوں کو آزادی فراہم کردی

4۔ ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقہ کی ہمت افزائی

5۔ ہندوستانیوں کے درمیان سائنس کا فروغ

ہنٹر کمیشن:

1۔ 1822ء میں ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی قیادت میں ایک کمیشن قائم کیا گیا۔

2۔ یہ عام طور پر ابتدائی دور میں ثانوی سطح تک محدود تھی۔

3۔ اس میں ابتدائی تعلیم پر زور دیا گیا اور اسی کا کنٹرول ڈسٹرکٹ اور میونسپل سطحوں پر دینے کی ہدایت کی گئی۔

4۔ عملی نوعیت کی یونیورسٹی تعلیم نے تجارتی یا پیشہ ورانہ میدانوں میں روزگار کی فراہمی کی راہ کھولی کی۔

5۔ تعلیم کے میدان میں نجی پہل قدمیوں کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔ صفحہ 37-35

5+5=10

1857ء کی بغاوت کے بنیادی اسباب

1۔ سماجی

2۔ معاشی

3۔ سیاسی

4۔ سپاہی

5۔ مذہبی (ان سبھی وجوہات کو بتائیے) (صفحہ۔47) 4x2=8

1۔ سوخت کے اصول کے منسوخی

2۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ، ہندوستان برطانوی تاج کے زیر تحت 2x1=2

10

صفحہ:57

جواب:16

ترقی

1۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ

2۔ اا نکاتی الٹی میٹم کا کوئی جواب نہیں

3۔ 12/مارچ 1930، گاندھی کی 72 لوگوں کے ساتھ سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کے لیے روانگی

4۔ 6/اپریل 1930ء ڈانڈی پہنچانا اور مٹھی بھر نمک اٹھانا

5۔ بنگالی، مہاراشٹر، آسام اور کراچی تک پھیلاؤ 4x1=4

واپسی

1۔ گاندھی، ارون معاہدہ پر دستخط

2۔ گول میز کانفرنس میں شرکت 2x4

تسلسل

گول میز کانفرنس سے کوئی فائدہ نہیں اور سول نافرمانی کا دوبارہ آغاز (2)

10

صفحہ 74

یا

1۔ 1939ء میں دوسری عالمی جنگ

2۔ کانگریس حکومت کا استعفیٰ

3۔ 1942ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک

4۔ دوسری عالمی جنگ کے اثرات، کانگریسی لیڈروں کے ساتھ بات چیت

5۔ 1947ء ہندوستان کی آزادی

مکمل جیت نہیں

1۔ ہندوستان اور پاکستان کا بٹوارہ

2۔ فرقہ وارانہ فسادات

(10)

صفحہ 78

جواب:17

انگریزوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ ہندوستان کی نوآبادیت میں تبدیلی

1۔ نوآبادیاتی ریاست کو جائز قرار دینے کے عمل کا آغاز

2۔ نوآبادیت سے قبل کے دیسی سیاسی حاکموں کو غیر قانونی قرار دینا

ایسٹ انڈیا کمپنی کے راج کو کئی دفعات (ریگولیٹنگ ایکٹ، پٹس ایکٹ کے ذریعہ قانونی قرار دینا اور 1857 کے بعد تاج برطانیہ کا اقتدار

یا

خورد ونوش کی ثقافت

1۔ کھانے کی عادتیں خطہ در خطہ بدلتی ہیں

2۔ عمل باہم کی وجہ سے کھانے کی عادتوں میں تبدیلی ہوتی ہے۔

3۔ مختلف خطوں میں پیدا ہونے والی فصلیں مختلف ہوتی ہیں۔ گیہوں کی پیداوار کے علاقہ، چاول کی پیداوار کے علاقہ، ساحلی علاقوں میں مچھلی کی پیداوار

4۔ سبزی خور اور غیر سبزی خور کھانے

5۔ مغل اور مغلئی کھانوں کی آمد

6۔ یورپین اور براعظمی کھانوں کی آمد